شیرازہ

اشاعتِ خصوصی بیادِ شمیم احمد شمیم



جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

ماہنامہ

شیرازہ

سرینگر، کشمیر

جلد: ۴۷ — **شمیم احمد شمیم نمبر** — شمارہ: ۶ تا ۸

نگران:

ظفر اقبال منہاس

مُدیر اعلیٰ:

محمد اشرف ٹاک

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

ناشر: سیکریٹری، جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

کمپیوٹر کمپوزنگ: بشارت احمد بابا

مطبع: میکاف آفسیٹ پرنٹرس۔ نئی دہلی

''**شیرازہ**'' میں جو مضامین شائع ہوتے ہیں اُن میں ظاہر کی گئی آراء سے اکیڈیمی یا ادارے کا کُلّاً یا جُزواً اتفاق ضروری نہیں۔

قیمت:۔ ۶۰ روپے (پیپر کور)
۸۰ روپے (مجلّد)

سَرورق ڈیزائننگ: بشیر احمد

☆......خط و کتابت کا پتہ:

محمد اشرف ٹاک

مدیر اعلیٰ ''شیرازہ'' اردو

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

سرینگر / جموں

فہرست

انتخاب ......(شمیم احمد شمیم کے ادب پاروں سے)

سخن ہائے گفتنی

"رشتوں کی تلاش ایک درد بھرا عمل ہے جو ہمارے زمانے میں اور بھی پیچیدہ اور درد بھرا ہو گیا ہے"۔ "شیرازہ" کا شمیم نمبر رشتوں کی تلاش سے عبارت ایسے ہی درد بھرے عمل کی کہانی ہے۔ شمیم احمد شمیم پر بات کرنا میرے لئے ہمیشہ ہی ایک مسئلہ رہا ہے، اس کی بڑی وجہ مرحوم کی سَت رنگی شخصیت اور میری ہشت رنگ دلچسپی ہے۔

میرے لئے کبھی بھی یہ آسان کام نہ تھا کہ شمیم کے بارے میں بات شروع کہاں سے کی جائے اور اسے ختم کہاں پر کیا جائے۔ شمیم، میرے نزدیک محض ایک فرد کا نام نہیں' نا ہی ایک ادیب، قلمکار، صحافی، مقرر یا پارلیمنٹرین کے کھاتے میں ڈال کر اُن کی شخصیت کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے بلکہ میری نظر میں شمیم ایک طرزِ احساس کا دوسرا نام ہے۔ وہ معاصر کشمیر کے پُر آشوب دور کا ایک ایسا کردار ہے، جس کو شکست و ریخت کے چھوٹے چھوٹے جوہڑوں اور نشیب و فراز کے تنگ و تاریک خانوں سے باہر آ کر جاننے اور پہچاننے کی ضرورت ہے۔ اب شاید وہ لمحہ آ گیا ہے جبکہ شمیم پر ایک باضابطہ سبجیکٹ کے طور پر کام کیا جائے۔ اس کے ایک سے زیادہ فائدے ہوں گے سب سے بڑا فائدہ فوری طور حاصل ہونے والا یہ ہے کہ ہمیں ہماری تاریخ کے ایک انتہائی اہم اور فیصلہ کن موڑ کے بارے میں بہت سی تبدیلیوں اور اُن سے مرتب ہونے والے دور رس نتائج کے حامل اثرات کو صحیح طور پر سمجھنے میں آسانی ہوگی، وہیں یہ عقدہ بھی ہم پر کھل پائے گا کہ ریاستی آسمبلی سے بھارتی پارلیمان تک اور ایس پی کالج سے چند صفحات پر مشتمل

ہفت روزہ آئینہ کے مدیر کے طور پر جواں سال شمیم کی آواز اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ گرجدار اور موثر بن کر کیوں کر اُبھری اور آج بھی اس حوالے سے وہ اپنی دُنیا کا بے تاج بادشاہ کیوں ہے؟۔ بدقسمتی سے شمیم نے جو کچھ کہا اور بولا وہ ہمارے پاس محفوظ نہیں (شاید پارلیمنٹ میں اُن کی تقاریر کا ریکارڈ ہو) لیکن جو کچھ اُنہوں نے لکھا، اُس کا بیشتر حصہ اب محفوظ ہے۔ لگ بھگ پچیس برس کے عرصے پر پھیلی ہوئی یہ تحریریں مذکورہ سوال کا جواب آسانی کے ساتھ فراہم کرتی ہیں۔ شمیم کے معاصرین نے شعر وادب میں بڑے معرکے سر کئے، سیاست کے میدان میں بڑے عہدوں پر فائز ہو کر نام کمایا، کاروبار کی دُنیا میں بعض نے کامیابی کے جھنڈے گاڑھے لیکن مجموعی طور پر کوئی بھی شمیم بننا تو در کنار اُس کی گرد کو بھی نہ پا سکا۔ اس کی وجہ آخر کیا ہے؟ ایک دانشور کا کہنا ہے ”جب سب سچ بول رہے ہوں تو سچ بولنا ایک سیدھا سادا معاشرتی فعل ہے لیکن جہاں سب جھوٹ بول رہے ہوں وہاں سچ بولنا سب سے بڑی اخلاقی قدر بن جاتا ہے۔ اسے مسلمانوں کی زبان میں شہادت کہتے ہیں اور شہادت اسلامی روایت میں ایک بنیادی اور مطلق قدر کا مرتبہ رکھی ہے۔ جب ایک معاشرہ تخلیق کے فریضہ کو فریضہ سمجھنا ترک کر دے اور اسے ترقی کا ذریعہ سمجھے تو جو شخص اس فریضہ کو ادا کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لیتا ہے، وہ گویا شہادت پیش کرتا ہے“۔ یہی شہادت شمیم احمد شمیم نے آئینہ کی اشاعت کے ساتھ پیش کر دی۔ افراد اور اداروں کے ساتھ ذاتی تعلقات میں اُتار اور چڑھاو سے پیدا ہونے والی مٹھاس اور کھٹاس سے قطع نظر اُنہوں نے مجموعی طور پر شہادت کا یہ حق تب تک ادا کیا جب تک وہ اس عالم سے سدھار نہ گئے اور بقول آلِ احمد سرور نہ صرف اُن کے غرورِ عشق کا بانکپن آخری دم تک اُن کے ساتھ رہا بلکہ غرورِ عشق کے اس بانکپن میں اُن کے معاصرین میں سے دُور دُور تک بھی کوئی اُن کا ہمعصر انہیں نظر نہ

آیا۔ ”شہادت“ کا یہ اعلان آئینہ کی اشاعت کے پس منظر میں آسانی کے ساتھ سمجھ میں آتا ہے۔ شمیم کے مطابق ”مجھ پر الزام عائد کیا گیا کہ میں سوچتا ہوں اور یہ کہ بہت بُرے خواب دیکھتا ہوں، سوچنا تو ایک شعوری فعل ہے، میں اس پر پابندی عائد کر سکتا تھا لیکن خواب کا تعلق لاشعور سے ہے، اس لئے یہ میری گرفت سے باہر تھے۔ میں خواب دیکھتا رہا، خوابوں کے کوتوالوں نے خبر دی کہ شہر میں ایک نوجوان غلط قسم کے خواب دیکھ رہا ہے، قصرِ شاہی سے فرمان جاری ہوا کہ اسے شہر بدر کر دو، اس پر جینا حرام کر دو، اس کی آنکھوں سے نیند اُڑا دو تا کہ دوسروں کو عبرت ہو۔ دوسروں کو عبرت ہوئی یا نہیں لیکن خود میری آنکھیں ضرور کھل گئیں۔ خوابیدہ احساس نے کروٹ لی، جس شعور کو تھپکیاں دے دے کر سُلا رہا تھا، وہ جاگ اُٹھا، غلامی اور ذلّت کی چھاؤں میں رہ کر میں اپنی زنجیروں سے کچھ مانوس ہو گیا تھا، مجھے یہ زنجیریں بھی اپنے وجود کا حصہ نظر آنے لگی تھیں۔ اب ان زنجیروں کا بوجھ نا قابل برداشت معلوم ہونے لگا۔ مجھے اپنے ماضی سے نفرت، اپنے حال سے بے اطمینانی اور مستقبل سے وحشت ہونے لگی اور مستقبل سے یہ وحشت آئینہ کے اجراء کی شانِ نزول بھی ہے اور میری آٹھ سالہ کشمکش کا حاصل بھی“۔ شانِ نزول کی یہ کہانی اس عہد و پیمان کے ساتھ انجام پذیر ہوتی ہے۔ ”عذرِ لنگ تراشنے سے بہتر یہ ہے کہ ہم اپنے جرائم کا اعتراف کریں اور یہ عہد کریں کہ ہم اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کریں گے، ہم اپنے ضمیر کی آواز کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے اور ہر ظلم اور زیادتی کے خلاف آواز بلند کریں گے۔ میرا یہ عہد ”آئینہ“ کے اجراء کا محرک ہے اور مجھے یقین ہے کہ میں ہر قیمت پر اپنے اس مقدس عہد کی آبرو رکھوں گا، یہ دُنیا کو مطمئن کرنے کا سوال نہیں، اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کا سوال ہے“۔

آئینہ کی اسی اشاعت میں ”یہ اخبار کس کا ہے“ کے عنوان کے تحت شمیم آئینہ کی

اشاعت کا مقصد ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں ''آئینہ'' کو دیکھ کر لمحہ بھر کے لئے آپ کو اپنی صورت نظر آئے گی اور کچھ دیر بعد آپ کو اس میں اور بھی صورتیں نظر آئیں گی۔ یہ صورتیں آپ کے اردگرد کی دنیا کی، آپ کے ماحول کی، آپ کے ماضی، حال اور مستقبل کی صورتیں ہوں گی اور آپ یہ سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ یہ کس کا آئینہ ہے؟۔ یہ کس سیاسی لیڈر کی جائیداد ہے؟ یہ کس سیاسی جماعت کا نمائندہ یا نوکر ہے؟ یہ کس رئیس کی کرامت ہے؟ یہ کس سیاسی نظریئے یا مذہبی فرقے کی ترجمانی کرے گا؟ یہ اور بہت سے سوال ذہن میں اُبھریں گے، ان تمام سوالات کا جواب یہ بھی دیا جاسکتا تھا کہ آئینہ کا کسی سیاسی جماعت یا لیڈر سے تعلق نہیں، یہ عوام کا اخبار ہے لیکن میں دو وجوہ کی بناء پر خود اس جواب سے مطمئن نہیں ہوں۔ اولاً یہ کہ یہ بڑا روایتی جواب ہے اور ثانیاً یہ پوری حقیقت بھی نہیں، یہ صحیح ہے کہ آئینہ عوام کے ہر جائز، صالح اور معقول مطالبے کی حمایت کرے گا لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ سستی مقبولیت حاصل کرنے کے لئے ''آئینہ'' اعتدال، توازن اور صحت مند تنقید کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دے۔ اپنے یہاں صحافتی تنقید کے معنی صرف حکومت کی نکتہ چینی سمجھا گیا ہے لیکن جمہوری نظام کی بقاء کے لئے صرف حکومت پر ہی نکتہ چینی کرنا کافی نہیں، عوام کو بھی تنقید کا ہدف اور موضوع بنانا چاہیے۔ آئینہ، جہاں حکومت کی فروگذاشتوں کو بے نقاب کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرے گا وہاں وہ بڑی بے باکی کے ساتھ تعصب، تنگ نظری، فرقہ پرستی، جہالت اور توہم پرستی کے خلاف بھی جہاد کرے گا''۔

1964ء سے 1978ء تک پندرہ برس کا عرصہ اس بات کے گواہ ہے کہ ''آئینہ'' اور ''صاحبِ آئینہ'' نے جہاں تعصب، تنگ نظری، فرقہ پرستی، جہالت، توہم پرستی اور دقیانوسیت کے خلاف جہاد میں ایک پل کے لئے بھی پیٹھ دکھانا تو دُور، کبھی بھی سُست

روی اور تساہلی نہیں دکھائی، وہیں شمیم صاحب نے آئینہ کے صفحات سے لیکر بھارتی پارلیمان تک کبھی بھی اور کسی بھی فیصلہ کن مرحلے پر جرأت مندی، بہادری اور بیباکی کے حوالے سے اپنی خو چھوڑی نہ وضع ہی بدلی، نتائج سے بے پرواہ ہو کر اظہار خیال کرنا بجلی کی ننگی تاروں کو چھونا ہے، خاص کر ایسے ماحول میں جب خود شمیم مرحوم کے بقول سوچنے پر اور خواب دیکھنے تک پر پابندی ہو، ایسے حالات میں یا تو ایسے کم فہم بولتے ہیں جنہوں نے عقل بیچ کھائی ہو یا وہ دُور بین اور دُور اندیش جنہیں خاموش رہنے کی سزا معلوم ہوتی ہے۔ شمیم صاحب سوچنے والوں اور بولنے والوں کی اسی دوسری برادری سے تھے اور یہ بتانے کی شاید ضرورت نہیں کہ ایسے مواقع پر جبکہ ''بولنا'' ایک عام قسم کے سیدھے سادے معاشرتی فعل کے بجائے سب سے بڑی سماجی قدر اور اخلاقی ضرورت بن جائے اور شہادت کا درجہ حاصل کرلے تو اس طرح کی شہادت دینے کے لئے بھیڑ میں سے وہ مردِ حُر ہی اُٹھ کھڑا ہوسکتا ہے جس کا پورا وجود فکر و خیال کی سرگرمی اور احساس کے آبِ حیات سے سرشار ہو چکا ہو۔ ایسا شخص مانگے کے اُجالے اور اِدھر اُدھر کے کتابی علم رکھنے والوں کی اُس برادری سے قطعی طور جُدا ہوتا ہے جن کی خالی خولی معلومات حواس سے بے تعلق ہوتی ہیں اور جو کبھی بھی اُن کے افکار و خیالات کا حصہ نہیں بن پاتیں۔ ایسا علم (اگر اُس کو علم کہا جائے) حکماء کے مطابق خشک علم رہتا ہے، حکمت نہیں بنتا۔ اس میں وہ تولیدی قوت پیدا نہیں ہوتی کہ خیال سے خیال پیدا ہو اور عملی زندگی کے وصل سے کچھ نئے رنگ، کچھ تازہ خوشبوئیں جنم لیں۔

شمیم احمد شمیم بلاشک وشبہ ایک پیدائشی جینیس (Genius) تھے، وہ مفکر تھے اور مدبر بھی۔ تاہم اُن کی مثال اُس ذہین وفطین کسان کی سی تھی، جسے اپنا کمال دکھانے کے لئے کم وقت اور تنگ زمین ملی۔ میرے نزدیک شمیم کی حقیقی زندگی 1964ء میں شروع

ہوئی اور 1978ء میں سرطان کے موذی مرض کی تشخیص کے ساتھ ختم ہوگئی، ایسے میں اُس کا مقابلہ اُن مفکرین اور مدبروں سے کرنا سراسر ناانصافی ہوگی جنہیں لمبی عمریں اور بڑا کینوس نصیب ہوا۔ اس سلسلے میں اُس دلچسپ مکالمے کو یہاں درج کرنا بے جا نہ ہوگا جو پاکستان کے سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو اور امریکی صدر جان ایف کینڈی کے مابین ہوا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ مسٹر بھٹو جب پہلی بار ایک سرکاری وفد کے ساتھ ممبر کے حیثیت سے امریکہ گئے تو جان کینڈی بھٹو کی دلنواز اور جگمگ شخصیت سے کافی متاثر ہوئے۔ دوران گفتگو ایک بار انہوں نے بھٹو سے مخاطب ہوکر کہا۔ ''مسٹر بھٹو! مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آپ امریکی شہری نہیں، ورنہ میں آپ کو اپنی کابینہ کا ممبر بنالیتا۔ اس پر مسٹر بھٹو نے ایک لمحہ کی تاخیر کئے بغیر جواب دیا۔ جناب صدر، آپ کی دلیل غلط ہے۔ اگر میں امریکی شہری ہوتا تو میں امریکہ کا صدر ہوتا نہ کہ آپ کی کابینہ کا ممبر۔[1]

بہر کیف، بہتر ہوگا کہ بات کو مزید طول دینے کی بجائے یہ کہتے ہوئے سمیٹ لیا جائے کہ ''کچھ اور چاہیے وُسعت مرے بیاں کے لئے''۔

آخر میں ناانصافی ہوگی اگر میں اُن تمام کرم فرماؤں کا شکریہ ادا نہ کروں جنہوں نے شمیم نمبر کو خوب سے خوب تر بنانے میں کسی نہ کسی شکل میں ہمیں تعاون دیا، یا گراں قدر مشوروں سے نوازا۔ شیرازہ کے مدیر اعلیٰ محمد اشرف ٹاک کی بطور خاص سراہنا کرنا ہوگی کہ اُنہوں نے اس خاص اشاعت میں اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود محنت شاقہ سے کام کیا۔

ظفر اقبال منہاس

---

[1] شمیم صاحب نے جو آخری تحریر لکھی وہ مرحوم بھٹو کے بارے میں تھی لیکن شمیم صاحب علالت کے باعث اسے مکمل نہ کرسکے۔

حرفِ چند

شمیم احمد شمیم، کشمیر کے ایک مایۂ ناز فرزند ہیں اور اس حوالے سے عصری دانشوری کی ایک علامت تھے۔ اپنی خداداد صلاحیتوں کی بدولت انہوں نے بہت ہی چھوٹی عمر میں شہرت اور مقبولیت کی حدوں کو چھو لیا تھا۔ آپ ادیب، قلمکار، صحافی، سیاست دان، دانشور اور صاحبِ فکر و نظر تھے۔ پینتالیس سال کی عمر، جبکہ لوگ ابھی جوانی کی سرمستیوں میں مگن ہوتے ہیں، شمیم صاحب نے اپنی حیات کا سفر تمام کیا۔ اس مختصر سی عمر میں سیاسی مصروفیات کے ساتھ ساتھ انہوں نے ادب اور صحافت کے شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دیئے، جو کہ آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ قدرت نے ان کو جتنی عمر عطا کی تھی، انہوں نے اس سے کہیں زیادہ کام کیا۔ آج جبکہ ان کو اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے قریب تین دہائیاں گذر چکی ہیں، لوگ انتہائی ذوق وشوق سے ان کی تحریریں پڑھ کر اپنی ذہنی بالیدگی اور آسودگی کا سامان بہم کر لیتے ہیں۔ شمیم صاحب کے حیات اور کارناموں پر گذشتہ تقریباً تین دہائیوں سے برابر لکھا جارہا ہے، لیکن حق یہ ہے کہ ابھی اُن پر بہت کچھ لکھا جانا باقی ہے۔ ادب اور صحافت میں ان کی حصولیابیوں پر کام کرنے کی ضرورت روز بروز شدت کے ساتھ محسوس کی جارہی ہے۔

شمیم احمد شمیم، مرحوم کے اکیڈیمی کے ساتھ گہرے روابط تھے اور اکیڈیمی کے ادبی اور ثقافتی پروگراموں میں بڑی دل جمعی سے حصہ لینے کے علاوہ اس کے

جرائد خصوصاً شیرازہ کے لئے پابندی کے ساتھ لکھتے تھے۔آج جبکہ شمیم صاحب کی وفات کو قریباً تین دہائیاں گذر چکی ہیں اور اس عرصے کے دوران شمیم صاحب کے کارنامے جستہ جستہ سامنے آرہے ہیں، تو شیرازہ نے بھی یہ اہم فریضہ جانا کہ ان کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لئے زیرِ نظر اشاعتِ خصوصی کا اہتمام کیا جائے۔زندہ اور مہذب قوموں کی یہ نشانی ہوتی ہے کہ وہ اپنے اسلاف کے کارناموں پر فخر کرتی ہیں اور ان کے کارناموں کو منصۂ شہود پر لانے کے جتن کرتی ہیں۔شمیم صاحب کو وطنِ مالوف کے ساتھ بے پناہ لگاؤ تھا، اپنے قلم اور زورِ خطابت سے انہوں نے اس کی سربلندی کا حق ادا کرنے کی کوشش کی۔انہوں نے ماضی میں جھانک کر مستقبل کی راہیں تلاش کیں اور حتی المقدور ان راہوں کو فروزاں کرتے چلے گئے۔آج بھی ان کی تحریریں زندہ ہیں اور زندہ لوگوں کے درمیان زندگی کی خوشبو اُڑا رہی ہیں ؎

ہر قدم، ہر راستے کو معتبر کرتے رہے
اپنی ہی شرطوں پہ ہم اپنا سفر کرتے رہے
ایک لمحہ بھی نہیں سوچا کبھی ہم ہیں کوئی
پھر بھی ہم نے جس طرح چاہا بسر کرتے رہے

شیرازہ کی زیرِ نظر اشاعت ادب، سیاست، صحافت اور دانشوری کے اس شہسوار کو خراجِ تحسین پیش کرنے کی مقدور بھر کوشش ہے۔گلدستہ کو زیادہ سے زیادہ خوبصورت اور وقیع بنانے کے لئے گذشتہ تقریباً تین دہائیوں کے دوران شمیم صاحب پر وقتاً فوقتاً شائع شدہ بعض چیدہ مضامین بھی شامل کئے گئے، جو کہ اس اشاعتِ خصوصی کو صوری اور معنوی حُسن بخشتے ہیں۔

ادارہ ان تمام مقالہ نگار حضرات کا ممنون ہے جنہوں نے اپنی گوناں گوں

مصروفیات کے باوجود زیرِ نظر خصوصی اشاعت کے لئے اپنے مقالات ارسال کئے۔سیکریٹری اکیڈیمی جناب ظفر اقبال منہاس نے اس اشاعت خصوصی کا بیڑا اُٹھایا اور اس کی بروقت تکمیل کے لئے نہ صرف کوشاں رہے بلکہ مواد کی فراہمی مضامین کے انتخاب اور پروف کی باریکیوں تک ہر قدم پر ذاتی دلچسپی سے کام لیا۔محترمہ قرۃ العین نے ذاتی کلکشن (Collection) سے بعض نادر و نایاب تحریریں اور تصاویر مرحمت کیں۔میرے بھائی، جناب محمد ادریس ملک نے مواد اور تصاویر فراہم کرانے میں قدم قدم پر اپنے دستِ تعاون سے نوازا، جس کے لئے میں ان سبھوں کا سراسر سپاس ہوں۔پبلی کیشن آفیسر ناظم الدین، کمپیوٹر ڈیزائنر بشیر احمد نجار اور بشارت احمد بابا نے جس مخلصانہ انداز سے اس اشاعتِ خصوصی کی تکمیل کے مختلف مراحل میں راقم کے شانہ بہ شانہ عرق ریزی سے کام کیا، اُس کے لئے ان کا شکریہ ادا کرنا واجب ہے۔

زیرِ نظر اشاعتِ خصوصی مرحوم شمیم احمد شمیم کی حیات اور انکی علمی و ادبی کارناموں کا کچھ کچھ احاطہ کرنے کی ایک پُرخلوص کوشش ہے۔اس میں ہم کس حد تک کامیاب ہوسکے ہیں، اس کا فیصلہ قارئینِ محترم کے ہاتھوں میں ہے اور ہمیں اس سلسلے میں حسبِ سابق ان کی رائے کا انتظار رہے گا۔

آبِ حیات خود ہی جو پی کر اَمر ہُوا
اس خضر سے کہیں تو ملاقات چاہئے

☆.......... **محمد اشرف ٹاک**

سری نگر
یکم جولائی ۲۰۰۹ء

پروفیسر آل احمد سرورؔ

شہر میں ایک چراغ تھا، نہ رہا

شمیم احمد شمیم یکم مئی ۱۹۸۰ء کو اس دُنیا سے منہ موڑ کر چلا گیا۔ موت تو ہر انسان کا مقدر ہے۔ جو آیا ہے اُسے ایک دن جانا ہے۔ مگر ایسے نوجوان کی موت، جو سرتاپا ایک شعلہ تھا، ایک للکار تھا، ایک تلوار تھا، اُس کے عزیزوں، دوستوں ساتھیوں اور قدر دانوں کے لئے ایک ایسا زخم ہے، جسے وقت بھی بھر نہیں سکتا۔

میں شمیم کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ تقریباً پچیس سال سے اُسے جانتا تھا، ایک نڈر، بے باک اور ذہین نوجوان کی حیثیت سے پہلے میں نے اُسے جانا، پھر ایک ایسے نوجوان کی حیثیت سے جس میں شوخی تھی، اپنے پر اعتماد تھا، ادبی ذوق تھا، تقریر اور تحریر دونوں میں ایک بانکپن تھا۔ ایک انفرادیت تھی، زبان کے برتنے کا سلیقہ تھا۔ اُس کے ساتھ ادیبوں کے لئے ایک احترام، دانش وروں کے لئے ایک اُنس، فن کاروں کیلئے دِل میں جگہ تھی اور اس کے ساتھ دوستوں کے لئے بے پناہ محبت اور ان کی ہر حال میں خدمت کا جذبہ تھا۔ شمیم کم عمری میں نہ صرف اپنے ہم عمر ساتھیوں میں ممتاز تھا اُس نے سرینگر کی اَدبی، تہذیبی، سیاسی اور ذہنی زندگی میں اپنے لئے ایک خاص جگہ بنالی تھی۔ اربابِ نظر کو اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ نوجوان آگے چل کر نہ

صرف کشمیر کی زندگی میں بلکہ ملک میں بھی بلندی کے اُونچے سے اُونچے درجے طے کرے گا۔

۱۹۵۹ء میں یونیورسٹی کی ایک میٹنگ کے سلسلے میں سرینگر آنا ہوا۔ اُس وقت شمیم انفارمیشن کے شعبے میں تھا۔ ایک سکوٹر خرید لیا تھا۔ اس لئے آسانی سے ہر ایک سے مِل سکتا تھا۔ اُس زمانے میں وہ بخشی صاحب کے خاصا قریب تھا اور اُسی نے ان سے میری ملاقات کا وقت مقرر کرایا تھا۔ تعمیر کی ادارت کے زمانے میں اُس کی اَدبی صلاحیت آشکار ہوئی۔ اُس کے خاکوں اور تبصروں کو جمع کیا جائے تو آج بھی وہ لطف سے پڑھے جائیں گے۔ ان میں ایک انفرادی نظر، ایک ادبی حسن، ایک رعنائی فکر، خاصی نمایاں ہے، بخشی صاحب سے بعد میں اختلاف ہوگیا اور شمیم نے ملازمت چھوڑ دی۔

اُس نے ۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۵ء تک علی گڑھ میں قانون کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے[۱] تعلیم حاصل کی۔ اُردو میں ایم۔ اے پریویس کا امتحان بھی امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ فائنل کرنے کا ارادہ پورا نہ ہوسکا۔ علی گڑھ کے قیام کے زمانے میں وہ وہاں کی تعلیمی، ادبی اور عملی سرگرمیوں میں برابر حصہ لیتا رہا۔ جب کوئی ممتاز سیاست داں یا مقرر علی گڑھ آکر تقریر کرتا تو اکثر شمیم بحث کے دوران، اپنی خطابت، اپنی نکتہ سنجی اور اپنی ظرافت کی وجہ سے مقرر سے زیادہ مجمع پر حاوی ہوجاتا۔ شمیم میں ایک خاص بات میں نے یہ دیکھی کہ اُس زمانے میں بھی وہ کسی سے مرعوب نہیں ہوتا تھا۔ جن کا احترام کرتا تھا یا جن سے محبت کرتا تھا، اُن سے بھی بحث کرتا، ہاں

۱ محترمہ قرۃ العین نے شمیم صاحب کی تحریروں کو "آئینہ نما" کی آٹھ جلدوں میں مرتب کیا ہے۔ (ادارہ)

بحث میں احترام ملحوظ رکھتا۔ مگر جن سے اُس کا کوئی ایسا رشتہ نہ ہوتا تھا، اُن کے لئے وہ ایک چلتی ہوئی تلوار تھا جس کا وار کم ہی خطا ہوتا تھا۔ ۱۹۶۷ء میں آل انڈیا یونیورسٹی اُردو اساتذہ کی کانفرنس کے سِلسلے میں سرینگر میں آٹھ دس دِن ٹھہرنے کا اِتفاق ہوا۔ میرے بڈشاہ ہوٹل میں قیام کا انتظام شمیم نے ہی کیا تھا۔ وہ اُس زمانے میں ایم۔ ایل۔ اے ہو چکا تھا۔ اور اُس کی مصروفیت اور مقبولیت دونوں میں اضافہ ہوگیا تھا۔ ''آئینہ'' ہفتہ وار نے اپنی جگہ بنائی تھی۔ اُس میں شمیم کے مضامین اور خاکے عام طور پر بڑی دِل چسپی سے پڑھے جاتے تھے اور شہر میں اُن کا چرچا ہوتا تھا۔ اس زمانے میں خاصا وقت شمیم کے ساتھ گزرا اور اُس کے کئی ذہین دوستوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ اُس وقت بھی جب شمیم محفل میں ہوتا، جانِ محفل ہوتا۔ اُس کے چبھتے ہوئے فقرے، اُس کے لطیفے، اُس کے برجستہ استدلال کا نقش بہر حال بہت گہرا ہوتا تھا۔

اس زمانے کا ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ کشمیر یونیورسٹی کے اُس وقت کے پرووائس چانسلر مرزا محمود بیگ نے کانفرنس کا خیر مقدم کرتے ہوئے جو خطبہ پڑھا تھا اُس میں کشمیر کی ایک پرانی روایت کا ذکر کیا تھا۔ جس کے مطابق ہری پربت کی پہاڑی کے نیچے ایک راکھشس دبا پڑا ہے جو چھ مہینے کے بعد کروٹ لیتا ہے۔ اس ظرافت پر کچھ کشمیر کے نوجوان چراغ پا ہو گئے۔ سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر مسعود حسین خان نے اپنے مقالے میں کشمیری کو ایک بولی قرار دیا۔ اس پر ایک جماعت نے اخباروں میں اُردو کی اور کانفرنس کی مخالفت شروع کر دی اور ان دونوں حضرات سے معافی کا مطالبہ کیا۔ بات شاید بڑھ جاتی مگر شمیم نے دوسرے دِن

اجلاس میں ایک زوردار تقریر کی۔ جس کے بعد ساری مخالفت ہَوا ہوگئی۔ شمیم سے ٹکر لینے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔

شمیم نہ صرف خود بہت اچھی اور معیاری اُردو لکھتا، وہ اُردو کا حامی اور مبلّغ تھا۔ وہ کشمیری کی ترقی چاہتا تھا۔ مگر وہ اس حقیقت سے واقف تھا کہ اُردو ریاست کی سرکاری زبان ہی نہیں، ریاست کے تینوں علاقوں میں رابطے کی زبان بھی ہے۔ نیز یہ عرصہ دراز سے کشمیر کی ادبی اور تہذیبی زبان بھی رہی ہے اور اس کے ریاست میں فروغ سے کشمیری کے فروغ کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا ہاں اسے مدد ملتی ہے۔ شمیم برابر کشمیری ادیبوں کی تخلیقات پر مضامین اور تبصرے لکھتا رہا۔ رسالہ ''آئینہ'' میں ہر ہفتے اُس نے ایک کشمیری صفحہ بھی شروع کیا تھا، جو خاصا مقبول ہوا۔ جب کشمیر میں انجمن ترقی اُردو ہند کی ریاستی شاخ قائم کی گئی تو شمیم کو اُس کی ایڈہاک کمیٹی کا کنوینر بنایا گیا تھا۔ بعد میں انجمن ترقی اُردو ہند کی مجلس عامہ کا ممبر بھی منتخب کیا گیا تھا۔ یہ شمیم کی اَدبی خدمات کا ہلکا سا اعتراف تھا۔ افسوس ہے کہ بعد میں پارلیمنٹ کی مصروفیات اور سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے شمیم کو انجمن ترقی اُردو ہند کی ریاستی شاخ کو فعال بنانے کا موقع نہ ملا مگر ریاست میں اور ملک میں اُردو کے فروغ کی ہر کوشش سے اُس کی گہری دِل چسپی برابر رہی۔

۱۹۶۹ء میں یونیورسٹی میں چند توسیعی لیکچر دینے کے لئے میرا پھر سرینگر آنا ہوا۔ اِن لیکچروں میں شمیم نے شرکت کی اور ریڈیو کے مشاعرے میں جو ممتاز شعراء آئے تھے، اُن کے ساتھ خاصا وقت گزارا۔ اُسی زمانے میں مشہور عالم اور کشمیر یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر آصف فیضی بھی آئے ہوئے تھے۔ وہ بھی شمیم کی صلاحیتوں کے بڑے معترف تھے۔ خواجہ غلام محمد صادق، اُس زمانے میں چیف

منسٹر تھے۔انہیں بھی ادب سے گہری دِل چسپی تھی اور اُردو کے معیاری اشعار یاد تھے۔کہا جاتا ہے کہ اکثر کمیٹیوں کی نشستوں میں وہ اور شمیم ایک دوسرے کو پرچے پر شعر لکھ کر بھیجا کرتے تھے۔اُس زمانے میں شمیم کی چھوٹی بہن کی شادی ہوئی۔ نکاح میں بھگوان سہائے گورنر، چیف منسٹر صادق اور شیخ عبداللہ یہ تینوں حضرات ایک جگہ جمع ہی نہیں ہوئے تھے، بلکہ موجود تھے۔اب سرینگر کے ممتاز ترین شہریوں میں اور کشمیر کے نوجوانوں کے رہنماؤں میں شمیم کا نام عام طور پر لیا جاتا تھا۔

۱۹۷۱ء میں صادق بہت بیمار رہے۔اُن کے گردے کا فعل عرصہ سے خراب تھا۔آخری علالت میں وہ چنڈی گڑھ لے جائے گئے۔ جہاں شمیم بھی اُن کی مزاج پُرسی کے لئے گئے۔ارباب اقتدار کی مصیبت یہ ہوتی ہے کہ خواہ کتنے ہی بیمار ہوں اُنہیں ظاہر یہ کرنا ہوتا ہے کہ وہ بالکل ٹھیک ہیں اور سب باتیں معمول کے مطابق ہیں۔شمیم ملنے گئے تو فوج کے کمانڈر ان چیف بھی تھے۔وہ گئے تو صادق نے شمیم کو اشارے سے قریب بلایا اور لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں فیضؔ کا یہ شعر پڑھا۔

کرو کج جبیں پہ سرِ کفن
میرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن
پسِ مرگ میں نے بھلا دیا

شمیم نے صادق کے متعلق اپنے تاثرات آئینہ میں قلم بند کرتے ہوئے اس واقعے کا ذکر کیا ہے۔کیا خبر تھی کہ فیضؔ کا یہ شعر جو صادق نے اپنے آخری دنوں میں پڑھا تھا۔شمیم کے بھی حسب حال ہوگا۔"غرورِ عشق کے بانکپن" میں مجھے تو شمیم کے ہم عصروں میں کوئی اُس کا ثانی نظر نہیں آتا۔

۱۹۷۱ء کے لوک سبھا کے الیکشن میں شمیم نے بخشی غلام محمد کو شکست دی۔ بلاشبہ اِس شکست میں شیخ محمد عبداللہ کی در پردہ اور بیگم شیخ محمد عبداللہ کی اعلانیہ حمایت اور عملی کوششوں کا بڑا حصّہ تھا مگر یہ بات نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ اُس وقت بخشی صاحب کی ایسی ہیبت چھائی ہوئی تھی کہ بڑے بڑے سیاست کے کھلاڑی اور سورما، باوجود شیخ صاحب کے ترغیب دِلانے کے، بخشی صاحب کے خلاف میدان میں آنے کے لئے تیار نہ تھے،اس مشکل میں یہ نوجوان ہمت کر کے سامنے آیا۔ بڑے کانٹے کا مقابلہ ہوا۔بقول فردوسی ؎

زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت

مگر بالآخر بقول آصف فیضی داؤد نے جالوت کو نیچا دکھا دیا......شمیم کی یہ فتح کشمیر کی سیاسی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گی۔

پارلیمنٹ کی ممبری کے زمانے میں شمیم نے اپنی خطابت، اپنی سیاسی سوجھ بوجھ اور اپنی معاملہ فہمی کی دھاک بٹھا دی۔ وہ آزاد ممبر تھا اور سیاسی پارٹیوں کے نقار خانے میں ایک آزاد طوطی کی آواز کون سُنتا ہے۔مگر رفتہ رفتہ یہ نوبت آگئی تھی کہ ہر اہم مسئلے پر چار پانچ مقرروں میں ایک شمیم بھی ہوتا تھا۔یوں تو آزادی کے بعد سے کشمیر کے نمائندے برابر پارلیمنٹ میں جاتے رہے اور اُن میں ممتاز سیاسی شخصیتیں بھی تھیں مگر حق بات یہ ہے کہ کشمیر کی نمائندگی جس طرح شمیم نے کی، کسی اور نے نہیں کی۔ کشمیر کے مسئلے کو قومی نقطہ نظر سے بیان کرنا کشمیر کی شخصیت، اُس کی علاقائی خصوصیات، اُس کی سیاسی جدوجہد کو صحیح پس منظر میں پیش کرنا اور شیخ عبداللہ کی طرف جو مسلمہ طور پر کشمیر کی تحریک حریت کے راہ نما اور نئے کشمیر کے معمارِ اعظم ہیں حکومت ہند کے دست تعاون بڑھانے پر اصرار کرنا شمیم کا ایسا بڑا کارنامہ ہے

جس پر کسی طرح خاک نہیں ڈالی جاسکتی۔

شمیم کی سیاسی زندگی میں اُتار چڑھاؤ آتے رہے۔ان کی تفصیل کا اور اُن پر تبصرے کا یہ موقع نہیں ہے۔۱۹۷۷ء میں شمیم کی آنکھ میں تکلیف ہوئی اور وہ علاج کے لئے لندن گیا۔ وہاں سے واپسی پر اُس نے کشمیر اسمبلی کے لئے شوپیان سے انتخابات لڑا۔مگر اُس میں کامیابی نہ ہوسکی۔۱۹۷۷ء کے وسط سے آخر ۱۹۷۸ء تک معلوم ہوتا تھا کہ شمیم بالکل تندرست ہیں اور وہ ''آئینہ'' نکالنے میں اور کشمیر کی سیاست میں مصروف رہا۔مجھ سے اکثر ملاقاتیں رہیں اور میں نے اُنہیں برابر چاق و چوبند، مصروف لکھتے، بولتے یا بحث کرتے دیکھا۔نہ کبھی مایوس نہ ملول، نہ دل گرفتہ نہ بیزار۔ہاں کچھ لوگوں کی غلط روش پر برہم ضرور دیکھا۔

۱۹۷۹ء کے شروع میں یہ شُبہ ہوگیا تھا کہ اُن کے ۱۹۷۷ء کے آپریشن سے مرض دور نہیں ہوا، بلکہ اُس نے اب جسم کے دوسرے حصوں میں اپنا اثر جمالیا ہے۔ علاج کے لئے وہ دہلی اور بمبئی کے علاوہ امریکہ بھی گئے۔ شمیم نے اور اُن کے خاندان نے اُن کے علاج میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔ان کے امریکہ میں کشمیری دوستوں نے بھی اُن کی ہر طرح دیکھ بھال کی۔مگر مرض بڑھتا گیا۔ وہ آخر اکتوبر ۱۹۷۹ء میں سرینگر واپس آئے تو اُسی دن میں اُن سے ملنے گیا۔میری بیوی ساتھ تھیں۔اُن کے چہرے سے اور اُنکی باتوں سے بیماری کی کوئی دھونس نہیں معلوم ہوتی تھی۔شمیم کی چنگاری کو یہ خوف ناک بیماری بھی ماند نہ کرسکی تھی۔

اُس کے بعد کئی دفعہ اُنہیں دیکھنے گیا۔ بیماری کے متعلق نہ میں نے کچھ پوچھا نہ اُنہوں نے کچھ کہا۔مگر ہندوستان کی سیاست، ادب کی حالت، علی گڑھ کے مسائل اور عالمی میلانات پر باتیں ہوتی رہیں ۔ مارچ میں اُن سے آخری

ملاقات ہوئی۔اُن کے مرنے سے دو یا تین دِن پہلے ملنے گیا تو اُن کے بہنوئی نے بتایا کہ سو رہے ہیں۔ حالت سُنی تو احساس ہوگیا کہ اب چند دن کے مہمان ہیں۔ اس کے بعد ملنے کی ہمت نہ ہوئی اور پہلی مئی کی دوپہر کو سُن لیا کہ بالآخر موت نے اِس شعلے کو نگل ہی لیا۔

شمیم کشمیر کے ذہن، اُس کی اُمنگوں اُس کے حوصلوں، اُس کے ولولوں کی علامت تھا۔ یہاں کے لوگوں کی ذہانت اور صلاحیت میں کسے کلام ہوسکتا ہے مگر ان میں شمیم ایک امتیازی حیثیت رکھتا تھا۔موت کا ظالم ہاتھ اُسے موقع دیتا تو وہ کن بلندیوں تک نہ پہنچ سکتا تھا۔شمیم بڑا جیالا، بڑا بہادر آدمی تھا۔ایسی سخت اور طویل اور ظالم بیماری میں اُس نے جس صبر وضبط اور ہمت واستقلال کا ثبوت دیا اُس کی مثالیں کم دیکھنے میں آتی ہیں۔ پینتالیس سال کی عمر میں 'جب' اُس کی ذہنی صلاحیتیں اپنے شباب پر تھیں اُس کا اِس طرح دُنیا سے رخصت ہوجانا ایسا دردناک اور اندوہ ناک واقعہ ہے کہ اُسے کسی طرح بھُلایا نہیں جاسکتا۔ مارلو کا یہ فقرہ یاد آتا ہے اور دل کو مسل جاتا ہے Cut is Apollo's Laural Branch اُس کی یاد تازہ رکھنا، اُس کے اخبار ''آئینہ'' کو چلانا، اُس کے ذہنی ادبی اور صحافتی رول کی اہمیت کو نمایاں کرنا، اُس کی حق گوئی اور بے باکی کی روایت کو زندہ رکھنا، اُن سب کا فرض ہے جو شمیم کے قریب تھے۔

دیکھنا ہے کہ ہم اپنے اس فرض سے کس طرح عہدہ براہوتے ہیں......

........☆☆☆........

بشیر شاہ

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں

"زندگی کے راستے کتنے عجیب ہیں' کس قدر ٹیڑے میڑھے! بہت سے راستوں سے جُڑے ہوئے یہ بہت سارے راستے کہاں جاتے ہیں اور کہاں جا کر ختم ہوتے ہیں یہ سوال آج بھی سوالیہ نشان بنا ہوا ہے؟ ہماری سانسوں پر کیا ہمارا کوئی اختیار نہیں...... ہم سب اپنی انا کا ایک چلتا پھرتا اشتہار ہیں اور بس"؟ شمیم احمد شمیم کی بات کرنی ہے تو اپنی بات کہنے کے لئے اپنے ہی ریڈیائی ڈرامے "تم میرے پاس رہو" کے ایک کردار کی زبان اپنا رہا ہوں۔ ڈاکٹر شیکھر اپنی ڈائری کا ایک ورق اُلٹتا ہے۔ "یہ زندگی ایک اندھا کنواں ہی تو ہے کہ جس میں جب جب بھی ہم آواز دیتے ہیں تو اپنی ہی آواز ہمیں ڈس لیتی ہے آواز کا یہ زہر کہاں کہاں پھیلتا ہے کون جانے؟ میرے وجود کی سڑک کو روندتی ہوئی شب گردی کی آواز آخر کب تک پیچھا کرے گی مرا پاگل کُتے کی طرح" میرے ڈرامے کا یہ کردار Agnostic ہے یا Escapist' ٹھیک سے نہیں بتا سکتا لیکن ہے' ہماری ہی سوچ کی کوئی پرچھائی ہمارے ہی وجود کا کوئی حصہ؟! میرے اس ڈرامے کا

مرکزی کردار ہے آصف عثمان، سٹیج کا ایک معروف اداکار، جو دلوں میں بستا ہے اور ذہنوں میں ہل چل مچادیتا ہے؟ ایک روز اُسے پتہ چلتا ہے کہ وہ گلے کے سرطان کا شکار ہے اور اپنے Vocal Chords کو کھو دینے والا ہے تو کیا اُس کی آواز کا جادو ٹوٹنے والا ہے...... آواز جو اُسکی پہچان ہے!...... ڈاکٹر شیکھر اپنی ڈائری کا ایک اور صفحہ رقم کرتا ہے "اتنی بڑی دُنیا کو بنانے والا' جو بھی ہے اور جہاں بھی ہے' اُسکی اپنی انا اُسکے وجود سے کہیں بڑی ہوگی وہ آپ اپنی محبت میں گرفتار ہوگا ایسا نہ ہوتا تو پھر وہ کیوں اپنی ہی کسی رچنا کو مٹانے پر تُل جاتا ہے۔ بات اصل میں شمیم صاحب کی ہو رہی ہے اُنکے قلم کی آواز خاموش ہو چکی ہے لیکن اُس آواز کا طلسم برابر قائم ہے...... اور اب کچھ باتوں، کچھ یادوں اور کچھ ملاقاتوں کا ذکر" یہ میرے کالج کے ایام کی بات ہے مجھ پر اور میرے کچھ دوستوں پر تھیٹر Theatre کرنے کا شوق سوار ہو گیا ہے۔ میں اور میرے قریبی ساتھی جاوید، رحمان اور یاسین (یاسین بیگ ریاست کے ایک جانے پہچانے اُردو شاعر) فرانسیسی ڈرامہ نگار مولیئر کے مشہور ڈرامے Tartuffe کے انگریزی Adaptation، 'Imposter' کو اُردو کے قالب میں ڈھال دیتے ہیں اور ریاستی کلچرل اکادمی کے سالانہ مقابلوں میں حصہ لینے کے لئے آگے بڑھتے ہیں۔ ڈرامے کا ٹائیٹل "ڈھونگی" رکھ لیا جاتا ہے۔ ہم سبھی اس ڈرامے میں اداکاری کا مشکل کام بھی نبھاتے ہیں۔ اکادمی کے سالانہ کمپٹیشن میں ڈرامے کو پہلا انعام دیا جاتا ہے۔ شمیم احمد شمیم بنفسِ نفیس ٹیگور ہال میں موجود ہیں اور تعجب کی بات یہ کہ وہ شروع سے آخر تک ڈرامہ دیکھ لیتے ہیں ہفت روزہ "آئینہ" میں ڈرامے کی بات کرتے ہوئے شمیم صاحب کہتے ہیں "بشیر شاہ کی اولین پیشکش دیکھ کر ریاست میں سٹیج کی ترقی کے امکانات روشن نظر آتے ہیں" اُن کے تاثرات

جان کراوّل تو یقین ہی نہیں آتا اور جب خود اخبار دیکھتا ہوں تو اُن سے بڑے ادب سے پوچھتا ہوں ” آپ کی ذرّہ نوازی کا شکریہ لیکن میرے ساتھ ساتھ آپ میرے دوستوں کا حوالہ بھی دُینے تو اچھا رہتا“ وہ اپنے مخصوص انداز میں جواب دیتے ہیں ” اُنکا حوالہ چھپنے کی کیا ضرورت تھی' میں جانتا تھا کہ سارا ڈھونگ رچانے والے تم تھے“ جی ہاں ڈرامے کا عنوان تھا ”ڈھونگی“ ....سرینگر کے کافی ہاؤس میں ایک روز ہماری ٹولی کافی کی چسکیاں لینے میں مصروف ہے۔ باتوں باتوں میں ایک لفظ پر بحث چھِڑ جاتی ہے ہمارے ایک ساتھی کسی دلدوز واقعے کے حوالے سے کہتے ہیں کہ فلاں علاقے میں بھگڈر مچ گئی۔ اُس پر فوراً دوسرے صاحب کہتے ہیں صحیح لفظ بھگڈر نہیں 'بھگدڑ' ہے' انگریزی میں اسے Stampede کہتے ہیں۔ شمیم صاحب کافی ہاؤس سے باہر جاتے ہوئے ہمارے ٹیبل کے سامنے ذرا سا رُک جاتے ہیں بھگڈر کہنے والے گروپ کو کامیاب قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں ” لفظوں کے ہیر پھیر میں نہ پڑو ہماری اس قوم کو بڑی بڑی جنگیں لڑنا ہیں“!

........'آئینہ' کی سالگرہ کی سلسلے میں سال نامے کا اجراء ہونا ہے۔ میں بھی اپنا مضمون ”شمیم کچھ خدشات کچھ توہمات“ اشاعت کے لئے پیش کرتا ہوں۔ شمیم صاحب مضمون پڑھ کر اسے پسند کرتے ہیں اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے مجھ سے کہتے ہیں ”میں نے توہمات کو توقعات میں بدل دیا ہے۔ باقی کا مضمون سارا تمہارا“ اُردو ادب وصحافت سے شغف رکھنے والے دوست جانتے ہیں کہ ”آئینہ“ کو روزنامے میں بدلتے وقت شمیم ”سنگریزے“ نام سے ایک کالم شروع کرتے ہیں۔ اس کالم میں دوسرے اُردو روزناموں کی اغلاط کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے۔ تلفظ اور املا کی غلطیوں کی طرف اشارے کئے جاتے ہیں۔ بعض اخباروں

کے مدّیراں کو شمیم صاحب کی یہ ادا ایک آنکھ نہیں بھاتی اور وہ تیر وتفنگ لے کر صف آرا ہو جاتے ہیں اور اسطرح ایک نیک اور مخلصانہ کوشش رائیگاں ہو جاتی ہے.......... زندگی کے آخری دنوں میں شمیم دوست احباب سے کم کم ہی ملتے ملاتے ہیں۔ خود کو گھر کے افراد تک ہی محدود کر لیتے ہیں۔ یاری دوستی' زندگی اور زمانے کا رُخ دیکھ کر اُن کے یہاں ایک Disillusionment پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن ایسے میں بھی خودی اور خود اعتمادی اُن کا دامن نہیں چھوڑتی ؎

کم سے کم ہم میں یہ حوصلہ تو رہا
زندگی کاٹ دی امتحانوں کے بیچ

شمیم صاحب کی بذلہ سنجی آخری دنوں تک اُن کا ساتھ نبھاتی ہے.......ایک پیر صاحب کچھ آیتوں کا ورد کرنے کے لئے ہدایات دے جاتے ہیں۔ کچھ روز بعد تشریف لاتے ہیں تو یہ جان کر کہ ایک آیت کو صحیح تلفظ اور ہجوں کے ساتھ نہیں ادا کیا گیا ہے' سیخ پا ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں شمیم کے ہونٹوں کی دھوپ چمکتی ہے۔ ”پیر صاحب' پروردگار کوئی تھانیدار تھوڑی ہے جو ایک بندے کی چھوٹی سے بھول یا خطا' درگزر نہیں کریں گے؟ میں آپ سے شرط لگانے کے لئے تیار ہوں کہ میرا پروردگار آپکے پروردگار سے کہیں زیادہ سمجھدار ہے“ ....اور یہ بھی شمیم صاحب کے آخری ایام کی بات ہے کہ اُنکی ایک رشتے دار ڈھارس بندھاتی ہوئی دُعائیں دیتی ہے ”اللہ آپ کو بہت جلد صحت یاب کرے گا“۔ شمیم صاحب برجستہ بول دیتے ہیں ” مگر یہ اللہ میاں کا 'پورٹ فولیو' تو ہے نہیں' اللہ میاں نے اپنے پاس ٹکنیکی جانکاری کے محکمے ہی رکھے ہیں جیسے چاند ستاروں کا نظام، رات دن کا ظہور موسموں کا تغیر و تبدل.........دوسرے فروعی کام اُن کا کوئی ڈپٹی وزیر انجام دیتا ہوگا“!

شمیم احمد شمیم آج ہمارے درمیاں نہیں ۔ میں آج بھی تصور کی آنکھ سے اُنہیں دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ بزبانِ حال جیسے کہہ رہے ہوں ۔

مجھے تلاش کرینگے نئی رُتوں میں لوگ
میں گہری دُھند میں لپٹا ہوا جزیرہ ہوں

☆☆☆

بلراج پوری

شمیم...... چند بکھری یادیں

شمیم نے میرا ''مرثیہ'' لکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ کیونکہ اُسے خدشہ تھا کہ ایک ''فرقہ پرست مسلمان'' کے ساتھ شاید مسلمان اِنصاف کریں نہ ''کافر''۔

میرے نام سے ظاہر ہے کہ میں مسلمان نہیں (نام سے بڑھ کر مسلمان ہونے یا نہ ہونے کی اور کوئی پرکھ نہیں)اور نہ ہی فرقہ پرست کہلوانا چاہوں گا۔ البتہ کافرانہ حرکتیں ضرور سرزد ہو جاتی ہیں۔

شمیم میرا کیا حُلیہ بناتا۔ وہ میری فوٹو سے کِتنا ملتا جُلتا اور دونوں میں سے حقیقت کے ساتھ زیادہ میل کِس کا ہوتا اِن سوالوں پر بحث کئے بغیر مجھے ''آئینہ'' کے موجودہ ایڈیٹر سے پُورا اتفاق ہے کہ اکثر ''زندہ رہنے والوں کو مرنے والے کی قِسمت پر رشک آتا کہ اُسے شمیم جیسا مرثیہ خواں مِلا ہے۔''

آج شمیم میری جگہ ہوتا، تو انصاف کے کئی تقاضے پورے ہوتے۔ میری سینیارٹی کا پاس کئے بغیر آگے نکل جانا کہاں کا اِنصاف ہے؟ اور پھر وعدہ خلافی!

شمیم میری جگہ ہوتا، تو یہ مضمون لِکھنے کا حق بھی ادا ہوتا۔ اُس نے اپنے قلم اور زبان میں ہی دماغ کے ٹکڑے رکھے ہوئے تھے۔ اس لئے آٹومیٹک

مشین کی طرح چلتے تھے۔ اِدھر میرا قلم شمیم کی موت سے کئی دِن پہلے مفلوج ہوگیا تھا، صبح وشام کئی بار اُسے ''آخری خط'' لکھنے کا جتن کیا۔ لیکن ایک لفظ نہ لکھا گیا۔

آج بھی یہ احساس غالب ہے کہ جو کچھ بھی لکھ رہا ہوں، اس سے اُس کا حُسنِ بیان نہیں ہوتا، محدود ہوتا ہے۔

سوچ رہا ہوں کہ یادوں کے لمبے فاصلے کے کِس منظر میں اُس کا حسن زیادہ نمایاں ہے۔ ''آئینہ'' کے کالموں میں ایک بار میرے کارناموں اور ناکامیوں کے میزان پر شمیم اور میرے درمیان دِل چسپ بحث ہوئی تھی۔ کامیابی اور ناکامی ماپنے کے گز کے بارے میں میرا اُس سے اختلاف تھا۔ اپنی ان دلیلوں کی روشنی میں شمیم کے کِس روپ کو عظیم تر قرار دوں؟ جب وہ پارلیمنٹ کے ایوان میں فتح کے نشہ میں داخل ہوا یا جب اُس نے موت کی وادی میں اپنے نڈر قدم رکھے؟ جب اُس نے ریاست کے سابق وزیر اعظم کو چناؤ میں شکست دی یا جب وہ ملک الموت سے دودو ہاتھ کرکے مات کھا گیا؟

اگر زندگی کو جدوجہد کے انجام کی بجائے جدوجہد کی شدت اور نوعیت سے جانچنا چاہئے، تو زندگی کے آخری دور کی جدوجہد، اُس کی عظمت کو بہتر اُجاگر کرتی ہے۔ اقتدار کی جنگ میں فتح حاصل کرنے والے جرنیل کی بجائے ایمان کی حفاظت کے لئے لڑنے والا بے تیغ سپاہی مومن کہلانے کا زیادہ حقدار ہے۔

شمیم کے ایمان کی حرارت اور جذبہ خودداری کا سب سے کڑا امتحان تب شروع ہوا، جب اُس نے ۱۹۷۷ء کی انتخابی جنگ ہارنے کے بعد سیاسی خداوندوں کی اطاعت قبول کرنے سے اِنکار کردیا۔ ایک عام آدمی کی حیثیت سے اُس کی

سرکشی اُس کی غیر معمولی شخصیت کا بہتر ثبوت ہے باغی شمیم ہی اصلی شمیم تھا۔

مجھے وہ دِن نہیں بھولے گا، جب سیاسی موجوں سے کھیلنے کا سودا اس کے سرِ میں سمایا تھا۔ ۱۹۶۴ء کے کِسی مہینے کی کِسی تاریخ کی شام کو ایک نوجوان ''ایک اہم مشورہ'' کرنے کے لئے جموں میں مجھے ملنے آیا۔ دراصل وہ مشورہ کرنے سے پہلے ہی اپنی زندگی کے اہم فیصلے کر چکا تھا۔ سرکاری نوکری سے استعفیٰ، سیاست شروع کرنا اور ایک اخبار جاری کرنا، اعلانِ بغاوت کرنے سے پہلے شاید وہ کچھ مزید اخلاقی حمایت حاصل کرنا چاہتا تھا۔

میں اُن دنوں کشمیر کی مجروح جذباتی اور سیاسی اُمنگوں سے نہ صرف پوری طرح ہم آہنگ تھا بلکہ اُن کا مسلمہ غیر کشمیری وکیل بھی۔ شمیم نے اپنے مخصوص شاعرانہ مبالغہ کے ساتھ میرے رول کا ذکر کرکے کشمیری نوجوانوں کے رول کے بارے میں میری رائے پوچھی۔ میں نے کہا' مجھے ایسے شخص کی تلاش ہے' جو کشمیری ہو، مسلمان ہو، ہندوستانی ہو اور انسان ہو، شمیم چلا اُٹھا۔ ''تو وہ شخص مِل گیا'' اور میرے ردِّعمل کا انتظار کئے بغیر مزید کہا کہ اُس کا نام شمیم احمد شمیم ہے۔

مجھے اُس کے دعوے پر قطعاً شک نہیں۔ اُس سے بہتر کشمیری' بہتر مسلمان، بہتر ہندوستانی اور بہتر انسان کشمیر میں ضرور بستے ہیں۔ مگر اِن سب حیثیتوں میں تضاد ختم کرنے میں جو کامیابی شمیم نے حاصِل کی، وہ اُس وقت شاذ ہی کوئی اور کرسکا......

تب سے میرا اور شمیم کا فِکری، سیاسی اور جذباتی اشتراک سفر شروع ہوا، جو یکم مئی ۱۹۸۰ء کے جھٹکے کے ساتھ ختم ہوا۔

یہ کہنا مبالغہ ہوگا کہ ہم ہر بات پر ہمیشہ متفق ہوتے تھے۔ ہم میں سے کوئی دوسرے کا جی حضوری نہ تھا، یہ تو دو بالغ ذہنوں کی دوستی تھی۔ ہماری بنیادی اپروچ اور قدریں مشترک تھیں اور اختلاف رائے کا احترام کرتے تھے۔

جولائی ۱۹۶۴ء میں ''آئینہ'' کے اجراء نے ریاستی سیاست اور صحافت میں ایک دھماکہ پیدا کیا۔ اُس کے سرورق پر ایڈیٹر کے طور پر اپنا نام پڑھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے اُس کی ایڈیٹری کا کبھی کوئی کام نہیں کیا۔ وہ الف سے ی تک شمیم نامہ تھا۔ کسی معاون کے تعاون کی اُس میں گنجائش ہی کہاں تھی۔ میں نے گزارش کی کہ میرے نام کے لئے ''آئینہ'' میں جو جگہ وقف تھی، اُس کا کوئی بہتر استعمال کیا جائے۔ میرے بعد بہت سے ایڈیٹروں کے نام شمیم کے نام کے ساتھ چھپتے رہے اور کئی بار وہ اپنے ساتھی ایڈیٹر پر بھی قلمی حملے کرنے سے نہ چوکتا، جس سے وہ ساتھی بھی چٹخارے لیکر پڑھتا۔ بہر حال میں اُس تحریک کے ساتھ وابستہ رہا، جسکی آئینہ اپنے مخصوص انداز میں نمائندگی کرتا تھا۔

شوپیاں کے انتخابی معرکہ میں مجھے یوں محسوس ہوا کہ اُمیدوار شمیم نہیں، میں خود ہوں۔ انتخابی جلسوں میں میرا حصہ برائے نام تھا۔ میں سرودے نیتا شری آر۔ کے پاٹل کے ساتھ لے کر شوپیاں پہنچا تاکہ ووٹروں کو بھروسہ دِلایا جاسکے کہ چناؤ کی غیر جانبدارانہ نگرانی ہو رہی ہے۔ اعلیٰ چناؤ کمشنر مِسٹر سندرم سے بھی میری اِس چناؤ کی خاص اہمیت کے بارے میں بات ہوئی۔ اُنہوں نے چناؤ کمیشن کے سیکریٹری کو اپنی نگرانی میں گنتی کرانے کے لئے مامور کیا۔ کئی مرکزی اور ریاستی لیڈروں کو بھی میں نے قائل کرنے کی کوشش کی کہ ایک آزاد ممبر کی کامیابی سے کشمیر میں چناؤ اور ہندوستانی جمہوریت کا وقار کتنا بڑھ جائے گا۔

لیکن اصل معرکہ شمیم کی دِل کش شخصیت اور شعلہ بیانی نے مارا۔ اب تک وہ اپنے قلم کا لوہا منوا چکا تھا۔ اب اُس کی تقریر کا جادو رنگ لایا۔ ۱۹۶۴ء سے ۱۹۷۱ء تک کے سات قلیل برسوں میں شمیم شہرت اور کامیابی کی کئی سیڑھیاں ایک ہی سانس میں چڑھ گیا۔ اُس کا ایک راز یہ بھی تھا کہ وہ مختلف بلکہ متضاد طاقتوں کا مفاد اپنی کامیابی میں وابستہ کرنے کا ڈھنگ جانتا تھا۔ ۱۹۷۱ء کے پارلیمانی چناؤ میں میرے جیسے کئی لوگوں نے شمیم کی کامیابی کو ہندوستانی سرکار کو نیچا دِکھانے کا ایک ذریعہ سمجھا۔ صادق صاحب کو شمیم کی کامیابی کے ذریعے بخشی غلام محمد سے خلاصی نصیب ہوئی اور اُن سب کے مفاد کے ذریعے شمیم کی تابناک شخصیت کو اُبھرنے کا موقعہ ملا۔

یہ محض حکمت عملی کا کمال نہ تھا۔ مختلف نظریوں کو ہم آہنگ کرنے کی ذہنی صلاحیت کا بھی اس میں ہاتھ تھا، عملی سیاست میں لچکدار ہونے کے باوجود اُس نے اپنے بنیادی عقائد سے سمجھوتے نہیں کئے۔ مُلک کے آہنی قانون سے ڈر کر اُس نے انسانی حقوق کے لئے اپنی آواز مدھم نہیں کی اور رائے شماری نواز ہجوم کو خوش کرنے لئے اُس نے اپنی ''ہندوستانیت'' سے کبھی انکار نہیں کیا۔

قومی مفاد اور ریاست کی اکائیوں کو ہم آہنگ کرنے کے لئے، میں اور شمیم اس فارمولا پر متفق تھے کہ ہندوستان کے اندر ریاست کو اٹانومی اور ریاست کے اندر اِس کے تینوں خطوں کو اٹانومی دِی جائے۔

چنانچہ جب ۱۹۶۷ء میں جموں کے حقوق کے سیاسی وآئینی تحفظ کے لئے میری صدارت میں جموں اٹانومی فورم کا قیام ہوا، تو اپنے ایک پیغام میں شمیم نے لکھا۔

"چونکہ میں کشمیر کی اٹانومی انفرادیت اور شخصیت کے تحفظ کو عظیم اہمیت دیتا ہوں، اِس لئے مجھے جموں اٹانومی فورم کے پروگرام اور مقصد میں گہری دِلچسپی ہے۔ میں جموں کی قیمت پر کشمیر کی خوشحالی میں یقین نہیں رکھتا کیوں کہ یہ مساوات اور بھائی چارہ کے بنیادی انسانی حقوق کے اصولوں کے منافی ہوگا......

جو لوگ جموں کے لئے اٹانومی کا مطالبہ کر رہے ہیں، اُن کے بارے میں چاہے جو کچھ بھی کیا جائے، لیکن اُن پر فرقہ پرستی یا انٹی کشمیری ہونے کا الزام لگانا بے انصافی کی انتہا ہوگی۔ ریاست کو تقسیم کرنے کی خواہش درکنار وہ جموں اور کشمیر کے باہمی رشتے صحت مند اور مستحکم بُنیادوں پر استوار کرنا چاہتے ہیں"۔

شمیم نے گجندر گڈکر کمیشن کو ایک میمورنڈم کے ذریعے ریاست کے تینوں خطوں کو اٹانومی دینے کا مطالبہ دُہرایا اور ریاستی اسمبلی میں اس مقصد کا ایک بل بھی پیش کیا۔

جموں کا مسئلہ ہو یا ریاست کے مستقبل کا معاملہ یا ہندوستانی جمہوریت کے بقاء کا سوال، ہم میں نہ صرف نظریاتی یکسانیت تھی، بلکہ عملی سرگرمیوں میں بھی اکثر تال میل رہتا۔ شمیم نے مجھے کہا کہ شیخ محمد عبداللہ بدلے حالات میں ہندوستانی آئین کے دائرہ کے اندر سمجھوتہ کے لئے تیار ہیں، اُسی بنیاد پر میں نے شریمتی اِندرا گاندھی، جو جموں کے دورہ پر آئی تھیں، کے ساتھ فوری اور ضروری ملاقات مانگی اور مشورہ دیا کہ مسئلہ کشمیر حل کرنے کے لئے شیخ صاحب کا تعاون حاصل کریں۔ اُس کے بعد میں اندرا جی اور شیخ صاحب سے کئی بار

مِلا اور اس طرح کشمیر ایکارڈ کے لئے زمین ہموار کرنے میں مقدور بھر حصّہ ادا کر سکا۔ شمیم کا اپنا رول زیادہ اہم رہا۔ دراصل ایک لحاظ سے ہر مرحلہ پر ہمارا رول سانجھا تھا۔

اُن دنوں جب میں نے شمیم سے اُس کے سیاسی مستقبل کی بات چھیڑی، تو اُس نے کہا کہ وہ اپنا سارا دھیان یک ممبری حلقہ اِنتخاب کو نرس کرنے پر صرف کر رہا ہے۔ وہ اُس ممبر کے لئے نرس کا کام بھی کرتا (اُس کی ذات کی دیکھ بھال کا کام)۔

شمیم کی سب سے بڑے قائد سے اتنی قربت، شخصیت کا دبدبہ، ذہن کی بلندی، سیاسی رول کی اُونچی سطح، انفرادیت اور انانیت نے اُن کے اور پارٹی کے باقی لیڈروں کے درمیان حسد کی دیواریں کھڑی کر دیں اور اُسے تنظیمی کارکنوں سے بہت دُور کر دیا۔

۱۹۷۷ء کے پارلیمانی انتخابات سے پہلے نیشنل کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی اور پارٹی کے سرکردہ کارکنوں کا اجلاس جموں میں بلایا گیا، جسے اُمیدواروں کا پینل تجویز کرنے کے لئے کہا گیا۔ میں نے ایک تجویز شمیم کے نام کی بھی بھجوائی۔ میں پارٹی کے پارلیمانی بورڈ کا ممبر تھا۔ جب بورڈ کی میٹنگ میں تجاویز کی پرچیاں کھولی گئیں، مجھے یہ جان کر سخت حیرانی ہوئی کہ شمیم کے نام کی ایک ہی پرچی تھی۔ بورڈ کے اندر اور باہر سب نگاہیں اُس مجرم کی تلاش کر رہی تھیں، جس نے وہ پرچی بھیجی تھی۔

جس گاڑی پر میں اور شمیم سوار تھے، وہ دونوں طرف سیاسی لاشیں بکھرتی جاتی ہے۔ کچھ چلتی گاڑی سے پھینکے جاتے ہیں اور کچھ باہر کودنے پر مجبور

ہوتے ہیں۔شمیم سے نکل گیا اور مجھے نکال دیا گیا۔ہمیں اپنے اپنے گناہوں کی سزا بھی ملی اور ایک دوسرے کے گناہوں کی بھی۔

شمیم سیاسی لاش نہیں بن سکتا تھا۔مگر جسمانی لاش تو بن گیا!

☆☆☆

شمیم احمد شمیم سابق ممبر پارلیمنٹ و ایڈیٹر آئینہ کی اچانک اور بے وقت وفات پر ریاست میں ہی نہیں بلکہ پورے ملک میں رنج وغم کا اظہار کیا گیا۔خدا بخشے مرنے والے میں بے پناہ خوبیاں تھیں وہ اہل قلم ہی نہ تھے بلکہ اہل زبان ہونے کا بھی اُن پر بجا طور پر فخر کیا جارہا تھا وہ بہترین پارلیمنٹیرین تھے۔۴۵ سالہ نوجوان کی تقریر کو سننے والے ہمیشہ بے قرار رہتے تھے یہی وجہ ہے کہ شری شمیم کا ماتم ان کے خاندان تک محدود نہیں رہا بلکہ ملک بھر کے صحافیوں، قلم کاروں، ادیبوں اور سوشل سنتھاؤں کے علاوہ سیاسی اور غیر سیاسی اداروں میں نہایت عقیدت اور احترام سے منایا گیا ہے. جموں میں سمال نیوز پیپرز ایڈیٹر کونسل کا ایک خاص اجلاس بلا کر کونسل کے صدر شری رام لال ورما کی صدارت میں ایک ماتمی قرارداد پاس کی گئی۔قرارداد میں کہا گیا کہ ایڈیٹر آئینہ شری شمیم احمد شمیم ریاست جموں و کشمیر، ایک نامور ادیب کہنہ مشق قلم کار بے خوف و نڈر صحافی اور جادو بیان مقرر تھے اُن کی بے وقت موت پر جموں کی صحافی برادری گہرے رنج غم کا اظہار کرتی ہے کونسل اُن کے ادبی ساتھیوں اور اُن کے پسماندگان کے اس عظیم صدمہ میں برابر کی شریک ہوتی ہوئی ان کی روح کی تسکین کے لئے خداوند کریم سے دعا گو ہے۔کونسل یہ بھی محسوس کرتی ہے کہ شمیم صاحب کی وفات سے ادبی اور صحافی حلقوں میں جو خلاء پیدا ہوا ہے اس کا پُر کیا جانا بہت مشکل ہے۔

سمال نیوز پیپرز (ایڈیٹر کونسل۔جموں) ☆☆☆ ☆☆☆

پدما سچدیو

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا

ماضی میں جانا جیسے جی ہوئی زندگی کو دوبارہ جینا ہے۔زندگی کو کاٹنے کے لئے زندگی کو جینا پڑتا ہے۔بات سرینگر کی ہے۔ان دنوں ٹیلی فون کرنے کے لئے آپریٹر سے نمبر مانگنا پڑتا تھا۔کئی کئی منٹ لگ جاتے تھے۔۱۹۶۰ء کی بات ہے، میں سرینگر میں درگجن اسپتال میں تین سالوں سے بیماری سے لڑتی لڑتی آخر جیت گئی تھی۔بیس برس کی عمر میں آدمی زندگی کا ہر پل جینا چاہتا ہے۔خدا میرے ابا جی ڈاکٹر حفیظ اللہ صاحب کو جنت میں جگہ دے۔انہوں نے مردے میں جان ڈالی تھی۔اس اسپتال میں گاؤں سے آئے کسان عورتوں کے بیچ میں میں ہیروئن تھی۔سب پیار کرتے تھے۔

ان دنوں ٹیلی فون کرنے کے لئے گیٹ پر جا کر چوکیدار کی منت سماجت کرنا پڑتی تھی۔پھر ٹیلی فون آپریٹر ٹیلی فون ملاتا۔میں ٹیلی فون پر اپنے کالج کی سہیلی سے باتیں کر رہی تھی۔بیچ میں ایک مردانہ آواز آئی۔میرے دوست کا نام لیکر اس نے بڑے احترام سے کہا'' جی! میں شمیم احمد شمیم بول رہا ہوں۔کیسی ہیں آپ۔میں آداب بجالاتا ہوں'' میری دوست چُپ رہی۔میں نے اسے کہا تم ٹیلی فون چھوڑ دو۔میں اسے دیکھتی ہوں۔میں نے فون زور سے پٹک کر نہایت غصے سے

کہا۔"آپ شمیم ہو یا کریم میری بلا سے۔ پر آپ کو اتنی تمیز نہیں کہ جب دو خواتین بات کر رہی ہوں تو بیچ میں بولنا بدتمیزی ہے۔ آپ بیشک بے حد بدتمیز شخص ہیں"۔

میں نے اپنی اونچی آواز میں نہ جانے کتنی گالیاں دیں اور فون پٹک کر غصے سے لال ہوگئی۔ سیڑھیاں اتر کر اپنے وارڈ میں چلی گئی۔ مجھے یاد آیا۔ شمیم اسپتال کے ڈاکٹر طاہر مرزا کے دوست تھے۔ ڈاکٹر طاہر مرزا، ڈاکٹر کم شاعر زیادہ تھے۔ صبح جب وہ اسپتال آئے تو مجھے دیکھ کر بولے۔"ارے پدما تم نے میرے دوست شمیم کو اتنی گالیاں دیں کہ وہ حیران رہ گیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ ایسی گالیاں تو زندگی میں میں نے کبھی نہیں سنیں ہیں۔ یہ اتنی تیز طرار خاتون کون ہے؟" ڈاکٹر طاہر مرزا ہنس رہے تھے اور میں غصے سے لال ہو رہی تھی۔ میں نے ان سے کہا۔"ڈاکٹر صاحب آپ اتنے اچھے انسان ہیں۔ دوستی کے نام پر آپ نے یہ کیا گدھے پال رکھے ہیں۔ دو لڑکیاں آپس میں بات کر رہی ہیں اور یہ بے شرمی سے سن بھی رہے ہیں اور دخل بھی دے رہے ہیں۔"

ڈاکٹر طاہر مرزا مسکرا کر چلے گئے۔ ان کو پتہ تھا کہ میں شاعرہ ہوں۔ میں اپنی نظمیں ڈوگری سے اردو میں ترجمہ کرتی اور وہ رسالوں میں چھپنے کے لئے بھیجا کرتے تھے۔ ایسا تھا ہمارا ماضی۔ میں نے ایک نظم لکھی تھی۔ اس کی دو لائنیں:

تھک سی گئی تھی، ہاری نہ تھی
ڈاکٹر ٹھیک کر دو اب جلدی

میں ٹھیک ہوگئی تھی۔ ساری دنیا کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لینا چاہتی تھی۔ اسپتال میں بیمار عورتوں کو بنائی سکھاتی۔ الف ب سکھاتی، وہ نہال رہتیں۔ مجھے بے حد پیار کرتیں اور اپنی دعاؤں میں مجھے شامل کرتیں۔

"یا اللہ! یہ چھوٹی ہیں، معصوم ہیں، اسے شفا دے۔ میں تب پدما نہیں فاطمہ ہوتی اور میرا ٹھیک ہو جانا انکی دعاؤں کا صدقہ تھا"۔

ان دنوں اسپتال میں ایک سوشل ورکر مسز میکلین آتی تھی۔ وہ ہمیشہ مجھے کسی نہ کسی کام میں مصروف پاتی۔ زیادہ تر میرے ہاتھوں میں بنائی رہتی۔ مسز میکلین کو معلوم تھا۔ ایک دن میں نے انکی ٹوپی اتروائی تھی اور دوسرے دن ویسی ہی بُنی ہوئی ٹوپی دکھا دی تھی۔ ان دنوں سرینگر میں عالم و فاضل درویش جیسے دکھائی دینے والے وائس چانسلر آصف علی اصغر فیضی تھے۔ انکی نہایت پُرخلوص بیگم' سلطانہ فیضی ہماری مسز میکلین کی دوست تھی۔ مسز میکلین نے دیکھا یہ مسز فیضی پچھلے مہینے سے کچھ بُن رہی ہیں۔ پر یہ تین انچ سے زیادہ نہیں بڑھ پایا۔ انہوں نے ڈیزائن کی کتاب اور اون لا کر میرے بیڈ پر پٹک دیا۔ میں نے بنائی میں اپنی شہرت کو مدنظر رکھ کر پندرہ دنوں میں ایک نہایت مشکل، پر خوبصورت گولڈ شال بنا کر انکی نذر کر دیا۔ مسز فیضی اسے دیکھ کر اتنی خوش ہوئی کہ ایک دن اسپتال آ پہنچی۔ انکے آنے پر اسپتال کے سپرانٹنڈنٹ ڈاکٹر حفیظ اللہ صاحب کی ہدایت کے مطابق وارڈ کے باہر تکو نے پارک میں دو کرسیاں لگ جاتیں اور ہم باتیں کرتے رہتے۔ اُن کے کہنے پر میں انہیں اماں کہتی تھیں۔ سرینگر تب ایک بسا بسایا قصبہ تھا جس پر خدا کی رحمت اور لوگوں کی محبت کا سائباں لگا رہتا تھا۔

آپ کہیں گے یہ مضمون شمیم پر ہے یا ماضی پر' تو میں معافی چاہوں گی۔ پر ماضی کی گلیوں میں آدمی گم ہو کر کہیں سے کہیں جا نکلتا ہے۔ ایک دن میں اور مسز فیضی باغ میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ تیز ہوا [illegible] طرح شمیم آئے اور کہنے لگے "مسز فیضی میں یہاں سے گزر رہا تھا کہ باہر آپ کی گاڑی دیکھ کر سراغ لگاتے

ہوئے آ پہنچا کہ اسپتال میں آپ کس خوش نصیب کے پاس آئی ہیں۔'' مسز فیضی نے مجھے دیکھ کر کہا پدما ہیں، بھائی۔ ڈوگری کی بہت بڑی شاعرہ اور بہت خوبصورت انسان۔ شمیم نے ہنستے ہوئے شرارتاً کہا'' جی بیشک، میں انکی اتنی گالیاں سن چکا ہوں جو اس ریاست میں آج تک مجھے کسی نے نہیں دیں۔''

اِسی اثناء میں باغ میں ایک تیسری کرسی بھی آ گئی۔ شمیم اس پر نہایت بے تکلفی سے بیٹھ گئے۔ میں تو منع نہیں کر سکتی تھی۔ بیٹھتے ہی مجھ سے مخاطب ہوئے جیسے برسوں سے جانتے ہیں۔ ''پدما جی آپ کی وہ دوست کیسی ہیں؟ میں نے جل بھن کر کہا۔ آپ سے مطلب۔ وہ بنا ہچکچاہٹ کے کہنے لگے۔ ارے آپ کی دوست ہیں تو ہماری بھی دوست ہوئی نا۔ اس بات کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ اماں کو چونکہ ساری بات معلوم تھی وہ ہنستے ہنستے بات پلٹ کر بولیں، ارے چلو اس کی نظم سنتے ہیں جو اُس نے کل ہی لکھی ہے۔

یہ شمیم احمد شمیم سے میری پہلی ملاقات تھی۔ میں انہیں پہچاننے لگی تھی۔ پھر سرینگر کی وہ شام جب شکیلہ بانو بھوپالی کا پروگرام تھا۔ اس کی حاضری جوابی کے کے کیا کہنے۔ انکی ایک ایک ادا سو سو جواب دیتی تھی۔ انکو مجھ سے بھی زیادہ شعر یاد تھے۔ اباجی (ڈاکٹر حفیظ اللہ) کو معلوم تھا کہ میں اسکا پروگرام دیکھنا چاہتی تھی۔ انہوں نے مجھے اپنا ٹکٹ دیکر کہا'' پدمی جب پروگرام ختم ہو جائے تو فون کر دینا تمہیں لانے کے لئے گاڑی بھجوادوں گا''۔ مجھے پدمی صرف اباجی ہی کہتے تھے۔

زندگی سے کوئی گِلہ نہ تھا۔ اُن دنوں رات کے دس بجے تک باہر رہنا بڑی بات تھی۔ شکیلہ بانو بھوپالی کو سننا ایک یادگار واقعہ تھا جو زندگی بھر یاد رہا۔ اسکا پروگرام ختم ہوتے ہی سب لوگ چلے گئے۔ میں نے ایک طرف لگے ٹیلی فون بوتھ میں

جا کر آپریٹر سے کہا میں ڈاکٹر حفیظ اللہ صاحب کی بیٹی ہوں۔ میں نے گھر سے گاڑی منگانے کے لئے فون کرنا ہے۔ وہیں کہیں سے شمیم صاحب کی آواز آئی۔ ارے آپ آیئے میں چھوڑ دیتا ہوں۔ جیپ میں پیچھے میری بہنیں بیٹھی ہیں آپ بھی وہیں بیٹھ جایئے، میں نے شکر کیا۔ اللہ میاں مہربان ہے۔ اباجی کو پتہ نہیں چلے گا کہ میں رات کو کب واپس آئی۔ اس کے بعد جب جب میں نے اپنے دوست سے بات کی، شمیم نے کبھی دخل نہیں دیا۔

۱۹۶۱ء کی ۷ رجنوری کو میں اسپتال میں تین سال بتانے کے بعد رہا ہوئی۔ بالکل ٹھیک ہو کر ایک نئی پدما۔ ۱۹۶۱ء کی ہی جنوری میں کسی دِن قلمکاروں، اخبار نویسوں، دانشوروں اور شاعروں کا ایک جتھہ پہلی بار ریاست سے باہر گیا۔ بخشی صاحب ریاست کے وزیر اعظم تھے۔ انہوں نے خود ہی نام چنے تھے۔ اس میں میرا بھی نام تھا۔ جتھے میں شمیم بھی تھے۔ انکے رہنے سے کبھی کوئی اداس نہیں ہوتا تھا۔ ان دنوں کلچرل اکیڈیمی کے سیکریٹری اردو کے مشہور ادیب علی جواد زیدی ہوا کرتے تھے۔ شمیم نے ان پر ایک شعر کہہ دیا:

میری زلفوں کا قیدی آرہا ہے
علی جواد زیدی آرہا ہے

کیا خوب شعر تھا۔ قہقہے لگے۔ سب سے اونچا قہقہہ شمیم کا ہوتا۔ مجھے یاد ہے ہم بھوپال گئے تھے۔ وہاں ایک جگہ مشاعرہ ہوا تو مشہور شاعر اسد بھوپالی بھی تھے۔ انہیں پڑھا بہت بار تھا لیکن دیکھا پہلی بار۔ میرا بھی اپنے شہر سے باہر کہیں تعارف ہوا تھا۔ سب نے بڑی تعریف کی۔ میں نے ''راجہ کا محل'' کو پڑھا۔ ان دنوں سب وہی سنانے کو کہتے تھے۔

شمیم ہر جگہ موجود رہتے۔ ڈوگری کا ڈانس ہو یا اردو میں ناٹک ۔ وہ ہر جگہ حصہ لیتے تھے۔ ناٹک میں وہ اپنے ڈائیلاگ بھول کر کچھ بھی بولتے اور باقیوں کو اسے پکڑنا پڑتا۔ انکا ڈائیلاگ ہر بار نیا ہوتا، شمیم کہتے جہاں میں کہوں وہیں سے آپ ڈائیلاگ بولو۔ مصیبت آجاتی، پر انکی شخصیت کچھ ایسی ہی تھی۔ ایسا اپنا پن ہوتا کہ انکی بات کوئی بھی نہ کاٹتا۔ ہمارے گروپ میں ایک کلاکارہ رانی جموال تھی۔ ان کی آنکھیں نہایت خوبصورت اور خوب بڑی تھیں۔ شمیم میک اپ مین سے کہتے۔ دیکھو میک اپ کرتے وقت میری آنکھیں رانی کی آنکھوں سے بڑی کر دیا کرو۔ ہم سب ہنستے رہتے اور میک اپ مین گھبرایا سا رہتا۔

ہمارے گروپ میں مشہور جرنلسٹ اور ادیب ستی ساہنی بھی تھے۔ نہایت ہی سلیقے دار آدمی۔ شمیم کہتے ایک پوٹلی میں شکریہ، تھینکس، مے آئی، یس میڈم، جی حضور ڈال دیا جائے تو وہ ستی ساہنی ہوں گے۔

اسی گروپ کے دوران ہمیں کہیں ٹرین سے جانا تھا۔ مشکل سے ٹرین پکڑی تو شمیم عورتوں والے ڈبے میں آکر ایک بڑے سے پیکٹ پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد باتھ روم سے ایک عورت تولئے سے ہاتھ پونچھتے ہوئی آئی تو شمیم کو دیکھ کر بھڑک اٹھی۔ اسکے چلانے کی آواز سے ساری عورتیں اکٹھا ہو گئیں۔ وہ چلا کر کہہ رہی تھی ''اٹھو اٹھو جس پیکٹ پر تم بیٹھے ہو اس میں میری بیش قیمتی کراکری ہے، وہ ٹوٹ جائے گی۔'' شمیم نے بڑی معصومیت سے کہا محترمہ وہ تو اب تک ٹوٹ ہی چکی ہوگی۔ اب مجھے کیوں اٹھاتی ہو۔ ٹرین میں سبھی عورتیں ہنسنے لگیں۔ اس عورت نے پینترا بدل کر کہا، تم عورتوں کے ڈبے میں کیسے آگئے۔ میں ابھی چین کھینچتی ہوں۔ میں نے آگے آکر کہا یہ میرا بھائی ہے۔ ہمیں ٹرین پر چڑھانے آیا تھا تو

ٹرین چل پڑی۔ اب اگلے سٹیشن پر ٹرین سے اتر جائیں گے۔ مہربانی کر کے آپ تھوڑا سا انتظار کریئے۔

آہ! پھر یاد آتا ہے شمیم کو ایک لڑکی پسند آگئی تھی۔ کبھی ملاقات ہوتی تو کہتے ''پدما تمہاری بھابی کی آنکھیں اتنی خوبصورت ہیں ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے''۔ پھر شادی ہوئی بچے ہوئے۔ میں نے شمیم کی بیوی کو دیکھا۔ لمبی چھرمری، بے حد سندر آنکھوں والی۔ میں نے اسے پیار سے کہا۔ ''تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے''۔ شمیم کی باتیں ہوا میں خوشبو کی طرح اڑتی رہتیں۔ وہ پارلیمنٹ کے ممبر ہو گئے تھے۔ جب شریمتی اندرا گاندھی نے ایمرجنسی لگائی تھی تب اس کے خلاف ایک ہی آواز پارلیمنٹ میں گونجی تھی ''میں شمیم احمد شمیم ایمرجنسی کے خلاف ہوں'' یہ آواز کسی شاعر کی آواز ہی ہو سکتی تھی۔ انہیں دنوں میری شادی نامی گائیک سردار سریندر سنگھ جی کے ساتھ ہوگئی۔ ہم لوگ ممبئی آگئے تھے۔ وہاں شمیم اپنے دوست یوسف خان کے ساتھ آئے ہوئے تھے۔ میرا بنایا کھانا کھا کر تعریف کی۔ ہم نے ایک بہت بڑے کمرے میں رسوئی رکھی ہوئی تھی۔ میری ساس وہیں تخت پوش پر بیٹھی تھی۔ شمیم نے ان سے کہا کیا میں کافروں کی رسوئی میں ہاتھ دھونے آسکتا ہوں۔ میری ساس نے کہا بیٹا ضرور آیئے آپ ہمیں کافر کہتے ہیں اور ہم آپ کو ملیچھ کہتے ہیں۔ شمیم ہنسے اور جھک کر آداب کرتے ہاتھ دھونے لگے۔ انکو بھی لگا ہوگا میری بہن پڑھے لکھے خاندان میں آئی۔ کچھ دیر بعد ہم ٹہلنے چلے گئے تھے۔ شمیم وہاں بھی آئے تھے۔ میں ان لوگوں کو چائے پلا کر جانے لگی تو بولے، ٹیریس سے نیچے دیکھو لال رنگ کی ایک گاڑی کبھی نہیں دیکھی ہوگی۔ جاؤ تمہیں چھوڑ دے گی۔ جب میں دفتر سے واپس آئی تو سردار جی نے مجھے سے کہا ''تمہاری ریاست میں یہ

پہلا آدمی ہے جس نے مجھے کہا یہ میری بہن بڑی سادہ خاتون ہے، ہمیشہ اسکا خیال رکھنا اور ساتھ رہنا۔ میری آنکھیں بھر آئیں۔

شمیم کو سردار جی بے حد پسند آئے تھے۔ دونوں بیٹھ کر راج نیتی کی باتیں کرتے۔ دونوں میں کون زیادہ حاضر جواب تھا یہ کہنا ناممکن تھا۔ پھر وہ جان لیوا خبر شمیم نے پہلے سردار جی کو ہی بتائی تھی۔ انہوں نے جب شمیم کو آنکھوں کے علاج کیلئے امریکہ بھیجا تب مجھے پتہ چلا کہ اسے آنکھوں کا کینسر ہے۔ یہ جان لیوا خبر تھی جو پوری ریاست میں بیماری کی طرح پھیل گئی تھی۔ شمیم ہر دلعزیز تھے۔ کل ہی میں نے ستیش جی سے بات کی تو انہوں نے کہا "شمیم کو ہمیشہ اپنی زبان پر یقین اور بھروسہ تھا۔ وہ نہایت عقل مند آدمی تھے۔ زبان پر کمانڈ تھی، جو بھی کہنا چاہتے تھے کہہ دیتے۔ پارلیمنٹ میں وہی پانچ سو آدمیوں کو چپ کرا سکتا تھا۔"

اس دنیا کی گود سے اللہ میاں شمیم کو زبردستی اٹھا کر لے گئے۔ جو آدمی پیارا ہوتا ہے وہ سب کا پیارا ہوتا ہے۔ وہ اپنی بیماری کے بارے میں ان سے بات کرتے۔ میں شریک نہ ہوتی۔ انہوں نے پروفیسر نیلا امبر دیو شرما کو کہا تھا "میں نئی زندگی کی تلاش میں امریکہ جا رہا ہوں۔ میرے لئے دعا کرنا"۔ شمیم کی حاضر جوابی اور ہنسی میں کھلا پن سب کو ملتا تھا۔

جس راہ پر شمیم چلتے تھے ان کے دوستوں سے وہ بھر جاتی تھی۔ مجھے میرے گھر میں ایک بار انہوں نے ہنستے ہوئے کہا تھا "پدما اپنی بھابی کا خیال رکھنا۔" جب وہ موج میں آتے تو مجھے کہتے جب میں چیف منسٹر بنوں گا تب میں سب کو کہہ دوں گا یہ خاتون چیف منسٹر کی کوٹھی کے آس پاس بھی دکھائی نہیں دینی چاہئے۔ میں بھی کہتی جاؤ جاؤ میں تمہاری بات تھوڑے ہی مانوں گی۔ میں چیف منسٹر کی بہن ہوں مجھے

کون گدھا روکے گا۔ اس پر وہ پیار سے ہنس دیتے۔

ہائے آج اسے کہاں سے لاؤں۔ شمیم جیسے آدمی روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ ان کا جانا ہم سب کے کتنے خواب توڑ گیا۔ شمیم پوری طرح ابھی کہاں گئے وہ ہم سب کے بیچ ہیں۔

.........☆☆☆☆.........

مشہور صحافی اخبار نویس اور پارلیمنٹرین شمیم احمد شمیم کا گذشتہ دنوں انتقال ہوگیا ان کی وفات پر مرکزی وزیر اطلاعات شری وسنت ساٹھے، ریاست کے وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ اور دیگر کئی لوگوں نے اظہار تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ شری شمیم کی بے وقت موت سے سارے ملک میں خصوصاً ریاست میں ایک خلا پیدا ہوگیا ہے، جو کبھی پُر نہیں ہوسکتا۔

شری شمیم کی موت پر جموں میں ایک ماتمی اجلاس زیر صدارت شری رام لال ورما ہوا، جس میں ریاست کے نامور صحافی سابق ممبر اسمبلی ایم، پی کی بے وقت موت پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔ اجلاس میں شامل تمام صحافیوں نے مرحوم کے تئیں شردھانجلی بھینٹ کرتے ہوئے کہا کہ ان کی وفات سے جرنلزم میں جو خلا پیدا ہوا ہے اُسے صدیوں پُر کرنا مشکل ہے آخر میں دُعائے مغفرت کی گئی۔

چڑھتا سورج۔ کٹھوعہ

.........☆☆☆.........

تبسم کاشمیری

شمیم احمد شمیم
شخصیت اور خدمات

ریاست کے نامور عالم دین اور سیاسی مفکر مولوی محمد عبداللہ وکیل علاقہ کیلر ڈسٹرکٹ شوپیان کے ایک دور اُفتادہ گاؤں گتی پورہ (نزد کریوہ مانلو) کے لون خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کے ایک بیٹے کا نام محمد یعقوب تھا جو مولوی محمد یعقوب کے نام سے مشہور تھا۔ حالانکہ پیشے کے لحاظ سے نہ وہ مولوی تھا اور نہ ہی آج کل کے معیار کے مطابق اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ موصوف قصبۂ شوپیان میں دُکانداری کرتے تھے جبکہ اُس زمانے میں اُن کی مستقل بود و باش اپنے سُسرالی گاؤں آسنور (نزد اہرہ بل) تحصیل کولگام میں تھی۔

۱۹۳۴ء میں اُن کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا، جس کا نام شمیم احمد رکھا گیا جو بعد میں شمیم احمد شمیمؔ کے نام سے ریاست کے ادبی، صحافتی اور سیاسی اُفق پر روشن ستارے کے روپ میں جلوہ گر ہوا۔ ۱۹۷۱ء کے پارلیمانی انتخابات میں جب شمیم احمد شمیمؔ نے بخشی غلام محمد جیسے مشاق سیاست دان کو شکست فاش دی، تو کسی گمنام شاعر نے اُس زمانے کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات کے علاوہ الیکشن

کے بارے میں بھی ایک طویل نظم لکھی جس میں شمیم صاحب کی قد آور شخصیت اور اُن کے ممتاز مرتبے کی عکاسی کی گئی ہے۔

شمیم صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی گاؤں آسنور میں حاصل کرلی۔ بعد ازاں اُنہوں نے شوپیان سے Schooling مکمل کرلی۔ گریجویشن اُنہوں نے ایس پی کالج سے کرلی۔ ڈاکٹر فاروق اُن کے College Mate تھے اور یارِ جانی تھے۔ اُس زمانے میں بخشی غلام محمد ریاست کے وزیر اعظم تھے اُنہوں نے ریاست میں کلچرل سرگرمیوں کو خوب بڑھاوا دیدیا جن کے دوران یہاں پر آل انڈیا لیول کے درجنوں مشاعرے ہوئے، جن میں جگر مُراد آبادی، عرش ملسیانیؔ، وامقؔ جونپوری، فناؔ کانپوریؔ، سکندر علی وجد، فضا ابن فیضیؔ، گلزار دہلوی، علی سردار جعفری، دل لکھنویؔ، فراقؔ گورکھپوری، شاذ تمکنت، بلراجؔ کومل، خمار بارہ بنکوی، بیکلؔ اُتساہی، راہی معصوم رضا، عادل منصوری، پروفیسر آل احمد سرور، فرقتؔ کاکوروی، علی جواد زیدی، وحید اختر، مخدوم محی الدین، حسرت جے پوری وغیرہ حصہ لیتے تھے۔ اسکے علاوہ متعدد سیمنار اور کانفرنسیں بھی یہاں پر منعقد ہوئیں۔ شمیم صاحب نے ان مشاعروں، کانفرنسوں، اور سیمناروں میں اپنی ذہانت، حاضر جوابی اور طنز وظرافت کے جھنڈے گاڑھ دئے۔ بعض مواقع پر بخشی صاحب نے اُن کی خداداد قابلیت، بذلہ سنجی اور حاضر جوابی کا بچشمِ خود مشاہدہ کیا اور حد درجہ متاثر ہوئے۔

بخشی صاحب شمیم احمد شمیمؔ کے خاندانی پسِ منظر سے اچھی طرح واقف تھے اور چونکہ وہ حد درجہ مُردم شناس بھی تھے لہٰذا وہ اُن تمام افراد کو جو اُن کی حکومت کے لئے کسی بھی سطح پر باعث پریشانی ہوسکتے تھے بغیر کسی پس وپیش کے اپنے قابو میں کرلیتے تھے چنانچہ اُنہوں نے شمیم صاحب جیسے ہونہار اور بیدار مغز نوجوان کے

ساتھ بھی یہی کچھ کیا اور اُنہیں محکمۂ اطلاعات کے دیوان خانے میں مقید کرلیا جہاں اُنہیں ماہنامہ ''تعمیر'' کی ادارت سپرد کرلی گئی۔اُن کے دورِادارت میں ماہنامہ ''تعمیر'' نے ''مہجور نمبر'' اور'' آزاد نمبر'' شائع کئے جن کی بدولت پہلی بار عام لوگ مہجور اور آزاد کے فکروفن سے روشناس ہوئے۔ان دونوں شماروں میں آزاد اور مہجور کی بعض نادر تصویریں اور مکتوبات وغیرہ شائع ہوئے۔بعد میں شمیم صاحب کو فیلڈ پبلسٹی آفیسر کے عہدے پر ترقی دیدی گئی لیکن سرکاری نوکری اُن کو راس نہیں آئی اور وہ اس سے الگ ہوئے۔اس کے بعد وہ ایل ایل بی کے لئے علی گڑھ چلے گئے جہاں پر اُنہیں نامور ادیب خلیل الرحمٰن اعظمی کی محبت کا شرف حاصل ہوا۔اُن دنوں وہاں پر انجمن ترقی پسند مصنفین کا زبردست غُلغلہ تھا۔شمیم صاحب انجمن کے جلسوں میں پابندی کے ساتھ شریک ہوتے تھے اور اپنی خداداد قابلیت کا لوہا وہاں بھی منوالیا۔انجامِ کار اُنہیں انجمن کی ورکنگ کمیٹی کا ممبر چن لیا گیا بعض حضرات کی روایت ہے کہ اُنہیں انجمن کا جوائنٹ سیکریٹری چُن لیا گیا۔

دُنیا بھر کی سٹوڈنٹس یونینوں میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی سٹوڈنٹس یونین ایک منفرد مقام رکھتی ہے اس کے قدوقامت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے سابق صدور آج بھی ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں اعلٰی وزارتی اور تنظیمی عہدوں پر براجمان ہیں۔بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے قیام اور سرگرمیوں کے ضمن میں اس کے عہدیداروں اور عام ممبران نے نہایت ہی فعال کردار ادا کیا۔ بعض اوقات یہ یونین بھارت کی مسلم سیاسیات کا رُخ متعین کرنے میں اہم رول ادا کرتی ہے۔چنانچہ تحریک پاکستان کے دوران اس یونین نے تاریخ ساز رول ادا کیا۔اس یونین کے پلیٹ فارم پر کھڑا ہونا ایک بہت بڑے اعزاز کی بات

ہے۔شمیم احمد شمیم اس یونین کے پلیٹ فارم پر نہ صرف کھڑے ہوئے بلکہ گرجے بھی۔اُنہوں نے یونین کے تحت ہونے والے تمام مباحثوں اور مناظروں میں اپنی دھاک بٹھادی۔جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر منتخب ہوئے۔ المختصر شمیم احمد شمیم نامور کشمیری شاعر امین کامل کے اس شعر کی عملی تفسیر تھے کہ۔

ہجومس منزتہ چھس مرکز زمانک
سخن گہلس اندر پزیز لیائے میائی

علی گڑھ سے واپسی کے بعد شمیم نے وکالت کا پیشہ اپنانے کی کوشش کی حالانکہ عدالتی نظام کے وارے نیاروں سے اُن کا ضمیر آسودہ نہیں تھا لیکن مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اُنہوں نے اس پیشے کے ساتھ چمٹے رہنے کا فیصلہ کرلیا۔اُس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اُس کے پاس آمدنی کا کوئی اور ذریعہ نہیں تھا۔اس دوران ۲۷ دسمبر ۱۹۶۳ء کو درگاہ حضرت بل (سرینگر) سے آنحضور ﷺ کے موئے مقدس کی گمشدگی کا دلخراش واقعہ پیش آیا۔اس نے نہ صرف ریاستی حکومت کو ہلا کے رکھ دیا بلکہ حکومت کے پالیسی ساز اداروں کے Kashmir Related منصوبوں پر بھی پانی پھیردیا۔موئے مقدس ایکشن کمیٹی کی تحریک نے ریاست کے بیشتر علاقوں میں حکومتی WRIT کو ختم کرڈالا۔مرکزی حکومت تحریکی لیڈروں کے ساتھ مذاکرات کرنے کے لئے مجبور ہوئی۔اس مجبوری کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ بھارتی وزیراعظم پنڈت جواہرلال نہرو نے اپنے دستِ راست اور نائب وزیراعظم لال بہادر شاستری کو یخ بستہ موسم کے دوران سرینگر کے محلّہ بسنت باغ روانہ کردیا جہاں موئے مقدس ایکشن کمیٹی کے سرکردہ لیڈر مولانا محمد سعید مسعودی اور خواجہ غلام محی الدین قرہ محاذ رائے شماری کے ایک لیڈر خواجہ غلام محمد بٹ

کے ہاں فروکش تھے۔ بٹ صاحب کے دولت خانے میں ہی بخشی غلام محمد کی حمایت یافتہ شمس الدین وزارت کو برخاست کرنے کا فیصلہ لیا گیا۔ جس کے نتیجے میں ۲۹ فروری ۱۹۶۴ء کو خواجہ غلام محی الدین قرہ کے بہنوئی خواجہ غلام محمد صادق کی بحیثیت وزیراعلیٰ تاج پوشی کی گئی۔ صادق صاحب نے عنانِ اقتدار سنبھالنے کے فوراً بعد تحریر وتقریر کی آزادی کا اعلان کیا جس کے نتیجے میں ریاست میں چند نئے اخبارات کا اجراء ہوا۔ اُن میں ''محافظ''، جہلم، وادی، الغفران، دلیر، سوپور، چنار، آئینہ وغیر قابلِ ذکر ہیں۔ ہفتہ روزہ ''آئینہ'' شمیم صاحب نے جاری کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس اخبار نے ریاست کے صحافتی، سیاسی اور ادبی حلقوں میں دھاک بٹھادی اور اس کی طرزِ تحریر، جرأت مندی اور بے باکی نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اس کا گرویدہ بنالیا۔ اس طرح نہ صرف ریاست بلکہ بیرون ریاست بھی اس کے مداحوں کا حلقہ وجود میں آیا۔ کہا جاتا ہے کہ برصغیر ہندوپاک کے بلند پایہ صحافی مولانا عبدالماجد دریا آبادی اپنا اخبار ''صدق جدید'' پورے کا پورا متن خود ہی ترتیب دیتے تھے اور یہی حال شمیم احمد شمیم کا تھا اُن کے قریبی دوست غلام محمد باون کا بیان ہے کہ ''آئینہ کی ۹۸ فیصدی تحریریں خود شمیم کی ہوتی تھیں۔'' اُن کے بارے میں برصغیر ہندوپاک کے بلند پایہ ادیب پروفیسر آل احمد سرور نے یوں کہا:۔

''دیوان سنگھ مفتون کے بعد شمیم برصغیر کے سب سے مشہور اور مؤثر صحافی تھے لیکن اُن کی صحافت میں ادبیت تھی' فن تھا''

وادی کے ایک قلمکار ڈاکٹر مبارک احمد نے شمیم صاحب کے بارے میں یوں لکھا ہے:

''وہ ریاست کے ان گنے چنے صحافیوں میں ایک تھے جو اچھے

خاصے پڑھے لکھے تھے۔ اُنہیں پڑھنے کی دُھن سوار رہتی تھی اور اچھی کتابوں کے رسیا تھے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ وہ اپنے مطالعے کے مواد کو گاہے گاہے ''آئینہ'' کے قارئین کے ساتھ Share کرتے تھے۔ اُن کی طرزِ تحریر قارئین کا دل موہ لیتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ''آئینہ'' کے قارئین کو ''آئینہ'' اور ''صاحبِ آئینہ'' کی یاد رہ رہ کر آتی ہے اور دل ہی دل میں وہ یہ سوال کرتے ہیں کہ کشمیری پنڈتوں، مولوی عمر فاروق، سید علی شاہ گیلانی، یاسین ملک، شبیر شاہ کے علاوہ عمر عبداللہ، فاروق عبداللہ، مفتی سعید، محبوبہ مفتی، ہاشم قریشی، کوکہ پرے، جاوید شاہ، سیٹھ گجر، الطاف پڈر، الطاف پال، پاپا کشواڑی، عثمان مجید، بلال لودھی، وغیرہ کے بارے میں شمیم کیا لکھتا؟ نیز صلاح الدین، اشفاق مجید، ڈاکٹر عبدالاحد گورو، پروفیسر عبدالاحد وانی، جُنید الاسلام، مسعود کولگامی وغیرہ کے بارے میں کیا تبصرہ کرتا؟''

۱۹۶۷ء میں شمیم نے شوپیان سے بحیثیتِ آزاد اُمیدوار ریاستی اسمبلی کا الیکشن لڑا۔ اُن کے مقابلے پر کانگریس نے غلام حسن خان (پنجورہ شوپیان) کو کھڑا کیا۔ اس بات کا قوی امکان تھا کہ حسبِ قدیم حکومتِ ہند اور مقامی حکومت دھاندلیوں کے بل بوتے پر اُنہیں ہرا لے گی لہٰذا ریاست اور بیرون ریاست کے چند صاحبِ رسوخ شخصیتوں نے حکومتِ ہند اور چیف الیکشن کمشنر مسٹر سندرم کو خبردار کیا کہ شمیم کے ساتھ کوئی ناانصافی نہ ہونے پائے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ بھارت کے نامور سماجی کارکن شری آر کے پاٹل نے جموں کے شری بلراج پوری کی معیت میں شوپیان کا دورہ کیا۔ انجام کار شمیم جیت گیا اور غلام حسن خان نے سیاست سے سنیاس لیا۔ بحیثیتِ ممبر اسمبلی شمیم نے اہلیانِ شوپیان کی بے لوث خدمت کی اور

اسمبلی میں کورپشن، ناانصافی اور ظلم وستم کے خلاف پہلی بار آواز اُٹھائی جس کے نتیجے میں چند غنڈوں نے شوپیان میں ہی اُن پر قاتلانہ حملہ کیا اُس کی وجہ یہ تھی کہ شمیم صاحب نے اخبار "آئینہ" میں کروڑوں روپے کے گول مال کا سکینڈل، فیلڈ پبلسٹی آفس میں دھاندلیوں کا سکینڈل اور محکمہ کسٹوڈین میں دھاندلیوں کا سکینڈل وغیرہ طشت ازبام کیا تھا۔اُس زمانے میں محمد ایوب خان (ارناس گول گلاب گڑھ) پردیش کانگریس صدر تھے۔ شمیم صاحب نے اُنہیں چیلنج کرتے ہوئے یوں کہا:

"ہمارے شائع کردہ اعداد وشمار غلط ثابت ہوں تو ہم آئینہ کی اشاعت بند کردیں گے" (ہفت روزہ "آئینہ" ۷/جولائی ۱۹۷۵ء)

۱۹۶۸ء میں شیخ محمد عبداللہ نے سٹیٹ پیوپلز کنونشن کا اہتمام کیا۔اس سلسلے میں ریاست جموں وکشمیر کے سبھی علاقوں اور سیاسی ومذہبی تنظیموں کے سرکردہ لیڈروں کو دعوت دی گئی۔ یہ کنونشن مجاہد منزل (سرینگر) میں منعقد ہوا۔اس کا افتتاح بھارت کے نامور سیاسی لیڈر شری جے پرکاش نارائن نے کیا، جنہیں سرینگر کی مختلف شاہراہوں سے ایک جلوس کی صورت میں مجاہد منزل پہنچایا گیا۔ اس کنونشن کے اہتمام کی خاطر شیخ صاحب نے ایک سٹیرنگ کمیٹی تشکیل دے دی اور شمیم صاحب کو بھی اس کا ممبر نامزد کرلیا، چنانچہ اُنہوں نے نہایت جانفشانی اور خلوصِ نیت سے کام کیا۔

۱۹۷۱ء میں اُنہوں نے پارلیمنٹ کا الیکشن لڑا۔ابتداء میں اُنہوں نے دو انتخابی حلقوں (سرینگر اور اننت ناگ) سے کاغذات نامزدگی داخل کئے لیکن بعد میں اُنہوں نے اننت ناگ سے دستبرداری لے لی اور سرینگر حلقے پر دھیان

دیا۔کانگریس نے سابق وزیر اعظم بخشی غلام محمد کو میدان میں اُتارا اور جماعت اسلامی نے اپنے محبوس لیڈر سیف الدین قاری کو کھڑا کیا۔جس دن کاغذات نامزدگی کی جانچ پڑتال ہوئی اُس دن شمیم صاحب اپنے ساتھیوں غلام محمد باون ایڈوکیٹ، ہلال جالب پٹن، ڈاکٹر مبارک احمد سرینگر، غلام محی الدین ٹاک شوپیان، رفیق فدا ایڈوکیٹ، اومکار ناتھ ترسل ایڈوکیٹ پلوامہ، محمد یوسف ملک منیجر "آئینہ" کی معیت میں پیدل ڈی سی آفس سرینگر پہنچے، وہاں پر بخشی غلام محمد کے حامیوں کا جمِ غفیر تھا۔شمیم صاحب کو دیکھتے ہی اُنہوں نے نعرہ بازی شروع کی لیکن پولیس کی مدد سے شمیم صاحب ریٹرننگ آفیسر کے کمرے میں داخل ہوئے۔ جانچ پڑتال شروع ہوتے ہی بخشی صاحب کے وکلاء (جو سب کے سب کشمیری پنڈت تھے) نے یہ موقف اختیار کیا کہ چونکہ سیف الدین قاری جماعت اسلامی کے سرکردہ لیڈر ہیں اور جماعت اسلامی آئین ہند کو تسلیم نہیں کرتی ہے لہٰذا قاری صاحب کے کاغذات نامزدگی رد ہونے چاہئیں۔قاری صاحب کے وکیل اور اُن کے دوساتھی اس درجہ سہمے ہوئے تھے کہ وہ کچھ بول ہی نہیں پائے۔اس موقعہ پر شمیم صاحب نے قاری صاحب کے کیس کو زور دار طریقے سے پلیڈ کیا اور عدالت سے درخواست کی قاری صاحب کے کاغذاتِ نامزدگی منظور کئے جائیں کیونکہ اُنہوں نے آئین ہند کی وفاداری کا حلف اُٹھالیا ہے لیکن بخشی صاحب کے وکلاء نے اس بات پر زور دار طریقے سے Agitate کیا کہ قاری صاحب ریاست جموں وکشمیر کو ہندوستان کا اٹوٹ انگ نہیں مانتے ہیں اور اسی وجہ سے وہ آج کل سینٹرل جیل سرینگر میں نظر بند ہیں۔اس پر شمیم صاحب نے گرجدار آواز میں کہا کہ چونکہ قاری صاحب نے اپنے کاغذات کے ساتھ Oath Allegiance کا

فارم بھی Attach کرلیا ہے آئین ہند، الیکشن کمیشن کے قواعد وضوابط کی رُو سے اُن کے کاغذات رد کرنا غیر قانونی ہے۔ شمیم صاحب کے اس مؤقف کو عدالت نے تسلیم کرلیا اور قاری صاحب کے کاغذات قبول کر لئے گئے۔ شمیم صاحب کے اس رویئے نے یہاں کے سیاسی و مذہبی حلقوں کو حیران و ششدر کر کے رکھ دیا کیونکہ جماعت اسلامی کے ساتھ اُن کے تعلقات حد درجہ کشیدہ تھے۔ یہاں تک کہ جماعت اسلامی والوں نے شمیم صاحب کو ''کافر'' قرار دیا تھا۔ جس پر غلام رسول نازکی اور عائشہ بٹ نے جماعت اسلامی والوں کو آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ کمرۂ عدالت سے باہر آتے ہی بخشی صاحب کے حامیوں نے شمیم صاحب اور اُس کے ساتھیوں کے خلاف انتہائی غیر مہذبانہ اور معاندانہ رویہ اختیار کیا۔ اُن کے ایک ساتھی ڈاکٹر مبارک احمد کا مفلر بھی اُڑا لیا گیا لیکن پولیس کی بروقت مدد سے سبھی حضرات محفوظ رہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ بخشی صاحب شمیم صاحب کو اپنے لئے خطرہ نہیں سمجھتے تھے۔ اُنہیں جماعت اسلامی کا ہی ڈر تھا۔ الیکشن کا بگل بجتے ہی بخشی صاحب کے حامیوں نے سرینگر، گاندربل اور بڈگام وغیرہ کے علاقوں میں زوردار طریقے سے اپنی سرگرمیاں شروع کیں۔ شمیم صاحب کے اردگرد فقط چند سو مداح ہی جمع ہوگئے۔ لیکن جب شیخ محمد عبداللہ نے شمیم صاحب کی حمایت کا اعلان کیا تو لوگوں نے خوف ودہشت کی زنجیروں کو توڑ کر شمیم صاحب کو ہاتھوں ہاتھ لے لیا۔ شیخ صاحب اُن دنوں دہلی میں جلاوطن تھے لہٰذا اُن کی طرف سے بیگم شیخ محمد عبداللہ نے خانیار (سرینگر) پارک کے جلسۂ عام میں حمایت کا اعلان کیا۔ شمیم صاحب کی الیکشن مہم کی کمان مولانا مسعودی اور خواجہ غلام محی الدین قرہ نے سنبھالی۔ بیگم شیخ

محمد عبداللہ نے بھی گاؤں دیہاتوں میں جا کر لوگوں کو لام بند کیا۔ اس دوران چرار شریف میں شمیم صاحب اور اُن کے حامیوں پر حملہ کیا گیا جس میں شمیم صاحب، رفیق فدا ایڈوکیٹ، غلام محی الدین ٹاک وغیرہ زخمی ہوئے۔ اس واقعہ نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور ماحول اور بھی شمیم صاحب کے حق میں سازگار ہوگیا اور یوں وہ اور بھارتی پارلیمنٹ کی زینت بن گئے۔ پارلیمنٹ میں اُنہوں نے اپنی خطابت، نکتہ فہمی اور حاضر جوابی سے ایک بلند مقام حاصل کرلیا۔ اُنہوں نے وہاں پر نہایت زوردار طریقے پر کشمیریوں کے مسائل کو پروجیکٹ کیا۔ شمیم سے قبل بھارتی پارلیمنٹ میں مولانا محمد سعید مسعودی، شیخ محمد اکبر بارہمولہ، صوفی محمد اکبر سوپور، پنڈت موتی رام بیگرہ اُودھم پور، مولوی عبدالرحمان جموں، کوشک بکولا لداخ، کامریڈ محمد شفیع میرپوری، غلام قادر گاندربلی المعروف شیر گاندربل، علی محمد طارق، سید محمد شاہ جلالی، سردار بُدھ سنگھ، بریگیڈیئر گھنسارا سنگھ وغیرہ نے ریاست کی نمائندگی کی لیکن مولانا مسعودی کے سوا کسی نے بھی اپنا منہ نہیں کھولا۔ مولانا مسعودی نے جو تقریریں کیں وہ پڑھنے کے لائق ہیں۔ شمیم نے کشمیر کے جغرافیائی، سیاسی، اقتصادی، تعلیمی، معاشرتی، مسائل وغیرہ کو نہایت جرأت مندی اور صاف گوئی سے پیش کیا اور ایوان نے ہمیشہ اُن کو کان کھول کر سُنا، حالانکہ وہ ایک آزاد اُمیدوار کی حیثیت سے وہاں داخل ہوئے تھے۔ اُنہوں نے فرقہ پرستوں کی قلعی کھول دی جس پر اُنہیں ''پاکستانی ایجنٹ'' ہونے کا الزام بھی لگایا گیا لیکن اُنہوں نے سرینڈر نہیں کیا بلکہ حق گوئی کو اپنا شعار بنالیا۔

پارلیمنٹ میں اُن کے کردار کے بارے میں پروفیسر آل احمد سرور نے یوں کہا ہے:

"مگر حق بات یہ ہے کہ کشمیر کی نمائندگی جس طرح شمیم نے کی کسی اور نے نہیں کی۔ کشمیر کے مسئلے کو قومی نقطہ نظر سے بیان کرنا' کشمیر کی شخصیت' اُس کی علاقائی خصوصیات' اُس کی سیاسی جدوجہد کو صحیح پس منظر میں پیش کرنا اور شیخ عبداللہ کی طرف جو مسلمہ طور پر کشمیر کی تحریک حریت کے راہ نُما اور نئے کشمیر کے معمارِ اعظم ہیں حکومت ہند کے دست تعاون بڑھانے پر اصرار کرنا شمیم کا ایسا بڑا کارنامہ ہے جس پر کسی طرح خاک نہیں ڈالی جاسکتی"

شمیم نے صرف کشمیریوں کے مسائل ہی پروجیکٹ نہیں کئے بلکہ بھارتی مسلمانوں کے ساتھ کی گئی زیادتیوں اور ناانصافیوں کو بھی اُجاگر کیا۔ ۱۹۷۵ء میں جب اندرا گاندھی نے بھارت میں ایمرجنسی لگادی تو ہزاروں سیاسی ورکروں کو پابندِ زنداں کیا گیا۔ پریس پر بھی قدغن لگادی گئی ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ شمیم نے تنِ تنہا اس کی مخالفت کی اور زوردار طریقے سے کی۔ اُس نے چاپلوسوں، مُفاد پرستوں اور موقعہ پرستوں کی خوب خبر لی۔

پارلیمنٹ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ترمیمی بل پر بولتے ہوئے شمیم نے کہا کہ: "آزادی کے 25 سال بعد بھی ابھی تک مسلمانوں کو اس ملک میں تعلیم اور ترقی کے وہ مواقع حاصل نہیں ہیں کہ جن کی ہندوستانی آئین میں ضمانت دی گئی ہے" (ہفتہ روزہ "آئینہ" ۳۰ رجون ۱۹۷۲ء صفحہ ۶)

اسی تقریر کے دوران آپ نے یوں بھی فرمایا:

"نوکریوں کے معاملے میں سرکاری اور پرائیوٹ سطح دونوں پر مسلمانوں کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ کالجوں میں داخلے کے سلسلے میں بھی ان سے انصاف نہیں

ہوتا، تجارتی اداروں میں مسلمانوں کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ ترمیمی بل میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ساتھ اس بات کی صراحت کی جائے کہ یہ ادارہ مسلمانوں کا قائم کردہ ہے اور انہیں اس کے انتظام وانصرام میں غیر معمولی دخل رہنا چاہیے"

نامور شاعر مرزا عارف نے اُن کی وفات پر یوں لکھا:

"اُس کی بے باکی اور بے جگری جبلی تھی وہ شعلوں سے لپٹنے میں لذت پاتا تھا وہ قلم سے تیرونشتر کا کام لیتا تھا' وہ ہر نمرود و فرعون کے سامنے خلیل و موسیٰ بن کر بھری محفل میں صداقت کے طمانچے رسید کرتا تھا' وہ مجاہد تھا اور حق وصداقت کے اس بے باکانہ جہاد میں کام آیا وہ غازی جیا اور شہید مرا۔"

برصغیر کے نامور ادیب پروفیسر آل احمد سرور نے اُن کے موقف پر یوں کہا:

"شمیم بڑا جیالا' بڑا بہادر تھا۔ ایسی سخت اور طویل اور ظالم بیماری میں اُس نے جس صبر وضبط اور ہمت واستقلال کا ثبوت دیا اُس کی مثالیں کم دیکھنے میں آتی ہیں۔"

اُس کے مداحوں کو اس بات کا دُکھ نہیں ہے کہ وہ کیوں مرا بلکہ اس بات کا قلق ہے کہ وہ جواں مرگ ہوا۔ شمیم اس وقت سید منصور صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے آستانہ کے بغل میں آسودۂ خاک ہیں۔ اُن کی تُربت پر جو کتبہ نصب کیا گیا اُس کی تحریر یوں ہے ۔

اے مردِ جواں مرگ شمیم! اے دُرِ نایاب
روتے ہیں تیری قبر پہ اعدا ہوں کہ احباب
اس مصرعہ تاریخ میں ہے ضبط تیری ذات
تھا صحنِ گل و صاعقۂ ، شعلہ و سیماب

☆☆☆

جاوید اقبال

شمیم وقرۃ العین......محبت وایثار کی کہانی!

شمیم احمد شمیم کو نئی نسل نہیں جانتی لیکن اُن سے پہلے کی نسل جو ۱۹۶۰ء و ۱۹۷۰ء کے دہائی میں عالم شباب میں شاداب وسرشار تھی اور جن پہ اب بڑھاپے کی خزاں چھائی ہوئی ہے اُن کے نام وکام سے اکثر وبیشتر آشنا ہے خصوصاً پڑھے لکھے افراد میں جنہیں ادب سے دلچسپی تھی یا سیاست کو دل دے بیٹھے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ کشمیر میں کوئی ایسا فرد جسے سیاست میں دلچسپی نہ ہو نادِر ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہاں کی زمین سیاست کے لئے زرخیز ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ ہاں کچھ کچھ نمی کی کمی ہوسکتی ہے۔ شمیم ہماری سیاسی وسماجی دنیا میں ہوا کے ایک خوشگوار جھونکے کی مانند آئے۔ اُن کو جاننے والوں کا دعویٰ ہے کہ آپ اُنہیں پسند یا ناپسند کرسکتے تھے لیکن اُن کو نظر انداز کرنا آپ کے حدِ اختیار میں نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ وہ آپ کو ایسا موقعہ فراہم کرنے کے قائل ہی نہیں تھے۔ ان کے جہاں بے شمار مداح اُن کی یاد کو سینے سے لگائے تماشائے اہل کرم دیکھتے رہتے ہیں وہیں کچھ افراد ایسے بھی ہیں جنہیں اُن کی زندہ جاوید شخصیت کی عیب جوئی سے آج بھی فرصت نہیں ملتی۔ آخر

اشرف المخلوقات کو اصراف الصارفین بننے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے؟ جنہیں آفتاب کو چراغ دکھانا کا شوق چرائے اُن کے جذبے کو جذبہ کہنا اِس دل کو موہ لینے والے کلمے کی توہین ہے!

شمیم کی یاد کو سینے سے لگائے اگرچہ آج بھی اُن کے بے شمار مداح اُن کی وادی کشمیر کے علاوہ برصغیر کے طول وعرض میں موجود ہیں لیکن اِس انفرادی جذبے کی مجموعی سطح پہ آبیاری کی ضرورت اُن کی وفات کے پچیس برس بعد بھی شدت سے محسوس کی جارہی تھی۔ قدرت کی کرم فرمائی سے یہ سعادت قرۃ العین کو ملی جنہوں نے پچھلے سات سال سے حالات اور گوناگوں مشکلات وتغیرات کے باوجود ہماری ریاست کے ادبی وسماجی حلقوں میں اُن کی یاد کی شمع کو فروزاں رکھا۔ شمیم وقرۃ العین کی کہانی محبت وایثار کی کہانی ہے۔ مشرقی روایات میں محبت کا مفہوم اور اِس جاذب لفظ کا دائرہ نہایت ہی وسیع ہے اور اُس کی تفسیر میں عشق کی وسعتیں بھی سماتی ہیں۔ شمیم و قرۃ العین کے رشتے کو عشق کے دائرے میں ہی سمجھا جاسکتا ہے۔

عشق کی انتہا کو اگرچہ عشق حقیقی یعنی خالق، رب ذوالجلال کی ذات اقدس سے بے چوں وچرا لگاؤ کو مانا جاتا ہے لیکن دنیاوی رشتوں کی قدر وآبیاری بھی جو عشق مجازی کے زمرے میں آتی ہے، اہمیت کی حامل ہے۔ عشق مجازی میں والدین کا اپنے بچوں سے پیار، زوجین کا لگاؤ، بھائی بہن کی آپسی محبت کے علاوہ ہر باہمی انسانی رشتہ بھی شامل ہے۔ قرۃ العین رشتے میں شمیم کی بہن ہے، سکے کے دورخ، ایک ہی ماں باپ کی اولاد۔ لیکن اگر یہ کہاں جائے کہ قرۃ العین کے لئے شمیم سب کچھ ہے تو یہ مبالغہ آرائی نہیں ہوگی۔ عشق کی تفسیر میں محبوبیت کا دائرہ کافی وسیع ہے اور کچھ مسالک میں مخصوصاً صوفی مسلک میں محبوبیت حقیقی ومجازی کے فرق کو

مٹادیتی ہے، بقول علامہ اقبال حقیقت کا مجازی لباس میں نظارہ کرنے کی سعی اجاگر ہوتی ہے۔محبوب کوئی بھی ہوسکتا ہے روایتی ہونے کی سنت بھی رائج نہیں!

قرۃ العین کو شمیم کے بے شمار مداحوں کی مانند میں نہ صرف اپنی بہن مانتا ہوں بلکہ وہ میری قریبی دوستوں کی فہرست میں خاص مقام کی حامل ہے۔اگر چہ مجھے اِس بات کا احساس تھا بلکہ وقت گذرنے کے ساتھ بڑھتا ہی جارہا ہے کہ قرۃ العین کی ہستی و نیستی شمیم ہی ہے، پھر بھی تقویت احساس کے لئے میں نے اُن کی شادی کے کچھ سال بعد ہی طلاق کی وجہ پوچھ ہی لی۔قرۃ العین کی خاصیت اگر چہ سوال پوچھنے پہ شمیم کی مانند بلا تامل جواب ہے لیکن اُس دن کچھ سوچتے ہوئے ناپ تول کے البتہ معمول کا وقار بنائے ہوئے اُنہوں نے کہا ''میں نے اپنے شوہر میں شمیم کو ڈھونڈنے کی کوشش کی!'' یہ بات ظاہراً اگر چہ انہونی لگتی ہے لیکن تجزیہ کاری میں معنی و مفہوم سمجھ میں آہی جاتا ہے۔محترمہ اندرا گاندھی کو بھی تلاشِ بسیار کے بعد اپنے فیروز میں جواہر لال نہرو کی جھلک نہیں ملی، حالات بگڑنے لگے۔انجام کار وہ اپنے جلیل القدر باپ کی ہی بن بیٹھی اور فیروز کیساتھ کچا دھاگا جڑا رہا تا کہ عوام الناس میں بات بنی ہے۔بینظیر بھٹو ایک قدامت پرست سماج میں اپنی سیاسی ساکھ بنائے رکھنے کی خاطر آصف زرداری کو اپنا دل دے بیٹھی لیکن آخر تک بھٹو ہی بنی رہیں اور جو کچھ بھی تحریر فرما گئیں وہاں بھٹو ہی بھٹو ہے۔ آصف کا دور دور تک نام و نشان نظر نہیں آتا۔اللہ تبارک تعالیٰ کا کرم زرداری کے شامل حال رہا اور بینظیر کی وفات ناگہانی بلکہ ایسا کہیں وحشت زدہ سیاست کا شکار ہونے کے بعد کچا دھاگا پاکستان کی کرسی صدارت کے ساتھ جڑ گیا۔اِسی طرح بنگلہ دیش کی حسینہ پہلے شیخ ہے پھر واجد، آخر میں آنے والے خیال کی مانند بلکہ واجد تو اکثر و بیشتر

تذکرات میں نظر ہی نہیں آتا۔

شمیم کے ہاں فنِ تحریر میں مشرقی فنکاروں کی جھلکیاں نظر آتی ہیں ظاہر ہے یہ عمیق مطالعہ، وسعت نظر اور کچھ حد تک خداداد صلاحیتوں سے ہی ممکن ہوسکتا ہے۔ایک ادبی گھرانے میں جنم لینے کے اثرات کو بھی شمیم کی ذات کے تجزیے میں ملحوظ خاطر رکھنا ہوگا۔ویسے بھی پشت در پشت مثبت و منفی کی منتقلی سائنسی تجربات سے پایہ اثبات تک پہنچ ہی چکی ہے۔یورپی رستاخیز کے بعد مغرب مشرق پہ چھا گیا، جس کے اثرات ادبی دنیا میں بھی ظاہر ہونے لگے لیکن مشرقی ادب کی ساخت جاندار و درخشاں تھی کہ عشق و مشک کی مانند اُسے چھپایا نہ جاسکا اور گوئٹے جیسے عظیم مغربی فنکار نے مغرب میں عموماً اور ادب کی دنیا میں خصوصاً مشرقی ادب کی شاہکاروں کی رونمائی کی اور اِس طرح اگر چہ مشرق پہ عموماً دورِ انحطاط چھایا رہا لیکن خواجہ حافظ شیرازیؒ و مولانا جلال الدین رومیؒ کی روایات قائم رہیں۔رومیؒ کے ہاں جمال کے باوجود جلالِ حقیقی قائم رہا لیکن حافظؒ کے ہاں زاہد و عابد کے ساتھ رند بھی لگے رہے۔ادبی دنیا کے رندوں میں مرزا اسد اللہ خان غالب نے تو حد ہی کر لی جب اُن سے غدر کے زمانے میں سوال ہوا کہ وہ مسلمان ہیں یا نہیں؟ اُن کا جواب تھا کہ ''آدھا مسلمان!'' سوال ہوا کہ وہ کیسے؟ جواب میں غالب نے کہا ''شراب پیتا ہوں سور نہیں کھاتا''!!۔

شمیم کی تحریروں کی ساتویں جلد کی تقریب رونمائی جو حال ہی میں قرۃ العین کی مسلسل کاوشوں کے نتیجے میں انجام پذیر ہوئی، اُن کے قریبی دوست اور کالج کے ساتھی ڈاکٹر علوی نے شمیم کی شخصیتی تجزیہ نگاری میں اُن کی شرارتوں کے ساتھ ساتھ اُن کے زاہد و تقویٰ کا بھی ذکر کیا۔ڈاکٹر صاحب ہماری وادی کے معروف ترین اطباء

میں شمار ہوتے ہیں اور زہد وتقویٰ کی مثال مانے جاتے ہیں۔ شمیم کی رندانہ خصلت کی گواہی دینے کے لئے اُن کے کئی قریبی ساتھی آج بھی وادی کے طول وعرض میں ملیں گے، اُن کی شخصیت کے پنہاں گوشوں میں زہد وتقویٰ کی کمی بھی نہیں تھی یہ بات جب ڈاکٹر صاحب نے درد بھرے انداز میں بیان فرمائی تو شمیم کو جاننے و چاہنے والوں کی آنکھیں بھر آئیں۔ ڈاکٹر علوی کی راست گوئی اور اُن کے ایمان و تقویٰ کی محکمی کو سب ہی جانتے اور مانتے بھی ہیں۔ اُنہوں نے شمیم کے زہد و تقویٰ کی بات جس درد بھرے انداز میں سامنے رکھی اُس پہ ایمان لانے کے باوجود شمیم کی رندانہ روش اُن کے چاہنے کے لئے اُن کی خواہش کی نہیں بلکہ افزائش شخصیت کی دلیل ہے!

مشرقی ادب میں جہاں سے شمیم کے ذوق نے تقویت پائی، زاہدانہ روش ورندانہ انداز دونوں ہی ساتھ ساتھ پہلے سے ہی چلے آرہے ہیں۔ جہاں نفس کی پاکیزگی کے بغیر روح کو چھونے والی تحریر کا رقم ہونا ناممکن ہے وہی قدامت پرستی، تغیرات زماں وتبدیلی کی واضح ضرورت کی نشاندہی کے باوجود لکیر کا فقیر بنے رہنے کی سماجی روش قلم کار کو طنز نگار بنا دیتی ہے اور حفظ ماتقدم کے پجاری جو زہد کو باپ کی جاگیر مانتے ہیں قلم کار کے تئیں باغی کا فتویٰ صادر کرتے ہوئے اُسے رند قرار دیتے ہیں اور قلم کار کو یہ خطاب اپنانے میں کوئی باک نہیں ہوتا۔ حافظ قرآن خواجہ حافظ شیرازیؒ کو بھی یہ طعنہ دیا گیا، علامہ اقبالؒ پہ بھی فتویٰ صادر ہوا اور شیخ نورالدین نورانیؒ کی پند ونصائح کو سحر کا نام دیا گیا، صرف اِس لئے کہ اُن جیسے صحت مند ذہن کے اہل فن میں زہد کے سماجی ٹھیکداروں کی خشکی نہیں ہوتی بلکہ وہ بنجر زمیں کو نم کرنا چاہتے ہیں لیکن جب اُن کا وجود چھلنی کر دیا جاتا ہے تو وہ نہ صرف رند بے باک بلکہ

منصور حلاج کی مانند مکمل باغی بننے پہ آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اِسی ضمن میں شمیم نے بھی پگڑیاں اچھالنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ اُنہیں جہاں اپنے ہی جیسے اہل فن پروفیسر محی الدین حاجنی کی مسلسل گالیاں سننے میں ساز کی مدھر آواز سنائی دی وہی ایک بدکلام وزیر کی گالیوں میں اُن کی رُوحانی غلاظت کی چیخیں سنائی دیں!

شمیم میں آخر کیا بات تھی جو وہ ہماری سیاسی، سماجی، مطبوعاتی وادبی دنیا کو اِس حد تک متاثر کر گئے کہ آج اُن کی وفات کے رُبع صدی بعد وہ ہماری یادوں میں بسے ہوئے ہیں۔ مانا کہ اُن کا فن تحریر منفرد ونمایاں تھا لیکن نگارش کے فنکار آج بھی ہیں علم کی وسعتیں بھی بڑھ گئی ہیں معلومات کی فراہمی اتنی کبھی نہ تھی جتنی آج ہے۔ دراصل شمیم کی گرفت میں ہماری دکھتی رگ آ گئی تھی۔ وہ ہمارے درد کو جان چکے تھے اور اُس کیمیا کی پہچان میں مصروف نظر آرہے تھے جو ہمارے درد کا مداوا بن سکتا تھا۔ یہ مانا کہ درد کی تشخیص صرف وصرف شمیم کا خاصہ رہا صحیح نہیں اور بھی تھے بلکہ آج بھی ہیں اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اُن کی تشخیص شمیم سے دقیق تر و بہتر رہی ہو لیکن جامع انداز میں ''اپنے آئینہ'' میں جس انداز سے ہمیں وہ ہمارا اصلی چہرہ دکھا گئے وہ منفرد تھا۔ مہجور ایک بار کہہ گئے تھے ۔

اُتھ دَرد سُورس پرِ دِتلبتھ گو رسول میر
مہجورؔ لُکبتھ آ و بیہ اُ تی ر و ز

مہجور صحیح فرما گئے تھے رسول میر نے درد آشنائی کے لئے دعوت عام کا اہتمام کیا

ولوو عاشقو چیوتور ٹورے　　　چھُ مورے للہٕ وُن نار

مورے للہٕ وُن نار' عمر بھر دہکتی آگ شمیم کو بھی سہنی پڑی، یہ دہکتی آگ اُن کی سلگائی ہوئی ہے جو کئی صدیوں سے ہمیں چین وآرام سے جینے نہیں دے رہے ہیں اور یہ

آگ ابھی تک بجھی نہیں ہے اگر چہ شمیم بھی جب تک جیئے ٹوٹ ٹو ریا، جام پہ جام ہمیں پلاتے رہے جو اُن کے آئینے میں چھلکتے رہے۔

شمیم پہلے ادیب تھے، صحافی تھے، نقاد تھے یا سیاستدان؟! اِس بات کا فیصلہ ابھی تک نہیں ہوسکا شاید یہ اہم بھی نہیں۔ کالج کے دنوں میں وہ ایس، پی کالج کی معروف 'بزمِ ادب' کے روحِ رواں تھے، کالج کے میگزین 'پرتاپ' کی ادارتی ترتیب میں اُن کا خاصہ رول رہتا تھا اور اُن میں نطق کی صلاحیتیں بھی تھی جن کی گواہی اُن کے کالج کے قریبی ساتھی ڈاکٹر علوی نے پچھلے دنوں براڈوے ہوٹل میں منعقدہ بزمِ عام میں دی اگر چہ پہلے پہل طغیانی دریا جیسی روانی دستیاب نہیں تھی جس سے بعد میں خاص و عام کو کہنے میں باک محسوس نہیں ہوا کہ وہ ہندوستانی پارلیمنٹ میں مولانا آزاد کے بعد اُردو کے عظیم ترین ناطق رہے اور اگر مولانا کی طرح شمیم کو عربی پہ عبور حاصل ہوتا تو وہ شاید اُن سے بھی بڑے ناطق ہوتے کیونکہ جس طرح فارسی شاعری 'انگریزی ڈرامہ، فرانسیسوی نثر کا ادب کی دنیا میں کوئی حریف نہیں ویسے ہی عرب کے نطق کا بھی کوئی مدمقابل نہیں۔ جہاں مولانا پہ حفظ ماتقدم کی چھاپ کچھ حد تک قائم تھی اور سیاسی لحاظ بھی، وہیں شمیم حریفوں پہ بے چوں و چرا برسنے میں لاثانی تھے۔ نطق کو لحاظ بے اثر بنا دیتا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ یوسف بن حجاج جب بغداد کا گورنر بنا تو اُن کے پہلے ہی نطق نے اُنہیں بے خوف و پُر اثر ناطقوں کی صف میں سرفہرست بنائے رکھا کیونکہ اُنہوں نے کسی کا لحاظ کئے بغیر اسلام کے اِس باغی صوبے کے باشندوں کو دہلا کے رکھ دیا اور جب تک تاریخ اسلام کا سخت ترین منتظم بغداد میں رہا کسی کو سر اٹھانے کی ہمت نہیں رہی۔ نطق بغداد عربی ادب کا ایک قیمتی باب مانا جاتا ہے۔

براڈوے ہوٹل میں منعقدہ تقریب میں صحافت میں شمیم کے رول کی کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ریاض پنجابی نے بھرپور تجزیہ کاری کی اور اُنہوں نے شمیم کے آئینہ کو مولانا آزاد کے الہلال پہ ترجیح دی۔ ایسا کر کے عالم و فاضل پروفیسر صاحب مولانا کے اونچے مقام کو نیچا دکھانے کی کوشش نہیں کر رہے تھے بلکہ مطلب و مفہوم یہ تھا کہ مولانا کی تحریر پر کھنے کے لئے خاصی علمی سطح کی ضرورت ہے جبکہ شمیم طرزِ نگارش میں سب ہی کیلئے قابلِ فہم تھے اِس کے باوجود ان کی تحریر معیاری ہوتی تھی۔ پروفیسر صاحب کیا کہنا چاہتے تھے اِس کا اندازہ مولانا آزاد کی 'غبارِ خاطر' پڑھ کے ہوتا ہے جہاں نثر کے کچھ ہی جملوں کے بعد یا تو تفسیر میں فارسی کا یا عربی کا شعر نظر آتا ہے۔ ایسے میں 'غبارِ خاطر' سمجھنے میں تینوں زبانوں پہ عبور لازمی ہے جس کی توقع رکھنا خاصکر دورِ جدید میں جہاں انگریزی چھائی ہوئی ہے جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ حتیٰ کہ مولانا کے دَورِ حیات میں بھی خاصے پڑھے لکھے افراد ہی اُنہیں سمجھ سکتے تھے۔ الہلال کی زباں اگر چہ 'غبار خاطر' سے سلیس تر رہتی تھی پھر بھی معیاری فہم و شعور کے بغیر بھرپور سمجھ مشکل تھی۔ 'آئینہ' کے قدرداں پاکستان کے ادبی حلقوں میں بھی پائے جاتے ہیں اور دہلی، حیدر آباد دکن کے علاوہ لکھنو میں بھی 'آئینہ' کو خوب داد ملی۔ لکھنو کے ادبی حلقوں میں ویسے ہر ایسے قلم کار کو شک کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے جن کی مادری زباں اُردو نہیں۔ حتیٰ علامہ اقبالؒ بھی لکھنوی تنقید سے بچ نہیں پائے! شمیم کی تحریر میں دلچسپی اُن کی پارلیمنٹ میں گھن و گرج نے بھی پیدا کی۔ تحریر کو تقریر نے تقویت بخشی اور ہند کے ادبی، مطبوعاتی و سیاسی حلقوں میں اُنہیں بھرپور پذیرائی حاصل ہوئی۔ یہ پذیرائی اُردو حلقوں تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ دہلی کے روشن فکر حلقوں میں جہاں ہندی زبانوں

کا اثر جزوی اور انگریزی حاوی ہے شمیم کو ناپ تول کے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اُنہوں نے خشونت سنگھ، اندر ملہوترہ، کلدیپ نیر اور اے. جی نورانی جیسے معروف کالم نگاروں سے بھرپور داد پائی۔

سیاست میں شمیم نے کب قدم رکھا، اگر چہ اِس بارے میں عام رائے یہی ہے کہ ۱۹۶۷ء کے اسمبلی انتخابات میں حلقہ شوپیاں سے انتخابات میں کامیابی کے بعد وہ رسمی طور پہ اِس خاردار میدان میں اتر آئے لیکن کامیابی کے بعد جب اُنہوں نے ہندوستان کی سیکولر سیاست کے بارے میں کچھ مثبت باتیں کہیں تو اُن کے ایک پرانے ساتھی نے اُن سے ایک چبھتا سوال کیا کہ کالج میں کشمیر کے بارے میں پاکستانی نقطہ نظر کے حامی ہونے کے بعد وہ اتنی جلدی کیسے سیکولر بن گئے؟! جہاں ہمیں اُن کے بغلیں جھانکنے کا انتظار رہا وہیں اُنہوں نے بِلا تامل جواب دیا کہ "اِس کام میں مجھے کشمیر کے باقی سیاست دانوں سے کافی کم وقت لگا اور دِقت بھی محسوس نہیں ہوئی" حیرت زدہ ہوتے ہوئے پوچھا گیا "وہ کیسے؟!" برجستہ جواب ملا "یار اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ میں اُن سب سے زیادہ ذہین ہوں"! شمیم نے زندگی میں کسی سے دب جانا سیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ کسی بھی وار سے بچنے کا ہنر بخوبی جانتے تھے اور الٹا جوابی وار اتنا کاری ہوتا تھا کہ حریف اپنے آپ کو بچائے نہیں بچا پاتا تھا۔ یہ اُن کی بے پناہ ذہانت کی واضح دلیل تھی۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد شمیم فیلڈ پبلسٹی آفس سے منسلک ہوئے جو محکمہ اطلاعات سے وابستہ تھا۔ اِس آفس کے بارے میں یہ تصور عام تھا کہ یہ سیاسی حمایتوں کو روزگار فراہم کرنے کا ذریعہ ہے۔ شمیم کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اُنہیں یہ نوکری بخشی صاحب کے داماد میر نصر اللہ کی سفارش پہ ملی۔ نصر صاحب ایس پی کالج

میں شمیم کے استاد رہ چکے تھے اور ظاہر ہے شمیم سے متاثر نہ ہونا کسی بھی صاحب نفاست کے حدِ اختیار میں نہیں رہتا تھا۔ نصر صاحب جو کہ بعد میں ریاست کے چیف سیکرٹری بنے، ویسے نظافت پسند تھے اور نظافت شمیم کی شخصیت میں کوٹ کوٹ کے بھری تھی، اسلئے اِس دلیل میں وزن نظر نہیں آتا کہ شمیم نے سیاسی خدمات کی پاداش میں یہ نوکری حاصل کر لی اگر چہ اُن کی قلمی خدمات حاصل کرنے کی سعی کو خارج از امکان قرار نہیں دیا جا سکتا۔ سرکاری رسالے 'تعمیر' کی ادارت میں شمیم کی شمولیت اِس دلیل کی گواہ ہے۔ بہر حال کچھ ہی سالوں میں شمیم سرکاری طوق سے نجات حاصل کر کے 'آئینہ' لے کے ہمیں اپنا اصلی چہرہ دکھانے میں مصروف ہوئے اور یہیں سے وہ ہماری سماجی زندگی پہ چھانے لگے، جو سلسلہ اُن کی بے وقت وفات تک نہ صرف قائم رہا بلکہ دن بہ دن بڑھتا ہی رہا، یہاں تک کہ 'آئینہ' ہر پڑھے لکھے گھرانے کی زینت بننے لگا اور اِس بات کے کئی گواہ ہے کہ جس گھر میں کئی پڑھے لکھے افراد ہوتے تھے وہاں پہلے پڑھنے پہ جھگڑے بھی ہوتے تھے۔ ایک نشہ سا چھا گیا تھا۔

اسمبلی چناؤ جیتنے پہ شمیم نے اِس بے جان ایوان میں جان ڈالی۔ فنِ تحریر تو لوگ پرکھ ہی چکے تھے یہاں سے لوگ اُن کے فنِ تقریر کے شیدائی بننے لگے۔ سرکاری بنچوں کو ریاستی اسمبلی میں پہلی بار آڑے ہاتھوں لیا جانے لگا۔ شمیم اور ریاست کے سب سے زیرک وزیر درگا پرشاد در کے مابین نوک جھونک کسی بھی پارلیمانی فورم کے لئے قابلِ قدر سند ہو سکتی ہے۔ دونوں کو فصاحت و بلاغت میں کمال حاصل تھا اور دونوں کا مطالعہ بھی وسیع تھا، ہاں یہ بات بھی صحیح ہے کہ اُن کی بات ایوان کی بڑی اکثریت کے سر کے اوپر سے گذرتی تھی کیونکہ اُن میں ۲۲ ممبران

اسمبلی بلا مقابلہ کامیاب قرار دئے گئے تھے ۔ جنہیں شمیم نے ''خالق میڈ'' کے خطاب سے نوازا تھا کیونکہ ضلع اننت ناگ کے ڈپٹی کمشنر خالق صاحب نے اُنہیں بلا مقابلہ کامیاب قرار دیا تھا۔ 'خالق میڈ'' نے نہ صرف سیاسی طنز بلکہ مستقل سیاسی فقرے کی حیثیت اختیار کی اور یہ بھی سننے میں آیا کہ جب یہ ممبران صادق صاحب کی جگہ قاسم صاحب کو وزیر اعلیٰ بنوانے کی سعی میں مسز گاندھی کے دربار میں پہنچے تو اُنہوں نے بھی کہا تھا کہ وہ کیسے اسمبلی میں پہنچے ہیں اُنہیں بخوبی معلوم ہے!

شمیم کے جہاں بے شمار خیر خواہ تھے بدخواہوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ حاسدوں کی ایک لمبی قطار ہمیشہ اُن کے پیچھے لگی رہی جن میں سے کچھ اُن ہی کو زینہ بنا کے اوپر آئے تھے لیکن اُن کی وفات کے بعد بھی فطری بدنیتی کے سبب وہ میدان صاف ہونے کے باوجود شمیم نہیں بن سکے جو بننے کی آگ اُن کو سلگاتی رہی بلکہ آج بھی سلگا رہی ہے۔ اسمبلی چناؤ کی جیت کو بھی صادق صاحب کے کھاتے میں ڈالنے کی کوشش کی گئی دلیل یہ دی گئی کہ ایسا کر کے وہ اپنی پارٹی کے داخلی حریفوں پہ وار کروانے کیلئے شمیم کی جیت کی راہ ہموار کر گئے۔ اِس دلیل کو محکم کرنے کیلئے صادق صاحب کے تئیں شمیم کے نرم گوشے کی بات سامنے لائی گئی جو بظاہر صحیح تھی بلکہ صادق صاحب قولاً وفعلاً شریف انسان تھے البتہ بقول شمیم جو چڑیا گھر اُنہوں نے ریاستی کابینہ کے نام سے سجا رکھا تھا اُس چڑیا گھر کے خدوخال بیاں کرنے میں شمیم بالکل نہیں چوکے اور کئی بار صادق صاحب کی ذات بھی بری طرح نرغے میں آ کے زخمی نظر آنے لگی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی مقام پہ، کسی نہ کسی مقصد کی بر آوری کے لئے اُن کی راہیں ملی ہوں جسے سیاست میں خارج از امکان قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن اتفاقات اور استثنات کو ایک قاعدہ کلیہ ہرگز نہیں مانا جا سکتا۔

مقاصد اور مطالب کے اسی سنگ نے ۱۹۷۱ء میں شمیم کے لئے ہندوستان کی پارلیمنٹ میں داخلے کے لئے راہ ہموار کی۔ اُنہوں نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے فارم بھر تو دیا لیکن بخشی غلام محمد کے مقابل یہ کوشش طفلانہ لگی۔ کئی خیر خواہوں نے شمیم کو باز رہنے کی تلقین کی لیکن اُن کے اطمینان کو دیکھ کے حیرت ہوتی تھی۔ ہر تلقین کے بعد وہ کہتے رہے کہ وقت فیصلہ کرے گا اور واقعی وقت نے اپنا فیصلہ سنایا۔ کشمیر کی قیادت تو ۱۹۵۳ء میں بکھر چکی تھی، شگافوں کی کمی نہیں تھی جو زمان و مکان کی مناسبت کھلتے رہے ایک ایسے ہی شگاف میں شمیم کی راہ ہموار ہوئی۔ جیتنے کو تو شمیم جیت گئے لیکن پارلیمنٹ میں بے مثال کارکردگی کے باوجود اُن کو یہ احساس رہا کہ اِن شگافوں کی موجودگی میں آگے چلنے کی راہ دشوار سے دشوار تر ہوتی جائے گی۔ اِس کا نہ صرف وہ اظہار کرتے رہے بلکہ زندگی میں پہلی دفعہ وہ خاموشی سے پردے کے پیچھے کام کرنے میں جٹ گئے اور اِس کام میں کچھ دیر اُن کو شگاف کے آر پار اہم ترین اشخاص کا اعتماد حاصل رہا اور اپنے تئیں بھی وہ جواں رہبروں کی ایک صف کو ترتیب دینے کیلئے کوشاں رہے اِن میں مرحوم عبدالغنی لون، مسٹر مظفر بیگ کے علاوہ کچھ اور لوگ شامل تھے جو مختلف تنظیموں میں کام کرنے کے باوجود ایک مثبت اتحاد کے حامی تھے۔ شمیم کا یہ نیا انداز اگرچہ اُن کے مداحوں کو بھی حیران کر گیا لیکن افزائش قدر کا سبب بھی بنا البتہ یہی انداز کچھ لوگوں کی نیند حرام کر گیا۔ کشمیر کے ارتعاشی سوداگروں نے ایک بار پھر سازشوں کے دفتر کھول دئے، بدظنی کی فضا قائم کی گئی اور اونچے ایوانوں میں ردوبدل کی کارروائی مکمل کر لی گئی۔ اُس کے بعد جو کچھ ہوا وہ اِس حد تک عیاں ہے کہ بیاں کا محتاج نہیں صرف اِس قدر کہنے پہ اکتفا کیا جا سکتا ہے کہ جنہوں نے شمیم کی جگ ہنسائی کے بندوبست کو آخری شکل دی تھی اُنہیں

قدرت نے ایسا کرنے نہیں دیا اُس سے پہلے ہی رب ذوالجلال نے اُنہیں اپنی جانب بلالیا۔

ماضی قریب میں شمیم کی تحریروں پہ مبنی ساتویں جلد کی رونمائی کی تقریب کے بعد شام کے دھندلکے میں گھر واپس جاتے وقت میں نے گاڑی میں قریب بیٹھے ہوئے اپنے بہنوئی عبدالمجید بابا جو شمیم کے قریب ترین ساتھیوں میں سے تھے اچانک کہا کہ جس کے نصیب میں قرۃ العین جیسی بہن ہو وہ زندگی عزیز ہوتے ہوئے بھی مرنے کی چاہ کیوں نہ کرے، حتیٰ شمیم کی مانند عین شباب میں؟!

بنا کردند خوش رسمے بہ خاک وخوں غلطیدند
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را!

...............☆☆☆...............

جی، ایم، باونؔ

نوجوان نسل کی آواز

یہ ۱۹۶۰ء کی بات ہے۔ میرے کانوں میں شمیم کے نام کی بھنک پڑی تھی۔ اُن دِنوں اُس کے بارے میں یہ بات مشہور تھی کہ وہ ''مشاعروں'' میں شاعروں کو بہت تنگ کرتا ہے۔ مجھے اُنہیں دیکھنے کا شوق ہوا کیونکہ اُن دنوں مجھ پر شاعری بُری طرح سوار تھی۔ ایک دِن سرینگر میں ایک مشاعرہ ہوا۔ میں بھی شاعروں کے کلام سے محظوظ ہونے کے لئے اِس میں شامل ہوا۔ شمیم بھی وہاں موجود تھے۔ وہ فرش پر سامعین کے ساتھ ہی بیٹھے تھے، مشاعرہ شروع ہوا تو شمیم کی رَواں کمینٹری بھی شروع ہوئی۔ ایک ایک شعر پر اُس کے تیر برستے رہے۔ شاید ہی کسی شاعر کو اُس نے بخشا۔ میں نے دیکھا کہ اکثر شاعروں کے چہروں سے ہوائیاں اُڑ رہی تھی۔ ایک شاعر نے تنگ آ کر اُنہیں بہت بڑی گالی دی۔ ہر شاعر اُن ہی سے مخاطِب ہوتا۔ "شمیم صاحب شعر عرض ہے" اور ہر شاعر اُن سے ہی داد چاہتا۔ لیکن وہ جس زاویئے سے ہر شعر پر طنز سے بھر پور فقرے چست کرتے، اُس کو سنتے ہی شاعر بَد حواس ہو جاتا۔ یہ حالت دیکھ کر، میرے سَر سے ہمیشہ کے لئے شاعری کا بھوت اُتر گیا۔ حد تو یہ ہے کہ مشاعرہ ختم ہونے کے بعد سب کے لبوں پر شمیم کا نام تھا۔ جیسے اُنہوں نے ہی اپنے کلام سے مشاعرہ لوٹا ہو۔ اِس واقعہ کے بعد میں کئی بار اُن سے ملنا چاہتا تھا

لیکن ملاقات نہ ہوسکی۔ تین سال بعد میں علی گڑھ چلا گیا۔ شمیم نے وہاں قانون کے شعبے میں داخلہ لیا ہوا تھا۔ اُن کے ساتھ میری پہلی ملاقات یہیں ہوئی اور وہ بھی بہت ہی دلچسپ ماحول میں۔ وہ ایک ڈابے میں کچھ دوستوں کے ساتھ چائے پی رہے تھے، میں نے اُنہیں دیکھا تو میں بھی ''ڈابے'' میں داخل ہوا۔ اور اُن کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنا تعارف کرایا۔ اُنہوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور دوسرے لوگوں کا تعارف مجھ سے کرانے لگے۔

''یہ ہیں پاجامہ صاحب''

''پاجامہ صاحب؟ میں نے حیرت سے دُہرایا۔''

''جی ہاں۔ اِس بھلے آدمی نے کثرت استعمال سے اپنی پتلون کو پاجامہ بنادیا ہے۔ اسلئے......''

یہ سُن کر اُس آدمی کا چہرہ لال پیلا ہوگیا۔ شریف آدمی تھا۔ طنز کا تیر سہہ گیا لیکن مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا آپ کو اپنے دوستوں کا مذاق اُڑانے میں لطف آتا ہے؟'' ''آپ اذیت پسند تو نہیں؟'' اُنہوں نے میری طرف سے غور سے دیکھا۔ اور کہا ''بھائی میرا دوست بنا ہے'' تورات کو پتلون پہنکر کبھی نہیں سونا۔ یہ فقرہ میرے لئے غیر متوقع تھا۔ میرے چہرے کا رنگ پہلے سرخ اور پھر پیلا ہوگا۔

اِس ملاقات کے بعد ہم اکثر ملتے رہے۔ آہستہ آہستہ شمیم کی شخصیت کا جادو مجھ پر چلنے لگا اور اِس کے مختلف پہلو ظاہر ہونے لگے میں اور میرے دوست زندگی کے اُس مرحلے میں تھے، جہاں سوچ، فکر، سنجیدگی کا گذر نہیں ہوتا، بے فکرے تھے کسی چیز پر دھیان نہیں دیتے تھے۔ سیاسی طور تو بالکل نابالغ تھے، جذباتیت کا چکر ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ ''رائے شماری فوراً کرو''۔ کی گونج ابھی ذہنوں میں تازہ تھی۔

کشمیر کا مسئلہ ہمارے لئے ایک جذبہ تھا لیکن شمیم کی قربت نے آہستہ آہستہ ہمیں بڑی بڑی باتوں پر غور کرنے کی طرف راغب کیا۔ اُنہوں نے سنجیدگی کا عنصر ہم میں داخل کیا۔ اُنہوں نے مسئلہ کشمیر اس کی تاریخ اور اس کے ثقافتی ورثے پر جس طرح ہمیں Educate کیا اور اس کی سیاسی، اقتصادی اور جغرافیائی پیچیدگیوں کو سمجھایا۔ اُس سے ہماری نظر میں وسعت، سوچ میں سنجیدگی اور اپروچ میں عقلیت پیدا ہوئی کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اگر شمیم زِندگی کے اِس نازک مرحلے پر ہمیں نہ مِلے ہوتے تو آج ہم ذہنی طور یتیم اور فکری طور نا آسودہ ہوتے۔ علی گڈھ میں اُن کے دوستوں کا حلقہ کافی وسیع تھا۔ وہ یہیں سے ''آئینہ'' کیلئے مواد بھیجتے صبح ساڑھے چار بجے نیند سے جاگ اُٹھتے اور ''آئینہ'' کے لئے خوبصورت تحریریں یہیں جنم لیتیں۔ اُنہوں نے شاید ہی زندگی میں کوئی (Sunrise) نہ دیکھی ہو۔ اُن دِنوں کشمیر میں ''موئے مقدس کی بازیابی'' کی تحریک عروج پر تھی۔ ساری وادی ''سازش کو ننگا کرو'' کے فلک شگاف نعروں سے گونج رہی تھی۔ شمیم نے ''سازش کو کپڑے پہناؤ'' جیسے عنوان سے ساری سازش کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ اِن کی تحریریں، حاضر جوابی تیز فہمی اور طنز سے بھر پور فقرے کبھی کبھی جھگڑوں کا باعث بنتے۔ لیکن وہ کسی بھی جھگڑے کو ایک حد سے زیادہ بڑھنے نہ دیتے۔ کچھ لوگ اُن سے جلتے تھے، رشک اور حسد کی آگ میں جھلستے تھے، وہ اُن کے پیٹھ پیچھے مکروہ پروپیگنڈا کرتے لیکن شمیم نے ہمیشہ ایسے لوگوں کو ایک شان بے نیازی سے نظر انداز کیا۔ وہ وقت کے بہت پابند تھے، اُنہیں وقت کی قدر و قیمت کا صحیح احساس تھا۔ اُن کے پاس ایک ایک منٹ کا حساب تھا۔ اُن کی اس پابندی سے مجھے سخت کوفت ہوتی تھی۔ ایک بار ایک دوست کی شادی تھی۔ میں دس منٹ تاخیر سے پہنچا ہوا۔ بس پھر کیا تھا۔ شمیم

مجھ پر برس پڑے۔ اُنہوں نے آسمان سر پر اُٹھایا۔ میری حالت عجیب ہوگئی۔ مجھے بہت بُرا لگا تھا۔ میں نے حواس پر قابو پا کر جوابی حملہ کر دیا اور پھر شادی کی مجلس سے اُٹھ کر چلا گیا۔ ایک مہینے ہم ایک دوسرے سے بات نہ کر سکے، لیکن شمیم نے دوسرے دوستوں کو اِس واقعہ سے آگاہ کیا اور اُن کی مداخلت سے صلح و صفائی ہوگئی۔

علی گڑھ میں شمیم کے کشمیری دوستوں کا جو حلقہ تھا اُن میں ایک عجیب وغریب کنفیوژن تھا۔ یہ حلقہ شمیم کے سیاسی، مذہبی اور سماجی عقائد کو اچھی طرح سمجھ نہ رہا تھا۔ کوئی اُسے دہریہ سمجھتا تھا تو کوئی مذہبی جنونی، کوئی اُسے سیکولر سمجھتا تھا تو کوئی فرقہ پرست اور ہر بار جب اُن کے اِن عقائد کو ٹٹولنے کی کوشش کی گئی تو اُنہیں اپنے ذہن کی دیواروں میں دراڑیں نظر آئیں اور خود اُن کے اپنے عقائد چور چور ہوتے دِکھائی دیے۔ یہ اُن کی سیمابی طبیعت کا کرشمہ تھا کہ اُن کے عقائد کا ٹھیک ٹھیک پتہ نہیں چلتا تھا۔ وہ مذہب کی روح کو سمجھتے تھے لیکن رسم ورواج کو مذہب نہیں مانتے تھے، میں نے اُنہیں کئی بار سونے سے پہلے تین بار ’’قل اللہ احد‘‘ پڑھتے دیکھا ہے۔

علی گڑھ سے واپسی کے بعد میں ’’آئینہ‘‘ سے منسلک ہوا۔ ’’آئینہ‘‘ کی ۹۸ فیصدی تحریریں خود شمیم کی ہوتی تھیں، ایک دِن اُن کو کئی ہفتوں کے لئے ریاست سے باہر جانا پڑا۔ اُنہوں نے آئینہ میرے سپرد کیا۔ میں اخبار کی ترتیب و تزئین سے بے خبر تھا۔ میں نے ایک مزاحیہ نظم کو پہلے صفحہ پر نمایاں طور شائع کیا اور جب شمیم صاحب واپس آگئے اور اِس نظم کو پہلے صفحہ پر دیکھا تو اُنہوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کے بال نوچ لئے۔ اِسی طرح ایک اداریے میں ایک جملے پر

کشمیر اسمبلی نے میرے خلاف توہینِ اسمبلی کی کارروائی شروع کی۔ میں بہت گھبرایا کہ شاید جیل کی ہوا کھانا پڑے گی۔ لیکن شمیم نے جس تدبر سے اِس معاملے کو نبھایا وہ کسی اور کے بس کی بات ہی نہیں۔ ۱۹۶۷ء میں جب اُنہوں نے شوپیان سے الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا تو میں نے اُنہیں ایسا کرنے سے روکنے کی بہت کوشش کی، لیکن اُنہوں نے یہ کہہ کر میں کشمیر میں Poltical Monotony کو توڑنا چاہتا ہوں، مجھے خاموش کر دیا۔ اُن کا اندازہ صحیح ثابت ہوا اور ۱۹۷۱ء کے پارلیمانی اِنتخاب کے پیچھے بھی یہی جذبہ کارفرما تھا۔ وہ جمہوری قدروں کی بحالی، فرد کی آزادی اور سیاسی اجارہ داری کے خلاف برسرِ پیکار رہے۔ انہیں کشمیری مسلمانوں کی پسماندگی کا احساس تھا لیکن اُن سے جو توقعات وابستہ کئے تھے وہ پوری نہ ہوئیں۔ آل احمد سرور نے کشمیری مسلمانوں کے بارے میں ایک بار لکھا:۔

> ’’کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ مسلمانوں میں بہت سی خوبیاں ہی لیکن کچھ خامیاں بھی ہیں اور ان خامیوں کو دور کرنے کی سعی میں ہی سچی دوستی ہے۔ پہلی خامی تو یہ ہے کہ مسلمان مذہب اور سیاست کو اب تک علحیٰدہ نہیں کر پائے اور مذہب کے نام پر جو لوگ اپنی دکان لگاتے ہیں اپنی سیاست کو فروغ دیتے ہیں اُن کے فریب کو دیکھ نہیں پاتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ بیسویں صدی میں ازمنہ وسطیٰ کے ذہن سے کام چلانا چاہتے ہیں اور رسم ورواج کے بہت سے پہلوؤں کو مذہب سمجھ بیٹھے ہیں۔‘‘

مندرجہ بالا تجزیہ ۱۳ سال پرانا ہے لیکن اتنی مدت گذرنے کے باوجود یہ آج

بھی صحیح ہے۔ کیونکہ اِس عرصے میں سماجی، سیاسی اور اقتصادی محاذوں پر کچھ تبدیلیاں ضرور ہوئی ہیں۔ لیکن تہذیبی اور ثقافتی سطح پر کوئی نمایاں کامیابی نظر نہیں آئی۔ تعلیمی میدان میں کچھ پیش رفت ہوئی ہے لیکن تعلیم یافتہ طبقہ ذہنی طور پوری طرح آزاد نہیں ہوا ہے۔ سب سے زیادہ وہ نسل جو ۱۹۴۷ء کے بعد پروان چڑھی ہے، ذہنی طور ایک اِضطراب اور کشمکش میں مبتلا رہی ہے۔ ملک کی تقسیم نے سب سے زیادہ نقصان اِسی نسل کو پہنچایا ہے۔ تاریخی اعتبار سے یہ نسل ایک پُر آشوب دور سے گزری ہے۔ اِس نسل نے اپنی آنکھوں سے قدروں کے حصار کو ٹوٹتے دیکھا ہے۔ اخلاقی قدروں کی پامالی دیکھی ہے، سیاست کی ریشہ دوانیاں دیکھی ہیں۔ رہبروں کی شکل میں رہزنوں کو دیکھا ہے، فریب، ریاکاری، دغابازی اور جعلسازی کی متواتر کامیابیاں دیکھی ہیں۔ اِس گھناونے ماحول میں جو نسل پَروان چڑھی ہو، اُس کی ذہنی تربیت کیا رہی ہوگی۔ تنگ نظری، فرقہ پرستی، اور توہم پرستی اِسی نسل کے حصے میں آئی ہے۔ شمیم اِسی دور کی نسل کا ترجمان بھی ہے اور آواز بھی۔ اُس کا مشن یہ تھا کہ یہ نسل خودداری، خوداعتمادی اور بے خوفی کا فن سیکھے، وہ اِسے علم اور عرفان کی دولت حاصل کرنے کی ترغیب دے رہے تھے۔ لیکن شمیم کا المیہ یہ ہے کہ وہ جس ذہن، فکر اور سوچ کے مالک تھے۔ اُس کی تشہیر کے لئے اُسے سازگار ماحول نہیں مِلا۔ وہ Audience نہیں ملی جو اُس کے خیالات کی گہرائی اور اِن میں پوشیدہ صالح مقاصد کو سمجھ سکتی۔ اہلِ کشمیر اُسے سمجھ نہ سکے، اس کی قدر و قیمت کا اندازہ نہ کر سکے، وہ اپنوں میں اجنبی ہی رہے۔

وہ ایک صحافی تھے، اور اس حیثیت سے ایک تاریخی ضرورت پورا کر رہے تھے، اُن کا نقطۂ نظر سائینسی تھا۔ اُنہیں تاریخ، فلسفہ، سماجیات اور موجودہ دور کی تیز

رفتار، صنعتی ترقی کا احساس تھا۔ اِسی لئے کبھی کبھی واقعات وحالات پر اُن کا جارحانہ ردِ عمل بڑی بڑی غلط فہمیوں کو جنم دیتا تھا۔ اُس کے ''آئینہ'' کو کئی بار مخصوص مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی کوشش کی گئی لیکن وہ ''آئینہ'' کو اپنے ذہن اور ضمیر کی آواز سمجھتے تھے اور اُنہوں نے ہر اُس کوشش کو ناکام بنا دیا جو اِس جانب کی گئی۔ اِسی لئے اُنہیں وقتاً فوقتاً مختلف اِلزامات سے نوازا گیا۔ کبھی اُنہیں موقعہ پرست کہا گیا کبھی طالع آزما، کبھی ابن الوقت اور کبھی شکست خوردہ، لیکن اُنہیں اپنے اوپر اعتماد تھا، وہ اپنے آپ کو صرف اپنے ضمیر کے سامنے جوابدہ سمجھتے تھے اور دُنیا کی پروا کئے بغیر اپنے مشن کی تکمیل میں مصروف رہے۔ وہ کثرت (Mob) سے خوف زدہ نہیں ہوتے تھے، اُنہیں صحافت اور تجارت کے فرق کا بخوبی علم تھا۔ اُنہوں نے صحافتی رقابتوں کا جس جوانمردی سے مقابلہ کیا وہ کچھ اُن ہی کا حصہ ہے۔ کچھ لوگ اُن سے چڑتے تھے، اُن کی دوستی سے ڈرتے تھے، ایک بار میں نے اپنے ایک مضمون میں اُن کے بارے میں لکھا تھا۔ ''شمیم مرچیں بہت کھاتا ہے۔ اِسی لئے اُن کی طبیعت میں مرچوں جیسی کڑواہٹ ہوتی ہے، کچھ لوگ اُنہیں دیکھ کر ہی چھینکنے لگتے ہیں لیکن جو لوگ اُن سے مانوس ہیں وہ اِس کڑواہٹ کو نگل جاتے ہیں اور اُن کی باتوں کا رس چُوس کر اپنی مٹھاس کا سامان کرتے ہیں۔''

شمیم بے صبر تھے
خود بھی کہا کرتے

I am a young man in Hurry.

اور مرنے میں بھی اُنہوں نے جلد بازی سے کام لیا اور اپنے دوستوں کو رُلاتے ہوئے چھوڑ گئے۔ اُنہیں ابھی مرنا نہیں چاہیئے تھا۔ ......☆☆☆......

جی، این ستھو

حوصلہ مندی کا پیکر

شمیم احمد شمیم اب اس دُنیائے فانی میں نہیں ہیں۔ اُن کی وفات پر بہت لوگوں کی طرح مجھے بھی صدمہ پہنچا ہے۔ اُن کی جُدائی وہ بھی ۴۵ سال کی عمر میں ذاتی طور میرے لئے ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ میں اپنے ایک عزیز دوست اور ایک پیشہ وارانہ رفیق سے ہمیشہ کے لئے جُدا ہوا ہوں۔ اس سانحہ نے کشمیر کو کئی وجوہ سے مفلس تر کر دیا ہے۔

شمیم صاحب متنوع شخصیت کے مالک تھے۔ ایک صحافی جن کے قلم میں سادگی کے باوجود کافی اثر تھا۔ ایک انتھک اور کبھی کبھی ناقابل برداشت نکتہ دان۔ ایک عظیم مقرر' ایک غیر متزلزل نقاد' اور ایک دانشور' ہر کوئی اِس سے واقف ہے اس لئے مشکل ہے کہ اِس شخص کی گونا گوں تفاصیل میں جاؤں۔ ملک کی کئی اور نامور ہستیوں کی طرح اِن میں بھی یہ خصائص تھے۔ ہاں جو بات انہیں ممیز کرتی ہے وہ ہے اُنکی لچک دار سوچ، دلیل اور عقلیت پسندی کے لئے اُن کے دِل میں احترام۔ اُن کی بذلہ سنجی' اور اُن کا آہنی عزم اُن کے طنزیہ مزاج سے کم نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اکثر چھوٹے بڑے اُمور پر اپنے آپ کو اختلافی حالت میں پاتے تھے۔

ایک روز' آج سے کوئی تین سال قبل' میرے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی' میں نے ریسور اُٹھایا۔ ایک جانی پہچانی آواز تھی'' جگرا...... میرے سامنے ''فری تھاٹ' کا ایک شمارہ ہے، جو تم نے مجھے بھجوایا ہے، میں نے اسے پڑھ لیا ہے۔ میرا یقین کرو' کہ مجھے اس کے مواد سے کوئی اتفاق نہیں' اور اس انداز بیان سے جو اس میں اختیار کیا گیا ہے تو بالکل ہی اتفاق نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی تمہیں یقین دلاؤں کہ میں اس کا مطالعہ جاری رکھوں گا اور دلچسپی سے۔ پہلا اِس وجہ سے کہ میں جان لوں ان آراء کو جن کا اِس میں اظہار کیا گیا ہے۔ دوسرے اِس وجہ سے کہ تم کو اس خوش فہمی کا موقعہ نہ دوں کہ میں نے اپنے ذہن و دماغ پر پہرے بٹھائے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ اسے خود پڑھوں گا بلکہ اس کا بھی خیال رکھوں گا کہ کسی کو اس کے مطالعے سے روکا نہیں جاتا ہے'' یہ شمیم صاحب تھے جو اپنے مخصوص انداز میں مجھے اس رسالے کے بارے میں اپنے خیالات سے آگاہ کر رہے تھے، جو مدراس سے شائع ہوتا ہے' جس میں صرف دہریت کا پرچار ہوتا ہے اور جس میں خدا اور خدا رسیدہ لوگوں کو ہدف ملامت بنایا جاتا ہے۔

میں نے یہ واقعہ اس وجہ سے دُہرایا تا کہ شمیم صاحب کی وسیع القلبی کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہ رہے، میں نے سنا ہے کہ وہ الوہیت پر ایمان رکھتے تھے، اگر چہ اُس کا ایقان مختلف نوعیت کا تھا لیکن اس کے باوجود جبکہ مجھے بعد میں معلوم ہوا وہ باقاعدگی سے یہ رسالہ پڑھتے تھے جس میں مسلمہ نظریات کے خلاف توہین آمیز پیرائے میں پرچار ہوتا تھا۔ بظاہر اُن کا یقین والٹر کے اس نظریہ پر تھا۔

''میں تمہارے ایک لفظ سے بھی اتفاق نہیں کرتا لیکن تمہارے اس حق کی خاطر اپنی موت تک لڑوں گا کہ تم اپنی بات آزادی کے ساتھ کہہ سکو۔''

علیل ہونے اور صاحبِ فراش ہونے کے فوراً بعد ہی میں شمیم صاحب کی عیادت کو گیا۔ موت کے گھنیرے سایوں میں بھی وہ بالکل خاموش اور پُرسکون تھے، موت کے یہ سائے کسی بھی وقت اُن کی زندگی لے سکتے تھے۔ میں نے اُن پر علاج ومعالجہ کے بارے میں سوالات کی بوچھاڑ کردی۔ مدہم اور نحیف آواز میں اُنہوں نے کہا۔

''دستھو! اگر تم مجھے صحت مند دیکھنا چاہتے ہو، تو مجھے حکومت کی طاقت کے دو گھونٹ پلا دو''...... کیسی طنزیہ بات، لیکن پھر بھی ایک امر واقعہ، مختصراً اُنہوں نے کہا کہ ''سیاسی اقتدار کئی سیاستدانوں کے لئے زندگی بچانے والی ایک صحت بخش دوائی ثابت ہوا ہے اور انہیں قبر کے دہانے سے واپس لایا ہے۔

اپنی زندگی کی آخری سانس تک شمیم صاحب نے غضب کی حوصلہ مندی کا مظاہرہ کیا۔ جب کبھی میں اُن کی عیادت کو گیا۔ میں یہی عقیدہ لے کر لوٹا کہ موت کا انہیں کوئی ڈر کوئی خوف نہیں، اگر ہوگا بھی، تو وہ کبھی اس کا کوئی اشارہ تک نہ دیتے۔ وہ کبھی اِس جان لیوا بیماری کا ذکر نہ کرتے، ہاں اگر کوئی شخص اس کا تذکرہ کرتا تو چڑ جاتے۔

باوجود یکہ علالت کی وجہ سے کافی نحیف اور لاغر تھے، لیکن پھر بھی شمیم صاحب ذہنی طور ہمیشہ کی طرح چوکس تھے، اور یہ بات شک سے بالاتر تھی کہ اُنکی ذہنی صلاحیتیں کسی بھی طرح متاثر نہیں ہوئی تھیں اور ہر وقت بالکل ٹھیک حالت میں تھیں۔ موت سے چند دن قبل میں اُن سے ملنے گیا۔ وہ بالکل ٹھیک نہیں تھے، قرینے سے سجے ہوئے کمرے میں داخل ہوا، تو تھوڑی ہی دیر میں اُنہوں نے مجھ پر ایک نظر ڈالی اور ایک طنزیہ انداز میں مجھ سے پوچھ بیٹھے۔ ''کیا بزاز کو ہندوستان پر

منڈلا رہے رام راج کے بھوت کے سوا کچھ اور دکھائی نہیں دیتا''۔ یہ حوالہ تھا پریم ناتھ بزاز کی ایک حالیہ کتاب ''ہند میں رام راج کے سائے'' کا اس کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہندوستان میں زندگی کے ہر شعبہ...... سیاسی، سماجی اور اقتصادی...... پر رام راج کے فرسودہ اور تنگ نظر خیالات کی گہری چھاپ ہے۔ جن کا ذکر تلسی داس کی رام چرتر مانس میں ہے اور جن کی تبلیغ گاندھی نے کی۔ مجھے بتایا گیا کہ چوں کہ شمیم صاحب سخت علیل تھے، اس لئے وہ اس کتاب کا گہرائی سے مطالعہ نہ کرسکے اور صرف طائرانہ نظر ہی ڈال سکے۔ بظاہر تیز ذہانت کی بدولت شمیم صاحب نے کتاب کے مرکزی خیال کا احاطہ کیا۔ ظاہر ہے کہ اُنہوں نے سوچ لیا کہ بزاز نے اس جانب کوئی توجہ نہ دی کہ ملک بھر میں ایک متوازی نظریہ تقویت پارہا تھا جو فرسودہ خیالات کے خلاف ایک بغاوت تصور کیا جاسکتا ہے جو ملک کے لئے اُمید افزا ہے۔

شمیم صاحب ان سے بھی زیادہ اوصاف کے حامل تھے۔ میں اپنے تئیں اور شمیم صاحب پر انصاف نہیں کروں گا، اگر میں نہ کہہ دوں کہ آخری ایام میں وہ ایک متضاد شخصیت بن گئے تھے، اُن کا تضاد خاص کر اُن کے اس کردار میں ظاہر ہوتا ہے، جس میں وہ شیخ عبداللہ اور اُن کے دورِ حکومت کے سب سے بڑے مخالف کے رُوپ میں ظاہر ہوتے ہیں۔

آج سے چار ہی سال قبل شمیم صاحب نے شیخ صاحب کی وکالت زوردار پیرائے میں کی تھی۔ اُنہوں نے اِس کشمیری رہنما کے تمام خصائص پر آتشِ بیانی سے کام لیا، اور انہیں کشمیریوں کے واحد اور غیر متنازعہ رہنما کے روپ میں پیش کیا۔ اُنہوں نے بہت سے اشخاص کے ساتھ حتیٰ کہ اپنے چند گہرے دوستوں کے

ساتھ بھی جنھوں نے ایک یا دوسری وجہ سے شیخ پر تنقید کی تھی، جھگڑے کئے اور اُن کی تنقید کو اس ذاتی عناد سے تعبیر کیا، جو انہیں کشمیری رہنما سے تھا۔

لیکن اچانک حالات کا رُخ بدل گیا اور شمیم صاحب، شیخ عبداللہ اور اُن کی حکومت کے شدید ترین مخالف کے رُوپ میں ظاہر ہوئے، اُنہوں نے اپنے سابقہ ہیرو کی تنقیص اور تنقید میں اپنے اسلوبِ تحریر کی تمام صلاحیتیں بروئے کار لائیں اور اُنکی اپنی اور اس کی حکومت کی غلط کاری کا پردہ چاک کیا، اور ماننا پڑے گا کہ انھوں نے یہ کام نہایت ہی پُر اثر انداز میں کیا۔

شمیم صاحب کے دوست حیران ہوئے، پہلے پہل تو وہ اپنے مخصوص انداز میں ہر اس مطالبہ کو ٹھکراتے جو شیخ عبداللہ کے بارے میں اُن کی اچانک اور تعجب انگیز تبدیلی کے بارے میں ہوتا۔ لیکن بعد میں اُنہوں نے ایک دن کہہ ہی دیا کہ "یہ ایک بالکل معمولی بات پر شروع ہوا اور معمولی باتیں بھی کبھی کبھار تاریخ کا رُخ موڑ دیتی ہیں۔ میں خوش ہوں کہ ایسا ہوا، کیوں کہ اس نے میری آنکھوں سے پردے ہٹائے اور مجھے دُنیا کے اس حصے میں شخصیات اور معاملات کے بارے میں بہتر جانکاری دی"۔

اس کا کیا مفہوم ہے؟ میں یہ فیصلہ قارئین پر چھوڑتا ہوں......

............☆☆☆............

پروفیسر حامدی کاشمیری

شمیم احمد شمیم

زمانے کے آتش بیانوں میں تھا

شمیم احمد شمیم کے انتقال سے نہ صرف وادیٔ کشمیر میں بلکہ پورے ملک میں غم کی ایک لہر دوڑ گئی ہے۔ کسی شخص کا اتنی کم عمری میں اپنی خداداد ذہانت اور لیاقت سے ملک کی ادبی اور صحافتی سطح پر ایک نمایاں مقام پیدا کرنا معمولی بات نہیں۔ شمیم صاحب واقعی اپنے لئے ایک نمایاں مقام پیدا کر چکے تھے اور یہ تو ابھی اُن کا آغاز سفر تھا۔ اُن کے بے پایاں عزم، ولولے اور حوصلے کو دیکھ کر یہ سوچنا غلط نہ تھا کہ وہ ستاروں کے آگے کے جہانوں پر نظر رکھتے ہیں۔

اہلِ کشمیر صدیوں سے غلامی اور افلاس کے ہاتھوں اپنی شخصیت اور وجود کی قوتوں کا احساس کرنے سے محروم رہے ہیں۔ موجودہ دَور میں شمیم احمد شمیم میں مجھے ایک ایسا نوجوان نظر آیا تھا جو جرأت فکر اور جرأت گفتار سے کام لے کر کشمیر کی "زرخیزی" اور "تردماغی" کا زندہ پیکر بن کر اُبھرے گا وہ جس محفل میں محوگفتار ہوتے

تھے،کوئی دوسرا اجرأت سخن نہیں کرتا تھا۔

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے   جاں کالبد صورت دیوار میں آوے

شمیم صاحب کی موت سے پورے ملک نے اور خاص کر اہل کشمیر نے ایک مایہ ناز فرزند سے ہاتھ دھویا ہے مجھے شخصی طور پر بھی اُن کی جواں مرگی کا غم ہے وہ طالب علمی کے ایام سے ہی میرے دوست تھے میرے عزیز!

خوش درخشید ولے شعلہ مستعجل بود

............☆☆☆............

خلیق انجم

خاکہ نگار۔ شمیم

اچھا خاکہ وہی ادیب لکھ سکتا ہے جو غیر معمولی طور پر ذہین ، حساس، باشعور، دانشور، انسان دوست اور انسانی نفسیات کا ماہر ہونے کے ساتھ فکر و شعور کی سطح پر اس میں ایک دانشورانہ آن بھی ہو۔ یہی نہیں وہ ایک گہرا سماجی، سیاسی شعور بھی رکھتا ہو۔ تخلیقی جو ہر کا مالک ہو اور اُسے زبان پر نہ صرف غیر معمولی قدرت حاصل ہو۔ بلکہ صاحبِ طرز بھی ہو۔ خاکہ نگاری اِس اعتبار سے ایک پیچیدہ معاملہ ہے۔ خاکہ نگار کسی شخصیت کو ہمارے سامنے پوری طرح بے نقاب تو کرتا ہے لیکن اس طرح کہ اُس شخصیت کی حُرمت اور احترام بھی باقی رہتا ہے اور ہمیں تمام خرابیوں کے باوجود اس شخص سے ہمدردی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ شمیم احمد شمیم انجمن ترقی اُردو (ہند) کے کارکن بھی رہے تھے۔ اسی لئے جب وہ دلّی آتے تو اُردو گھر ضرور تشریف لاتے۔ کسی مصروفیت کی وجہ سے اُردو گھر نہ آسکتے تو ٹیلی فون پر ہی بات کرتے۔ اُن کی شخصیت کے ایک پہلو نے ہمیشہ مجھے متاثر کیا اور وہ پہلو یہ تھا کہ وہ کشمیر اور اس کی فلاح و بہبود کے علاوہ کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتے۔ شمیم صاحب نے شیخ عبداللہ کا بہت دلچسپ خاکہ لکھا ہے۔ اس کا درج ذیل اقتباس

ملاحظہ ہو:

"لیکن ایک بات جس پر ان کے دوست دشمن سبھی متفق ہیں۔ وہ ہے اُن کی حب الوطنی، اُنھیں کشمیر سے بے پناہ عشق ہے۔ وہ کشمیر کی خاطر ساری دنیا کی بادشاہی کو بھی ٹھکرا سکتے ہیں اور اُن کی ساری زندگی اس عشق کی تفسیر ہے یہ اُن کی بہت سی کمزوریوں اور نامرادیوں کا منبع بھی ہے اور اُن کی بے پناہ قوت کا خزینہ بھی۔ ۱۹۳۱ء کی صبح سے لے کر ۱۹۶۹ء کی شام تک اُن کی زندگی کے ایک ایک لمحے کا حساب کیجئے تو اندازہ ہوگا کہ اُن کی ہر سانس کشمیر کے غم، اس کے دُکھ درد اور اس کی خوشبو سے عبارت ہے اور یہی خصوصیت اُنھیں دیگر کشمیری رہنماؤں سے بلند اور ممتاز کر دیتی ہے۔ شیخ صاحب کی فتوحات کی فہرست مرتب کیجئے یا اُن کی ناکامیوں کی تفصیلات، ہر عنوان کے تحت کشمیر سے ان کی بے پناہ محبت اور عقیدت کا احوال مل جائے گا۔"

شمیم صاحب نے شیخ عبداللہ کی کشمیر سے بے پناہ محبت کے بارے میں جو کچھ لکھا، اُس کے ایک ایک لفظ کا اطلاق خود اُن پر بھی ہوتا ہے۔ شمیم صاحب سے میری گھنٹوں بالمشافہ باتیں ہوتی یا ٹیلی فون پر چند منٹ، دونوں صورتوں میں یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ کشمیر، اس کی سیاست اور وہاں کے سیاست دانوں، کشمیر کی اقتصادی، تعلیمی اور سماجی حالات کے بارے میں کوئی بات نہ کرتے۔ بعض اوقات یہ باتیں بہت دلچسپ ہو جاتیں۔ مین نے ایک دفعہ اپنی کسی بات پر زور دینے کے لئے غالب کا ایک شعر پڑھا۔ شمیم صاحب نے پہلے غالب کے شعر کی داد دی، میری بات کا جواب دیا اور پھر کہنے لگے آپ کو معلوم ہے کہ غالب کی والدہ کشمیری تھیں۔

غالب کے نانا خواجہ غلام حسین خاں کمیدان کشمیری النسل تھے۔ یہ غالباً خواجہ ہمدانی کے خاندان سے تھے میں نے ہنستے ہوئے کہا تھا کہ شمیم صاحب کبھی تو کشمیر سے باہر بھی آ جایا کیجئے۔

کشمیر کے مسئلے پر میں انھیں اکثر چھیڑتا، وہ میری بات ہنس کر ٹال دیتے مگر بات بات پر کشمیر کا ذکر کرتے ضرور۔

میں آج بھی سوچتا ہوں کہ بہت کم لوگ ہوں گے، جنھیں اپنے وطن سے ایسا خلوص اور محبت اور جن کی زندگی کا مقصد ہی اُن کا اپنا وطن ہو۔

کشمیر میں جب بھی کچھ ایسا ہوتا جس کا کشمیریوں پر بُرا اثر پڑتا اس کا شمیم صاحب کے دل و دماغ پر بہت گہرا اثر پڑتا اور وہ موقع بے موقع کشمیریوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کا ذکر ضرور کرتے۔

شمیم صاحب عرصے تک سیاستدانوں سے قریب رہ کر اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر وہ کشمیر کی فلاح چاہتے ہیں تو انھیں کشمیر کے سیاستدانوں اور سرکاری افسروں کے لئے آئینہ سازی کا کام کرنا پڑے گا تاکہ یہ حضرات آئینے میں اپنی شخصیت اور کردار کو خود بھی دیکھ سکیں۔

وہ اس مقصد کے لئے "آئینہ" نام سے ایک ہفت روزہ جاری کرنا چاہتے تھے۔ مگر مالی وسائل اجازت نہیں دیتے تھے۔ غالباً ۱۹۶۷ء میں وہ اس قابل ہوئے کہ یہ ہفت روزہ جاری کر سکیں۔ اس کے پہلے شمارے کے اداریے کا آغاز اس فقرے سے ہوتا ہے۔ "آئینہ میرے دیرینہ خواب کی تعبیر ہے۔" چونکہ آئینہ ایک خاص مقصد کے لئے جاری کیا گیا تھا۔ روپے کمانے کے لئے نہیں۔ اس لئے ابتدا ہی سے اس کا ایک خاص مزاج بن گیا تھا۔ بہت جلد "آئینہ" نے کشمیر کی سرحد سے

باہر نکل کر پورے ہندوستان میں شہرت اور مقبولیت حاصل کرلی اور بہت جلد ''آئینہ'' اور اُس کے ایڈیٹر شمیم احمد شمیم نے اردو صحافت میں اپنی شناخت بنالی۔

اچھا خاکہ لکھنے کے لئے ادیب میں جو صلاحیتیں ہونی چاہئیں، وہ سب اُن میں تھیں۔ شمیم مرحوم ایک غیر معمولی شخصیت کے حامل تھے۔ وہ ممتاز ادیب اور اعلیٰ درجے کے صحافی تھے۔ اگر کبھی اُردو صحافت کی تاریخ ایمانداری سے لکھی گئی تو شمیم صاحب کا نام اُن صحافیوں میں شامل ہوگا جنھوں نے اُردو صحافت کی تاریخ میں اپنے لئے ممتاز ترین مقام بنایا ہے۔ شمیم ایک غیر معمولی ذہین انسان تھے۔ کشمیر اور پورے ہندوستان کی سیاست پر جن چند لوگوں کی بہت گہری نظر تھی، اُن میں شمیم احمد شمیم بھی شامل تھے۔ کم عمر ہونے کے باوجود مرحوم سیاست کے نشیب و فراز اور سیاست کا کھیل کھیلنے والوں کی شخصیت پر بہت گہری نظر رکھتے تھے۔ انھیں اُردو نثر لکھنے کا جو سلیقہ تھا وہ کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔ اُن کی خاکہ نگاری کے بارے میں کچھ عرض کرنے سے پہلے اُن کی شخصیت کے بارے میں چند باتیں اور عرض کردوں۔

اپنے اُن بزرگ ہم عصروں کو جو دنیا سے چل بسے ہوں، خاکہ لکھنا نسبتاً آسان رہتا ہے۔ بعض خاکہ نگار اُن شخصیتوں کو اپنے طنز و مزاح کا ہدف بناتے ہیں اور اُن کے بارے میں انتہائی مضحکہ خیز باتیں بھی کرتے ہیں۔ مرحومین کے بارے میں کچھ بھی لکھا جا سکتا ہے، کیوں کہ ایسی صورت میں خاکہ نگار سے کوئی جواب طلب کرنے والا یا جھگڑا کرنے والا نہیں ہوتا ہے۔ رفتگاں کا خاکہ لکھنے والے کی مثال ایک ایسے شکاری کی ہوتی ہے جو ایک کمین گاہ میں چھپ کر شیر پر گولیاں چلاتا ہے۔ ایسی صورت میں شیر گولی چلانے والے کو جواب نہیں دے سکتا۔ اس کی مثال

ایک ایسے پہلوان کی بھی ہے جو اپنے دشمن کے ہاتھ پیر بندھوا کر ڈال دیتا ہے اور اُس بندھے ہوئے انسان پر مکّوں اور لاتوں سے اپنی طاقت کا اظہار کرتا ہے اور پھر دادطلب نگاہوں سے ناظرین کی طرف دیکھتا ہے۔

اس کے برعکس معاصرین کا خاکہ لکھنا بہت دشوار کام ہے۔ کیوں کہ خاکہ نگار جو کچھ لکھتا ہے، اُس کے ایک ایک لفظ کا اُس کو جواب دینا پڑتا ہے۔ جس شخص کا خاکہ لکھا گیا ہے، وہ جواب مانگتا ہے اور اگر صاحبِ اقتدار ہے تو خاکے میں تلخ اور سچی باتیں کہنے کا جواب اپنے اقتدار کے ذریعے دیتا ہے جیسا کہ شمیم مرحوم کے ساتھ پیش آیا۔ بعض اوقات جس کا خاکہ لکھا گیا ہے، اُس کے ہمدرد اور مداح بھی جواب طلبی میں شامل ہوجاتے ہیں۔ میں یہاں ایک مثال دینا چاہتا ہوں۔ بہت عرصہ پہلے میں نے مولانا انور صابری مرحوم کا کا خاکہ لکھا تھا۔ میں مولانا کا پہلے مداح تھا اور آج بھی ہوں۔ میں نے خاکے میں مولانا کی خوبیاں اپنے انداز میں بیان کی تھیں لیکن میں نے ایک اچھا خاکہ نگار بننے کی کوشش میں مولانا کی شخصیت کے کچھ کمزور پہلوؤں کی طرف اشارہ کردیا۔ جب وہ خاکہ پاکستان کے ماہنامہ ''ساقی'' میں شائع ہوا تو مولانا کے معتقدوں اور مداحوں میں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ میرے خلاف ایک زبردست مہم چلائی گئی۔ میں چوں کہ اس وقت کم عمر تھا، اس لئے میرے سامنے مولانا کے مریدوں کے آگے جھکنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا بلکہ لکھ کر معافی مانگنی پڑی۔ میری حالت گلیلیو کی سی تھی جس نے انکشاف کیا تھا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ اور چوں کہ یہ بات چرچ کے عقائد کے خلاف تھی اس لئے اسے پکڑ کر چرچ میں لے گئے اور بہت سے صاحب اقتدار لوگوں نے مل کر اُسے سخت سزا کی دھمکی دی۔ گلیلیو کے سامنے معافی مانگنے

کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔ معافی مانگنے پر اسے چھوڑ دیا گیا۔ جب وہ چرچ سے باہر آیا تو آسمان پر چمکتے ہوئے سورج پر اس کی نظر پڑی تو اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا ''کیا کروں زمین تو سورج گرد گھومتی ہے۔'' میرا بھی یہی حال تھا۔

دو سال تک شمیم احمد شمیم صاحب بڑی پابندی سے کشمیر کی سیاسی اور کچھ ادبی شخصیتوں کے خاکے لکھتے رہے۔ اگر چہ ان شخصیات کا تعلق کشمیر ہی سے تھا، لیکن صرف کشمیر ہی میں نہیں بلکہ کشمیر سے باہر بھی خاکوں کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ شمیم صاحب نے جن لوگوں کے خاکے لکھے ہیں۔ ان کا تعلق زندگی کے مختلف شعبوں سے تھا۔ ان میں اہم اور غیر اہم سیاسی لیڈروں کے علاوہ سرکاری ملازم، صحافی اور ادیب سبھی طرح کے لوگ شامل تھے۔ شمیم صاحب کی یہ کوشش تھی کہ وہ ایسے لوگوں کے خاکے لکھیں گے جو سیاسی، سماجی اور ادبی زندگی میں اپنے لئے کوئی مقام بنا چکے ہیں اور جو کشمیر کی سیاسی، سماجی، اقتصادی، تعلیمی اور ادبی زندگی کے بہاؤ کی سمت متعین کرتے ہیں۔ یہ سمت منفی ہو یا مثبت۔

انہوں نے چھوٹے اور بڑے میں کوئی فرق نہیں کیا۔ انھیں جس کی شخصیت نے متاثر کیا، اس کا خاکہ لکھ دیا۔ مولوی عبدالحق اُردو کے بہت ممتاز خاکہ نگار تھے۔ انھوں نے ایک طرف تو حالی، مولانا محمد علی، پروفیسر مرزا راحت، خواجہ غلام الثقلین کے خاکے لکھے ہیں تو دوسری طرف ایک معمولی سپاہی نور خان اور ایک مالی نام دیو مالی کے خاکے لکھے گئے۔ عام خیال ہے کہ مولوی صاحب کے یہ دونوں خاکے بہت اچھے ہیں۔ اسی طرح شمیم صاحب نے بھی یہ نہیں دیکھا کہ کسی کی شخصیت بلند ہے۔ انھوں نے تو یہ دیکھا کہ کون ایسا ہے، جس کی شخصیت کے مثبت یا منفی پہلو۔ انسانی سماج اور بالخصوص کشمیر کو متاثر کرتے ہیں۔

۱۹۶۹ء میں انھوں نے '' آئینہ نما'' کا شخصیات نمبر شائع کیا، جس میں چونتیس خاکے شامل تھے۔ یہ سب خاکے شمیم صاحب کے زورِ قلم کا نتیجہ تھے۔ اس میں ایسے خاکے بھی ہیں جو پہلے ہفت روزہ '' آئینہ'' میں شائع ہو چکے تھے اور کچھ ایسے خاکے بھی جو انھوں نے اس خاص نمبر کے لئے لکھے تھے۔ شمیم صاحب ایک سچّے، کھرے اور ایماندار انسان تھے۔ انھوں نے اپنی خاکہ نگاری کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، اس سے بہتر میں نہیں کہہ سکتا۔ لکھتے ہیں۔

'' یہ خاکے نہ سوانح حیات کا درجہ رکھتے ہیں اور نہ عدالتی فیصلوں کا۔ ان میں افراد کے کارناموں سے زیادہ ان کی شخصیت اور کردار کی نمایاں خصوصیات کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن کو میری نگاہ میں ان کے عناصر ترکیبی کی حیثیت حاصل ہے اور ظاہر ہے کہ اس میں میری پسند اور ناپسند کا بڑا عمل دخل رہا ہوگا۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے۔ ایمانداری سے لکھا ہے۔ لیکن ایمانداری بھی ایک اضافی قدر ہے اور اس لئے مجھے اس کا دعویٰ نہیں کہ ہر فرد کے متعلق میری رائے بالکل صحیح اور میرا تجزیہ بالکل ایماندارانہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض شخصیات کے بارے میں، میں نے ذہنی تشدد کا مظاہرہ کیا ہو۔ اس کے بہت سے سیاسی اور نفسیاتی اسباب ہیں۔ ۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۵ء تک کا زمانہ میرے لئے بغاوت، برہمی اور بیزاری کا زمانہ تھا اور میں ہر اُس بُت کو توڑنے کے لئے کوشاں تھا کہ جس کو بخشی صاحب کے دور استبداد میں اقتدار کے مندر میں جگہ مل گئی تھی اور اس لئے اس دور کی بہت شخصیات کے متعلق میرا رویّہ بے حد جارحانہ بلکہ دشمنانہ تھا۔ لیکن بعد کے واقعات

نے ثابت کردیا کہ نئے دور کے فرعون پرانے دور کے فرعونوں سے
زیادہ مختلف نہیں۔ان میں صرف اسٹائل کا فرق ہے۔"

شمیم صاحب نے جن لوگوں کے خاکے لکھے گئے ہیں مثلاً شیخ محمد عبداللہ، خواجہ غلام محمد صادق، مرزا افضل بیگ،مولانا مسعودی، سیّد میر قاسم وغیرہ اور دوسرے درجے کے ایسے سیاست داں بھی، جن کے ممکن ہے،ہم نے نام سے تو ہوں لیکن ان کے سیاسی اور سماجی کارناموں سے واقف نہیں ہیں اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کے نام اور کارناموں دونوں ہی سے ہم واقف نہیں ہیں مثلاً مختار صاحب، زُتشی صاحب، تب جی، شیونرائن فوطیدار، کارصاحب، موتی لال مصری صاحب، ان کے علاوہ شمیم صاحب نے کشمیری اور اُردو کے شاعروں کے بھی خاکے لکھے ہیں۔ان میں بنسی نردوش، حاجنی صاحب اور دینا ناتھ نادم وغیرہ ہیں۔ غلام رسول سنتوش کشمیر کے بہت اہم مصوّر تھے۔ شمیم صاحب نے سیاسی رہنماؤں، سرکاری ملازموں، اخبار نویسوں، ادیبوں اور شاعروں کے خاکے لکھے ہیں۔جن شخصیتوں نے منفی یا مثبت انداز میں ان کے ذہن کو متاثر کیا اُس کا انھوں نے خاکہ لکھا ہے۔

مجھے شمیم صاحب کے خاکوں میں سب سے اچھا خاکہ وہ لگا ہے جو شمیم صاحب کے نام سے خود اپنے آپ پر لکھا ہے۔ چوں کہ وہ ایک صحافی اور سیاست داں تھے اور کشمیر کی بعض اہم شخصیتوں مثلاً شیخ عبداللہ، بخشی غلام محمد وغیرہ سے بہت قریب رہے تھے۔ اس کے علاوہ خود اُن کا مزاج ایسا تھا کہ وہ ہر وقت باغیانہ باتیں کرتے تھے اور پھر اُن کا معیار اتنا بلند تھا کہ اس پر بہت کم لوگ پورے اتر پاتے ہے اور چوں کہ ان میں قوّتِ برداشت نہیں تھی اور بقول خود ان کے وہ

بہت منہ پھٹ تھے اور بعض اوقات گستاخی کی حدوں کو پار کر جاتے تھے۔ان کی شخصیّت بہت متنازعہ تھی لیکن ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اگر دوسروں کے بارے میں وہ سچی اور کھری باتیں کہا کرتے تھے تو خود اپنے بارے میں بات کرتے ہوئے بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے۔ان کے مخالف جو اُن کے بارے میں کہا کرتے تھے، اُسے اُنھوں نے اپنے خاکے میں خاصے مبالغے کے ساتھ مزے لے کر لکھا ہے۔خاکے کی ابتداء ہی بہت دلچسپ ہے۔ شمیم صاحب اپنے بارے میں لکھتے ہیں:

"وہ بڑا بے ایمان ہے۔"
"وہ ایک نمبر کا فراڈ ہے۔"
"وہ باتوں کا سوداگر ہے۔"
"وہ بڑا منہ پھٹ اور گستاخ ہے۔"

شمیم احمد شمیم کے متعلق بہت دیر تک ایک ہی رائے پر قائم رہنا ذرا مشکل ہے۔اس کی شخصیت بیک وقت اتنی متضاد اور مختلف کیفیات کی حامل ہے کہ اس کا مطالعہ کرنے والے کو ہر قدم پر اپنی رائے میں ترمیم اور تصحیح کی ضرورت محسوس ہوگی۔ میں اس کے بارے میں جو کچھ کہوں گا۔وہ اسی حد تک صحیح ہے کہ اس خاکے کے مکمل کرنے تک میری اس کے متعلق رائے ہے، ہوسکتا ہے کہ اس کے مکمل ہونے کے فوراً بعد مجھے یہ احساس ہوجائے کہ یہ ہر لحاظ سے نامکمل ہے۔"

شمیم صاحب نے جب ہوش سنبھالا اور ملازمت کی تلاش میں نکلے تو بخشی غلام محمد کے دربار میں ان کی رسائی ہوگئی اور وہ بخشی صاحب کے بہت قریب ہوگئے۔ بخشی صاحب نے انھیں کشمیر کے سرکاری رسالے "تعمیر" کا ایڈیٹر مقرر کردیا۔

یہ واقعہ بیان کرکے شمیم صاحب نے اپنے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ لکھنے سے پہلے ان کا بدترین دشمن بھی کئی بار سوچتا لیکن شمیم صاحب کا رسالہ ہی ''آئینہ'' نہیں تھا، ان کی تحریر بھی آئینہ تھی۔ اُن کے دل و دماغ میں کچھ ہوتا اس کا بھرپور عکس اس آئینہ میں دکھائی دیتا۔

''ان دنوں شمیم احمد بخشی صاحب کی ناک کا بال تھے۔ بخشی غلام محمد کی سیاسی بدعنوانیوں کے لئے اخلاقی جواز تراشنا، ان کی زیادتیوں کو سیاسی جنگ کی اخلاقیات قرار دینا۔ ان کی خامیوں کو علیت کا معیار ثابت کرنا اور ان کی ذات کو کشمیر کی نجات سے تعبیر کرنا شمیم صاحب کا محبوب مشغلہ تھا۔ ان ہی دنوں بخشی اور صادق کشمکش اپنے نقطۂ عروج پر تھی اور بخشی صاحب نے صادق صاحب کی اینٹوں کا جواب پتھروں سے دینے کے لئے ''حقیقت'' نام کا ایک ہفت روزہ جاری کردیا تھا۔''

''ایک روایت کے مطابق صادق صاحب اور ان کے ساتھیوں کے خلاف اس ہفت روزے میں جتنی دشنام طرازی ہوا کرتی تھی وہ سب شمیم صاحب کے زورِ قلم کا نتیجہ ہوا کرتی تھی اور شمیم صاحب اپنی وفاداریوں کا یقین دلانے اور اُن کا معاوضہ حاصل کرنے کے لئے بخشی صاحب کے مخالفوں پر ہر پہلو سے وار کیا کرتے تھے۔ بعض سیاسی مبصرین کا کہنا ہے کہ ''ترقی پسندوں'' کی منظم جماعت کلچرل کانگریس میں انتشار اور پھوٹ پیدا کرنے کا کارنامہ بھی ان ہی کے ہاتھوں انجام دیا گیا۔ شمیم صاحب کی ان ہی خدمات کے عوض میں انھیں سرکاری جیپ کا ناجائز استعمال کرنے کی مکمل اجازت دی گئی تھی۔

پھر ایک دن خبر آگئی کہ بخشی غلام محمد کو شمیم صاحب کی وفاداریوں پر شبہ ہو گیا ہے۔ کافی ہاؤس اور کئی اور مقامات پر شمیم نے کچھ ایسی باتیں کہی ہیں جن سے بغاوت اور نافرمانی کی بُو آتی ہے اور بخشی صاحب شمیم سے بے حد ناراض ہیں۔ شمیم صاحب سے ان کی سرکاری جیپ چھین لی گئی اور وہ مستعفی ہوکر علی گڑھ کو روانہ ہوگئے۔''

بہت سے ایسے لوگ ہیں جو شہرت اور مقبولیت کے پیچھے رہتے ہیں۔ اگر وہ کوئی اخبار نکالتے ہیں تو وہ اخبار ان کی ذاتی پبلسٹی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ لیکن اس طرح کے لوگ اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے۔

یہ شمیم احمد شمیم کی غیر معمولی عظمت ہے کہ وہ اس کمزوری کا شکار تھے لیکن انھوں نے اس کا ایمانداری اور کھُلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ انھوں نے خاکے میں اپنے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ ایسا ہی شخص لکھ سکتا ہے جو اپنے مخالفین سے خائف نہیں ہوتا۔ ان کی خود اپنے بارے میں یہ تحریر ملاحظہ ہو:

''اس میں تعمیر کی بے پناہ صلاحیتیں ہیں، لیکن اس نے اپنی تمام قوتیں تخریب میں صرف کر رکھی ہیں۔ وہ سیاسی دنیا کا سعادت حسن منٹو ہے، جو چونکا دینے پر یقین رکھتا ہے۔ آپ شمیم سے نفرت کرسکتے ہیں اس کو گالی دے سکتے ہیں، لیکن آپ اسے نظر انداز نہیں کرسکتے۔ وہ اپنی شخصیت کو منوانے کا گُر جانتا ہے اور جب سے وہ اسمبلی کا ممبر بن گیا ہے۔ اس نے اپنے اخبار ''آئینہ'' کو اپنی ذات کا اشتہار بنا دیا ہے اور اسی لئے مشہور اردو مصنف ظ۔ انصاری نے ''آئینہ'' کو شمیم صاحب کی ذہنی صحت کا بلیٹن یا ان کی ''صحیح بخاری'' قرار دیا ہے۔ عام لوگ ''آئینہ''

کو شمیم گزٹ اور شمیم نامہ کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ کیوں کہ پچھلے دو تین سال سے اس میں شمیم صاحب کی تقریریوں ان کی مصروفیات اور ان کے لطائف کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔"

شمیم صاحب میں ایک اچھا ادیب بننے کی صلاحیتیں موجود ہیں لیکن ادب چوں کہ زیادہ ریاض، لگن اور توجہ چاہتا ہے، اس لئے شمیم صاحب نے اپنے لئے صحافت کا راستہ اختیار کیا ہے۔"

شمیم صاحب شخصیتوں کا بہت قریب سے مطالعہ کرتے ہیں اور ان کی خوبیوں اور خرابیوں کا بے خوف ہو کر اظہار کر دیتے ہیں۔ خواجہ غلام محمد صادق کے خاکے میں انھوں نے خواجہ صاحب کی خوبیاں بھی دل کھول کر بیان کی ہیں اور اُن کی خامیوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس خاکے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

" فائدہ یہ کہ انھیں اپنی سیاسی زندگی کے آغاز میں ہی وہ عزت و توقیر اور منصب حاصل ہو گیا کہ جس کے لئے بخشی غلام محمد اور قبیل کے دوسرے رہنماؤں کو غیر معمولی جدوجہد کرنا پڑی۔ تحریک آزادی کے سرکردہ رہنماؤں میں سے وہ غالباً سب سے کم مدت کے لئے جیل گئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ اہم اور تاریخی منصبوں پر فائز رہے ہیں۔ ان کی کم آمیزی اور سنجیدگی کی عادت نے انھیں نوجوانی ہی میں بزرگ بنا دیا۔ لیکن اس سے نقصان یہ ہوا کہ صادق صاحب کبھی عوام سے براہِ راست تعلق پیدا نہ کر سکے۔ وہ عوامی زندگی کے آداب اس کے تقاضوں اور اس کے زیر و بم سے ہمیشہ نا آشنا رہے۔ انھیں لوگوں کی عزت تو حاصل ہو گئی۔ لیکن وہ ان کی محبت سے محروم رہ گئے۔

عوامی مقبولیت حاصل کرنے کے لئے عقیدت کی بلندیوں سے نیچے آ کر کبھی کبھی ذہن اور ضمیر کے ساتھ نا انصافیاں بھی کرنا پڑتی ہیں۔ صادق صاحب نے ان بلندیوں سے نیچے آنے کی کبھی زحمت ہی گوارا نہیں کی۔ اس بے نیازی بلکہ سرد مہری کے لئے انھیں بہت بڑی قیمت ادا کرنا پڑی ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اتنی بڑی قیمت ادا کرنے کے باوجود وہ آج بھی اپنی روش بدلنے کو تیار نہیں۔"

پچھلے تیس بتیس سال میں اُردو میں خاکہ نگاری کے فن، اس کے آغاز و ارتقاء پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن کسی ادیب یا نقاد نے خاکہ نگار کی حیثیت سے شمیم احمد شمیم کا ذکر نہیں کیا جس کی وجہ صرف یہ ہے کہ شمیم صاحب کے تمام خاکے ہفت روزہ " آئینہ" میں دبے پڑے تھے۔ ان کی چھوٹی بہن قرۃ العین کو تیس بتیس سال بعد خیال آیا لیکن خدا کا شکر ہے کہ خیال تو آیا۔ اُنھوں نے ہر سال " آئینہ نما" کے نام سے شمیم صاحب کے مضامین آٹھ جلدوں میں مرتب کر کے شائع کئے ہیں جو شمیم صاحب نے کشمیر کی سیاسی، سماجی اور تعلیمی موضوعات پر لکھے تھے " آئینہ نما" کے یہ مضامین ہوں یا ان کے خاکے۔ یہ سب کشمیر کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہیں اور کشمیر کی تاریخ کا اہم حصہ ہونے کے علاوہ فن خاکہ نگاری میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

..................☆☆☆..................

ڈاکٹر وحید

لکھتے رہے جنوں کی حِکایات خونچکاں

میں ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر پایا ہوں کہ شمیم احمد شمیم کی شخصیت کے کس پہلو نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے اس پُر بہار اور پہلودار شخصیت پر قلم اُٹھاتے وقت دل و دماغ عجیب کشمکش میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ کون سا پہلو اُجاگر کیا جائے اور پھر یہ خوف بھی لگتا ہے کہ اُن کے صرف ایک پہلو کو ذرا تفصیل کے ساتھ اُجاگر کرنا بھی کہیں کوشش ناکام اور سعی ناتمام ثابت نہ ہو جائے۔ مجھے اس وقت اُن کی ذاتی زندگی کا ایک ایسا لمحہ یاد آرہا ہے جو واقعی درد و کرب کی گھڑی تھی۔ میں نے کبھی اُن کے چہرے پہ گردِ ملال نہیں دیکھی۔ اُنہوں نے کبھی بھی تلخی ایام سے گھبرا کر شکست قبول نہ کی۔ وہ ہر حال میں اپنی بذلہ سنجی، اپنی فطری ظرافت اور اپنی خوش گفتاری سے دوسروں کو زندہ رہنے کا سلیقہ اور شعور عطا کرتے تھے۔ لیکن اُن کی زندگی میں ایک ایسا واقعہ بھی آیا کہ جب حاکمانِ وقت نے دسمبر ۱۹۷۹ء میں اُنہیں بزرلہ میں واقعہ اپنے رہائشی مکان سے بے گھر اور دوسری جائیداد سے اُن کی غیر موجودگی میں محروم کر دیا تو کچھ دن گزرنے کے بعد وہ مجھے ملے۔ اُن کے چہرے پہ

تھکاوٹ کے آثار تھے۔ اُنہوں نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا......"۱۹۷۷ء کے شروع سے اب تک جتنی قیامتیں مجھ پر گزری ہیں اُنہوں نے میرے حوصلوں کو شکستہ کرنے کے بجائے کچھ اور تازہ دم کر دیا۔ لیکن مجھے دُکھ اس بات کا ہے کہ میرے رہائشی مکان پر حملہ کرنے والی فوج نے "آدم کے کھلونے تک توڑ ڈالے۔" شمیم ایک شفیق باپ اور اپنی رفیقۂ حیات کا وفا شعار ساتھی تھا۔ آدم اُن کے اکلوتے فرزند اور سب سے کمسن اولاد کا نام ہے اور جب وہ تولّد ہوئے تھے تو اُنہوں نے بزرلہ کے رہائشی مکان میں خوشیوں کے چراغ جلائے تھے اور وہیں اپنے چند دوستوں کو ایک پارٹی بھی دی تھی۔ اُنہوں نے جب مجھ سے کہا کہ مکان پر دھاوا بول دینے والوں نے آدم کے کھلونوں کا بھی پاس نہ کیا، اُن کو بھی توڑ ڈالا تو اُن کے چہرے پہ پدری تلخی ایک عجیب رنگ میں اُبھر آئی اور مجھے محسوس ہوا کہ جیسے ایک آدم کے کھلونے تو کیا، ساری انسانیت کی قبا تار تار کی گئی ہو۔ مجھے یاد ہے کہ اپنی سخت ترین مصروفیات کے باوجود اُن کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی تھی کہ اپنے اہل و عیال کے لئے کچھ وقت نِکال سکیں۔ ایک روز میں اور میرے ساتھیوں نے مرحوم غلام محمد صادق سے شمیم کی وساطت اور اُن کی رفاقت میں ملنے کی خواہش ظاہر کی تا کہ اُن کی موجودگی میں صادق صاحب جیسے سنجیدہ اور بالغ نظر سیاستدان سے کھل کر قلب و نظر کی باتیں ممکن ہوں اور اس کے لئے ہم نے اتیوار کے روز صبح ۹ بجے کا وقت بھی مقرر کروایا۔ لیکن شمیم کو یہ دن اور یہ وقت بڑا ہی ناگوار گزرا۔ اُنہوں نے ہم سے کہا......"آپ کو تو ذہنی عیاشی کے لئے صادق صاحب کے پاس جانا ہے۔ یہ کوئی موت و حیات کا مسئلہ نہیں اور نہ ہی کسی کی مجبوری کا معاملہ ہے"۔

اتوار کا دن تو میں اپنے اہل و عیال کے لئے مخصوص رکھتا ہوں"۔ بعد میں

اپنے دوستوں کی خواہش کا تو اُنہوں نے احترام کر ہی لیا۔اسی طرح ایک روز ہم شیخ صاحب کے پاس ٹنگمرگ گئے تھے۔ ہمارے ساتھ عبدالحمید گورو، مشتاق احمد ایڈوکیٹ ، غلام محمد باون ،ظفر احمد ایڈوکیٹ، منظور وکیل اور دوسرے کئی ساتھی تھے۔ہم نے سرینگر سے ہی وازہ وان کا بندوبست کروایا تھا اور شیخ صاحب کے ساتھ تناول کیا۔کوئی ڈیڑھ بجے کے قریب شیم نے مجھ سے کہا......"چلو بھئی دیر ہوگئی۔میں نے اپنے بچوں سے وعدہ کیا ہے کہ میں تین بجے تک واپس آؤں گا۔"شیم، شیخ صاحب سے رخصت ہوئے اور مجھے ٹنگمرگ سے سرینگر تک اپنی کار میں اپنا شریکِ سفر بنایا، باقی سارے دوست شیخ صاحب کے پاس محوِ کلام اور مصروفِ گفتگو رہے۔اپنے بچوں سے اتنا پیار کرنے والا شیم کبھی بھی اپنے کمسن بچوں کی خاطر کسی کے سامنے جھکنے کے لئے تیار نہ ہوئے۔اُن کے ذہن پر اپنے افرادِ خانہ کے مفادات کا بھوت کبھی سوار نہ ہوا۔بلکہ جتنے آلام و مصائب اُنہوں نے اپنے اہل وعیال کو عطا کئے اور جتنی صبر آزما اور کٹھن آزمائشوں میں اُن کو مبتلا کروایا، کشمیر کی سیاسی تاریخ میں کسی بھی قائد نے شاید ہی ایسا کیا ہو۔اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اُن کی غیور طبیعت نے ہمیشہ سمجھوتوں سے گریز کیا۔اُنہوں نے کبھی بھی اپنی آزادیٔ ضمیر کا سودا نہ کیا۔اُن کے کردار کی اس خصوصیت نے اُن کو گھر سے بے گھر بنا کے چھوڑا۔اُن کی طبیعت کی اس کج کلاہی نے اُن کے کمسن بچوں کو بھی تنگیِ حالات اور تلخیِ ایام کی پریشانیاں عطا کیں۔اپنی آنکھوں سے اس قسم کے حالات دیکھ کر میں بھی ایک روز کچھ گھبرا سا گیا اور جب شیم بسترِ علالت پر موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھے تو میں نے اُن سے کہا۔"شیم صاحب۔اب جبکہ آپ کی پوری زندگی ہی ایک سوالیہ علامت بن کر سامنے آئی ہے تو اصولوں اور

آدرشوں کی جنگ حاکمانِ وقت کے ساتھ معرکہ آرائیاں اور ناانصافی کے خلاف جدوجہد سب کچھ بے کار اور غیر متعلق سا لگ رہا ہے۔آپ کے کمسن بچے کٹھن آزمائشوں میں مبتلا ہوئے ہیں۔اُن پر غم واندوہ کے جو پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں، آپ اپنے سخت رویئے میں تھوڑی سی لچک پیدا کر کے اُن کا جینا کچھ حد تک آسان بنا سکتے ہیں"......شیم نے جواب دیا۔

"اگر آسمان سے کوئی فرشتہ اُترے اور مجھ سے یہ کہے کہ حاکمانِ وقت کے ساتھ سمجھوتے کے عوض آپ کو زندگی کے مزید دس سال ملیں گے میں وہ سودا کرنے کے لئے تیار نہیں۔میں اُس فرشتے سے کہوں گا کہ سمجھوتے کی زندگی سے موت کو ہی ترجیح دیتا ہوں۔"

ہر طوفان سے مقابلہ کرنا شیم کی فطرت کا خاصہ اور اُن کے کردار کی خصوصیت تھی۔شیم اپنی بیماری کے مہلک انجام سے باخبر ہونے کے باوجود مرتے دم تک ہنستا رہا۔وہ کتنا بہادر تھا۔میں نے ایک روز اُن کا ہاتھ چوم لیا اُن کی پیشانی پر بوسہ دیا اور ایسا کرتے میری آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔لیکن مجھ سے جدا ہونے والا میرا دوست مجھے ہی دلاسا دیتا رہا۔اُنہوں نے بسترِ مرگ پر بھی ہمت اور حوصلے سے کام لیا۔بلکہ اکثر دوست جو اُن کی مزاج پُرسی کو گئے، حیران و ششدر رہ جاتے تھے، اُس کے انجام کا اُنہیں بخوبی علم تھا۔ایک روز بیماری کی شدّت سے اُنہیں رات بھر نیند نہیں آئی تھی۔میں نے اُن سے کہا کہ دوائی کی گولی لیجئے تا کہ تھوڑی دیر آرام مِل سکے۔اُنہوں نے کہا دوائی نہیں لوں گا......جاگتے جاگتے تھک جاؤں گا سو جاؤں گا۔وہ موت اور درد کی قوتوں کے ساتھ اپنی فطرت کی خصوصیت کے عین مطابق مقابلہ کرتے رہے

موت کے فرشتے کے ساتھ بھی بغیر مقابلہ ہتھیار ڈالنا اُنہیں راس نہ آیا۔

امریکہ سے اپنے ایک خط میں انہوں نے مجھے لکھا ''تم ڈاکٹر ہو۔ تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میں جس بیماری میں مبتلا ہوں اُس کا علاج ڈاکٹروں کے پاس نہیں۔ زندگی اور موت کی قوتوں کے درمیان جو جنگ چل رہی ہے انجام کچھ بھی ہو میں یہ ضرور کہہ سکوں گا کہ ؎

''مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا''

مقابلہ کرنا تو اُن کی ساری زندگی کا شغل رہا۔ جب ۱۹۷۷ء میں شیخ صاحب نے اُنہیں پارلیمنٹ کا منڈیٹ نہیں دیا تو وہ خاموش رہ سکتے تھے اور اُن سے واقعی طور کہا بھی گیا تھا کہ پارلیمنٹ کی ممبری نہ سہی اس سے بھی بڑھکر کوئی موزوں اور مناسب عہدہ آپ کو دیا جائیگا۔ لیکن اُن کو منڈیٹ نہ دینے سے نہیں منڈیٹ نہ دینے کی اصل وجہ سے بڑا دُکھ ہوا تھا۔ اُنہوں نے اس اصل وجہ کو لیڈرانِ وقت کی مصلحت سے تعبیر کیا اور اس مصلحت کے خلاف مقابلہ کرتے رہے۔ اُنہیں یقین نہ آتا تھا کہ ہماری قیادت مسز اندرا گاندھی کی پسند اور ناپسند کے سامنے مجبور ہو کر اپنی بے بسی کا کھلا مظاہرہ کرے گی۔

ایمرجنسی کے دوران سارے ملک میں موت کی سی خاموشی طاری ہوگئی تھی اور آزادیٔ فکر کے بڑے بڑے دعویداروں نے مسز اندرا گاندھی کی چاپلوسی اور سنجے گاندھی کی خوشنودی میں ہی اپنی عافیت سمجھی تھی۔ لیکن شمیم کی تنہا آواز مسز گاندھی پر گرجی اور ایمرجنسی کے خلاف کچھ ایسے ڈٹ گئے کہ اِندرا گاندھی کے لئے دردِ سر ہی نہیں دردِ جگر بن کر اُبھرے۔ اور بقول روزنامہ سٹیس مین ۵ رمئی ۱۹۸۰ء ایمرجنسی کے پہلے مرحلے میں تنِ تنہا لوک سبھا میں لڑتے رہے اور حکمرانوں کو انتباہ دیا کہ عوام

کا قہر و غضب ایک دن اُن کو بھسم کر ڈالے گا۔'' ان حالات میں وہ اِندرا گاندھی کے لئے ناپسندیدہ شخصیت بن گئے اور منڈیٹ دیتے وقت اسی پسند اور ناپسند کو معیار بنایا گیا۔ شمیم نے کہا کہ میں اسی آزادیٔ فکر اور آزادیٔ ضمیر کی موت کا ماتم کر رہا ہوں ورنہ اُنہیں اقتدار سے نہیں اقدار اور افکار سے لگاؤ تھا۔ جب اُنہوں نے ۱۹۷۷ء میں جنتا پارٹی میں شمولیت اختیار کی تو مرارجی نے شوپیان کے انتخابی جلسے سے مخاطب ہو کر کہا...... ''یہ حالات کی ستم ظریفی ہے کہ میں شمیم کی خاطر اسمبلی کی ممبری کے لئے ووٹ مانگ رہا ہوں۔ ورنہ میں اُن کو پارلیمنٹ میں دیکھنا چاہتا تھا۔''

مرارجی ملک کے وزیر اعظم تھے اور جنتا لہر کی اُٹھان کے ساتھ اُن کا اقبال بلند تھا۔ شمیم انتخاب ہار گئے۔ لیکن ملک کی برسر اقتدار جنتا کے ساتھ اُن کے تعلقات کافی مستحکم تھے اور اُنہیں کسی ملک میں سفیر بنانے کا منصوبہ بھی زیرِ تکمیل تھا۔ شمیم کسی ایسے ملک میں سفیر بن کر جانا چاہتے تھے جہاں ایک طرف اُن کی مہم پسند طبیعت کو تسکین مل جاتی اور ساتھ ہی ساتھ اُن کی بگڑتی ہوئی صحت کا علاج بھی ممکن ہو سکتا تھا۔ یہی خواہش لے کر وہ مرارجی کے پاس گئے۔ لیکن ؎

کہنے میں اُن کے سامنے بات بدل بدل گئی

شمیم نے اپنا نہیں مرارجی کے بیٹے کانتی ڈیسائی کا کیس اٹھایا۔ مراجی کی دُکھتی رگ کو چھیڑ کر شمیم نے ایک ہی ملاقات میں اُن کو زخمی کیا۔ اور اُن کی محفل سے فوراً واک آوٹ کر کے ایک پریس کانفرنس میں کانتی ڈیسائی کے کرتوتوں کو بے نقاب کر کے چھوڑا۔ کچھ دوستوں نے شمیم سے کہا کہ اِس وقت جبکہ ریاستی سطح پر اُن کے لئے ماحول سازگار بھی نہیں، مرارجی سے رزم آرائی، اُن کی ذات اور اُن کے مستقبل کے لئے سودمند ثابت نہیں ہو سکتی تو شمیم نے جواب دیا...... مجھے خود معلوم نہیں کہ

میں بیک وقت تن تنہا کتنی لڑائیاں لڑوں ۔

مقامِ فیضؔ ! کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

طبیعت ہی کچھ ایسی مل گئی ہے کہ جس سے دشمنوں کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے۔ میں کیسے اس ضعیف الاعتقاد اور خود کو گاندھیائی کہنے والے شخص کی باتوں اور اُس کی منطق کو تسلیم کروں۔ مجھے معلوم ہے کہ میری فطرت مجھے کیا صلہ دے گی ۔

ہاں تلخیٔ ایام ابھی اور بڑھے گی
ہاں اہلِ ستم مشقِ ستم کرتے رہیں گے

شمیم نے تلخیٔ ایام سے کبھی شکست قبول نہ کی۔ وہ اپنے دوستوں اور رفیقوں کی محفل میں اپنی پُر بہار اور دلنواز شخصیت کے رنگ بکھیرتے رہے۔ اُن کی خوش گفتاری اور دوست نوازی سے ہر محفل رنگ اور مہک کی دولت سے مالا مال ہوتی رہی۔ شمیم بنیادی طور میرا دوست رہا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں کا بھی دوست ہی رہا۔ لیکن موت کے بے رحم ہاتھوں نے محفلوں میں پھول جھڑنے والا نکتہ دان اور نکتہ چین ہم سے چھین لیا۔ اب ہر محفل پھیکی اور ویران نظر آتی ہے ۔

جمے گی کیسے بساطِ یاراں کہ شیشہ و جام بجھ گئے ہیں
سجے گی کیسے شبِ نگاراں کہ دِل سرِ شام بجھ گئے ہیں
بہار اب آ کے کیا کرے گی کہ جن سے تھا جشنِ رنگ و نغمہ
وہ گل سرِ شاخ جل گئے ہیں وہ دِل تہ دام بجھ گئے ہیں

میری ملاقات شمیم سے پہلی بار ۱۹۶۴ء میں ہوئی تھی۔ اُس وقت میرے

نظریات وہی تھے جو عام کشمیر کے ذہن میں پرورش پارہے تھے۔

رائے شماری کا دلفریب نعرہ ہر کشمیری کے ایمان کا جز بن گیا تھا۔ لیکن شمیم نے اس قسم کے تعصبات اور نظریات کے خلاف اپنے زورِ قلم سے ایک ایسی مہم چلائی اور اپنے نظریات کی پختگی سے ایک ایسا ماحول پیدا کیا کہ رائے شماری کا نعرہ بے مقصد، ناقابلِ عمل اور فرسودہ نظر آنے لگا۔ اُنہوں نے ۱۹۶۹ء میں پیپلز فورم کے نام سے نوجوانوں کے ایک گروپ کو منظم کیا۔ میں نے اُن سے کہا...... ''آپ کی اس پارٹی کو قبولِ عام خاص نہیں ہوسکتا کیونکہ اِس جماعت کے نظریات ہندنواز ہیں اور آپ ہند سے کشمیر کے الحاق کو تسلیم کرتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ کشمیر میں ہندنواز جماعتوں کا دائرہ اثر صرف اُن کے دفاتر تک ہی محدود ہے۔

شمیم نے جواب دیا۔

''یہاں کے اکثر ہندنواز لیڈر اور ورکر محض ہندوستان کے ایجنٹ ہیں۔ انہوں نے جان بوجھ کر مرکز اور ہمارے درمیاں شک وشبہات بداعتمادی اور بے اعتمادی کی فضا قائم کرنے کا مکروہ فریضہ انجام دیا ہے تاکہ وہ اپنی وفاداری کے عوض مفادات حاصل کرسکیں۔ میں ہندوستان کے ایجنٹ کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک کشمیری کی حیثیت سے منفی سیاست کے مضر اثرات اور اس کی فرسودہ حیثیت کچھ اس رنگ سے اُبھارنے کی کوشش کرنا چاہتا ہوں کہ غیر یقینیت کی فضا مسمار ہوسکے۔ میں مرکز اور ریاست کے درمیان تعلقات کو ایک ایسی سطح پر لانا چاہتا ہوں کہ جہاں استحصال کا امکان ختم ہوسکے۔ یہ درست ہے کہ کشمیر کے جذباتی ماحول میں یہ فریضہ انجام دینا بہت ہی مشکل ہے۔ میں لوگوں کے جذبات سے کھیل کر سستی شہرت اور دادِ

تحسین حاصل کرسکتا ہوں لیکن مجھے قطعاً اس سیاست پر اعتقاد نہیں اور نہ ہی انور عشائی اور بشیر کچلو کی طرح میری یہ خواہش ہے کہ رائے شماری اور اسی قسم کے دلفریب نعروں سے لوگوں سے داد حاصل کروں اور لیڈر بن جاؤں۔ مجھے لیڈر بننے کا شوق نہیں۔ اگر سارے کشمیر میں صرف ایک ہزار نوجوان حقائق کو سمجھنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں تو میں اُسے اپنی فتح تصور کروں گا اور ممکن ہے کہ کل کو شیخ محمد عبداللہ، مرزا محمد افضل بیگ اور مولوی فاروق بھی میرے نظریات کی صحت اور میرے عقائد کی سچائی پر ایمان لائیں گے"

شمیم صحیح معنوں میں کشمیر اور ہندوستان کی سیاست اور ریاست اور مرکز کے درمیان تعلقات پر ایک بالغ نظر اور پختہ رائے رکھتے تھے۔ اُنہوں نے اپنی فکر انگیز تحریروں سے اس رائے اور اس نظر کو عام لوگوں تک پہونچا دینے کا فرض اس حسین انداز سے نبھایا کہ جذباتیت کی قدر و قیمت میں کمی واقع ہونے لگی اور حق شناسی اور حقیقت پسندی کا رجحان بڑھتا گیا۔

۱۹۷۰ء میں جب اُنہوں نے پارلیمنٹ کی رکنیت کے لئے اننت ناگ کے حلقۂ انتخاب سے لڑنے کا فیصلہ کیا تو عام لوگوں کے ہجوم اُن پر ٹوٹ پڑے کہ وہ الحاق نواز سیاستدان ہیں۔ الحاق نوازی کے جُرم میں اُن کو کشمیر کے انتہا پسند سیاسی مجنونوں کا نشانہ بنانا پڑا لیکن بعد میں ثابت ہوا کہ وادی کے یہ مجنوں حقیقی مجنوں نہیں تھے۔ اُن کے عقائد سچے نہیں تھے۔ اُن کا اپنا کوئی نظریہ نہ تھا۔ کیونکہ کہ بعد میں جب شیخ صاحب کی حمایت اور اُن کی اپیل پر شمیم بخشی غلام محمد کے خلاف انتخابی میدان میں کود پڑے تو انہی مجنونوں نے شمیم کی کامیابی یقینی بنانے کیلئے شمیم کے سیاسی عقائد کو یکسر فراموش کر دیا اور خود شیخ صاحب نے بھی بخشی غلام محمد کو شکست

دینے کی خاطر ایک ایسے نوجوان کی حمایت کی جو کبھی اُن کی سیاست سے نہ متاثر ہوا تھا اور نہ ہی اُن کے کسی نظریئے کا حامی رہا تھا۔ جب وہ پارلیمنٹ کا انتخاب جیت گئے تو میں مبارک باد پیش کرنے کی غرض سے اُن کے پاس گیا۔ اُنہوں نے مجھ سے کہا...... "الیکشن مہم کے دوران بخشی غلام محمد کے انتخابی جلسے کو ہلڑ بازی کا شکار بنایا گیا جس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔" اُنہیں واقعی بدمزگی کا ایک احساس ستا رہا تھا۔ اُن کا کہنا تھا کہ یہ محض ایک یکطرفہ انتخابی مہم تھی اور یکطرفہ انتخابی تقریروں سے اُن کے ذوقِ خطابت کو تسکین نہیں ملی تھی۔ جب شیخ صاحب نے اُن کی حمایت اور اُن کی کامیابی یقینی بنانے کے لئے تمام وسیلے بروئے کار لائے تو بہت سارے لوگوں نے شمیم کی اِمکانی فتح پر اُن کو پیشگی مُبارک دی تھی۔ میں بھی اُن میں سے ایک تھا۔ جب شمیم نے انتخاب جیت لیا تو اُنہوں نے مجھ سے کہا...... "آپ نے پیشگی مبارک دینے کی جرأت کیسے کی تھی؟۔ شاید آپ نے شیخ صاحب کی اپیل اور دوسرے لیڈروں کی اعانت اور حمایت کے پیش نظر میری فتح کو یقینی سمجھا تھا۔ لیکن خدا کی قسم انتخابی معرکہ بہت مشکل تھا۔ اِنتخابی جنگ کے دوران بخشی غلام محمد کی سیاسی قوت اور اُن کے مستحکم اثر و رسوخ کو میں نے ہر جگہ محسوس کیا"۔ شمیم ہر بات سے اپنی حق شناسی اور حق گوئی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اُنہوں نے مزید فرمایا۔

"ذاتی طور مجھے خوشی ہے کہ میں نے اِنتخاب جیت لیا لیکن دُکھ اس بات کا ہے کہ جن لوگوں نے مجھے الحاق نوازی کے جُرم میں اپنے پتھروں اور لاٹھیوں کا نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی اور مجھے شہر بدر کرنے نکلے تھے، وہی لوگ میرے محافظ، معاون اور مددگار بن گئے۔ یہی کشمیری قوم کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ شیخ صاحب کی اپیل کے بعد مجھ پر پتھر اور لاٹھیاں برسانے والے ایک ہی رات میں

بخشی غلام محمد کے دشمن بن گئے۔اس سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ اُن کی اپنی کوئی سوچ نہیں بلکہ اُن کا اپنا کوئی نظریہ بھی نہیں۔وہ قوم پرست اور عقاید پرست ہونے کے بجائے لیڈر پرست ہیں۔اُن سے لیڈروں نے کہا کہ کھمبے کو ووٹ دو تو وہ فوراً ووٹ دینے اور ووٹ چھیننے کی جنگ میں مصروف ہوگئے۔اُنہوں نے ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی قیادت سے استفسار نہیں کیا کہ ہم نے شمیم کو ہندنواز ہونے کے جرم میں رد کیا تھا اب کس منہ اور کس دِل سے اُن کے انتخابی معرکے کو آگے بڑھا سکتے ہیں۔میں اس قوم کی سادگی پر آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتا اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جب تک یہ قوم اپنے لیڈروں سے اُن کے عمل کا حساب نہ مانگے گی تب تک اس وادی کے رہنے والے عوام اپنے راہبروں سے کچھ بولنے اور کچھ پوچھنے کی جراُت اور شعور پیدا نہیں کرسکتے۔میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس قوم کا قومی مفاد کے نام پر پچاس سال تک استحصال ہوتا رہے گا۔ مجھے تعجب نہ ہوگا کہ اگر کل شیخ صاحب اور میرزا افضل بیگ اور مولوی فاروق ہند کشمیر الحاق زندہ باد کا نعرہ بلند کریں گے تو یہ قوم یکسر اُن وعدوں کو بھول جائے گی جو اُن سے لیڈروں اور راہبروں نے کئے تھے۔عوام اُن سے اپنی قربانیوں کے بارے میں یہ بھی نہ پوچھیں گے کہ اُن قربانیوں کا جواز بھی کچھ تھا کہ نہیں۔یہ صورت حال انتہائی مایوس کن ہے اور ہمارے سیاسی شعور کا سب سے بڑا المیہ۔

پارلیمنٹ ممبر کی حیثیت سے وہ فوراً ملک بھر میں مشہور ہوئے اور بقول خشونت سنگھ پارلیمنٹ میں سب سے اچھی تقریر شمیم صاحب کی ہوتی تھی۔اور بقول سٹیٹمین (۵رمئی ۱۹۸۰ء) لوک سبھا میں وہ ایک آتش نوا مقرر کی حیثیت سے ہمیشہ یاد کئے جائیں گے۔اُن کی اردو تقریر ادب کا شاہکار ہوتی تھی۔اُردو کے

مشہور نقاد آل احمد سرور کا کہنا ہے کہ کشمیر سے بہت نمائندے پارلیمنٹ میں گئے مگر شاید ہی کسی نے پارلیمنٹ سے اِتنی داد حاصِل کی ہو۔شاید ہی کسی نے کشمیر کے نقطہ نظر، اُس کے حقوق اور اُس کے مفادات سے حکومت کو آگاہ کیا ہو، جتنا شمیم نے کیا۔"آل احمد سرور کا کہنا ہے کہ اُن کی ہر تقریر پہاڑ پر اذان کی مانند گونجتی تھی۔دہلی میں اُن دنوں وہ ۲۷ مہادیو روڈ کے ایک چھوٹے سے کوارٹر میں رہتے تھے۔مجھے اُن دِنوں شمیم کی کئی تقریریں سُننے کا موقعہ مِلا۔وہ جب بولتا تھا تو طوفان بپا کرنے والا آتش فشاں شعلہ زن ہوتا تھا۔وہ ہر ظلم کے خلاف مردِ مجاہد کی طرح اپنی آواز کی گرج سے لوک سبھا کے ایوان میں زلزلہ پیدا کرتا تھا۔اُن دِنوں دہلی میں شیخ صاحب ریاست بدری کے دِن گذار رہے تھے۔بہت سے ارکانِ پارلیمنٹ، صحافی اور لیڈر شیخ صاحب کو اِس بات پر مبارک دیتے تھے کہ انہوں نے شمیم جیسے ذہین نوجوان کو چُن کر اپنے حسنِ انتخاب کا مظاہرہ کیا ہے۔شمیم کی شہرت سے متاثر ہوکر ایک روز شیخ صاحب نے شمیم سے کہا۔" آپ نے اپنی تقریروں سے ایک مقام پیدا کیا ہے۔آپ کی قیمت بڑھ گئی ہے کہیں اپنی قیمت بڑھتے دیکھکر مجھ سے بے وفائی نہ کرنا۔جیسا کہ بہت سے میرے پروردہ دوستوں نے مجھ سے کی ہے۔"شمیم نے فوراً جواب دیا۔"میں اپنی جگہ اور اپنے عقائد پر قائم ہوں کہیں آپ ہی مجھ سے بے وفائی نہ کرنا"۔بہر کیف! سیاسی اُتار چڑھاؤ کی یہ داستان انتہائی تلخ، سبق آموز اور عبرت ناک ہے۔شمیم نے دہلی میں نہ صرف سیاسی حلقوں میں نام پیدا کیا بلکہ اُنہوں نے اپنے جراُت فکر، اپنی ذہانت صلاحیت اور اپنے عزم ہمت سے مداحوں کا ایک ایسا حلقہ پیدا کیا تھا جس میں ملک کے ممتاز صحافی، وکیل، ارکان، پارلیمنٹ اور ادیب سبھی شامل تھے۔کرشن چندر اور خلیل الرحمٰن اعظمی سے لیکر اے۔جی نورانی،

رام جیٹھ ملانی اور پیلو مودی جیسی نامور شخصیتیں اُن کے حلقۂ احباب میں شامل ہو گئی تھیں۔

شمیم دیکھنے میں رومان پسند لگتا تھا۔ حسنِ صورت اور شوخی اُس کی شخصیت کا حصہ تھے لیکن شمیم ہر حال میں خدا پر بھروسہ کرنے والے اور ہر حالت میں اُسی سے مدد مانگنے والے پکے مسلمان تھے۔ سیاست اور ادب کے ساتھ ساتھ اُنہیں دینی امور پر بھی نظر تھی۔ اگر چہ باقاعدگی کیساتھ ہماری طرح نماز کے پابند نہیں تھے وہ کئی بار اپنے دوستوں کے ساتھ نمازِ جمعہ ادا کرنے کے لئے حضرت بل جایا کرتے تھے۔ اکثر ہمارے ساتھ عبدالحمید گورو اُن کے برادر غلام محمد اور کئی دوسرے اصحاب ہوتے تھے۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ رسول اکرمؐ دُنیا کے عظیم انقلابی راہنما ہیں لیکن ملاؤں اور مولویوں نے مذہب کو محض چند عقائد اور رسوم کے طور پر پیش کیا ہے۔ اُنہیں پریم ناتھ بزاز کی صحافت سے عشق تھا۔ وہ مولانا مسعودی کی سادگی کی قسمیں کھاتے تھے لیکن اُن کی عافیت پسندی مصلحت اور منطق سے بیزار تھے۔ وہ شیخ محمد عبداللہ کو کشمیر کے سب سے مقبول لیڈر کی حیثیت سے تسلیم کرتے تھے لیکن اُن کی شخصیت کی کسی بھی پہلو نے انہیں متاثر نہیں کیا تھا۔ وہ سید میر قاسم کے خلوص اور شرافت کے زبردست قائل تھے اُنہوں نے ایک روز مجھ سے کہا...... "میں نے عمر بھر قاسم صاحب کے خلاف زہر اگلا لیکن میری عمر کے آخری حصے میں وہ میرے کام آئے اور میں اُن کا احسان مند ہوں۔" وہ اِقبال کے تصورِ خودی کا مجسمہ تھے لیکن غالب اور فیض احمد فیض کے اشعار سے اُنہیں کلام کی شوخی ملی تھی۔ وہ مرحوم ذوالفقار علی بھٹو کی رومانی شخصیت کے گرویدہ تھے اور اُن کا سٹائل اور اُن کی ادا انہیں پسند تھی۔ جب وہ قتل کئے گئے تو اُن کو زبردست صدمہ ہوا تھا اور فیض احمد فیض کے چند اشعار آئینہ

کے پہلے صفحہ پر اُن کی نذر کئے تھے۔ میں آج اپنے دوست کے بچھڑنے پر اُنہی اشعار کو شمیم کی نذر کرتا ہوں۔

کرو کج جبیں پہ سرِ کفن، میرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن، پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا

☆

مرے چارہ گر کو نوید ہو، صفِ دشمناں کو خبر کرو
جو وہ قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا

☆

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

............☆☆☆............

پروفیسر رحمان راہی

دُعائے اقبال کی تاثیر

شمیم احمد شمیم میرے لیے ان چند شخصیتوں میں سے ایک ہیں کہ جن کی وفات کا واقعہ مجھے خود اپنے وجود کی معنویت یا لا یقینیت کے بارے میں شدّت سے سوچنے پر مجبور کرتا رہا ہے:

عاقبت منزلِ ما وادیٔ خاموشاں است
حافظاؔ غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز

وادیٔ خاموشاں کو زندگی کی انتہائی منزل قرار دیتے ہوئے گنبدِ افلاک میں فی الوقت غلغلہ اندازی کی جو بات حافظؔ شیرازی کہہ گئے ہیں مجھے اُس کے پردے میں شمیم احمد شمیم کی بات محسوس ہوتی ہے۔ موت سے پہلے آدمی کو جو تھوڑی بہت فرصت ملتی ہے اُس کا استعمال زندگی کہلاتا ہے اور اُس فرصت کو برتنے کا انداز زندگی کی کیفیت اور کوالٹی متعین کرتا ہے۔ فرصت کم سے کم بھی ہوسکتی ہے اور زیادہ سے زیادہ بھی، مقدار کے اعتبار سے، ہم کم بھی جی سکتے ہیں اور زیادہ بھی۔ زندگی کی صبح کو اکثر لوگ جوں توں شام کر ڈالتے ہیں جب کہ کسی کسی کو ایک ایک لمحے کا حساب دینا پڑتا ہے سو سال جی کر بھی کسی کے تجربات کا اندوختہ حقیر ہوتا ہے جبکہ کسی کی

چند روزہ وارداتیں بڑی وافر ہوتی ہیں۔ اس روشنی میں شمیم احمد شمیم کو یاد کرتا ہوں تو اُن کی خوش حاصلی حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے۔ کہاں کشمیر کے ایک نہایت ہی دُور افتادہ اور پچھڑے ہوئے گاؤں آسنور میں پیدا ہونے والا شمیم احمد اور کہاں یورپ اور امریکہ کی ہوا کھا کر دنیا کی سب سے بڑی پارلیمنٹ میں اپنی آتش بیانی کی دُھاک بٹھانے والے شمیم احمد شمیم ۔ وہ سائنس کا طالب علم، وہ شعر وادب کا رمز شناس، وہ فنِ صحافت کی اقدار میں وسعت و برتری پیدا کرنے والا، وہ نکتہ سنج و نکتہ چین، وہ طنز کو الماس میں بدلنے والا جادوگر، وہ احتجاج کرنے والا ہوشیار ذہن، حساس دل اور وہ قدرت کے اٹل قوانین کے آگے صابر و شاکر، وہ زشت شناس و زیبا پرست، وہ مباحثہ ساز، مناظرہ کار، وہ حامی، وہ مخالف، وہ وفا شعار، وہ صف آرا:۔

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دل جس سے پہاڑوں کے دہل جائیں وہ طوفاں

آسمانوں تلے اس دنیا میں کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد، ہم جس مقام کو پہنچتے ہیں، حافظؔ اُسے وادیٔ خاموشاں سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ وادی منزل فنا نہیں مقامِ سکوت ہے۔ سکوت اگر دائم و قائم رہے تو بلا شبہ اُس میں اور واقعی موت میں فرق کرنا مشکل ہو جائے، برعکس اس کے اگر خاموش باسیوں کی یہ وادی کسی آواز، کسی جھنکار، کسی چھناکے، کسی فریاد سے گونجتی رہے تو سکوت صدا بن جائے اور موت زندگی میں بدل جائے۔ سوال یہ ہے کہ وادیٔ خاموشاں میں گونج پیدا کرنے والی یہ صدا کہاں سے آئے۔ حافظؔ کا اشارہ ہے کہ گنبدِ افلاک میں فی الوقت کوئی غلغلہ پیدا کرنے سے یعنی موت سے پہلے آدمی کو جو تھوڑی بہت فرصت ملتی ہے، اُس کا نہ

صرف یہ کہ بھرپور استعمال کیا جائے بلکہ یہ بھی کہ اُس استعمال کا انداز، اُس فرصت کو برتنے کا طور طریق کیفیاتی اعتبار سے اعلیٰ وارفع ہو۔ خوشی ہو کہ غم، چھنا کا ہو کہ فریاد اُس کا انداز غلغلہ اندازی کا ہو۔ ایسی غلغلہ اندازی کہ ہمارے اِس دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی گنبدِ افلاک گونجتا رہے حتیٰ کہ یہ گونج وادیٔ خاموشاں کو بھی مترنم کردے۔

شمیم احمد شمیم نے جو مختصر سی زندگی پائی وہ اوّل وآخر ایک غلغلہ بنی رہی، ایک ایسا غلغلہ کہ جس کی گونج برابر سنائی دیتی ہے اور نہ معلوم کب تک سنائی دیتی رہے گی!

یاد زندگی کا دوسرا روپ ہے۔ ہمیں شمیم احمد شمیم بہت یاد آتے ہیں اور اکثر یاد آتے ہیں۔ کبھی ایسے مواقع، سامنے آتے ہیں کہ چشمِ تخیل انہیں روایت کے ٹھہرے ہوئے پانی میں پتھر پھینکتے ہوئے دیکھتی ہے اور کبھی ایسے حالات رونما ہوتے ہیں کہ اُن کی غیر موجودگی ہی اُن کے بے پناہ وجود کا احساس دلاتی ہے۔
شمیم احمد شمیم ایک تہلکہ آفریں شخصیت تھے کہ جس کی نظیر کشمیر کی دانشورانہ زندگی دیر تک پیش نہیں کر پائے گی۔

اقبال نے کشمیری قوم کے ذہنی و روحانی انحطاط کا ماتم کیا تھا:

ضمیرش تہی از خیالِ بلندی — خودی ناشناسی زخود شرمساری
کشمیری کہ بابندگی خو گرفتہ — بُتی می تراشد ز سنگ مزاری

اور پھر دعا مانگی تھی کہ

ازاں می فشاں قطرہ ای بر کشیری
کہ خاکسترش آفریند شراری

میں سمجھتا ہوں کہ شمیم احمد شمیم اقبال کی اسی دعا کی تاثیر تھے۔ ایک بات جو

مرحوم کے بارے میں تردید کے کسی اندیشے کے بغیر کہی جاسکتی ہے کہ وہ ایک بڑے بُت شکن اور ایک بڑے مُبارزہ طلب آدمی تھے۔ اس باب میں کشمیر کی تاریخ مختصر سہی لیکن اس مختصر تاریخ میں شمیم احمد شمیم کا کارنامہ خاکستر کی شرر آفرینی کے مِصداق ہے۔ شمیم کی نگاہ میں فروغ، اُس کے سینے میں بے قرار دِل اور اُن کی ذات میں ناقابل شکست انا۔

کوہیم و در میانۂ دریا نشستہ ایم

سچی بات تو یہ ہے کہ جدید کشمیر کی تاریخ میں روایت پرستوں کی سخت گیری کے خلاف سب سے اُونچی بامعنی اور انفرادیت پسند آواز جو اُٹھی وہ شمیم احمد شمیم کی آواز تھی۔

وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا؟

شمیم کی مبارز طلبی، مناظرہ کاری اُن کی سب سے عیاں کارکردگی تھی۔ ادبی محفلیں ہوں کہ سیاسی اکھاڑے، نجی گفتگو ہو کہ جماعتی غور وفکر، شمیم کی مبارز طلبی اور مناظرہ کاری ہر حال میں دیدنی و شنیدنی ہوا کرتی تھی۔ وہ قدیم یونانی مفہوم میں کشمیر کے سب سے بڑے جدلیات پسند تھے۔ ان کی تقریر و تحریر دونوں ہمیشہ جدلیاتی طرز کی اعلیٰ مثالیں شمار ہوں گی۔

یہ کوئی کہنے کی بات نہیں کہ شمیم کی ہر بات سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ ساری زندگی ہمارے بعض افکار سے اختلاف کرتے رہے۔ بعض موقعوں پر انہوں نے ہمارے خلاف باقاعدہ محاذ آرائی سے بھی گریز نہیں کیا۔ کشمیر کی ثقافتی زندگی اور لسانی صورتِ حال کے بارے میں مرحوم کے جو خیالات و تاثرات تھے مجھے ذاتی طور اُن سے اختلاف رہا ہے۔ لیکن اصل بات جو گفتنی ہے، یہ ہے کہ شمیم سے

اختلاف کرنا خود اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے کے برابر ہوتا تھا۔

یاد اُس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ
ناداں پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائیگا

پر یاد کا کیا ٹھکانا۔ آئی تو آتی ہی رہے گی۔ صدا بلند ہوئی تو گونج بھی بیدار ہوگی۔

اچھے بُرے کی سوچنا تو پھر وہی معنویت اور لایعنیت کا مسئلہ ہوا۔ اگر عاقبت ہماری بھی منزل وہی وادیٔ خاموشاں ٹھہری ہے تو پھر ہو جائے بلند غلغلہ۔ ہم فیضؔ نہیں کہ کنج قفس کو غزال چشموں کی فکر اور سمن اندازوں کے ذکر سے بہاراں کر سکیں۔

ہم بہار سوختہ لوگوں کی خوش نصیبی یہی ہوگی کہ کوئی نالہ سر ہو کہ

نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم کفِ خاک
آسمان بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

ایسا تاکہ کہ تیر کھائے ہوئے پرندے کی آخری پھڑ پھڑاہٹ قانونِ قدرت کے لئے ایک چیلنج بن جائے۔

............☆☆☆............

رضوان احمد

ہوگئے خاک اِنتہا یہ ہے

آج شمیم احمد شمیم کی موت کی خبر سنکر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں خود مر گیا، میرا قلم مر گیا، میرا ذہن مر گیا۔ میرے احساسات مر گئے...... شمیم احمد شمیم سے میرا رشتہ کیا تھا؟ میرا تعلق کیا تھا؟ میں بہاری اور وہ کشمیری، میں افسانہ نگار وہ سیاست دان۔ سب میں کتنا بُعد تھا، لیکن ایک تعلق بھی تھا، شمیم اردو کے صحافی تھے اور میں بھی اردو صحافت سے وابستہ ہوں۔ ان سے میری خط و کتابت کا سلسلہ کم و بیش بارہ سال قبل یعنی ۱۹۶۸ء میں شروع ہوا تھا، ۱۹۶۹ء میں انہوں نے اردو کنونشن بمبئی میں جو تقریر کی اس کی بہت دھوم تھی۔ یوں تو وہ ۱۹۶۷ء میں ہی ملک گیر شہرت حاصل کر چکے تھے۔ کیوں کہ اسمبلی کے الیکشن میں ایک آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخاب جیتا تھا۔ اس سے کچھ ہی قبل شمیم نے سری نگر سے ایک ہفتہ وار اخبار آئینہ نکالنا شروع کیا تھا۔ پورا اخبار ان کی تحریروں کا ہی آئینہ دار ہوتا تھا سارے کالم وہ خود لکھتے تھے، ان کی تحریر میں بلا کی جان ہوتی تھی۔ ان کے اداریوں میں چنگاریاں دوڑتی محسوس ہوتی تھیں۔ ایک نوجوان کشمیری کے سینے میں جو آگ تھی وہ اس کی تحریروں میں منتقل ہو رہی تھی...... پھر ۱۹۷۱ء میں وہ آزاد امیدوار کی حیثیت سے

پارلیمنٹ میں جیت کر کے آئے اور وہ لوک سبھا کے سب سے کم عمر ممبر پارلیمنٹ تھے۔ اس وقت ان کی عمر بمشکل ۳۵ سال تھی اس لئے وہ موضوع بحث بن گئے۔ اس کے بعد پارلیمنٹ میں انہوں نے جو تقریر کی، چند ہی دنوں میں ان کا طوطی بولنے لگا۔ وہ موضوعات پر جس بے باکی سے اظہار خیال کرتے تھے اپوزیشن کا کوئی ممبر اس صاف گوئی میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ مسز گاندھی کیلئے سب سے پریشان کن ممبر تھے۔ اس زمانہ میں شمیم احمد شمیم، شیخ عبداللہ سے بے حد قریب تھے اور انہیں شیخ صاحب کا سایہ سمجھا جاتا تھا بلکہ درحقیقت میں ۱۹۷۴ء میں اندرا گاندھی اور شیخ صاحب میں سمجھوتہ ہوا اور شیخ صاحب برسر اقتدار آئے، اس میں شمیم کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ مسز گاندھی اور شیخ صاحب کے درمیان ثالثی کا فریضہ انہوں نے ہی انجام دیا تھا۔ انہوں نے شیخ صاحب کے برسر اقتدار آنے کی پیشن گوئی اپنے اخبار میں بہت قبل ہی کردی تھی۔

ایمرجنسی لاگو ہوئی تو کسی ممبر کی ہمت نہیں تھی حکومت کے خلاف آواز اٹھائے۔ یہ واحد ممبر شمیم تھے جنہوں نے لوک سبھا میں زوردار تاریخی تقریر کی تھی، اسی درمیان آئینہ روزنامہ ہوگیا تھا اور شاید یہ ہندوستان کا واحد اخبار تھا، جس پر سنسر شپ کا کوئی اثر نہیں تھا۔ یہ حکومت پر سخت تنقید کررہا تھا۔ ان سے میری خط و کتابت اکثر ہوتی رہی لیکن پہلی ملاقات ۱۹۷۴ء میں آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس کے لکھنو اجلاس کے موقع پر ہوئی وہ شیخ صاحب کے ساتھ آئے تھے۔ اس اجلاس میں وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی بھی آئی تھیں، اس میں شمیم نے اردو اخبارات کے مسائل پر ایک زوردار تقریر کی تھی، پھر دوسری ملاقات کچھ ہی دنوں بعد دہلی میں اردو ایڈیٹرس کانفرنس کی نشست کے موقع پر ہوئی، تیسری ملاقات ان سے کلکتہ کے

سالانہ اجلاس ۱۹۷۶ء میں ہوتی جس میں شیخ صاحب پوری کابینہ کے ساتھ شریک ہوئے تھے۔ اس اجلاس میں شمیم نے کتابت و طباعت کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے اپنا رخ ایمرجنسی اور سنسر شپ کی جانب موڑ دیا اور حکومت پر اخبارات کی آزادی سلب کرنے کے عنوان پر زوردار تقریر کی۔ حالاں کی ان کی تقریر کے دوران کئی اصحاب نے دخل اندازی کرنے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ اجلاس کے صدر جناب حیات اللہ انصاری کی پوزیشن ہی عجیب ہوگئی۔ انہوں نے بار بار مداخلت کی اور کہا کہ آپ موضوع سے ہٹ رہے ہیں لیکن شمیم تو جان بوجھ کر موضوع سے بھٹکے تھے۔

۱۹۷۷ء میں پارلیمانی الیکشن کا اعلان ہوا تو انہیں ٹکٹ نہیں دیا گیا، اس کا سبھوں کو بہت افسوس تھا۔ کیوں کہ وہ کشمیر سے پارلیمنٹ کے واحد رکن تھے، جس نے ہندوستان کے بڑے حلقے کا دل جیت لیا تھا۔ وہ وسائل کی کمی کے باعث آزاد امیدوار کی حیثیت سے الیکشن نہیں لڑ سکے اور انہیں اس بے وفائی پر صدمہ تھا...... میں جون ۱۹۷۷ء میں ایک سمینار کے سلسلہ میں سری نگر گیا تو ان سے ایک روز کمال صدیقی صاحب کے گھر پر ملاقات ہوگئی۔ ان دنوں وہاں ڈاکٹر خلیل الرحمان اعظمی صاحب بھی قیام پذیر تھے جن کے ساتھ میری کم از کم روزانہ بیٹھک اور دیر تک گپ شپ ہوتی تھی، میری شمیم سے کئی بار ملاقات ہوتی ان کی آنکھ میں کچھ تکلیف تھی جس کا وہ چند دنوں قبل ہی علاج کروا کر لندن سے لوٹے تھے۔ پھر جنتا پارٹی کے ٹکٹ پر وہ اسمبلی کا الیکشن لڑے۔ جس میں وہ ناکام رہے وہ ایک جذباتی انسان تھے اور ان کا ذہن باغیانہ تھا۔ اسی لئے وہ ہمیشہ اسٹیبلشمنٹ کا حصہ نہیں بن سکے۔ ان کا اخبار جو شیخ صاحب کے ایام اسیری میں ان کا قصیدہ خواں تھا ان کا سخت مخالف بن گیا، شمیم نے پوری توجہ صحافت پر دی اور اسی زمانہ میں انہوں

نے انگریزی میں بہت سے مضامین لکھے جو ملک کے مختلف اخبارات میں شائع ہوئے تھے۔ وہ اردو کے علاوہ بہت خوب صورت انگریزی بھی لکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب ایمر جنسی ان پارلیمنٹ Emergency in parliament بھی شروع کی لیکن مکمل نہیں کر سکے اسی دوران انہوں نے ایک مضمون لکھا Emergency who were the guilty جو "السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا" میں شائع ہوا۔ میں نے اس مضمون کے کئی نکات پر اعتراضات اٹھائے جس کا انہوں نے تفصیل سے جواب دیا۔ میں نے یہ مضمون اپنے اخبار میں شائع کیا اور اس پر بڑی گرم بحث ہوئی خود انہوں نے بھی لوگوں کی باتوں کے بہت تفصیل سے جوابات دیئے۔

پھر میں ۱۹۷۸ء میں دوبارہ سری نگر گیا تو ان سے کئی بار ملاقات ہوئی۔ ان کا دفتر میری رہائش گاہ سے قریب تھا لیکن مجھے ایسا لگا کہ ان کے اندر کی آگ بجھتی جا رہی ہے۔ ان کی تیز آنکھوں میں وہ کوندتا ہوا شعلہ نہیں ہے بس راکھ ہی راکھ ہے اور اس میں دبی ہوئی کچھ چنگاریاں مجھے لوگوں نے بتایا کہ شمیم کو کینسر ہو گیا ہے۔ ایک دن میں کشمیر کے بازار میں یوں ہی ٹہل رہا تھا کہ ان سے ملاقات ہوگئی، وہ مجھے ایک دکان میں لے گئے اور کہنے لگے کہ تم میرے بارے میں اپنے اخبار میں لکھتے ہو کہ میں نے اپنے محسن سے غداری کی۔ لیکن ہمیں بتاؤ کہ یہ حکومت جب خاندانی حکومت میں تبدیل ہوگئی ہے تو کیا اس کے خلاف آواز نہ اٹھائی جائے، یہ بھی غلط کاری کر رہی ہے تو اس پر کیا خاموش رہا جائے۔ کیا ایک بھی اخبار ایسا ہے جو شیخ صاحب کے خلاف ایک لفظ نکال سکے ان پر تنقید کر سکے اور میں یہ یہی فریضہ انجام دے رہا ہوں تو کم از کم تم میری ہمت کی داد دو، تم تو خود بھی باغیانہ ذہن رکھتے ہو۔ ایک آزاد قلم کے مالک ہو، کسی بھی قیمت پر سمجھوتہ نہیں کرتے تو کم از کم تم

تو میری اس جرأت رندانہ کا ساتھ دو۔ میں ان کی جرأت کا مداح تھا لیکن شیخ صاحب کی بزرگی اور عظمت جو کئی نسلوں سے ذہن پر طاری ہے کو ذہن سے کیسے نکالتا۔ پھر انہوں نے اپنے اخبار کا شیخ صاحب کے خلاف ایک نمبر شائع کیا، میں اسے پڑھ کر ان کے زور قلم اور جرأت رندانہ کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ شمیم نے کچھ ہی دنوں کے بعد جنتا حکومت کی غلط کاریوں کے خلاف کئی زوردار مضامین لکھے تھے، جس سے جنتا پارٹی کے وزیر اعظم مرارجی ڈیسائی ان سے سخت ناراض تھے، جنتا پارٹی کی داخلی پالیسی اور منافقت کا انہوں نے پردہ چاک کر دیا تھا۔

کچھ ہی دنوں قبل مجھے معلوم ہوا تھا کہ شمیم سخت بیمار ہیں اور انہیں علاج کے لئے باہر لے جایا گیا ہے لیکن بچنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ میں سوچتا ہوں کشمیر جیسی خوب صورت سرسبز شاداب وادی کے ایک خوب صورت جوان اور زندگی سے بھرپور شخص کو کینسر کیوں کر ہوا۔ وہاں تو کینسر کے مریض علاج کے لئے جاتے ہیں اور اس کی آب و ہوا سے اچھے ہو جاتے ہیں، مگر دراصل یہ کینسر نہیں تھا یہ شمیم کی باغیانہ ذہنیت تھی جس نے انہیں کسی سے سمجھوتہ نہیں کرنے دیا۔ وہ ایک شعلہ تھے جو جلے تو پوری توانائی کے ساتھ اور پھر بجھ گئے۔ میرے ذہن میں کشمیر کا تصور جب بھی آتا ہے تو شمیم کے خیال کے بغیر نہیں آتا۔ میں کشمیر جب بھی گیا تو اس تصور کے ساتھ کہ میرا بہادر دلیر، نڈر، بیباک اور بے خوف دوست شمیم وہاں رہتا ہے لیکن اس نے اتنی جلدی جان دے دی، حالاں کہ ظلم، ناانصافی، نابرابری کے خلاف جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی، اس نے اپنا کردار ادا کر دیا اب دوسروں کو اپنا کردار ادا کرنا ہے۔ شمیم نے اپنی صاف گوئی کی بہت سزا پائی۔ اس کے اخبار کے خلاف کارروائیاں ہوئیں، اس کے اشتہارات بند ہو گئے، اسے گھر سے بے گھر ہونا پڑا،

مگر اس نے سر نہیں جھکایا۔

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
ہو گئے خاک انتہا یہ ہے

میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ اپنے اس بہادر دوست سے میں کبھی پھر نہیں مل سکوں گا۔ آج اس کی موت کی خبر سنکر اس کا سراپا میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہا ہے اس کی بہنوں، بیوی اور بچیوں سے اس نے مجھے بڑی محبت اور اپنائیت سے ملایا تھا اس وقت وہ بہت خوش تھا۔ اسے تین بچیوں کے بعد بچہ ہوا تھا۔ میں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ شمیم کی موت فطری نہیں ہے۔ زندگی سے بھرپور قہقہہ لگانے والا، جذبات سے بھرپور اداریئے لکھنے والا، کیا اتنی جلدی اتنی آسانی سے مر سکتا۔ شمیم ایک آندھی تھی، ایک شعلہ تھے، ایک طوفان تھے، دریاؤں کے دل جن سے دہل جائیں وہ طوفان۔ انہیں تین برسوں میں دم گھونٹ گھونٹ کر مار گیا۔ ان کے سچ بولنے کی اتنی بھیانک اتنی عبرتناک سزا ان لوگوں کے لئے کتنا بڑا درس ہے جو ظلم و جبر، استبداد کے خلاف لڑنا چاہتے ہیں اور سچ بولتے ہیں یا سچ بولنا چاہتے ہیں۔ شمیم کو سچ بولنے کی سزا ملی لیکن جن لوگوں کو سچائی سے پیار ہوتا ہے جو حق و صداقت کا پاس کرتے ہیں ان کے لئے یہ سزا بالکل معمولی ہے اور وہ اس سے وحشت ناک سزائیں بھگتنے کیلئے تیار رہتے ہیں۔ سچ بولنے والے کفن بردوش ہوتے ہیں۔

لیکن میں سوچتا ہوں شمیم جیسے نڈر، دلیر بے باک، بے خوف انسان اتنی جلدی مر سکتا ہے تو میرے جیسے بزدل اور کمزور حوادث کا مقابلہ کتنے دنوں کر سکیں گے اور بزدل انسانوں کو اس دنیا میں جینے کا کیا حق ہے، کیا فریب کاری، عیاری مکاری کر کے جینے سے بڑی کوئی لعنت اس دنیا میں ہے۔ ☆☆☆☆

زاہد مختار

آبلہ پائی کے سفر کا پُرعزم مسافر

یہ قلم کے ایک سپاہی کی داستان جرأت ہے کہ ایک سیاسی شخص کی انقلابی سوچ کا عکس کہ آج جب میں اس نامور اُستادِ صحافت کے بارے میں کچھ رقم کرنے کی جسارت کر رہا ہوں تو میرے سامنے دو پیکر اُبھرتے ہیں ایک کے ہاتھ میں قلم ہے جس کی نوک تلوار کی دھار سے بھی زیادہ تیز اور ایک کے ہاتھ میں خنجر ہے جو زنگ آلودہ ہے۔ قلم کی نوک پہ لفظوں کی بیباکی، سحر انگیزی اور شائستگی، شستہ گی اور سلاست کی دھار ہے لیکن وہیں دوسرے کردار کے ہاتھ میں تھمے خنجر پر سیاست کی موقع پرستی اور ستم ظریفی نے اپنا زنگ اس انداز سے بکھیرا ہے کہ اُس فولاد سے زنجیر بن سکتی ہے دودھاری تلوار نہیں...... میں جب بھی شمیم صاحب کو پڑھتا یا اب بھی پڑھتا ہوں تو مجھے ایک عجیب سی انفرادی سوچ کا احساس ہوتا ہے یوں لگتا ہے جیسے ایک قلمکار گھپ اندھیرے میں بیٹھا ہوا ہے، چاروں طرف سناٹا ہے، نہ کوئی چراغ روشن ہے اور نہ کہیں آسمان پہ چاند کا نام و نشان اور وہ قرطاس پہ کرنیں سمیٹنے کی

کوشش کر رہا ہے لیکن جب میں اِسی کردار کو منصبِ سیاست کے ایوان میں اپنے تمام اوصاف ایک جھولنے میں ڈالے ہوئے دیگر لوگوں کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملائے ہوئے دیکھتا ہوں تو نہ جانے مجھے کچھ لمحوں کے لئے ایسا کیوں لگتا ہے کہ وہ ساری کرنیں جو قرطاس پہ سجائی گئی تھیں یکلخت دامن کی جانب چنگاریوں کی صورت بڑھ رہی ہیں۔

میں نے ہمیشہ اپنی صحافتی دنیا میں قلمکار اور صحافی شمیم صاحب کا ہم پلہ کوئی نہیں پایا لیکن جہاں تک اُن کی سیاسی بصیرت کا تعلق ہے تو وہ اسے ایک عوامی خدمت کا درجہ دیتے تھے حالانکہ فروری ۱۹۶۷ء میں انتخابی معرکہ سر کرنے کے بعد جہاں ایک طرف اُنہوں نے اپنی شعلہ بیانی سے ایک مختصر سی ہی لیکن ایک بے مثال تواریخ رقم کی وہیں اُنہوں نے کچھ عرصے کے بعد خود اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ سیاسی دنیا میں مخفی اور عیاں حقائق کی تلخیاں، اُن کی بصیرت میں اضافہ کر چکی تھیں اور یوں اڑھائی سال کی ممبر اسمبلی سے وہ نہ صرف اوب گئے تھے بلکہ وہ استعفیٰ دینے کے بارے میں بھی سنجیدگی سے سوچ رہے تھے خود اُن کے الفاظ میں......

''......میں اس سوال پہ غور کر رہا ہوں کہ مجھے مستعفی ہو کر اپنے ضمیر کو مطمئن کرنا چاہئے یا اپنی بے سود جدوجہد کو جاری رکھ کر ان لوگوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے رہنا چاہئے جنہوں نے مجھے منتخب کر کے مجھ سے کچھ توقعات وابستہ کی تھیں، دوسرے الفاظ میں مجھے اپنی شکست کا باقاعدہ اعلان کر دینا چاہئے یا نہیں؟......''

(''آئینہ'' اعترافِ شکست کالم سے)

دنیا جانتی بھی ہے اور مانتی بھی کہ شمیم احمد شمیم کے اندر ایک طوفان موجزن تھا۔ وہ ایک مصلحت، یا ایک جنون یا پھر ایک خواہش کے زیر اثر اپنے قلمکار شمیم سے

نبردآزما ہو کر کچھ دیر کے لئے ایک ایسے سٹ اپ کے جُز بن چکے تھے جو اُسکی طبیعت سے میل نہیں کھاتا تھا لیکن جب جب سیاسی شمیم کے اندر چھپے صحافی شمیم نے اُسے جھنجھوڑا تو اُس نے اپنی آزاد طبیعت پر کوئی بھی قدغن قبول نہ کیا اور بادِ مخالف کی اذیت پسندی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے آخری دم تک اپنے جوان قلم کی حرارت سے قاری کے قلب و جگر کو گرمایا اور شاید اسی لئے وہ اپنی زندگی کے مختصر سفر کو پلک جھپکتے ہی پورا کر کے دنیا سے ہی اوب گئے۔

شمیم صاحب کی تحریروں میں بالعموم اور اُن کے ''آئینہ'' میں بالخصوص ایک کاٹ ہوتی تھی لیکن اُن کا نشانہ ہمیشہ اُس نظام کا بگڑا ہوا ماحول ہوتا تھا جس کے اندرون و بیرون کا اُنہوں نے باریک بینی سے مشاہدہ کیا تھا۔ اُنہیں اُس سیاست سے اور سیاسی پینترہ بازی سے اللہ واسطے کا بیر ہو چکا تھا جس نظام کے وہ ایک بار خود بھی جُز تھے۔ کچھ لوگوں کا تو یہ بھی کہنا ہے کہ جب اُوپر والوں نے اُنہیں اپنا منظورِ نظر قرار نہ دیا تو جیسے اس ''دغابازی'' کا براہ راست اثر اُن کے قلم پہ پڑا اور اُن کی نوکِ قلم سے آگ اُگلنی شروع ہوئی جس نے نہ صرف وقت کے سیاستدانوں کی نیندیں حرام کیں بلکہ آج بھی اُن کے اَن گنت جملے ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جہاں تک اردو زبان پہ اُن کی دسترس کا تعلق تھا تو اتنے برس گزرنے کے باوجود بھی یہ کہا جاسکتا تھا کہ اُن کی تحریروں میں نہ صرف ایک سائنٹفک اپروچ تھا بلکہ انسانی شعور، انسانی احساسات اور انسانی سوچ کو وہ اس طرح کریدتی تھیں کہ کبھی کبھار اُنکے ''چراغ بیگ'' نام سے لکھے گئے کالم کسی ماہر جراح کی طرح دل و جگر چیر کے نکل جاتے تھے۔ اُنہوں نے کبھی کبھار ایسے نازک اور حساس

موضوعات کا بھی اتنی اعتدال پسندی کے ساتھ احاطہ کیا ہے کہ ''ماں بیٹی کے خطوط'' ''پنڈت بھائیوں کے نام'' اور ''مسئلہ توہین قرآن'' جیسے مضامین جب آج بھی نگاہوں کے سامنے آتے ہیں تو معتبر اور موثر تحریروں کی ایک کہکشاں آج بھی ظلمت شب میں ضوفشانی کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس ضمن میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ آج بھی اردو صحافت کے حوالے سے جب کسی مدیر یا کسی اردو اخبار کا ذکر ہوتا ہے تو شمیم صاحب ''آئینہ'' اور ''چراغ بیگ'' سرفہرست نظر آتے ہیں۔ مداح تو مداح خود اُسکے حریف بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ؎

چھپا لیا جسے پت جھڑ کے زرد پتوں نے
ابھی تلک ہے بہاروں پہ حکمراں وہ شخص

یہ شمیم صاحب کی ہی پُرعزم شخصیت تھی جس نے سیاسی بہار کا بھی مشاہدہ کیا اور اختلاف کے پت جھڑ کا بھی درد سہا۔ اُنہوں نے اپنے قلم کی روانی سے کم از کم یہ بات ثابت کر دی کہ وہ نہ ایوان جاہ و حشمت میں کیف و سرور کے اسیر ہوئے تھے اور نہ محدود وسائل کے دائرے میں ''اخبار نویسی'' کرتے ہوئے اُن کے پائے جرأت میں لغزش آئی تھی۔ وہ آبلہ پائی کے ایک ایسے پُرعزم مسافر تھے جن پر بے حسی یا مایوسی کا طلسم اپنا اثر نہیں کر سکا۔ وہ ایک ایسے شخص تھے جنہوں نے اپنی تمام عمر امتحانوں میں کاٹ دی تھی ۔ وہ اپنی شکست کا اعتراف کرنے والے بھی تھے اور اپنے شان بے نیازی کے زیر اثر اپنے قلم کی کاٹ سے مخالفیں کے غرور کا پیراہن چاک چاک کرنے کے فن سے بھی آشنا تھے۔ زمانہ کسی کو رسماً یاد کرے یا محبتاً شمیم صاحب جیسا جب بھی یاد آئیگا تو وہ اپنی تحریروں کے ساتھ ہی نگاہوں کے سامنے آئے گا کیونکہ شمیم صاحب کی بے باک، جرأت مندانہ اور نشتر کی کاٹ رکھنے والی

تحریریں اُسکی زرہ بکتر نہ سہی لیکن اُس کی ایسی قبا تھی جسے وقت نے بھلے ہی تار تار کیا ہو لیکن ہر چاک گریباں نے وہ گونج پیدا کی کہ آج بھی وہ آوازیں اپنی صدائے باز گشت بکھیر رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آج بھی اُسی قبا کو زیب تن کئے ہر ذی شعور کے درِ لاشعور پر دستک دیتا ہوا دکھائی دیتے ہوئے ایسا ہی کچھ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں:

میں خزاں کی دھوپ کا آئینہ کہ میں ایک ہو کے ہزار ہوں
کہیں آنسوؤں کا ہوں قافلہ، کہیں جگنوؤں قطار ہوں

وقت نے اس صاف گو سقراط کو بھی بھلے ہی زہر کا پیالہ پینے پر مجبور کیا ہو شمیم صاحب کی زندگی بھلے ہی تنکے تنکے بکھرنے کا منظر خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی ہو لیکن اُنہوں نے جب ایک بار صاف گوئی کا دامن تھام لیا تو وہ اپنی منفرد بے باکی کے نقوش ثبت کرتے ہوئے، اُنہی جرأت طلب راہوں پر اپنے آبلہ پائی کا درد سہتے ہوئے بڑی شان سے نکلے......اور یہی قلم کے ایک سچے سپاہی کا سب سے بڑا اعزاز ہوتا ہے۔

.........☆☆☆.........

ساجد رشید

شمیم کی یادیں

''میں اسلام کے ۵ رارکان کا پابند ہوں یا نہیں ، میں روزے نماز میں دل چسپی لیتا ہوں یا نہیں یہ دوسری بات ہے۔ مگر میرا نام ہی میرے مسلمان ہونے کی ضمانت دیتا ہے، مسلمانوں کے نام جب خیرات تقسیم ہوتی ہے تو ایک ٹکڑا میرے کاسہ میں بھی آتا ہے اور جب مسلمانوں کے سینے گولی چھلنی ہوتے ہیں تو میرے سینے میں بھی ایک گولی لگتی ہے۔''

گول چہرے اور سرخ وسپید رنگت کا ایک درمیانی عمر کا آدمی جوش وخروش سے ایک جم غفیر کو جھنجوڑ رہا تھا اور لوگ آنکھیں جھکائے بغیر اُس کی آواز کی صداقت کو محسوس کرر ہے تھے۔ وہ بار بار مسلمانوں کی غفلت اور حکمران طبقے کے خلاف ان کے دماغ میں کچوکے لگا رہا تھا، اُس کی آواز اتنی تیز اور نوکیلی تھی کہ خود مجھے اپنی روح میں اترتی محسوس ہورہی تھی اور میں اس کے قریب ہی اسٹیج پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ مجھے کہاں سے شروع کرنا ہوگا، کیوں کہ جس رفتار اور جس سفاک لہجے میں وہ حاضرین کی خوابیدہ حسوں پر حملے کرر ہا تھا اس کے بعد بھی دوسرے مقرر کے پاس کہنے کیلئے کچھ باقی بچا تھا کہا؟

یہ مرد بے باک تھا؟ کشمیر کا صحافی اور نڈر رہنما شمیم احمد شمیم اور یہ سیاسی جلسہ تھا جنتا پارٹی کا جو بمبئی کے مدن پورہ علاقے میں منعقد کیا گیا تھا۔ ۱۹۷۷ء وہ سال

تھا جب ملک میں اچانک سیاسی بیداری کا احساس ہونے لگا تھا، لوگ جلسوں میں سینکڑوں میں نہیں ہزاروں کی تعداد میں شرکت کرنے لگے تھے۔ شمیم احمد شمیم سے میں اُن کے غیر جانبدار اور بیباک اخبار'' آئینہ'' کے توسط سے متعارف تھا۔ ان کے معرکتہ الآرا ایڈیٹوریل کی طنز میں ڈوبی زبان کی وجہ سے میں ان کا مداح تھا وہ جب الیکشن مہم کے سلسلے میں ایک جلسے سے دوسرے جلسہ گاہ کی طرف کوچ کرتے تو نوجوانوں کی بھیڑ ان کی گاڑی کے تعاقب میں دوڑ پڑتی۔ انہیں سننے کیلئے لوگ اتنے بے قرار رہتے کہ مائیک پر جو مقرر رہتا اس کو وہ بڑی بے دلی سے سنتے اور بار بار اپنے برابر میں بیٹھے شخص سے پوچھتے رہتے۔ شمیم احمد شمیم کب بولیں گے؟

شمیم احمد شمیم پیشہ ور مولوی قسم کے مقرّروں میں سے نہیں تھے جو اپنی تقریروں میں مذہب اور قومیت کے نام پر زہر افشانی کرتے ہیں اور بھیڑ میں بیٹھی ناخواندہ اکثریت کے جذبات کو بھڑکانے کے لئے اچھی مثالیں دے کر تالیاں پٹواتے ہیں، شمیم احمد شمیم کی میں نے اب تک جتنی بھی تقریریں سنی ہیں، میں نے محسوس کیا ہے کہ انہیں حاضرین کی تالیوں کی نہیں بلکہ ان کے دلوں کی گہرائیوں میں اپنی بات اتارنے کی فکر ہوئی تھی وہ محلاتی سیاست کی لطیفے بازی پر حقائق اور اعداد وشمار کو اوّلیت دیتے تھے۔

وہ صحیح معنوں میں جمہوریت کی بقا کے ایک زبردست سپاہی تھے۔ انہوں نے خود غرضی اور موقع پرستی کی سیاست سے اپنے بے داغ دامن کو کبھی بھی آلودہ نہیں ہونے دیا، جس کا ایک جیتا جاگتا ثبوت شیخ محمد عبداللہ سے ان کے نظریاتی اختلاف بھی ہے ۱۹۷۲ء میں شیخ عبداللہ اور اندرا گاندھی کی ریاست کشمیر کے کردار کے سلسلے میں جو طویل گفت وشنید ہوئی تھی اس کے روح رواں شمیم احمد شمیم ہی تھے لیکن شیخ

صاحب کے اقتدار سنبھالنے کے بعد شمیم کی اُن سے ٹھن گئی۔ جس کے نتیجے میں انہیں صبر آزما معاشی آزمائشوں سے گزرنا پڑا اس کے باوجود اس کے قلم اور زبان کی طنزیہ کٹار گند نہ ہوسکی جس کا کشمیر کی حکمران جماعت کو ہمیشہ دکھ رہے گا۔

شمیم نے اپنی ۴۵ سال کی مختصر سی زندگی میں ہی اپنی ذات میں ایک انجمن کی حیثیت اختیار کر لی تھی ۔انہوں نے بڑی تنگدستی کے حالات میں بھی عزم وہمت کے ساتھ تعلیم حاصل کی، کشمیر کے محکمہ اطلاعات کے ماہنامہ ''تعمیر'' کے مدیر مقرر ہوئے، شمیم نے اس خشک سرکاری اطلاع نامے کو بہت جلد ایک متحرک ادبی مجلّہ بنادیا، ان کے قلم کی جولانی کو دیکھتے ہوئے انہیں ترقی دے کر پہلے کلچرل آفیسر اور پھر فیلڈ آفیسر بنایا گیا۔ اس کے بعد اقتدار کے ایوان میں کھلبلی سی مچی کہ اس نوجون کی پرواز ان حدوں کو چھورہی ہے جہاں شہتیر بھی جل جایا کرتے ہیں تب بخشی غلام محمد نے شمیم کو اپنے عتاب سے واقف کرایا۔ ۱۹۶۴ء میں شمیم نے اپنا ذاتی اخبار ''آئینہ'' جاری کیا اور یہیں سے شمیم کی زندگی اُس تیز روز نامے میں بدل گئی جو اپنے ساتھ بڑے بڑے شہتیروں کو بھی خش وخاشاک کی طرح بہالے جاتا ہے۔ شمیم اسمبلی سے پارلیمنٹ تک پہنچے اور اپنی شعلہ بیان تقریروں سے پارلیمنٹ کے ایوان کو لرزادیا۔

آج شمیم ہمارے درمیان نہیں ہے ۔اب صرف ان کی نوکیلی آواز کی بازگشت ہی رہ گئی ہے جس کو وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو اپنے احساسات کو بیدار رکھتے ہیں ۔ایسے حالات میں جبکہ ملک بے پناہ مسائل سے دوچار ہے شمیم جیسے بےلوث اور صالح کردار صحافی اور سیاسی رہنما کا اُٹھ جانا کیا کسی بڑے المیہ سے کم ہے؟

..........☆☆☆..........

سیّد تصدق حسین

پیدائشی باغی

لوگ کہتے ہیں شمیم کو بے موت وقت آگئی۔ میں یہ کہتا ہوں کہ شمیم کو پاکر موت کو بھی زندگی مل گئی۔ شمیم کی زندگی برق ورعد کی طرح حالات کے اندھیروں میں کوندتی گرجتی رہی۔ وہ گنبد کی صداؤں کی طرح زندگی کے آئینہ خانوں میں گونجتی رہی۔ وہ بجلیوں کے طوفانوں کی طرح کشمیری سماج کے تیرہ خاکدان کو منور کرتی رہی، اُس کی پہلودار شخصیت کے ہر مستور گوشے میں بھی ایک معرکہ آرا محشر عمل تڑپ رہا تھا اُس کی آواز کے سائے بے زبانوں کی پناہ گاہیں تھیں، اُس کی جنبش قلم میں دل ناصبور کی سیمابی تھی۔ ۔ایک اضطراب تھا ایک اضطرار تھا جو اظہار چاہتا تھا۔ وہ بے کسوں کی بے کسی کو بغاوت سکھانا چاہتا تھا۔ وہ مظلوموں کی مظلومیت کو آتش فشانوں کی آتش فشانی دینا چاہتا تھا وہ چیرہ دستوں کی چیرہ دستیوں سے اُن کا غرور چھین لینا چاہتا تھا وہ لوح مقدر پر لکھا ہر حرف ناتمام ''بغاوت'' تھا اور سچ تو یہ ہے کہ بغاوت کا دوسرا نام شمیم تھا۔ وہ ایک پیدائشی باغی تھا اور اس کی رگوں میں خون نہیں بغاوت گردش کرتی تھی، اور اس بغاوت نے اسے بڑی بڑی عصر حاضر کی شخصیات سے برسرپیکار کر دیا تھا۔ بمبئی ہسپتال سے ۱۳ر جولائی ۱۹۷۹ء کو اُس نے جو مجھے خط لکھا ہے اُس کا ایک اقتباس آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

بمبئی ہسپتال

۱۳ر جولائی ۱۹۷۹ء

ڈیر تصدق !

"میں بڑی بڑی طاقت ور شخصیات سے لڑنے کے بعد اب ایک اور اہم لڑائی لڑ رہا ہوں۔ اس کا تعلق میری زندگی اور میری موت سے ہے دل کہتا ہے کہ اس جنگ میں بھی میری فتح ہوگی، لیکن دل کا کیا کہنا دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت"

یہ ہے شمیم کی وہ شبیہہ جو اُس کے خط کے آئینے میں منعکس ہے۔ شاید شمیم کے لئے ہی ڈاکٹر اقبال نے یہ کہا تھا۔

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

اس کی تقریر میں دریاؤں کی روانی تھی اُس کے الفاظ میں جاگتا جادو تھا۔ اس کے بولنے کے انداز میں آبشاروں کا زور تھا اور بجلیوں کی کڑک تھی، کوندوں کی بے تابی تھی۔ سیماب کا اضطرار تھا اور بے پناہ کشش تھی بارہا ایوانِ نمائندگان ہندوستان کے در و دیوار اس کی آواز سے کانپ اُٹھے، اُس کی فکر نے کتنے ذہنوں کی سیاہی کو دھو ڈالا۔ اُس کی تحریروں میں آفاق کی وسعت تھی۔ اُس کے الفاظ میں برسات کی برستی ہوئی گھٹاؤں کا زور تھا اور سورج کی جوانی کی ضیا تھی اس کی فکر میں چاند کی چاندنی جگمگاتی تھی اور اب وہ آفتاب نصف النہار کی مانند درخشاں ہوا تو موت کی گھنگھور گھٹائیں اس پر چھا گئیں۔

وہ زندگی کا رسیا تھا مگر زندگی اُسے کچوکے دیتی رہی۔ لوگ اس کی جوانی کا ماتم کرتے ہیں، لیکن جوانی اُس پر ناز کرتی رہی ہے وہ کیا ہے اُسے خود معلوم نہ تھا وہ اپنا دوست بھی تھا اور خود پسند دشمن بھی!

شمیم میرا رشتہ دار ہی نہیں میرا قریبی ساتھی بھی رہا ہے، میں نے اُس کی نفسیات کا گہرا مطالعہ کیا ہے، میں نے شمیم کو بہت قریب سے دیکھا ہے، جسے شمیم کو سمجھنا ہو اُسے شمیم کے ان شعروں کو سمجھ لینا چاہیئے۔

روزِ محشر، داورِ محشر سے بھی ٹھن جائے گی
جانتا ہوں واں بھی میری جان پر بن آئے گی
سوچتا ہوں چُپ رہوں، خاموش آخر کیوں رہوں
میری گستاخی بھی آخر کچھ نہ کچھ رنگ لائے گی

اور سچ تو یہ ہے کہ شمیم کی گستاخیاں رنگ لاتی رہیں اُس سے اپنے بھی ناراض ہوئے اور بے گانے بھی ناخوش، اُس نے کبھی کسی کو کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ایک شمشیرِ آب دار کی مانند تھا جب برستی ہے تو کوئی پناہ نہیں ہوتی۔ آئینہ کے صفحات شمیم کی بت شکنی کے گواہ ہیں۔ عصر حاضر کی فرعونوں کے لئے آئینہ کی تحریریں نیل کا سمندر تھیں۔

اس کی لازوال تحریریں سیاست دانوں کے مسخ شدہ چہروں کی سیاہی سے لکھی گئی ہیں۔ اونچی سوسائٹی کے فریب کار راہزنوں کا جھوٹا تقویٰ بھی اس کے نوکِ قلم سے پارہ پارہ ہو کر رہا ہے۔ شمیم صحافت کا محمود غزنوی تھا اور آنے والی نسلیں اُس کی تحریروں کو اَدب نہیں کشمیر کے دورِ آشوب کی جیتی جاگتی تاریخ سمجھ کر پڑھیں گی۔

شمیم کی سیاست میں بھی بغاوت تھی جو برسات کی رم جھم کی طرح سیاست دانوں پر برستی رہی، وہ زیادہ دیر کسی کا ہم سفر نہ رہ سکا...... وہ ایک شہابِ ثاقب تھا اور اب شہابِ ثاقب کی طرح فضاؤں میں کھو گیا ہے۔

کئی لوگوں کو شمیم سے کئی باتوں پر اختلاف رہا ہے، کئی لوگ اُس کی فکر جمیل کو

خواب پریشان ہی سمجھتے رہے۔ کئی لوگوں کو اُس کے خوش استقلال میں سقم بھی دکھائی دیتا رہا، کئی لوگ اُس کی آتش بیانی کی آبشار کے چھینٹوں سے اپنا دامن بھی بچاتے رہے ہیں، کئی لوگوں کو اُس کی فکر کی قوسِ قزاح میں سیاہی بھی نظر آئی ہے لیکن اس کے بدترین دشمن بھی اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ شمیم کے قلم کو خدا نے بے باکی اظہار سے نوازا تھا اُس کی زبان کو حق بات بہ بانگ دہل کہنے کی قوت عطا کی گئی تھی جس چیز کو وہ صحیح سمجھتا تھا۔ اس پر وہ ہمالہ کی چوٹیوں کی طرح ڈٹ جاتا تھا۔ اِس کی حق گوئی نے اُس کے دوستوں کو بھی اُس کا دشمن بنادیا تھا، اُس کا المیہ مولانا محمد علی جوہر کا المیہ تھا، اس کی ادبیت میں بھی پتھروں کو سلطانی ملی۔ اس کے طنز ومزاح کے جملے سنگ وخشت کی بارش معلوم ہوتے ہیں اُس کی شرربار زندگی ہماری خرمن فکر میں آگ لگاتی رہی وہ تو ایک شعلہ عریاں تھا کہ کسی بھی فریب میں آنے کو تیار نہ تھا وہ حصول جاہ کو جوتے کی نوک سے ٹھکراتا رہا اُس کی انفرادیت مرتے دم تک قائم رہی، آخری وقت تک وہ موت کو بہلاتا رہا اور موت اُس سے بہلتی رہی، میں نے اُس کے آخری ایام میں بھی اُس کے ماتھے پر مایوسی کی شکن نہیں دیکھی، وہ مرتے وقت بھی اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کی مایوسیوں پر اُمید کی کرنیں نچھاور کرتا رہا۔

لحد کی آغوش میں سویا ہوا شمیم میری یادوں کی شمیم بن گیا ہے ان لحوں کی شمیم بن گیا ہے جو میں نے اُس کے ساتھ گذارے تھے ان ساعتوں کی شمیم بن گیا ہے جو اُس کی یاد سے فروزاں ہیں۔

اُس کی لحد پر میرے آنسوؤں کی شبنم
برستی رہی ہے اور برستی رہے گی

............☆☆☆............

سیّد شجاعت بخاری

شمیم............آئینہ خانے میں

جبینِ ناز کو آلودۂ ملال نہ کر
میں بے اَدب ہوں، میری بات کا خیال نہ کر

مرحوم شمیم احمد شمیم کا نام سنتے ہی ہر ایک شخص پر ایسی کیفیت طاری ہوجاتی ہے جسے شاید لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ ایک تو یہ کہ ان کا جواں سالی میں انتقال اس ریاست کے لئے ایک قومی نقصان سے کم نہ تھا اور دوسرا یہ کہ اس دنیا میں اُن کی پُرکشش اور مرنجان مرنج شخصیّت کے نہ ہوتے ہوئے بھی ایک عجیب دبدبے کی منظر کشی ہوتی ہے اور ایک پُرخمار سا رعب طاری ہوجاتا ہے کیونکہ انہوں نے اپنے عنفوانِ شباب میں ہی اُن حکمرانوں کی نیندیں حرام کیں، جن کی طاقت کو شاید ہی کوئی چیلنج کرسکتا تھا۔ میں نے صحافت کے ایک طالبعلم کی حیثیت سے شمیم صاحب کی تحریرات کو پڑھ کر سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ان کے بارے میں کوئی حتمی رائے دینا مشکل ہے جیسا کہ انہوں نے خود بھی اپنے خاکے میں ذکر کیا ہے۔ کیونکہ اگر وہ صرف ایک صحافی ہوتے تو اسی پیرائے میں بات کی جاسکتی تھی یا اگر صرف ایک سیاست دان ہوتے تو اسی پس منظر میں ان کی شخصیت کے مختلف

پہلوؤں پر بات ہوسکتی تھی لیکن انہوں نے جس انداز اور ڈھنگ سے بیک وقت ایک صحافی، ادیب، قلمکار اور سیاستدان کی حیثیت سے اپنا سکہ جمایا تھا' اس پر قلم اُٹھانا مشکل ہے۔ بہرکیف ان کی مختصر مگر پُر جلال زندگی نے جو چھاپ اور نقش ڈالا ہے' آج تقریباً ۲۹ سال کا عرصہ گذرنے کے باوجود بھی اُس کا اثر ونفوذ زائل ہوتے دکھائی نہیں دے رہا ہے بلکہ یہ ایک موثر انداز سے دوسری نسل کو منتقل ہوتا جارہا ہے۔ ریاست جموں وکشمیر میں درجنوں کی تعداد میں صحافی ہوگذرے ہیں اور آج کی تاریخ میں اُن کا شمار کرنا بھی مشکل ہے۔ گذشتہ صدی میں بھی ہم نے ایسے صحافیوں ، ادیبوں اور سیاستدانوں کو جنم دیا جنہوں نے اپنے پیشے کو اپنی فنی صلاحیتیوں سے مالامال کیا۔ ہمارے ہاں ایسے کئی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پیشے کو وقار بخشا۔ پنڈت پریم ناتھ بزاز جیسے دانشور اور صحافی' جنہوں نے کشمیر کی تحریکِ آزادی کی حقیقی معنوں میں ترجمانی کر کے ایک منفرد مقام حاصل کیا' بھی ان میں شامل ہیں۔ اُن جیسی شخصیات نے ایک مخصوص دور میں انتہائی مشکل حالات کے بیچ لوگوں کے جذبات کی عکاسی کرنے کی ٹھان لی۔ اس فہرست میں کئی اور لوگ بھی شامل ہیں۔ مرحوم شمیم احمد شمیم بے شک مختصر سی زندگی گذار کر راہیٔ ملکِ عدم ہوئے لیکن اگر دیکھا جائے تو انہوں نے صرف دو دہائیوں میں ایک ایسی دلآویز اور مقناطیسی شخصیت کا روپ دھار لیا جس نے شاید وہ سب کچھ حاصل کر لیا تھا جو کئی لوگ زندگی کی آخری دہلیز پر پہنچنے تک حاصل کرنے کی تمنا کرتے ہیں۔ وہ صرف چالیس سال کی عمر میں ہی ہندوستان کے سب سے بڑے جمہوری ادارے یعنی پارلیمنٹ کے ممبر بنے اور ریاستی اسمبلی کے رکن رہے۔ ایک کامیاب صحافی اور ادیب کی حیثیت سے ایسے نقوش چھوڑے جن کو آج بھی صحافت کی اعلیٰ قدروں کی

بنیاد بنایا جاسکتا ہے۔ ان کی نگارشات کا مطالعہ کرتے وقت کبھی یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ صرف ایک ادیب ہیں جو مختلف سماجی مسائل کی عکاسی کرتے ہیں لیکن شمیم احمد شمیم نے جس طرح کشمیر میں صحافت کی ایک نئی سمت متعین کی اس کا مقابلہ شاید صرف مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے برگزیدہ شخصیتوں اور ادیبوں کے ان جریدوں کے مواد سے کیا جاسکتا ہے جنہوں نے برصغیر میں اس پیشے کو ایک نئی جلا بخشی۔ یہ بات شک سے بالاتر ہے کہ ہماری ریاست کیا' ہندوستان جیسا بڑا ملک بھی اب تک شمیم احمد شمیم کے ہم پلہ کوئی ایسا صحافی پیدا نہیں کرسکا جسکے قلم کی حدّت سے حکومت کے اعلیٰ ایوان لرز اُٹھے ہوں یا جس نے لوگوں کے اذہان کو جھنجھوڑنے کی ذرا بھر بھی کوشش کی ہو۔ شمیم کی زندگی کا سب سے روشن پہلو یہ ہے کہ انہوں نے بنیادی طور ایک صحافی کی حیثیت سے اپنا کام شروع کیا لیکن بعد میں ایک سماجی کارکن اور سیاستدان کا زاویۂ نظر اپنا کر بھی اپنے مقدس قلم کو جس طرح توازن میں رکھنے کا بار شک کام انہوں نے سرانجام دیا' اُس کی مثال شاید مثالوں میں بھی نہیں مل سکتی۔ اکثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ صحافی اپنے مخصوص سیاسی عقائد کو کھلے عام اظہار کرنے کی رو میں اس طرح بہہ جاتے ہیں کہ پانی کے معمولی بہاؤ سے بھی ان کا نکلنا مشکل ہوجاتا ہے۔ 'آئینہ نما' کے سات جلدوں میں ان کی نگارشات ایک ایسا امتزاج پیش کرتی ہیں کہ نہ صرف شمیم کے قلم کو صحافت کی اعلیٰ بلندیوں کو چھوتے ہوئے دیکھا جاسکتا ہے بلکہ ان کی اُردو زبان پر دسترس بھی صاف جھلکتی نظر آتی ہے۔ آج کل کے دور میں بھی ہمارے یہاں کئی صحافی نظر آئینگے جو نڈر اور بے باک ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اخلاقی اقدار اور قانون کی پاسداری کا سبق دیتے ہیں لیکن وہ اُس وقت اپنے انہی خطبوں کی سرِعام دھجیاں

اُڑاتے ہیں جب وہ معمولی سے معمولی مراعات کے بھی بھینٹ چڑھتے ہیں۔
شمیم احمد شمیم بے شک ریاست کے بلند پایہ سیاسی قائد مرحوم شیخ محمد عبداللہ کے گرویدہ رہے ہیں لیکن وقت آنے پر انہوں نے اپنے قلم کو ان کے خلاف بھی بے باکی سے اس حد تک استعمال کیا کہ کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہونے کے باوجود بھی [illegible] کی حکومت نے انہیں سرکاری کوارٹر سے زبردستی باہر کرنے میں عار نہ سمجھا۔ یہ شاید اُن کی اس کمٹمنٹ کا نتیجہ تھا جسکا انہوں نے بار بار اظہار کیا تھا۔ ان کی تحریرات پر طائیرانہ نظر ڈالنے سے بھی ان کی صلاحیتوں کا بھرپور ادارک ہوتا ہے۔ انہوں نے مزاح کا سہارا لیتے ہوئے چراغ بیگ کے قلمی نام سے جو خاکے تحریر کئے ان سے انکے ذہن کی پختگی بھرپور طریقے سے جھلکتی ہے۔ وہ براہ راست کسی بھی بڑی شخصیت پر وار کرنے سے ہچکچاتے نہیں تھے۔ شخصیات پر مشتمل ان کی تحریرات میں انہوں نے دو درجن سے زائد شخصیات کی زندگی کا خاکہ ایک منفرد انداز میں کھینچا ہے جن میں شیخ محمد عبداللہ، افضل بیگ، دینا ناتھ نادم اور محی الدین حاجنی بھی شامل ہیں۔ پروفیسر خلیق انجم نے بھی 'آئینہ نما' میں شخصیات کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان کی شخصیت بہت متنازعہ تھی لیکن ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اگر دوسروں کے بارے میں وہ سچی اور کھری باتیں کہا کرتے تھے تو خود اپنے بارے میں بھی بات کرتے ہوئے وہ کوئی کسر باقی نہیں رکھتے۔ انہوں نے جو اپنے بارے میں خاکہ لکھا ہے اس کا آغاز اس طرح سے ہوتا ہے۔ "وہ بڑا بے ایمان ہے، وہ ایک نمبر کا فراڈ ہے، وہ باتوں کا سوداگر ہے، وہ بڑا منہ پھٹ اور گستاخ ہے"، شمیم نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ان کے متعلق ایک ہی رائے پر قائم رہنا مشکل ہے۔ مرحوم شیخ محمد عبداللہ کی

شخصیت پر لکھتے ہوئے شمیم نے ان کے ایک کامیاب سیاستدان ہونے پر اپنی رائے محفوظ رکھی ہے لیکن انہوں نے اس بات کا بلند بانگ دعویٰ بھی کیا ہے کہ انہیں کشمیر سے بے پناہ عشق تھا اور وہ کشمیر کی خاطر ساری دنیا کی بادشاہی کو بھی ٹھکرا سکتے تھ [redacted] ۔شاید ایسا شمیم کے اس مشاہدے کے زمرے میں آتا جس میں وہ ان کے کامیاب سیاستدان ہونے کے بارے میں رائے زنی سے احتراز کرتے ہیں۔ بہرحال شمیم کے دوسرے خاکے بھی کشمیر کی سیاست، سماجیات، ادب اور فنون لطیفہ سے جُڑے ہوئے لوگوں کی حیات کا احوال ہے۔ شمیم نے نہ صرف سیاست اور سماج کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کی بلکہ انہوں نے ادب کے حوالے سے بھی بے پناہ خدمات انجام دی ہیں۔ تنقید، کشمیری ناول، زبان وادب، ثقافت، افسانہ نویسی، فلم اور دوسرے ایسے موضوعات پر انہوں نے سیر حاصل تبصرے کئے ہیں جو آج بھی کسی سکالر کے لئے ایک خزینے سے کم اہمیت نہیں رکھتے۔ ان کے سفرنامے جن میں "پاکستان کے چالیس دن" نہ صرف ان کی مصروفیات کا احوال بیان کرتی ہیں بلکہ پاکستان کے سیاسی، سماجی اور دوسرے حالات کا ایک منفرد جائزہ بھی پیش کرتی ہیں۔ "آئینہ نما" کے چھٹی جلد کا عنوان قرۃ العین نے پھلجڑیاں رکھا ہے اور یہ اس میں شامل تحریرات کے حوالے سے صادق آجاتا ہے۔ اس میں شامل موضوعات جیسے اسمبلی نامہ، اسمبلی کی جھلکیاں، حاضر جوابی، فقرے بازی، اعلان گمشدگی، شمیم کے قلم میں موجود ایک منفرد مزاح نگاری کا

ایک ایسا تعارف پیش کرتی ہیں جسے واقعی ایک قاری کو شمیم کی شخصیت کے بارے میں اپنی رائے قائم کرنے میں مشکلیں پیدا ہوں گی۔ شمیم کی تحریرات میں سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ آج بھی جب ہم ان کا مطالعہ کرتے ہیں تو لگتا ہے کہ شمیم زندہ ہیں اور ہمارے آس پاس اسی طرح حالات کا مشاہدہ کرر ہے ہیں جس طرح وہ آج سے چالیس سال قبل کرتے تھے۔ کیونکہ اگر سیاست کی بات کی جائے تو حالات وواقعات اور لوگوں کے کام کرنے کا ڈھنگ وہی لگتا ہے اور جس میں شاید صرف کردار ادا کرنے والوں کے نام بدل گئے ہوں۔ اسی طرح سماج کے دوسرے شعبوں میں شعبدہ بازوں، فریب کاروں اور استحصالی عناصر کی تصویر کشائی آج بھی کسی اخبار میں شائع کی جائے گی تو شاید یہ نہ لگے کہ یہ خاکہ شمیم نے آج سے چالیس سال پہلے کھینچا تھا۔ یا تو ہم بدلے نہیں ہیں یا شمیم کی نظر اتنی گہری تھی کہ ان کے رشحاتِ قلم کا آئینہ برسوں کی ایک مخصوص تصویر کھینچنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

ایک طاقتور قلمکار اور صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ شمیم ایک شعلہ بیان مقرر بھی تھے جنہوں نے اپنے جادوئی انداز سے ایوانوں کی دیواروں کو ہلا کے رکھ دیا۔ شمیم بلاشک کشمیر کے چمن کے ایک ایسے دیدہ ور تھے جنہوں نے اس قوم کی بھرپور ترجمانی کرنے کی کوشش کی لیکن بدقسمتی سے انہوں نے صحافت کے جس تناور درخت کی بنیاد اعلیٰ اقدار سے رکھی، تو وہ ان کے جانے کے بعد مرجھا گیا اور اس کے سبز پتوں سے ایک ایسا institution قائم کرنے کی کوشش نہ کی گئی جس سے ہم سالہا سال تک فیضیاب ہوسکتے تھے۔

............☆☆☆............

شمس کنول

عہدِ حاضر کا مہارانا پرتاپ

وَہ مے کدے کو جگانے وَالا وَہ رَاتوں کی نیندیں اڑانے وَالا
نہ جَانے کیا اُس کے جی مَیں آئی کہ شام ہوتے ہی گھر گیا وَہ

شادی اور موت کی خبر چوکھٹوں میں شائع کرنے کی روایت اُردو اخبارات میں عام ہے۔ مگر کسی نہ کسی وجہ سے ''گگن'' نے اس رواج کو نہیں اپنایا۔ لیکن بعض اوقات اپنے ہی بَنائے ہوئے اصول توڑنے بھی پڑتے ہیں۔ اس وقت اپنا اصول ٹوٹنے سے زیادہ ایک دوست کے چُھوٹنے کا دُکھ ہے...... ہُوا یہ کہ جولائی ۱۹۷۹ء میں مجھے اچانک شمیمؔ کا ایک خط مِلا' جو بمبئیَ ہی سے لِکھا گیا تھا..........

فلیٹ ۹۵۲۔ پونم اپارٹمنٹ A
وَرلی' بمبئیَ۔ ۹/ جولائی ۷۹ء

پیارے شمس!

پچھلے دو بلکہ تین سال سے مجھے آپ کی تاریخ، جغرافیہ اور پولیٹکل سائنس کا کوئی عِلم نہیں۔ خط لِکھنے کے لئے میرے پاس آپ کا مَوجودہ ایڈریس بھی نہیں تھا۔ اس لئے کل جا کر ایک کُتب فروش سے ''گگن'' کا ایک شمارہ خریدا۔ اس پَر درج پتے پر یہ خط آپ کو اَور شہناز کو یہ اِطلاع دَینے کے لئے لکھ رہا ہوں کہ میں موت

کے دہانے پر کھڑا ہوں۔ پچھلے دس دن سے بمبئی میں زندگی کی تلاش کر رہا ہوں۔ انجام کیا ہوگا کچھ کہہ نہیں سکتا۔

آجکل میں ڈاکٹر صاحبان کا فیصلہ صادر ہوگا۔ لیکن اصل فیصلہ اُس کے ہاتھ میں ہے جو قرآن پاک کی زبان میں الرّحمٰن والرّحیم ہے۔ میں نے بھی اپنے وجود، مستقبل اور اپنی زندگی کو اُس کے ہاتھ سونپ دیا ہے۔ سُنا ہے کافروں کی دُعا بھی کبھی کبھی قبول ہوتی ہے اِس لئے اگر آپ بھی دُعا کریں تو شاید.........

شہناز کو آداب.........آپ کا ایک پُرانا دوست...... شمیم احمد شمیم

میں اُسی شام وَرلی پہنچا اور پونم اپارٹ منٹ میں شمیم سے مِلا۔ وہ اپنے ایک کشمیری دَوست کا مہمان تھا۔ حسبِ معمول مجھے دیکھتے ہی اُس نے ایک محبت بھرا قہقہہ لگایا اور بغلگیر ہوگیا اَور پھر اُس نے بتایا کہ ٹاٹا ہسپتال کے ڈاکٹروں نے کِڈنی (گُردے) کا کینسر تشخیص کیا ہے۔ مرضِ کینسر کے متعلق ہم دَونوں بُہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ بات چیت کے اِسی سلسلے میں شمیم نے یہ بھی اظہار کیا کہ ”یار شمس! نہ جانے کیا بات ہے کہ جنوری ۱۹۷۷ء سے جو بھی قدم اُٹھا رہا ہوں وہ غلط ہی پڑ رہا ہے“! میں نے کہا کہ ”شمیم بات یہ ہے کہ ہمارا فلاں قدم غلط ہے یا دُرست، اس کا فیصلہ ہم نہیں کر سکتے، یہ تو تاریخ ہی بتاتی ہے کہ ہمارا کون سا قدم غلط اُٹھا تھا اور کون سا صحیح......اسی ملاقات میں شمیم نے مجھے شیخ صاحب اور مرار.جی ڈیسائی سے اپنی جنگ کی کہانی بھی سُنائی......اُنہی دنوں اندرا.جی سے شمیم کی جو مُلاقات ہوئی تھی اُس کا بھی ذکر اُس نے کیا......میں نے پوچھا کہ ”اب اندرا.جی کے بارے میں کیا خیال ہے؟......کہنے لگا کہ ”ایمرجنسی تو انہوں نے اپنی کُرسی ہی بچانے کے لئے لگائی تھی مگر یہ ضرور ہے کہ پچھلے ڈھائی تین برس کے عرصے میں

”ہندوستان کی ہر سیاسی پارٹی نے سیکولرازم کا سودا کیا ہے مگر اندرا نے سیکولرازم کو ابھی تک نہیں بیچا“! اتنے میں شام کے چھ بج گئے۔ شمیم نے سامنے کی میز پر رکھے ہوئے ٹرانزسٹر کو آن کیا۔ خبر آئی کہ مُرار.جی اپنی وزارت سے مستعفی ہوگئے۔ یہ سُنتے ہی شمیم کا چہرہ کِھل اُٹھا' بولا! میری زندگی میں آج کا دِن انتہائی خوشی کا دِن ہے۔! مگر دوسرے ہی پل میں اِس کا چہرہ مرجھا گیا...... ”لیکن مجھے اب اس دُنیا سے کیا لینا ہے!“ اچانک اُس کی زبان سے یہ جملہ نِکلا۔ میں نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا کہ ”میرے بھائی! یہ مرض لاعلاج نہیں ہے۔ قوتِ ارادی سے اِس کا علاج ممکن ہے۔ جتنے دن تم زندہ رہنا چاہتے ہو رہ سکتے ہو اور ابھی تو تمہیں بہت سے کام کرنے ہیں“! مگر شاید میری بات سے وہ مطمئن نہیں ہوا۔ میں نے بات کو موڑ دیتے ہوئے اُس سے کہا کہ ہاں بھئی سنو! غازی صاحب نے مجھے پچھلے دنوں بتایا تھا کہ بمبئی ہی میں ایک صاحب ہیں کہ جنھوں نے قرآنِ شریف کی چند آیتوں کو کچھ عرصے وِرد کر کے اپنے مرضِ کینسر سے نجات پائی ہے۔ انہوں نے اب دوسروں کے فائدے کے لئے ان آیتوں کے مجموعے کو ایک کتابچے کی صُورت میں سائیکلوسٹائل کروالیا ہے۔ میری بات تمام ہونے سے پہلے ہی شمیم نے کہا...... ”شمس! وہ کتابچہ مجھ کو ضرور بھیجو۔“

بمبئی کے اس قیام میں شمیم سے میری ایک ہی ملاقات ہوئی۔ دراصل ملاقات سے اگلے ہی دِن وہ بمبئی سے دہلی ہوتا ہُوا سری نگر واپس چلا گیا۔ میں نے دوسرے ہی دِن قرآن کی آیتوں سے متعلق اُس کتابچے کی ایک کاپی شمیم کے نام بھیج دی۔ میں نے شمیم کے نام ایک خط لِکھا اور پھر دُوسرا بھی۔ دونوں کے ذریعے میں نے اس کی خیریت جاننا چاہی تھی۔ میں نے کسی اور سے اسکی مہلک بیماری کا ذکر بالکل نہیں

کیا تھا۔اس نے اپنی ملاقات میں مجھ سے کہا تھا کہ...... "شمس میں تو اس دس بارہ دن میں اِس فلیٹ سے بہت کم باہر نکلا ہوں۔ سلمیٰ صدیقی کے ہاں ایک دن گیا تھا اور ایک بار پدما سچدیو سے جا کر ملا۔" اس لئے میں نے بھی یہی سوچا سمجھا کہ شمیم کے موضوع پر کسی سے فی الحال بات ہی نہ کی جائے تاکہ اس کی بیماری کی خبر دبی ہی رہے لیکن اسکے برخلاف کسی نے مجھ کو یہ خبر دی کہ "شمیم امریکہ گئے ہیں"......

یقیناً وہ آپریشن کے لئے اگست ۱۹۷۹ء میں نیویارک گیا تھا۔

دِل چاہتا تھا کہ کوئی بُری خبر نہ آئے۔ مگر ذہن کہتا تھا کہ خطرہ قریب ہے.......... کہ اچانک پہلی مئی کی شب میں پونے نو بجے آل انڈیا ریڈیو نے وہ بُری خبر سُنائی کہ جس کے سُننے کے لئے دل بالکل تیار نہیں تھا۔ بس ایسا لگا کہ پیارا شمیم پلک جھپکتے ہی ہم سے جُدا ہو گیا۔

انسان نہ ہارٹ اٹیک سے مرتا ہے نہ کینسر سے، موت کی وجہ تو بس مَوت ہی ہوتی ہے۔ پھر بھی بات یہ ہُوئی کہ شمیم نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں بیک وقت تین محاذ پر لڑائی لڑی۔ اُس نے اندرا گاندھی سے جنگ کی۔ وہ مرارجی سے بھی لڑتا رہا اور اس کا وہ معرکہ جو شیخ عبداللہ سے تعلق رکھتا ہے، وہ تو اُس کی ڈرامائی زندگی کا کلائیمکس تھا۔ زندگی کے اس آخری جہاد میں وہ مخلص بھی تھا اور سنجیدہ بھی اور اُس نے اپنی اِس سیاسی لڑائی میں اپنے وطن خطۂ کشمیر کے عوام کے لئے انتہائی جذباتی ہونے کا بھی ثبوت دیا اور جذبات کی اِس شدّت نے ہی اُس کو کینسر جیسا مہلک مرض بخشا۔

مرگِ عاشق پر فرشتہ موت کا بدنام تھا
وہ ہنسی روکے ہوئے بیٹھا تھا جس کا کام تھا

اِس آخری معرکہ میں تو شمیم نے بہُت سی تکلیفیں اُٹھائیں۔ اُس کا اخبار سرکاری اشتہارات سے محروم ہو گیا۔ اس کو اور اس کے بچوں کو گھر سے بے گھر ہونا پڑا۔ اُس نے اپنی زندگی میں اپنی ایک الیکشنی تقریر میں کہا تھا کہ...... "میں جب مروں گا تو میرے پاس بس ایک کرائے کا مکان اور زیادہ سے زیادہ ایک پُرانی سائیکل ہوگی۔" مگر اس کی بات تو ضرورت سے زیادہ سچی ثابت ہوئی...... آخری دنوں میں تو اس کے پاس کرائے کا بھی مکان نہ تھا۔ وہ پچھلے ڈیڑھ دو برس سے اپنے بال بچوں کے ساتھ اپنے ایک بہنوئی کے یہاں رہ رہا تھا۔ لیکن اپنی کسی بھی جنگ میں وہ آخری دم تک ہارا نہیں اور اس کی فتح اِس طرح ہوئی کہ وہ ٹوٹ گیا مگر جُھکا نہیں۔ اس نے زمانے کی ہر ضرب خندہ پیشانی سے بُرداشت کی اور دراصل یہی بات اسکے اعلیٰ ظرف ہونے کی دلیل تھی۔

انسان کی زندگی کو اُس کی عمر کے ماہ وسال سے ناپا نہیں جاتا اور نہ اُس کے مکان ودُکان سے تولا جاتا ہے بلکہ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ اس نے دُنیا کو کیا دیا ہے اور کِتنا دیا۔ اس لئے یہ کہنا غلط ہوگا کہ شمیم کی موت قبل از وقت ہوئی۔ اُس نے اپنی ۴۵ برس کی مختصر سی زندگی میں وہ کچھ کر دیکھایا جو دُنیا کے اکثر لوگ ۹۰ برس کی عمر پانے پر بھی نہیں کر پاتے۔ اس نے خاصی اچھی تعلیم حاصل کی۔ وکالت کا امتحان پاس کیا۔ کم عمری ہی میں اپنی ریاست کشمیر کے اُردو آرگن "تعمیر" کا ایڈیٹر بنا اور پھر خُود "آئینہ" کے نام سے ایک ہفت رَوزہ اخبار جاری کیا اور اپنے ہم عصروں کو یہ بتایا کہ Views-Paper کسے کہتے ہیں۔ وہ ایم۔ ایل۔ اے بنا اور پھر ایم۔ پی بھی۔ اس کے بعد اس نے اپنے اخبار "آئینہ" کو ہفت روزہ سے روزنامے میں بدل دیا۔ اس کی تقریر مثالی ہوتی تھی اور اسکی تحریر بے مثال تھی۔ وہ اپنے وقت میں

پارلیمنٹ کا بہترین اُردو مقرر تھا۔ وہ فصاحت، خطابت اور اندازِ بیان کا بادشاہ تھا۔ وہ روایتی طرزِ فکر کا حامل کبھی نہیں بنا۔ اس کی فکر آزاد تھی اور اسی طرح اسکی بے باکی بھی اس کی ایک صفت تھی۔ ایمرجنسی کے نفاذ پر وہ صرف شمیم ہی تھا کہ جس نے بھری پارلیمنٹ میں ایمرجنسی کیخلاف آواز اُٹھائی۔

سبھی کو جان تھی پیاری سبھی تھے لب بستہ
بس اک فراز تھا ظالم سے چُپ رہا نہ گیا

شمیم اپنی دانست میں جس بات کو صحیح سمجھتا تھا اس کے لئے وہ اپنے عزیز ترین دوست سے بھی اپنے اختلاف کا اظہار دوٹوک کر دیتا تھا۔ ایمرجنسی کے نفاذ پر اور ختم ہونے پر بھی میں نے ''گگن'' میں ایمرجنسی کے حق ہی میں لکھا تو اُس سے نہ رہا گیا۔ اس نے میرے نام ایک خط میں اپنی ناراضگی کا اظہار اس طرح کیا۔

''بمبئی میں میرے دو ہی دوست تھے۔ ایک خشونت سنگھ اور
دوسرا شمس کنول...... میری طرف سے اب یہ دونوں مر گئے!''

شمیم کا وہ خط پڑھ کر مجھے غصہ نہیں آیا بلکہ اور زیادہ پیار آیا اور خوشی ہوئی کہ وہ اپنے نظریئے کے سلسلے میں سو فیصدی مخلص ہے۔ دراصل وہ بنیادی طور پر باغی تھا۔ جذبۂ سرکشی، بے باکی اور بُت شکنی سے اُس کا سینہ معمور تھا۔ وہ سرتاپا احتجاج تھا۔ اس نے تمام زندگی سیاست کے موضوع پر لکھا اور اس کی تقریر بھی سیاسی ہی ہوتی تھی۔ مگر وہ آخری دم تک مُلک کی سیاست سے سمجھوتہ نہ کرسکا۔ سمجھوتا اس لئے نہ کرسکا کہ وہ سیاستدان نہیں تھا اور سیاست دان وہ اس لئے نہیں تھا کہ وہ ایک شریف اِنسان تھا۔

آج کی دُنیا میں بلندی پر پہنچنے کیلئے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے دولت ہو

یا عہدہ یا پھر کسی گھنے درخت کا سایہ...... مگر شمیم کو ایسا سہارا میسر نہ تھا۔ بلکہ وہ خود شیخ عبداللہ جیسے بوڑھے برگد کے لئے کتنی مدت تک ٹیکن بنا رہا۔ اس کی شعلہ فشاں تقریر اور ریلائبل (Reliable) تحریر نے شیخ صاحب کی زوال پذیر شخصیت کو بلندی بخشی۔ اس حد تک کہ مرکزی حکومت کا جمود ٹوٹا اور وہ دوبارہ اُن سے رجوع ہوئی۔ چنانچہ شمیم ہی کی رفاقت نے شیخ صاحب کو وزارتِ عظمیٰ تک پھر پہنچا دیا۔ مانو نظام سقہ نے ڈوبتے ہوئے ہمایوں کو اپنی پیٹھ پر لاد کر کنارے تک پہنچا دیا ہو...... اور جب برسرِ اقتدار آتے ہی شمیم کی اُمید کے برخلاف شیخ صاحب کنبہ پروری کے مرتکب ہونے لگے تو وہ شمیم جو حلقۂ یاراں میں ریشم تھا رزم حق و باطل میں فولاد بن گیا، نتیجے میں بے مکاں ہوا۔ کینسر جیسی مہلک بیماری میں مُبتلا ہُوا۔ جو کچھ پسِ انداز کیا تھا وہ بھی علاج کی نذر ہوا۔ اپنا حال بگڑ گیا اور بچوں کا مستقبل خطرے میں پڑ گیا لیکن پھر بھی شیرِ کشمیر کے سامنے سرنگوں نہ ہُوا۔

تپتی ریت، نکیلے کانٹے، راہیں بوجھل، منزل دُور
میرا شوقِ آبلہ پائی پھر بھی سفر آمادہ ہے

وہ تو اپنے عہد کا رانا پرتاپ تھا جس نے تخت چھوڑ کر گھاس پر سونا قبول کیا مگر مہابلی کے سامنے اپنی آن کا بلی دان نہ ہونے دیا۔

شمیم کسی مخصوص سیاسی ازم کا پابند نہیں تھا۔ کسی کا پابند ہونا اُس کے مزاج کے خلاف تھا مگر وہ سیکولر مزاج کا حامل ضرور تھا۔ اُس نے اپنے ہم وطن کشمیریوں کی فلاح کے لئے بُہت لکھا اور بُہت کچھ کہا بھی۔ لیکن وہ سچا قوم پرست تھا۔ اس کی مادری زبان کشمیری تھی مگر اُس نے اُردو زبان کی وکالت ہندوستان کے ہر علاقے میں پہنچ کر کی۔ وہ ہر طرح کے تعصب سے پاک تھا۔ ہر فرقے اور ہر علاقے کے

انسان اِس کے دوست تھے۔ کہتے ہیں کہ اسلامی حقوق و آداب کا تقاضا ہے کہ ”اپنے دوستوں کا وہ حق جو تم پَر واجب ہے ضرور ادا کرو تا کہ باہمی دوستی اور انسانی تعلق ختم نہ ہو“! چنانچہ شمیم اس معنیٰ میں بھی ایک مہذب انسان تھا۔ دُور بیٹھ کر بھی وہ اپنے دوستوں کے کام آتا تھا۔ وہ ایک متواضع انسان تھا۔ دیس ہو یا پردیس تواضع کرنے میں وہی پہل کرتا تھا۔ دراصل اس کی پختہ اور بالغ شخصیت کے پیچھے سماجی شعور اور زندگی کی سچائیاں چھپی ہُوئی تھیں۔ اس کے لہجے میں کھرا پن تھا۔ سیدھا، صاف اور قابلِ بھروسہ انداز تھا۔ وہ بتاتا تھا کہ اُسے سچائی سے پیار ہے۔ زندگی اور انسان سے پیار ہے خُدا کی ہستی اتنی پیاری تھی کہ جس سے زندگی عبارت تھی۔

شمیم صحافی تھا، سیاسی لیڈر تھا مگر اسکے باوجود اپنی اچھی بیوی کا وفا شعار شوہر بھی تھا...... اپنے چار بچوں کا فرض شناس باپ تھا۔ اپنی نیک بہنوں کا پیارا بھائی تھا۔ وہ دوستوں کا دوست تھا اور اپنے مخالفوں کا بھی بہی خواہ تھا، اس لئے جس دن وہ جُدا ہُوا۔ جس نے سُنا اُسکی آنکھ ضرور روئی...... وہ کانٹا نہیں پھول تھا اسی لئے اتنی جلدی مُرجھا گیا مگر فضا کو معطر کر گیا۔ وہ بہادر تھا اسی لئے اپنے ہمعصروں کو وہ بانکپن سے جینا سکھا گیا اور وہ سورج بھی تھا اسی لئے ہماری راہوں کو روشن کر گیا۔

آگے آگے کوئی مشعل سی لئے پھرتا تھا
ہائے کیا نام تھا اُس شخص کا پوچھا بھی نہیں

وہ شمیم تھا!

شمیم! میرے پیارے!!

تیری خوشبو، تیری بہادری اور تیری روشنی کو میرا سلام!!!!

.........☆☆☆.........

شوریدہ کاشمیری

کشمیر کا بھٹو

شمیم احمد شمیم دُنیا کے اُن چند اشخاص میں سے ہیں جن کی زندگی کا سورج عمر طبعی کے نصف النہار کے قریب پہنچ کر ہی غروب ہو گیا، لیکن اس مختصر مدّت العُمر میں انہوں نے ایسے نمایاں کام کئے، جن سے اِنکا نام ہمیشہ روشن رہے گا۔ شمیم صاحب جیسا جوانِ رعنا، شگفتہ چہرہ، یار باش، صاف گو، بذلہ سنج، حاضر جواب اور تقریر و تحریر پر یکساں قدرت رکھنے والا ادیب و صحافی اور بے باک سیاسی کھلنڈرا جب بھی یاد آتا ہے، تو اس کو مرحوم کہتے ہوئے دل کو ایک دھچکا سا لگتا ہے اور کیا دوست اور دُشمن، دونوں اُس کی مرگِ ناگہانی پر دو آنسو بہاتے ہیں۔ صیادِ اجل، کس قدر بے رحم اور وقت کا پابند ہے وہ اپنے مطلوب کو کسی نہ کسی بہانے اپنی سخت گرفت میں لے کر بزمِ گیتی سے اُٹھا لیتا ہے، لیکن کسی کے حکم کے بنا وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ خوشا وہ لوگ جو عینِ حیات اور موت دونوں کو یاد کرتے ہیں، گلزارِ ہست و بود میں کتنے پھول رونما ہوتے ہیں اور کتنے روپوش! یہ سلسلہ ازل سے ابد تک جاری ہے۔ ہائے کیا فرما گئے ہیں مرزا غالب ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

ذوق بھی کیا خوب کہہ گئے ہیں ؎

پھول تو اپنی بہار جانفزا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بِن کھلے مرجھا گئے

لیکن شمیم بِن کھلا غنچہ نہ تھا بلکہ اَدھ کھلا، جس کی بہار ہمیشہ آنکھوں میں پھرتی رہے گی۔

"حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو ادھ کھلے مُرجھا گئے"

شمیم احمد کو میں نے پہلی بار شوپیاں میں اُس وقت دیکھا جب وہ چھٹی جماعت میں زیرِ تعلیم تھا۔ قمیض اور کِٹ میں ملبوس اِس چُست و چالاک لڑکے کے بُشرے سے ذہانت و فطانت کے آثار ٹپکتے تھے اور وہ اپنے ہمجولیوں میں ہر لحاظ سے غیر معمولی نظر آتا تھا، دیکھنے والا دل میں کہتا "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات"۔ پھر وہ وقت آیا، غالباً ۵۰ء یا ۵۱ء کا سَن، جب شمیم کو میٹرک کے امتحان میں شامل ہونا تھا۔ ایک دِن اس کے والدِ بزرگ نے خواہش ظاہر کی کہ میں ان کے بچے کو جاڑے کی چھٹیوں میں امتحان کیلئے تیار کروں۔ میں نے کچھ تامل کے بعد اِثبات میں جواب دیا۔ چنانچہ شمیم میرے پاس پڑھنے کے لئے مسلسل دو مہینے شوپیاں سے پنجورہ آتا جاتا رہا۔ برف و باراں کے دوران وہ کبھی کبھی میرے یہاں ہی ٹھہرتا۔ اُس کو خصوصیت سے حساب کے مضمون میں رہبری کرنی پڑتی تھی۔ انگریزی اور اردو میں بخوبی چل سکتا تھا۔ دیگر مضامین خود تیار کرتا تھا۔ اس کے برعکس اس کے ہم سبق پنجورہ کے محمد یاسین خان کو تمام مضامین میں مکمل رہنمائی کی ضرورت تھی۔ دو مہینے کی قلیل مدّت میں وہ کیا کر سکتا۔ آخر نتیجہ کیا نِکلا؟ ایک بخیر و خوبی امتحان میں کامیاب ہو گیا، لیکن دوسرا رہ گیا۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد شمیم کو اپنے ادبی ذوق کی تسکین اور اس کی نشوونما کے لئے کالج کا آزاد اور موافق ماحول مِلا۔ اور ایس، پی، کالج سری نگر کے میگزین "پرتاپ" کے اردو سیکشن کی اِدارت بھی سنبھالی۔ ان ایّام میں کبھی کبھی شوپیاں میں وہ مجھ سے ملتے۔ محمد یوسف ٹینگ بھی ساتھ ہوتے، اور شعر و اَدب کے بارے میں گفتگو کرتے۔ موخر الذکر بھی چند برس قبل یہاں کے مڈل اسکول میں میرا شاگرد رہ چکا تھا۔ دونوں فیض احمد فیضؔ سے متاثر تھے۔ کبھی اُن کا کلام مجھ کو سناتے اور کبھی میرے اشعار سے محظوظ ہو جاتے۔ چناں چہ میری نظم "طمانچہ" کسی طرح لے اُڑائی اور اسے پہلی بار "پرتاپ" میں شائع کیا۔ ایک دن اِن دو دوستوں نے اپنی اردو نظم و نثر کے کچھ مختصر نمونے مجھ کو دکھائے۔ میں نے دونوں کو نثر لکھنے کا مشورہ دیا۔ کچھ مدّت بعد شمیم نے پہلے مرزا غالبؔ اور پھر میر غلام رسول نازکیؔ صاحب کے کلام پر سخت تنقیدی مضامین شائع کئے۔ یگانہؔ چنگیزی کی طرح غالبؔ شکنی کی، پھر نازکیؔ صاحب کے مجموعہ کلام "دیدہ تر" کو تختۂ مشق بنایا۔ یارانِ محفل کو بڑا لطف آیا۔ لیکن میں نے ایک دِن شمیم سے کہا: "بھئی! یہ کاہے کی تنقید ہے؟ آپ کسی کو خاطر میں بھی نہیں لاتے"۔ جواب میں برجستہ بولا: میں دراصل لکھنے کی مشق کرتا ہوں"۔ شوپیاں کے جواں سال باذوق اَدب نواز خواجہ غلام قادر دیوان مرحوم بھی اپنے اس دوست کے تنقیدی روّیہ اور جُولانیٔ طبع پر کچھ متبسم تھے اور کچھ حیران۔

شمیم بُنیادی طور پر اَدب کا طالب علم تھا۔ نہ جانے کالج میں سائنس کے مضامین لینے کا مشورہ اسے کس نے دیا تھا۔ جوں توں کر کے ایف، ایس، سی میں کامیابی حاصل کی لیکن بی، ایس، سی پاس نہ کر سکا۔ آخر ۵۶-۱۹۵۵ء میں علی گڑھ یونیورسٹی میں آرٹس میں داخلہ لے کر بی اے پاس کر لیا۔ میں نے اُس زمانے میں

وہیں ایم اے اُردو (پریوئس اور فائنل) کے امتحانات کے ایام میں اکثر نصف رات کو کوئی طالب علم بدر باغ کے کھُلے میدان میں چارپائی بچھائے، مچھردانی تانے اور اس کے اندر شمع یا لال ٹین فروزاں کئے پڑھنے میں مصروف نظر آتا تھا، اور وہ شمیم احمد شمیم تھا۔

بی اے پاس کرنے کے بعد شمیم نے محکمہ اطلاعات جموں وکشمیر میں کچھ مدت تک کام کیا اور ماہنامہ "تعمیر" کے اد سے وابستہ رہا۔ محمد یوسف ٹینگ بھی اس کا رفیقِ کار تھا، اُسی زمانے غالباً ۵۸ء میں میری نظم "نیرنگِ زمستان" پہلی بار "تعمیر" ہی میں چھپی لیکن دوسری نظم "وشونالہ" یہ لکھ کر واپس بھیجدی گئی کہ یہ منظوم نثر کے سوا کچھ نہیں۔ میں نے سوچا کہ یار لوگ بہت اُونچا اُڑنے لگے ہیں۔

گو کہ شمیم کو شعروادب سے ایک خاص شغف تھا، لیکن اس کی سیمابی فطرت اور عالی ہمت اُسے ادب ہی پر قائم رہنے کب دیتی؟ ملازمت کے بندھن بھی قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ اس لئے سب چھوڑ پھر علی گڈھ چلے گئے۔ اور ایل، ایل، بی میں داخلہ لیا۔ یہ غالباً ۶۴ء یا ۶۵ء کا سن تھا اور اس سلسلے میں کئی سال علی گڈھ آنا جانا رہا۔ شمیم سے کئی بار ملنے کا موقع ملا۔ اسی زمانے میں اُس نے اپنا اخبار "آئینہ" جاری کیا اور مجھے اس میں لکھنے کی دعوت دی۔ لیکن اپنے تحقیقی کام نے مجھ کو اس قدر جذب کیا تھا کہ میں کچھ لِکھ نہ سکا۔ شمیم بھی بڑی جانفشانی سے کام کرتا تھا اور یونیورسٹی میں اپنی گوناگوں خصوصیات سے بہت نمایاں تھا۔ باہمی بات چیت ہو یا مباحثہ، مناظرہ ہو یا سیمنار، وہ کسی سے دبنے والا نہ تھا۔ لیکن جب شیخ محمد عبداللہ نے حج بیت اللہ کے بعد واپس آتے ہوئے ہندوستان میں ایک طرح کا غلغلہ ڈالا، شمیم بھی بڑی حد تک متاثر ہوا، ایکدن باتوں باتوں میں کہا: "یہ شخص کشمیری ہے یا کوئی

الجیرین؟"۔ میں نے بھی اُس وقت کی سیاسی فضا سے تاثر لے کر ایک غزل کہی جسکا مطلع یہ ہے۔

جنوں میں آج ہے پھر جوش دیکھئے کیا ہو
یہ آگ جلتی ہے خاموش دیکھئے کیا ہو

شمیم اب صحافت کے علاوہ شد و مد کے ساتھ سیاست کے میدان میں بھی اُترا۔ ریاست کی آئین ساز اسمبلی کے لئے اپنے ہی قصبہ شوپیاں سے پہلی بار ۱۹۶۷ء میں الیکشن لڑا اور اپنے مدِّ مقابل خواجہ غلام حسن خان صاحب جو اس کے بزرگوں کے ہم چشموں میں سے تھے، کے خلاف شاندار کامیابی حاصل کی۔ لیکن انتخابی مہم کے دوران ان کے خلاف بہت کچھ ناگفتنی بھی کہی، کشمیر میں پروپگنڈے کی یہی روایت رہی ہے۔ اپنے حریف کو نیچا دکھانے کیلئے کیا کچھ نہیں کہا جاتا۔ بھلا شمیم جیسا بساطِ سیاست کا نو وارد اور شعلہ خُو نوجوان اپنے جوش کو کیونکر تھام لیتا۔ اے کاش ایسا نہ ہوتا۔ کیا آداب واخلاق کو ملحوظ رکھ کر زورِ بیان اور استدلال سے کام لیتے ہوئے انتخابات نہیں لڑے جاسکتے؟ اس پر اگر قومی خدمات کے لئے سچّا جذبہ اور خلوص ہو تو نور' علیٰ نور۔ غرض انتخابات کے خاتمے کے کچھ عرصہ بعد خان صاحب اور شمیم کے نام مقید مطالب کے دو الگ خط لکھنا مجھ سے نہ رہا گیا جب کہ میں گھر سے بہت دُور بھدرواہ میں تھا۔ لیکن کسی خط کا بھی جواب نہ ملا۔

اسمبلی میں چار سال شمیم کو اپنے جوہر دِکھانے اور اہل شوپیاں کی حتی الامکاں خدمت کرنے کا خُوب موقع مِلا۔ یہاں تک کہ ۱۹۷۲ء کا سال آیا اور بخشی صاحب کے خلاف پارلیمنٹ کا الیکشن لڑا، جس میں شیخ صاحب کی حمایت اور بیگم صاحبہ کی انتخابی مہم سے سرینگر میں زبردست کامیابی حاصل کی۔ ماشاء اللہ اب کی بار شمیم کشمیر

کی طرف سے بحیثیت ایک ممبر کے پارلیمنٹ ہند میں پہنچا اور وہاں بھی اپنی فطری صلاحیتوں کا موثر رول اَدا کیا۔ کچھ عرصہ تک شیخ صاحب سے اچھے تعلقات رہے۔ پھر دو ایک دراندازوں کے ہاتھوں، جیسا کہ مشہور ہے، ان تعلقات میں شگاف پڑ گئے۔ شمیم نے جوش وخروش کے ساتھ شیخ صاحب کے خلاف مہم چلائی اور اپنی جرأت رِندانہ کا خُوب مظاہرہ کیا۔ بعض لوگوں کو گِلہ ہے کہ شمیم نے شیخ صاحب سے بے وفائی کی۔

پانچ سال گزر جانے کے بعد حالات نے زبردست پلٹا کھایا۔ ۱۹۷۷ء کے پارلیمانی انتخابات میں جنتا حکومت برسرِ اقتدار آئی اور کانگریس (آئی) نے زبردست مات کھائی۔ شیخ صاحب دو سال قبل ہی اِندرا اکارڈ کے ذریعہ کشمیر کی وزارتِ اعلیٰ پر براجماں ہوگئے تھے۔ اب کی دفعہ ان کی نیشنل کانفرنس نے الیکشن میں واضح اکثریت حاصل کی۔ اس طرح ان کے عہد کی توثیق ہوئی لیکن حزبِ اختلاف کی پاؤں تلے کی زمین نِکل گئی تھی۔

دوسرے سال نومبر میں کمال احمد صدیقی کے یہاں سری نگر میں مجھے شمیم صاحب سے مِلنے کا اتفاق ہُوا۔ میں نے محسوس کیا کہ اُن کے شگفتہ چہرے پر درد و کرب کے کچھ آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ جسامت میں مقابلتاً چھوٹے لگتے تھے لیکن ہمّت کے ہیٹے نہ تھے۔ بات چیت کے دوران مسکراتے ہوئے کہا: شیخ صاحب نے سب کچھ کھالیا"۔ میں یوں گویا ہُوا: "کوئی پروانہیں کہ گرتے ہیں شہسوار ہی میدان میں مثل برق"۔

بات آئی گئی ہوگئی۔

اس زمانے میں علاّمہ اقبال کی صد سالہ سالگرہ کی تقریبات کا سِلسلہ جاری

تھا جن میں اکثر شمیم صاحب بھی شریک ہوتے تھے۔ وہ اپنے مخصوص طنز و مزاح سے ان میں گرمی پیدا کرتے اور محفل پر چھا جاتے تھے۔ یونیورسٹی کے ایک سمینار میں سردار جعفری کے مقالے پر، جس میں انہوں نے اپنی بات منوانے کیلئے "ضربِ کلیم" کے طبعِ اوّل میں کہیں جلی حروف کا سہارا لیا تھا، ایسی بے باک اور طنز سے بھرپور تنقید کی کہ محفل قہقہہ زار بن گئی۔ جعفری صاحب کی پیشانی سے پسینہ پھوٹا اور شمیم کی طاقت لسانی کا ذکر کر کے بیٹھ گئے۔ مجھے اس وقت محسوس ہوا کہ اس بوڑھے شاعر و اَدیب پر زیادتی کی گئی بلکہ اس کے حال پر رحم آیا۔ شمیم نے کئی ایسے معرکے دکھائے جن میں ان کی صاف گوئی دریدہ دہنی تک پہنچ گئی۔ کبھی کبھی اپنے بڑوں سے بھی شوخیاں کرتے تھے۔ کبھی اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے۔ اپنی گرم گفتاری کی رَو میں کسی کی دِل آزاری کی بھی پروانہ کرتے، اور دل آزاری ہی صوفی کے نزدیک سب سے بڑا گناہ ہے۔ حاضر جواب ایسے تھے کہ مخاطب کو ساکت و صامت کردیتے۔ ایکدن چھیڑنے کے لئے پروفیسر شکیل الرّحمان نے سوال کیا: شمیم! یہ سائیکل کہاں سے چُرالائی ہے"؟ فوراً جواب مِلا: جہاں سے آپ "تنقیدیں چُرالاتے ہیں"۔

سیاسی میدان میں بھی وہ اپنے حریفوں پر بے باکانہ طنز و ظرافت کے نشتر ہی نہیں بلکہ وہ تیر چلاتے، جن کی تاب لانا مشکل تھا۔ اس سلسلے میں وہ اپنے مطلب کی نئی اصطلاحات وضع کرتے۔ جماعتِ اسلامی کو بھی اپنا ہدف بنایا۔ کہتے ہیں کہ شیخ صاحب کو اس جماعت سے بدظن کرنے میں شمیم کا بھی ہاتھ تھا۔ لیکن یہ تحقیق طلب امر ہے کیونکہ وہ جو کچھ کہتے ڈنکے کی چوٹ پر کہتے۔ جوڑ توڑ کی سیاست ان کی عادت کے منافی تھی۔

۱۹۷۹ء کے اوائل میں شمیم کی بیماری کی اطلاع اور پھر علاج معالجے کے لئے امریکہ جانے کی خبر سے ان کے احباب کو بڑی تشویش ہوئی۔ مجھے ۲۷ نومبر کو اُن سے ملنے کا موقع ملا۔ پہلے پونے چار بجے اُن کے مکان پر پہنچا۔ معلوم ہوا کہ رات کی بے خوابی کی وجہ سے ذرا آنکھ لگ گئی ہے۔ اس لئے ادھر اُدھر گھومنے کے بعد پانچ بجے کے قریب پھر ان کے یہاں پہنچ گیا، اُس وقت آنکھ کھل گئی تھی۔ پلنگ کے قریب جا کر میں نے اُن سے خیر و خبر دریافت کی۔ کچھ انہوں نے پُرسان حال کیا۔ پھر دُعا کے لئے کہا۔ مجھے یہ پوچھنے کی ہمت نہ ہو سکی کہ آخر درد کیا ہے۔ اتنے میں اور ملاقاتی جمع ہو گئے جن میں عوام و خواص دونوں طرح کے لوگ تھے۔ اس مرض الموت میں بھی وہ کئی لوگوں کے کام بناتے اور اس سلسلے میں فون پر بھی بات چیت کرتے۔ محسوس نہیں ہونے دیتے کہ سرطان کے موذی مرض میں مبتلا ہیں۔ بات چیت کے بعد میں نے اُٹھنا چاہا، لیکن انہوں نے یہ کہہ کر روک لیا۔ ''تشریف رکھئے''۔ چائے پی کر چلے جایئے۔ تھوڑی دیر کے بعد چائے آ گئی اور سب کا تواضع کیا گیا۔

جاڑے میں مجھے اپنے مجموعہ کلام ''جوشِ جنوں'' کی طباعت کے لیے دلّی جانا پڑا۔ یکم مارچ ۱۹۸۰ء کو اپنے مکان اسلام آباد واپس پہنچا۔ پھر لگاتار کئی کاموں میں اُلجھا رہا یہاں تک کہ ۱۶ اپریل کا دِن آیا اور میں شمیم کی عیادت کے لیے سرینگر چلا گیا۔ وہ دھوپ میں اپنی قیام گاہ کے آنگن میں پلنگ پر لیٹے تھے۔ بہت سے ملاقاتی جمع ہو گئے تھے۔ سب کو باری باری بیمار پُرسی کی اجازت مِلی مگر صرف دو دو منٹ کے لیے۔ مجھے دو چار منٹ کے لیے اُن سے بات چیت کرنے کا موقع مِلا۔ ہائے وہ گدرایا ہوا بدن اُترا ہوا تھا۔! مجھے دیکھتے ہی میرے کلام کی اشاعت پر

مبارکباد دی۔ میں حیران ہُوا کہ اُنہیں کہاں سے پتہ چلا۔ شاید ''آفتاب'' میں اشتہار دیکھا تھا۔ میں نے پُوچھا : آپ آج کل مطالعہ کرتے ہیں کیا؟ ''مطالعہ نہ کروں تو دن بھر اور کیا کروں؟'' معاً میں نے اپنی کتاب پیش کی۔ چند ورق اُلٹنے کے بعد کہا: اچھی چھپ گئی ہے۔'' اور لوگوں کے انتظار کے پیش نظر میں نے اُن سے رخصت چاہی۔ اُنہوں نے اس بار بھی دُعا کے لیے کہا۔ دُعا صرف زبان ہی سے نہ نِکلی بلکہ قلم سے بھی جو پیش کردہ کتاب کے پیش نامہ میں درج ہے لیکن خالقِ الموت والحیات کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ یکم مئی ۱۹۸۰ء کو خبر آئی کہ شمیم احمد شمیم اس دُنیا سے چل بسے۔ اِنا للہ۔۔۔۔۔۔۔۔

مولوی عبداللہ صاحب وکیل کے پوتے' ایم۔ اے صابر ایڈیٹر ''البرق'' کے بھتیجے اور محمد یعقوب صاحب کے بیٹے شمیم احمد شمیم نے کئی چیزیں خصوصاً خوش تقریری' بذلہ سنجی اور ظرافت اپنے ان بزرگوں سے وراثت میں پائی تھی جنہوں نے دیہاتی ہوتے ہوئے بھی بہت پہلے شہر سری نگر میں اپنی وجاہت وفضیلت کا سکّہ بٹھایا تھا۔ شمیم لڑکپن ہی سے اپنی ذہانت، لسانی طاقت اور سیمابی فطرت سے سب کو متوجہ و متاثر کرتا رہا۔ ایسی پرعزم و ہمّت اور بے باکی و جرأت بھی جسکی قِسمت میں ہو وہ کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ بزم ادب ہو یا مجلس وکالت، میدان صحافت ہو یا رزم گاہ سیاست اُس نے ہر جگہ دھوم مچائی۔ یہ ضرور ہے کہ اس کے ادب پر صحافت چھا گئی پہلی بار اُس نے ادب کو صحافت اور صحافت کو ادب بنا دیا۔ اور اپنی تحریروں میں طنز و ظرافت کے ایسے شوخ نقوش چھوڑے جن کی رنگت اور آبداری اِس خاکداں کے گرد و غُبار سے ہرگز متاثر نہ ہوگی۔

شمیم نے اپنی طرفہ کاری اور گرم گفتاری سے نئی نسل کو ایک ولولہ بخشا۔ ایوانِ

حکومت میں غلغلہ ڈالا اور جوانوں میں حوصلہ پیدا کیا کہ اپنے حقوق کے لیے اربابِ حکومت سے کیسے نبرد آزما ہوا جاتا ہے۔ کشمیر میں جتنے بھی وزرائے اعلیٰ ہوئے ہیں، سب سے وہ بے باکی کے ساتھ مِلا۔ حکام سے احباب اور عوام دونوں کے کام آسانی سے بنا سکتا۔ کِسی سے ڈرتا نہ تھا۔ یہاں تک کہ موت کی آنکھوں میں بھی آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ اس متاعِ عزیز کے کھو جانے پر سب کو افسوس ہُوا اور جن کی اُمیدوں کا وہ مرکز تھا' اُن پر کوہِ غم ٹوٹا۔ عزیزوں اور دوستوں کو یقین نہیں آتا کہ شمیم اُن سے جُدا ہو گیا۔ کیا خبر تھی کہ وہ شعلہ جوالہ شعلۂ مستعجل ثابت ہوگا' لیکن اس کی آب وتاب سے جوانانِ وطن میں عموماً اور اہلِ شوپیاں میں خصوصاً' حرکت وحرارت پیدا ہوتی رہے گی۔

شمیم احمد شمیم کی موافقت اور مخالفت میں بہت کچھ کہا جائے گا۔ دراصل وہ کئی طبعی اور شخصی خصوصیات میں پاکستان کے مِسٹر بھٹو کے قریب تھا' بلکہ ان کی شخصیّت وسیاست سے متاثر بھی۔ اس لِیے اگر شمیم کو کشمیر کا بھٹو کہا جائے' شاید بے جا نہ ہوگا۔

" حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا "

شہریار

اچھے شاعر تو جوَانی میں مرا کرتے ہیں!

شاعروں کے بارے میں اَختر انصاری کا خیال "اچھے شاعر تو جوانی میں مرا کرتے ہیں" اِس حد تک صحیح ہے کہ اَدب کی تاریخ سے اِس کی تصدیق ہوتی ہے۔ لیکن کِسی سِیاسی آدمی کو اور وہ بھی آج کے زمانے کے سِیاسی آدمی کو جوانی میں مرتے کم دیکھا گیا ہے۔ شمیم احمد شمیم کا عین عالم شباب میں مرنا اِسی لئے بہت سے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا۔ یقین تو مجھے بھی نہیں آتا، اور پھر بھی سوچتا ہوں کہ شمیم نے مرنے میں قدرے تاخیر سے کام لیا۔ جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں رہ کر خدا کے وجود سے انکار کرے، بخشی غلام محمد کے مقابلے میں کھڑا ہو اور کامیاب ہو، سیاسی سطح پر معتوب شیخ عبداللہ کی وکالت کو وظیفہ بنائے، ایمرجنسی کی مخالفت پارلیمنٹ اور پارلیمنٹ کے باہر بھی کرے، جنتا پارٹی کو عوام کے احساس کا ترجمان سمجھ کر شیخ عبداللہ جیسی طاقت سے ٹکر لے، سرطان جیسے موذی مرض کا حوصلے اور ہمت سے مقابلہ کرے اور مرارجی ڈیسائی کے طعنے سنے اور اِن سب کے سَاتھ سَاتھ بلکہ ان سب کے باوجود خلیل الرحمان اعظمی جیسے گوشہ نشین شاعر کے علاج کے لئے علی گڑھ اور دہلی کے فاصلوں کو ایک کر دے، اُسے سیاسی آدمی کہنے اور سمجھنے کو جی نہیں چاہتا ہے مگر وہ ایک باشعور اور ایماندار سیاسی آدمی تھا۔ ہاں اُس کے سینے میں ایک دِل تھا جو دھڑکتا بھی تھا۔

شمیم کی عمر موت کے وقت ۴۵ سال تھی۔ میں نے شمیم کو ۵۵ ء میں دیکھا اور برتا تھا۔ یعنی اُس وقت اُن کی عمر بیس، اکیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن چال ڈھال، وضع قطع، تحریر وتقریر میں اَپنی عمر سے کہیں زیادہ بڑے تھے۔ مَرتے وقت تو اُنکا قد اَپنے بزرگوں سے بہت بلند تھا۔

شمیم پہلی بار علی گڑھ آئے تو اپنے ساتھ مختلف لوگوں کے سفارشی خطوط اور تعارفی چٹھیاں لائے۔ خلیل الرحمان اعظمی کے نام سہیل عظیم آبادی کا خط تھا، جس میں شمیم کے سچے مخلص اور ذہین آدمی ہونے کی گواہی دی گئی تھی اور روشن مستقبل کی پیش گوئی کی گئی تھی۔ خلیل صاحب نے کچھ تو اِس خط کی وجہ سے اور کچھ نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کرنے کے اپنے رویّے کی وجہ سے شمیم کا بڑی خندہ پیشانی سے اِستقبال کیا۔ انجمنِ ترقی پسند مصنفین کی مجلس منتظمہ کا رُکن یا شاید جوائنٹ سیکریٹری منتخب کرادیا۔ ایک رکن میں بھی منتخب ہوا۔ شمیم بڑی پابندی سے انجمن کے جلسوں میں شریک ہوتے۔ ادب پاروں اور ادبی مسائل پر بڑے سلجھے ہوئے انداز میں بحث ومباحثہ میں حصہ لیتے۔ شمیم اُس زمانے میں بڑے جوشیلے آدمی تھے۔ اُن کی بعض باتوں اور خیالات میں کچھ لوگوں نے الحاد کے آثار بھی دیکھے اور متوقع ردِ عمل کا اظہار کیا۔ شمیم نے بڑی دلیری سے اس کا مقابلہ کیا۔

شمیم تعلیم کا پہلا مرحلہ طے کرنے کے بعد سرینگر واپس چلے گئے اور ماہنامہ 'تعمیر' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ پہلے شمارے کے مندرجات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شمیم کو ہر مکتبہ خیال کا تعاون حاصل تھا۔ اداریوں، تبصروں، مضامین اور رسالے کی ترتیب میں شمیم ہر جگہ شریکِ غالب رہے۔ سری نگر میں اُردو کے کئی بلند پایہ ادیب موجود تھے۔ آصف اصغر علی فیضی کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ شمیم

کا ان سب سے ربط ضبط تھا۔ ۵۸ء میں جب خلیل صاحب کے ساتھ سرینگر گیا تو شمیم کو اور بھی کچھ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ کمال احمد صدیقی کے گھر کے وہ ایک فرد تھے۔ صبح' دوپہر' شام کو تو آتے ہی تھے۔ موقع ملتا تو بیچ میں بھی پھیرا لگا لیتے۔ میں تقریباً ایک ماہ سرینگر میں رہا۔ شمیم سے بلا ناغہ ہر روز ملاقات ہوتی اور روز کسی نہ کسی مسئلہ پر تبادلہ خیال ہوتا۔ میرا رول اکثر سامع کا ہوتا۔ خلیل صاحب، کمال بھائی، فیضی صاحب اور سہیل صاحب شمیم کے مخاطب ہوتے یا ان کے سامع۔ بات گفتگو سے شروع ہوتی اور تقریر پر ختم ہوتی۔ اُردو الفاظ جب ساتھ چھوڑ دیتے تو بامحاورہ انگریزی کا استعمال شروع ہوجاتا۔ شدید سے شدید اختلافی مسائل پر گفتگو کرتے وقت بھی شمیم کے چہرے کی شادابی برقرار رہتی۔ میں نے شمیم جیسے شاداب لوگ کم دیکھے ہیں۔ بذلہ سنجی، حاضر جوابی اور ظرافت شمیم کی گفتگو اور تقریر دونوں میں ایک خوشگوار تناسب میں موجود رہتیں۔ ''تعمیر'' کی ادارت کے بعد شمیم فیلڈ پبلسٹی آفیسر ہوگئے اور پھر ایک دن معلوم ہوا کہ اُنہوں نے ملازمت سے لمبی چھٹی لے لی ہے اور ایل ایل بی کرنے علی گڑھ آگئے ہیں۔

اس بار شمیم ذرا مختلف شان سے آئے۔ وہ تو طالب علم ہی بنے رہنا چاہتے تھے لیکن ان کو 'بہت خاص آدمی' کی حیثیت دِی گئی۔ یونین کے پلیٹ فارم پر وہ پھر بھی طالب علم ہی بنے رہے۔ اردو اور انگریزی کے عام تقریری مقابلوں میں دھڑا دھڑ انعام حاصل کرتے رہے۔ ایل ایل بی کے پہلے سال میں داخلہ لیا اور علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر منتخب ہوئے۔ ایم۔ اے اُردو کی تکمیل کے بغیر واپس سرینگر چلے گئے۔ وہاں جا کر نوکری سے مستعفی ہوگئے اور وکالت شروع کردی۔ پھر آزاد اُمیدوار کی حیثیت میں شوپیاں سے اسمبلی کے رُکن چن لئے گئے۔ شمیم کی ،

جولانیوں کے لئے یہ مناسب جگہ تھی۔ اب کشمیر اسمبلی کے اجلاس کی کارروائی بھی قومی روزناموں میں جگہ پانے لگی اور اس کارروائی میں شمیم کا زیادہ سے زیادہ رول ہوتا۔

شمیم کی شخصیت نے کشمیر کے نوجوانوں کو خاص طور سے متاثر کیا۔ میں جب بھی ان سے ملا، یہ ذہین جوان، نوجوانوں میں گھرے ہوئے پایا۔ اکثر نوجوانوں کو تو حرکات و سکنات میں بھی شمیم کا اتباع کرتے ہوئے دیکھا۔ ان میں سے بعض آج کشمیر میں بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔ ان کی گفتگو، چال ڈھال اور بہت سے رویے شمیم کی دین ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض اِس بات کو چھپانے کے لئے شمیم کے شدید مخالف ہوگئے ہیں۔ اُس زمانے میں شمیم نے ’آئینہ‘ نکالا۔ یہ ہفتہ وار پیدا ہوا تھا لیکن اب ایک بلند پایہ روزنامہ کی حیثیت سے پھل پھول رہا ہے۔ (آئینہ برسوں سے بند ہو چکا ہے) شمیم کی اس یادگار کو جاری رہنا چاہئے کہ یہ حق گوئی اور بے باکی کی علامت ہے۔ ہمارا معاشرہ ان اقدار کا قصیدہ خواں ضرور ہے لیکن نہ تو ان کو برتتا ہے اور نہ کسی کو برتتے ہوئے دیکھتا ہے۔ ایسی صورت حال میں اس کی اشاعت اور بھی ضروری ہوجاتی ہے۔

۱۹۶۹ء میں ریڈیو سرینگر کی طرف سے ایک بہت بڑا مشاعرہ ہوا۔ ہندوستان کے کونے کونے سے شاعر آئے تھے۔ فراقؔ صاحب، مخدومؔ، سردار جعفریؔ، پروفیسر آل احمد سرورؔ، منیب الرحمٰن، خلیل الرحمٰن اعظمی، وحید اختر، شاذ تمکنت، بلراج کومل، عادل منصوری اور اس نیازمند کے علاوہ بھی بہت سے شاعر مدعو کئے گئے۔ اس تاریخی مشاعرے سے بعض تاریخی واقعات وابستہ ہیں۔ ایک واقعہ شمیم کے گھر کی ایک دعوت بھی ہے۔ جس میں مخدومؔ، خلیل صاحب، شاذ، وحید اختر اور میں موجود تھے۔ کچھ ایسی باتیں ہوئیں کہ شمیم ملول بھی ہوئے اور کچھ خفا بھی۔ مگر رات کی بات رات ہی کو ختم ہوگئی۔ صبح سب یوں ملے کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہ

تھا۔ مخدوم مرحوم سے کچھ دنوں کے بعد دہلی میں ملاقات ہوئی تو وہ اس رات کو دیر تک یاد کرتے رہے۔

شمیم اپنے گھر والوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ان کی ایک بہن کی شادی میں شرکت کا اِتفاق مجھے بھی ہوا ہے۔ پورے کشمیر کو ایک جگہ جمع کر لیا تھا۔ ایسا اہتمام اور انتظام میں نے کسی شادی میں آج تک نہیں دیکھا ہے۔

شمیم سے ۱۹۷۹ء کے آخر تک برابر ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ کبھی سرینگر میں، کبھی جموں، کبھی کلکتہ میں، کبھی دہلی اور کبھی علی گڑھ میں۔ پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوجانے کے بعد شمیم کی مقبولیت میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ سیاسی مسائل پر ان کے خیالات اور قومی معاملات میں ان کی سوجھ بوجھ کا اعتراف ہونے لگا۔ لیکن شمیم کے انسانی رویے ویسے ہی باقی اور برقرار رہے۔ ہم جیسے لوگوں سے ملتے وقت وہ کچھ زیادہ ہی احتیاط اور انکسار برتتے۔ جموں میں ایک نوجوان شاعر سے منتظمین کی بدسلوکی پر شمیم نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ وزیر اعلیٰ سیّد میر قاسم کو بیچ میں آنا پڑا اور نوجوان شاعر وزیر اعلیٰ کے خصوصی مہمان رہے۔ اسی طرح جب شمیم صاحب کو خلیل صاحب کے پروفیسر نہ ہونے کی خبر ملی تو خسرو صاحب (وائس چانسلر) کو سخت خط لکھا اور آکر ذاتی طور پر ملاقات بھی کی۔ خلیل صاحب کی بیماری کی اطلاع پاتے ہی علی گڑھ آئے اور اُن کے معالج سے رائے مشورہ کیا۔ آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ میڈیکل سائنسز میں اپنی نگرانی میں تمام ضروری ٹیسٹ کروائے۔ نہ کوئی پریشانی ہونے دی اور نہ کچھ خرچ! شمیم کے اس عمل نے مجھے کس قدر متاثر کیا بیان نہیں کرسکتا۔ بعد میں شمیم خود سرطان کے موذی مرض میں مبتلا ہوگئے۔ انگلستان اور امریکہ کے ان کے سفر کی خبریں ملتی رہیں۔ کبھی معلوم ہوتا کہ وہ خطرے کی زد

سے باہر آ گئے اور کبھی معلوم ہوتا کہ اِن کی حالت تشویشناک ہے۔ اور پھر ایک دِن یہ معلوم ہوا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہم سے رخصت ہو گئے ہیں۔ سرور صاحب جو اپنے جذبات کو اظہار نہ کرنے پر قادر ہیں' شمیم کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے اکثر جذباتی ہو جاتے تھے۔ ابھی پچھلے دنوں چھٹیوں میں جب انہیں شمیم کے ہاتھوں کا لِکھا ہوا خط مِلا' تو وہ بہت خوش ہوئے' ہر شخص سے انکا ذکر کرتے۔ اور اب ترقی اُردو بورڈ کی میٹنگ میں علی گڑھ آئے تو بہت اداس تھے۔ شمیم کی شخصیت میں نہ جانے کون سا جادو تھا کہ میں سرور صاحب کو صحیح معنوں میں اداس ہوتے ہوئے دیکھا۔

شمیم صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک ایسے طالب علم تھے' جس پر یونیورسٹی بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ ۶۰ء سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایک مسلہ بنی ہوئی ہے۔ اور اس مسلہ سے یونیورسٹی کے سابق طالب عِلم ہی نہیں وہ لوگ بھی بقدر ظرف فائدہ اُٹھا رہے ہیں جن کا یونیورسٹی سے کوئی جائز یا ناجائز تعلق کبھی بھی نہیں رہا۔ شمیم نے علی گڑھ سے محبت کی لیکن اُس محبت کی تجارت نہیں کی۔ کاش علی گڑھ والے شمیم کی اِس خوبی کی قدر کر سکتے اور علی گڑھ میں کوئی مناسب یادگار قائم کر سکتے۔

شمیم کی زندگی کے آخری دن بے سکونی میں گزرے۔ شمیم جیسے لوگوں کا یہ مقدر بھی ہوتا ہے۔ ہم جیسے لوگ صرف دیکھتے رَہتے۔ بہت ہوا تھوڑی سی عبرت حاصل کر لی اور بس ...... مگر وہ جواَب ہم میں نہیں ہے۔ اُس کی زندگی بھی رشک کے قابل تھی اور موت بھی!

گلشن میں جوشِ گل تو بگولا ہیں دَشت میں
اہلِ جنوں جہاں بھی رَہے آن سے رَہے

......☆☆......

ظریف احمد ظریف

شمیم صاحب کی حاضر جوابی

شمیم صاحب جس خانوادے کے چشم و چراغ تھے، ان کے اسلاف کا اثر و رسوخ براہ راست کشمیر کی سیاسی، سماجی بدحالی اور استحصال کرنے والے اُن بے ضمیر اور قوم دشمن عناصر کی نقاب کشائی اور نشاندہی کرنا تھا جنہوں نے ذاتی مفاد کے لئے ڈوگرہ شاہی ظلم و جبر کی پشت پناہی کی۔ شمیم صاحب کے دادا مولوی محمد عبداللہ شوپیاں کے علاقے آسنور میں رہتے تھے، لیکن بعد میں شہر سری نگر کے فتح کدل قلمدان پورہ میں سکونت اختیار کر لی۔ ان کے ایک فرزند محمد یعقوب اپنے ہی علاقہ آسنور میں دوکانداری کرتے تھے، ان ہی کے فرزندِ ارجمند شمیم احمد تھے جو بعد میں ادبی، علمی اور صحافتی کارناموں کی وجہ سے برصغیر ہند و پاک میں شمیم احمد شمیم کے نام سے جانے گئے۔ افسوس کشمیر کا یہ دُرِ بے بہا موذی مرض کے سبب ۱۹۸۰ء میں ۴۵ سال کی عمر میں اس حیاتِ فانی سے رخصت ہو گئے۔

۱۹۶۶ء میں جب میری تعیناتی محکمہ اطلاعات میں بحیثیتِ سکرپٹ رائیٹر ہوئی، تو وہیں پر شمیم صاحب سے تعارف ہوا۔ میرے والد محترم غلام محی الدین شاہ اور شمیم احمد شمیم کے بہنوئی خواجہ عبدالسلام پارمو کے ایک دوسرے سے اچھے

تعلقات تھے۔ دونوں میں تجارتی، دینی اور سماجی معاملات میں ہم آہنگی ہونے کی وجہ سے میرے والد صاحب پارمو صاحب کے گھر چمر دور (زینہ کدل) آتے رہتے تھے۔ اکثر و بیشتر میں، بچپن میں والد صاحب کے ساتھ رہتا تھا۔ تو جب بھی پارمو صاحب اور والد صاحب کے درمیان گفت و شنید ہوتی اور میں انکی بذلہ سنجی اور دانائی کی باتیں سن کر باریک بینی سے اُس وقت چل رہی سبز سیاست، قحط سالی، سماجی اور دینی معاملات پر بحث و مباحثہ کرتے ہوئے سنتا۔ ان موضوعات پر آج بھی میری یادداشت میں کچھ باتیں محفوظ ہیں اور گاہے گاہے کبھی سیاسی، سماجی اور ادبی محفلوں میں "یادِ ماضی" کی ورق گردانی کرتا ہوں تو سننے والے بھی محظوظ ہوتے ہیں جس سے میں ذہنی لذّت محسوس کرتا ہوں۔

پارمو صاحب کی زینہ کدل چوک میں جوتے کی دوکان تھی، جو بعد میں شہرِ خاص میں ایک "درباری بیٹھک" بن گئی۔ اس جگہ پر اُس زمانے کے سرکردہ عالم، نامور سیاسی، مذہبی، سماجی، تجارتی، ادبی اور تعلیمی ماہر، زیرک اور دانا ہندو مسلمان ایک جگہ بیٹھ کر کشمیر کے تجارتی، سماجی معاملات اور مسائل پر غور و خوض کرتے تھے۔ اکثر و بیشتر ماضی کی تلخ یادوں اور مستقبل کے خوابوں کی افہام و تفہیم ہوتی تھی اور یہیں پر وادی کے تاجران نے ایک کمیٹی بنائی، جس کا نام "ٹریڈرس فیڈریشن" رکھا گیا۔ جو آج اتنے سال کے گزرنے کے بعد بھی اپنا ایک وجود رکھتی ہے۔ اس فیڈریشن کے پہلے صدر پروفیسر پنڈت مدن لال (پرنسپل گاندھی کالج سری نگر) اور جنرل سیکرٹری خواجہ عبدالسلام پارمو منتخب ہوئے۔ انی مشہور و معروف، دکان نما دیوان خانے میں شمیم احمد شمیم اکثر و بیشتر آتے رہتے اور اپنے مخصوص انداز میں لیڈروں والی فکر انگیز تقریر کرتے اور سننے والے ہمہ تن و گوش محظوظ ہوتے۔ اس دکان پر میں

والد صاحب کی وفات کے بعد بھی آتا رہتا اور ایک آدھ گھنٹہ بیٹھکر مختلف ادا خیال لوگوں کی سیاسی، سماجی اور تاریخی باتیں سن کر بہت متاثر ہوتا، ان اصحاب کے کچھ نام آج بھی میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ جن میں اس دُکان کے مشہورِ زماں مالک اور معزز شہری خواجہ عبدالسلام پارمو، گاندھی کالج کے پرنسپل پروفیسر پنڈت مدن لال، اسلامیہ ہائی سکول راجوری کدل کے سیکرٹری جنرل مولوی محمد یحییٰ شاہ، مولوی محمد شاہ، مرحوم میر واعظ محمد یوسف شاہ، وکیل برادران عبدالحمید وکیل، عبدالمجید وکیل، خواجہ غلام محمد بانڈے (مہاراج گنج) صدر باپار منڈل مہاراج گنج خواجہ عبدالعزیز میر (کومہ) سماجی، ملی، تجارتی اور ادبی شخصیت خواجہ غلام رسول کاوسہ، خواجہ نور محمد بٹ (کتاب) مالِک دُکان (غلام محمد نور محمد تاجرانِ کتب مہاراج گنج سرینگر) معروف تاجر غلام احمد منتو و علی محمد منتو، حاجی محمد شفیع کول پنڈت دامودر شاہ آبادی، حاجی عبدالرحیم دلال (وازہ) قاضی برادران قاضی بشیر احمد، قاضی عبدالرشید (مہاراج گنج) محمد امین صدیقی (ڈب تل) المعروف ترکی، مہاراج کرشن ماما صاحب وغیرہ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ وادی کے سرکردہ تاجر اپنے کاروبار کے درپیش معاملات و مسائل کے حل کے لئے غور و خوض کرتے۔

۱۹۷۴ء ایک دفعہ میں اسی دُکان پر بیٹھا پارمو صاحب سے محو گفتگو تھا کہ مرحوم شمیم صاحب بھی آگئے۔ خیر و عافیت پوچھنے کے بعد میں نے کہا، شمیم صاحب سنا ہے اندرا گاندھی شیخ صاحب کو کشمیر کا اقتدار سونپنے پر تیار ہو گئی ہیں۔ یہ خبر سنتے ہی شمیم صاحب نے لاپروائی سے جواب دیتے ہوئے کہا کہ یہ کونسی سے خبر سنا رہے ہو۔ میں نے برجستہ جواب دیا کہ شہر و گام میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی ہے۔ شمیم صاحب نے طنزاً یہ کہا کہ زینہ کدل کی خبر میں ہاتھ ہوتے ہیں اور نہ ہی

پاؤں بلکہ یہ کوڑے دان پر پڑی جھوٹی خبر ہے۔ یہ کام صرف افواہ بازوں کا ہے۔ This is all rough stuff میں نے جواباً کہا کہ حضرت ہر خبر کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ آپ بھی تو اسی مقام سے ہو کر پارلیمنٹ کے ایوانوں میں داخل ہو گئے۔ اور تو اور کیچڑ سے ہی کنول کھلتے ہیں۔ شمیم صاحب نے بات کاٹتے ہوئے کہا کہ تم بھی دن میں خواب دیکھنے لگے ہو۔

جب ۱۹۷۵ء میں شیخ اندرا اکارڈ ہوا، اور شیخ صاحب کو ریاست کا وزیر اعلیٰ مقرر کیا گیا، تو شمیم صاحب مجھے پھر اسی دکان پر ملے۔ تو میں نے موقعہ غنیمت جان کر شمیم صاحب سے پوچھا، جناب یاد ہے جب میں نے آپ سے ایک سال پہلے کہا تھا کہ حکومت ہند شیخ صاحب کو پھر کشمیر کا اقتدار سونپ رہی ہے۔ تو آپ نے کہا تھا کہ زینہ کدل کی خبر میں ہاتھ ہوتے ہیں اور نہ ہی پاؤں۔ آج آپ کا کیا موقف ہے۔ شمیم صاحب نے نہایت سادگی سے کہا کہ میں اپنے وہ الفاظ واپس لیتا ہوں۔

ابھی انہوں نے اعتراف کیا ہی تھا کہ میں نے ایک اور بات چھیڑ دی کہ شمیم صاحب کشمیر کا الحاق پاکستان سے بہتر رہتا، جس کے لئے آپ کے بزرگوں نے ترکِ وطن ہونا قبول کیا اور شیخ صاحب نے بھارت کے ساتھ الحاق کر کے اپنے سارے مخالفین ملک بدر کئے یا قید خانے میں ڈال دیئے۔ کس کی رائے کشمیر کے متعلق صحیح تھی۔ شمیم صاحب درجواب بولے کہ تم نے جیالال کیلم کا نام سنا ہے میں نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے کہا کہ نام سنا ہے۔ انہوں نے مزید تفصیل دیتے ہوئے کہا کہ وہ ایک بڑے وکیل اور نیشنل کانفرنس کے طرفدار تھے۔ ان کو عدالت میں کسی نے حسبِ روایت خیر وعافیت پوچھی تو کیلم صاحب نے خوش اسلوبی سے جواب دیا۔ پھر خیر و عافیت پوچھنے والے نے مزید پوچھا کہ گھر میں

سب ٹھیک ہیں۔ تو کیلم صاحب کو بہت غصہ آیا اور کہا تم کو مجھ سے رسم وراہ ہے میرے گھر والوں کے متعلق کیوں پوچھ رہے ہو۔ یہ حکایت سنانے کے بعد شمیم صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے کہ تم مجھ پر میرے آباواجداد کی رائے کیوں ٹھونس رہے ہو۔ میرے متعلق جو رائے قائم کرنی ہے وہ میرے خیالات جان کر کرو۔

۱۹۶۸ء میں سرینگر میں بھارتی سوتنتر پارٹی نے ایک شاخ کھولی، جس کو ایک چالاک اور خوبصورت خاتون چلا رہی تھی۔ یہ خاتون اصل میں اُوبرائے گروپ آف ہوٹلس کی دختر نیک تھی، جو سارے ہندوپاک میں فائیو سٹار ہوٹل کا ایک منظم نظام چلا رہے تھے۔ اس پُرکشش اور ذہین خاتون کو شمیم احمد شمیم کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے۔ اسی نوزائد پارٹی کے باقی ممبران ریذیڈنسی پر واقع ڈارلی فوٹو گرافر کی دکان پر جمع ہوتے۔ جس میں عبدالوحید رینہ (رینہ واری)، شریف الدین (پٹن کشمیر) محمد یوسف ٹینگ (جواہر نگر)، غلام نبی خیال (سری نگر) وغیرہ، کچھ معروف اور کچھ غیر معروف پنجابی اور کشمیری ان دنوں اس نوزائد پارٹی کو کشمیر میں متعارف کرنے کے لئے تگ ودو کرنے میں مشغول تھے۔ مگر یہ پارٹی صرف اُوبرائے ہوٹل کے احاطے تک ہی محدود تھی۔

ان ہی دنوں کی بات ہے جب شمیم احمد شمیم کے مقبول عام وخاص اخبار "آئینہ" کی سالگرہ منانے کے لئے کشمیر کے سیاسی، سماجی، مذہبی پیشوا، صحافی، شاعر، وکیل اور دانشور اوبرائے ہوٹل کے احاطے میں جمع ہوئے تھے، جن میں خصوصی طور پر میرواعظ مولوی محمد فاروق آخر تک خندہ پیشانی کے ساتھ محو کلام رہے اخبار "آئینہ" کا سالنامہ اجراء کرتے ہوئے سبھی حضرات نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس سالنامے میں ایک طنزیہ کالم "چراغ بیگ کے قلم سے" میں بعنوان

"میر قاسم کی افضل بیگی" بھی موجود تھا۔ جو آج بھی شمیم نواز اور عاشقانِ آئینہ کے پاس موجود ہوگا۔ ان ہی دنوں ہم "شمیم گل" کے نام سے ایک ادبی اخبار نکال رہے تھے۔ جس کو چلانے میں میرے ساتھ محمد یوسف خان (عادل)، حفیظ اللہ قریشی (جو اس خبار کے ایڈیٹر بھی تھے)، اسسٹنٹ ایڈیٹر نذیر احمد قاضی قابلِ ذکر ہیں۔

ان دنوں میں ریاستی محکمۂ اطلاعات کے تمدنی شعبہ میں بحیثیت سٹاف آرٹسٹ (سکرپٹ رائٹر) ملازم تھا، اس لئے اخبار میں قلمی ناموں "ابوالجاوید" اور "کستور پربتی" کے نام سے نظم ونثر لکھتا تھا۔ سوتنتر پارٹی والوں نے ہمیں اس اخبار کو پارٹی کا ترجمان بنانے کے لئے کہا۔ اس کے عوض وہ معقول معاوضہ دینے پر بھی تیار تھے۔ نہ جانے کیوں مجھے اس بات سے اتفاق نہ ہوا، جو آج بھی میرے لئے ایک معمہ بنا ہوا ہے؟ جبکہ یہ اخبار بعد میں آٹھ مہینوں کے قلیل مدت میں ہی سرکاری پابندی کی وجہ سے بند ہوگیا۔

اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ان دنوں غیر ریاستی فرقہ پرستوں نے انجینئرنگ کالج میں زیرِ تعلیم کشمیری لڑکوں پر تشدد اور مار پیٹ کرنا شروع کر دیا، جس سے بہت سے کشمیری طالب علم زخمی ہوگئے۔ اس فساد سے شہر کا پُر امن ماحول متاثر ہونے لگا۔ لیکن لوگوں نے بڑے صبر وشکیب کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس فساد کا سامنا کیا۔ جوں ہی ہم نے اس سازش کے پس پردہ ہونے والے محرکات پر اخبار میں لکھنا شروع کیا اور کچھ خبروں کو مصدقہ اطلاعات کی بنا پر جلی حروف میں جگہ دی۔ کاتب صاحب نے کم علمی اور غیر سنجیدگی سے "بلوائی" کی جگہ "حلوائی" لکھا۔ جس پر متعلقہ حکام نے سخت نوٹس لیا۔ ایڈیٹر، اسسٹنٹ ایڈیٹر، پرنٹر پبلشر اور پروف ریڈر کے نام سمن جاری کر دیا، ان دنوں یہاں مسٹر بینرجی (بنگالی) چیف سکریٹری اور

انور کریم (سندھی) ڈویژنل کمشنر تھے۔ میں نے خود کو بحیثیت پروف ریڈر پیش کر کے اس غلطی کا اعتراف کیا اور معافی نامہ پیش کیا۔ اُس کے بعد میں نے اخبار نویسی سے توبہ کی، جب بھی مجھے یہ دن یاد آتے ہیں تو عجیب بے چینی محسوس کرتا ہوں۔

شمیم صاحب "آئینہ" کی سالگرہ کے موقعہ پر اخبارِ آفتاب کے دفتر میں داخل ہوئے۔ خواجہ ثناءاللہ بٹ کے پاس اس وقت جگن ناتھ ستھو، سورگیہ چمن لال چمن، بنسی نردوش اور میں بیٹھے تھے۔ شمیم صاحب نے اپنے خاص انداز سے بھی حضرات سے مصافحہ کیا اور مجھے دیکھ کر برجستہ کہا "بکر" اور "بٹہ" بزدل اور مصلحت پسند ہوتے ہیں اور فخراً اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ میں شیر ہوں۔ اسی دوران خواجہ صاحب نے کہا شمیم صاحب سنا ہے کہ آپ کو سوتنتر پارٹی کا پردھان بنایا جارہا ہے یہ سنتے ہی شمیم صاحب نے در جواب کہا کہ کیا میں بجلی کا کھمبا ہوں جو ایک ہی جگہ رہ کر سڑ جاؤں اور معمولی ہوا کے جھونکے سے گر جاؤں۔

My name is Shameem Ahmad Shameem.
Tell me some positive and constructive news,
I am a young man , always in hurry.

یہ باتیں یاد کر کے کشمیر کے بے مثال، نڈر، صحافی، مقرر، دانشور اور وقت شناس سیاست دان کی ذہنی اختراعوں کی خوشبو سے جسم وجاں معطر ہو جاتا ہے۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

(کشمیری سے ترجمہ: سلیم سالک)

☆★☆

ظفر اقبال منہاس

شمیم احمد شمیم

'چند یادیں نغمہ زن ہیں خیمۂ دل کے قریب'

یکم مئی ۱۹۸۰ء کو شمیم احمد شمیم صرف ۴۵ سال کی عمر میں وفات پا گئے۔ یوں آرزوؤں، امیدوں اور امکانات کی ایک دُنیا نہس نہس ہو کر رہ گئی۔ شمیم کی وفات کو اب بیس سال ہو چکے ہیں لیکن ایسا لگتا ہے گویا یہ کل کی بات ہو۔

شمیم مرحوم کو میں نے پہلی بار ۱۹۶۷ء میں دیکھا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، جنوری کا مہینہ تھا، ساری وادی' خاص کر بالائی علاقے برف کی سفید چادر میں ڈھکے ہوئے تھے، شوپیان سے چار کلومیٹر کی دوری پر ہمارا گاؤں' سڑک وغیرہ کی سہولت سے محروم تھا، پیدل آمد و رفت کا راستہ بڑی مشکل سے کھل پایا تھا، صبح سے ہی ہمارے ہاں خوب چہل پہل تھی، کچھ لوگ مکان کے صحن سے برف ہٹا رہے تھے اور بعض دیگر کاموں میں جُٹے ہوئے، اُس روز پہلی بار میں الیکشن، ووٹ اور اُمیدوار جیسی اصطلاحوں سے واقف ہوا، بڑے بزرگوں کو آپس میں باتیں کرتے سُنا۔ جو میں سمجھ پایا وہ بس یہ تھا کہ کوئی شمیم احمد نام کا نوجوان ہے جو وکیل ہے، اُس نے شوپیان کی دو معروف ترین شخصیات خواجہ عبدالمجید بانڈے اور خواجہ غلام حسن

خان کے مقابلے میں الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا ہے اور استعارے کی زبان میں نارِ نمرود میں ہاتھ ڈالا ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ آزاد امیدوار ہے۔ اگرچہ جہاندیدہ اور تجربہ کار بڑے بوڑھوں کے خیال میں یہ سراسر حماقت اور خودکشی تھی، تاہم جواں سال حضرات کا جوش و جذبہ دیدنی تھا۔ اگلے روز شوپیان کے بازار میں شمیم کی تقریر سُننے والے دو تین اصحاب مزے لے لے کر دوسروں کو وہ سب کچھ بڑھا چڑھا کر سُنا رہے تھے جو اُنہوں نے اپنے کانوں سے سُنا تھا۔ ایک صاحب کہہ رہے تھے، ارے بھئی یہ تو شیر کا بچہ ہے شیر کا بچہ۔ اُس نے پولیس والوں کی موجودگی میں اعلان کر دیا کہ وہ تب تک چین سے نہیں بیٹھے گا جب تک شیرِ کشمیر کو جیل سے رہا نہ کرا لے اور اُس نے ڈنکے کی چوٹ پر اندرا گاندھی' غلام محمد صادق اور میر قاسم کو للکارا کر کہا کہ یہ ملک لوگوں کا ہے اُن کے باپ دادا کی وراثت نہیں ہے وغیرہ۔ غرض دن کے دو ڈھائی بجے مہمانِ خصوصی تشریف آور ہوئے، اُن کے ساتھ تیس چالیس افراد ہوں گے۔ خیر مقدم کرنے والے بھی میرے اندازے کے مطابق دو تین سو لوگ رہے ہوں گے، تاہم جوں ہی مہمان اور میزبان آمنے سامنے ہوئے، زوردار نعروں سے فضا گونج اُٹھی۔ دوسری طرف نوجوانوں کی ٹولی جن میں، میں بھی شریک تھا، الگ سے نعرے بازی کرنے لگی۔ سیاہی مائل اُونی اوور کوٹ، سر پر Fur والی ٹوپی، آنکھوں پر عینک، شوپیان کے مشہور زمانہ امری سیبوں جیسے گال' مردانہ حُسن و وجاہت کا قابلِ رشک نمونہ، شمیم احمد شمیم اب ہمارے سامنے تھا۔ آتے ہی اُنہوں نے تقریر شروع کر دی۔ ساتویں جماعت کا دیہاتی طالب علم اُن دنوں بھلا تقریر کے حُسن و قبح کو کیا سمجھتا، تاہم اتنا اچھی طرح یاد ہے کہ اُنہوں نے کانگریس پارٹی کے ساتھ ساتھ اس کی لیڈرشپ کو خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ تقریر

کے اختتام پر بوڑھی کانگریس اور بوڑھا امیدوار سبھوں کی زبان پر تھا۔ شمیم کے ساتھ یہ پہلا تعارف تھا' اس کے بعد جب تک وہ جئے اُن کے بارے میں پل پل کی خبر رکھنا' اُن کے نظریات اور خیالات کی من پسند اور حسین تاویلات کرنا، اُن کے دوستوں اور دشمنوں کو بن دیکھے اپنا دوست اور دشمن سمجھنا شیوہ ٹھہرا اور آج جب اُن کے بارے میں کچھ لکھنے بیٹھا ہوں تو اِس مخمصے میں ہوں کہ بات کہاں سے شروع کی جائے۔ اُن کی زندگی کے کس گوشے پر روشنی ڈالی جائے' یہ بجائے خود ایک مسئلہ ہے کیونکہ شمیم کسی ایک فرد کا نام نہ تھا بلکہ پروفیسر آل احمد سرور کے بقول، وہ 'اپنے آپ میں ایک انجمن تھے'۔

مقرر شمیم، قلمکار شمیم، سیاست کار شمیم، جانباز شمیم، بہادر نڈر شمیم' ادیب اور صحافی شمیم، پالیمنٹرین شمیم، خاکہ نگار شمیم، دوست شمیم' غرض کس کس پہلو کا ذکر کیا جائے' کہیں وہ ہوا کا تازہ جھونکا تھا اور کہیں شعلہ جوالا بن کر لپکا، اُس کی مسیحائی کی یاد تازہ کروں یا پھر اُس جرّاح کو خراجِ عقیدت پیش کروں، جس نے سماج کے جسم کے جس انگ پر پھوڑا دیکھا' فوراً نشتر ہاتھ میں اُٹھالیا اور کبھی کبھی بلکہ بارہا اس نشتر زنی کے دوران اپنی انگلیوں کو بھی زخمی کرڈالا۔ شمیم نے اپنی عملی سیاسی زندگی کا آغاز شوپیان سے کیا۔ ۱۹۶۷ء میں اُنہوں نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے الیکشن ہی نہیں جیتا بلکہ ''کشمیر کی الیکشنی'' سیاست کی تاریخ رقم کر دی۔ میں بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ ۱۹۶۷ء سے ۱۹۸۰ء کے دوران شوپیان کی نوجوان نسل پر اگر کوئی رنگ چڑھا تو وہ شمیم کا رنگ تھا۔ یوں تو آئے دن اس ملک میں الیکشن ہوتے ہی ہیں، اور ان کے دوران دھاندلیاں اور ہیرا پھیری معمول ہے لیکن میری دانست کی حد تک شمیم واحد شخص ہے جس نے اپنے الیکشن کو ایک تاریخی حیثیت عطا کر دی اور

اُسے غیر معمولی بنا دیا۔ اُنہوں نے انتخابی جنگ کے حوالے سے آپ بیتی لکھ کر گویا کشمیر میں بھارتی جمہوریت کی تاریخ رقم کر دی ہے۔ اتنا ہی نہیں انتخابی جنگ کے کئی کردار ایک اعتبار سے لافانی بن گئے ہیں۔ یہ محض ایک روداد نہیں بلکہ اُس فرسودہ اور کورپٹ نظام پر ایک گہری چوٹ ہے جہاں جمہوریت کے نام پر ڈھونگ رچایا جاتا ہے' جو ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اس ملک کے اندر سرکاری ملازم' چاہے وہ عدلیہ کا جج ہی کیوں نہ ہو حکمرانوں کی کاسہ لیسی اور حاشیہ برداری میں کس حد تک گر سکتا ہے لیکن یہ دلچسپ اور کسی جاسوسی ناول سے بھی سنسنی خیز کہانی' ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ آدمی میں ہمت و حوصلہ ہو تو اس مایوس کن اور حوصلہ شکن صورت حال میں بھی اُمید کے پھول کھلائے جا سکتے ہیں۔ اُن دنوں شمیم کا حلف نامہ چُرایا جاتا ہے' اُس کے ساتھیوں کو گرفتار کیا جاتا ہے' اُن کی داڑھیاں اور مونچھیں نوچ لی جاتی ہیں' اُس پر قاتلانہ حملے کئے جاتے ہیں لیکن وہ ہار نہیں مانتا اور جب مخالفین کا بس نہیں چلتا اور انہیں اپنی شکست نظر آتی ہے تو وہ ووٹ شماری روک دیتے ہیں لیکن شمیم کی ہمت وحوصلے کو سلام کہیئے کہ وہ سرینگر سے ہندوستان کے اُس وقت کے الیکشن کمشنر کو فون کرتا ہے اور اُس سے یوں مخاطب ہوتا ہے:

''مسٹر سُندرم میں آزاد اُمیدوار شمیم احمد شمیم کشمیر سے بول رہا ہوں۔ میں ایک جیتی ہوئی بازی ہار رہا ہوں' لہٰذا آپ برائے کرم یہاں تشریف لے آئیں''۔ سندرم جواب دیتے ہیں۔ ''مسٹر شمیم، ہندوستان اتنا بڑا ملک ہے کہ یہاں سینکڑوں حلقہ ہائے انتخاب ہیں، ایسے میں میرے لئے یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہر جگہ پہنچ پاؤں''۔ شمیم جواب دیتے ہیں'' یہ کشمیر ہے اور یہاں میری ہار بھارتی جمہوریت کی شکست ہوگی''۔ اُن کے لہجے میں نہ جانے کیا تاثیر تھی' کیا جادو تھا کہ بھارت کا الیکشن کمیشن

موم کی طرح پگھل جاتا ہے اور کہتا ہے مسٹر شمیم ٹھیک ہے میں کل کی فلائٹ سے آرہا ہوں۔ یوں بھارت کی انتخابی سیاست میں شوپیان اوّلین حلقہ انتخاب اور شمیم پہلا اور ابھی تک کا آخری امیدوار بن جاتا ہے جس کی کامیابی کا اعلان الیکشن کمیشن آف انڈیا بہ نفس نفیس کرتا ہے اور اپنی موجودگی میں ووٹ شماری کراتا ہے۔

شمیم اسمبلی میں کیا داخل ہوا کہ اسمبلی کے در و دیوار بلا مبالغہ ایک نئی دُنیا سے آشنا ہوئے۔ ریاستی ایوان اسمبلی نے بڑے بڑے مقرر اور پارلیمنٹرین دیکھے ہیں لیکن شمیم بلاشبہ اپنی مثال آپ تھے۔ اسمبلی کے بعد تقدیر نے انہیں ایک اور معرکہ سر کرنے کے لئے چنا۔ اُنہوں نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے بخشی غلام محمد کے خلاف الیکشن لڑا اور انہیں ہرا کر پارلیمنٹ میں داخل ہوئے تو اُنہوں نے کشمیر کا نام روشن کردیا، جن دنوں شمیم پارلیمنٹ کے ممبر تھے اُن دنوں تین اشخاص سب سے بہتر مقرر مانے جاتے تھے۔ انگریزی میں پیلو مودی، ہندی میں اٹل بہاری واجپائی اور اردو میں شمیم احمد شمیم۔ خوشونت سنگھ کا کہنا ہے کہ بھارتی پارلیمان اردو میں اب تک شمیم کے پائے کا کوئی دوسرا مقرر پیدا نہ کرسکی۔ قدرت نے اُسے زیادہ موقع نہیں دیا لیکن صرف چند برسوں کے اندر اندر شمیم نے پورے ملک میں اپنی شعلہ بیانی اور جرأت رندانہ کی جو دھاک بٹھادی' اُس کی بازگشت آج بھی کانوں میں رس گھولتی ہے۔

جن اُیام میں وہ پارلیمنٹ کے ممبر تھے ان ہی ایّام میں بھارتی جمہوریت کو ایمرجنسی کے عذاب سے گذرنا پڑا۔ اس دوران بڑے بڑے جگادریوں کو سانپ سونگھ گیا لیکن شمیم احمد شمیم نے اس پُل صراط کو جس پامردی اور بہادری سے پار کیا وہ اُن کا ہی خاصہ تھا۔ ایک بار اُنہوں نے اپنی روایت سے ہٹ کر انگریزی میں تقریر فرمائی۔ تقریر کیا تھی نطق کا دریا تھا۔ چنانچہ برسہا برس سے اُن کے سیاسی حریف لیکن

اُن ہی جیسے ذہین و فطین درگا پرشاد در نے اُن کی تقریر سننے کے بعد انہیں لابی سے ایک پرچی لکھ کر بھیجی' جس میں یہ لکھا گیا تھا کہ آج آپ کی تقریر دلپذیر سن کر مجھے اس بات پر فخر محسوس ہوا کہ میں کشمیری ہوں۔ ایمرجنسی کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں شمیم کو حق گوئی اور بیباکی کی گویا لت سی پڑ گئی تھی جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جانا چاہیئے کہ جب اُن کے دوست خوشونت سنگھ نے ایمرجنسی کی حمائت کی تو شمیم نے انہیں خوشامد سنگھ کہہ کر پکارنا شروع کردیا اور یہ تک کہہ دیا کہ بمبئی میں میرے صرف دو دوست تھے ایک خوشونت سنگھ اور دوسرا اشمس کنول۔ آج سے دونوں میرے لئے مر گئے۔

شمیم اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک باغی تھا۔ وہ بُت گری کے فن سے بھی آشنا تھا لیکن بت شکنی اُس کے مزاج کا خاصا تھا۔ خاص کر اپنے ہی ہاتھوں تراشے گئے بتوں کو توڑنے میں اُسے مزہ آتا تھا۔ اُس کے خیالات اشخاص اور واقعات کے بارے میں بدلتے بھی رہے' اُس کے نظریات سے کل بھی اختلاف کی گنجائش تھی اور آج بھی اُن پر حرف گیری کی جاسکتی ہے لیکن اس بات کا اعتراف اُس کے بدترین مخالفوں کو بھی ہے کہ شمیم جب کسی چیز کی حمائت میں بولا تو اُس نے بولنے کا حق ادا کردیا اور جب اُس نے کسی بات کی مخالفت کی تو وقت کا بڑے سے بڑا حاکم اور طاقت ور سے طاقت ور شخص انہیں اپنے خیالات کے دوٹوک اظہار سے باز نہ رکھ سکا۔ وہ چاہتا تو اپنے لئے آسائش و راحت کے کئی سامان بہم کرسکتا تھا لیکن وہ آشیاں بندی کے لئے پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ وہ سرتاپا حرکت و حرارت تھا۔ شمیم اگر بہادر اور نڈر تھا، اُسی قدر حساس بھی تھا، جہاں بڑے بڑے واقعات پر اُس کی نظر تھی وہیں گرد و پیش کی چھوٹی چھوٹی جزیات بھی اُس کی آنکھوں سے اُوجھل نہ رہتی تھیں شہر میں کرفیو لگا، پکڑ دھکڑ ہوئی، شمیم کے دفتر کے سامنے بیٹھ کر جوتے گانٹھنے والا

موچی سلام شیخ گرفتار ہوا تو شمیم تلملا اُٹھا، اُس نے آسمان سر پر اُٹھا لیا، اُسے رہا کرا دینا تو بڑی بات نہ تھی لیکن شمیم نے اپنے آئینہ میں اُس کی گرفتاری کو کچھ اس ڈھنگ سے بیان کیا کہ جیسے کہ اُن دنوں یہ شہر کا سب سے بڑا حادثہ رہا ہو اور یوں سلام شیخ ایک جیتا جاگتا کردار بن گیا۔ اپنی سیاسی زندگی کے دوران ڈی پی در کے ساتھ ہمیشہ ہی اُن کی چشمک رہی، وہ انہیں کشمیری سیاست کی تباہ حالی کے حوالے سے ''اصلی مجرم'' گردانتے تھے لیکن جب ڈی پی در کی وفات ہوئی تو شمیم کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار لگ گئی۔ اُنہوں نے ڈی پی در کو کچھ اس طرح یاد کیا کہ خراج عقیدت کا حق ادا کر دیا۔ صادق صاحب کی سیاست شمیم کے مزاج کے خلاف تھی لیکن اس کے باوجود وہ اُن کے علم و حلم اور جمہور نوازی کے گُن گاتے تھے۔ ایک بار اسمبلی میں تقریر کرنے کے لئے اُٹھے تو صادق صاحب سے یوں مخاطب ہوئے ''صادق صاحب خدا گواہ ہے میرے دل میں آپ کی بے پناہ عزت ہے اور میں آپ کی شرافت و وجاہت کا دل سے شیدائی ہوں لیکن صادق صاحب شرافت اور نالائقی کے بیچ نہایت باریک پردہ ہوتا ہے اس لئے مجھے ڈر ہے کہ آنے والا مورّخ کہیں آپ کو نالائق نہ لکھے۔ آئینہ کا شخصیات نمبر جن دنوں نکلا، تب شمیم مرحوم شیخ محمد عبداللہ کے زبردست قریب سمجھے جاتے تھے۔ اس کے باوجود وہ یہ لکھنے سے باز نہ رہ سکے کہ شیخ صاحب ایک خوبصورت آغاز اور ایک حسرت ناک انجام کی علامت ہیں۔ وہ ہماری امیدوں، آرزووں اور تمناوں کا مخزن بھی ہیں اور مدفن بھی''۔ اور تو اور شخصیات نمبر میں اُنہوں نے اپنی شخصیت کا جو خاکہ کھینچا ' اس کی داد دوست تو دوست دشمن بھی دینے پر مجبور ہیں۔ شمیم کی بیسوں خوبیوں میں اُن کی بزلہ سنجی، نکتہ آفرینی اور حاضر جوابی بھی اپنی مثال آپ تھی۔ صرف ایک دو مثالوں پر اکتفا

کروں گا۔ اُن کی طالب علمی کا واقعہ ہے۔ شمیم ان دنوں سرینگر کے بدنام علاقے تاشوان میں قیام پذیر تھے۔ تاشوان دوسرے لفظوں میں لاہور کی ہیرا منڈی تھا'۔ شمیم کے کسی دوست کو پتہ چلا کہ شمیم تاشوان میں ٹھہرتا ہے تو اُس نے چوٹ کرنے کے لئے پوچھا ''شمیم صاحب آپ کا ڈیرہ کہاں پر ہے''۔ شمیم نے فوراً جواب دیا۔ ''تاشوان میں'' اب دوست نے تیر چلایا۔ ''کنجروں سے کتنی دوری پر؟''۔ شمیم نے برق رفتاری لیکن نہایت معصومیت سے جواب دیا۔ ''یار بس یوں سمجھ لو تم کنجر ہو اور ہم یہاں بستے ہیں''۔ اسی طرح ایک بار ریاستی اسمبلی میں دوران تقریر جب جلال میں آئے تو ممبران اسمبلی کو چور اور بددیانت کہہ گئے۔ اس پر خاصہ ہنگامہ برپا ہوا۔ ایوان کے لیڈر غلام محمد صادق نے سپیکر سے درخواست کی کہ وہ ممبر موصوف کو اپنے الفاظ واپس لینے کے لئے کہیں۔ اسپیکر کی مداخلت پر شمیم نے اپنے الفاظ تو واپس لئے لیکن بولے۔ ''جناب اسپیکر! میں آپ کے کہنے پر اپنے الفاظ واپس تو لیتا ہوں لیکن اس مرحلے پر مجھے ایک لطیفہ یاد آ رہا ہے جو میں نے کبھی آپ ہی کی زبانی سنا تھا۔ وہ یہ کہ کوئی شخص ایک عبادت گاہ کے پاس کسی غلیظ حرکت میں مبتلا تھا۔ پاس سے دوسرا آدمی گذرا اُس نے اُس پر تھوک دیا۔ اس پر پہلا شخص بولا۔ ''مصروف ہوں ورنہ تمہیں خانۂ خدا پر تھوکنے کا مزہ چکھاتا''۔ اس مرحلے پر آنجہانی ڈی پی در نے ازراہ مذاق چوٹ کی۔ ''شمیم صاحب! کام کی وضاحت کیجئے''۔ شمیم بولے۔ ''کام کی وضاحت اس لئے نہیں کروں گا کہ میرا دوست ڈی پی در اس میں ملوث ہے''۔

اس پر ڈی پی در بولے ''آپ بھی تو اس میں شامل ہیں''۔ شمیم ایک لمحے کی تاخیر کئے بغیر پھر سے بولے ''جی ہاں! میں تھوکنے والا ہوں''۔

شمیم پاکستان گئے تھے، وہاں مرحوم بھٹو سے اُن کی ملاقات ہوئی۔ بھٹو جیسا زیرک شخص اور ڈپلومیٹ بھلا کب موقع ہاتھ سے جانے دیتا۔ بوقت رخصت شمیم سے مخاطب ہو کر کہنے لگا: ''اچھا شمیم صاحب اب سرینگر میں ملاقات ہوگی''۔ شمیم بات کو سمجھ گئے۔ فوراً جواب دیا۔ ''جی شوق سے آیئے، ہم بطور سیاح آپ کا استقبال کریں گے''۔ شمیم کی بہت ساری خوبیوں میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ بے حد روشن خیال اور غیر متعصب شخص تھے۔ وہ فرسودگی، تنگ نظری اور کوتاہ بینی سے کوسوں دُور تھے۔ ایک کشمیری پنڈت لڑکی پرمیشوری نے غلام رسول کنٹھ نامی ایک مسلمان لڑکے کے ساتھ جو اُس کے ساتھ دفتر میں کام کرتا تھا، شادی کر لی تو پورے شہر میں کہرام کھڑا ہو گیا۔ کشمیری پنڈتوں نے اسے اپنی توہین سمجھا اور جلسے جلوس نکالنے شروع کر دیئے۔ اسلام کے ٹھیکے دار بھی بھلا کب چوکنے والے تھے۔ غرض ایک طوفانِ بدتمیزی بپا ہو گیا۔ نفرت، تنگ نظری اور طرفداری کے سیلاب میں بڑے بڑے نام نہاد روشن خیال اور روادار بہہ نکلے۔ دہلی سے سرینگر تک کئی چہرے بے نقاب ہو گئے۔ اس مرحلے پر شمیم کے خارہ شگاف قلم نے دونوں فرقوں سے تعلق رکھنے والے تنگ نظر اور فتنہ پرور حضرات کی جس طرح خبر لی وہ اب تاریخ کا ایک حصہ ہے۔

شمیم نے زندگی بھر کئی محاذ کھول رکھے اور ہر محاذ پر اُنہوں نے جس طرح جھنڈے گاڑھے، اُسے دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ ''ایں سعادت بزور بازو نیست، تا نہ بخشد خدائے بخشندہ''۔ تاہم کہا جا سکتا ہے کہ اگر اُنہوں نے اپنی ساری توانائیاں کسی ایک محاذ پر وقف کر دی ہوتیں تو بلاشبہ وہ اُن بلندیوں کو چھو لیتے جو مقدر والوں کو ہی نصیب ہوتی ہیں۔ وہ ایک صاحب طرز ادیب اور صحافی تھے۔ سیاست کی دُنیا میں اُلجھ جانے کے باوجود اُنہوں نے اردو صحافت کی جو خدمت کی اور اپنے لئے جو

مقام پیدا کیا وہ خال خال ہی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ آئینہ اور مدیر آئینہ کا اردو صحافت کی پوری دُنیا میں ایک اعلیٰ مقام تو ہے ہی، تاہم ریاست کی حد تک ابھی اس میدان میں آئینہ اور صاحب آئینہ کا کوئی ثانی پیدا نہیں ہو پایا ہے۔ آئینہ کے بارے میں یہ بات اب تواتر کی حد تک پہنچ چکی ہے کہ اس کو پڑھنے والوں میں نہ صرف چاہنے والے اور شیدائی ہی شامل تھے بلکہ وہ لوگ بھی آئینہ کو پڑھے بغیر نہ رہ سکتے تھے جو آئینہ اور اس کے خالق دونوں کے شدید مخالف تھے۔ غلام محمد صادق، بخشی غلام محمد، سید میر قاسم، ڈی پی در وغیرہ آئینہ کے بلاناغہ قاری تھے۔ مرحوم شیخ صاحب کے بارے میں راقم کو ایک قریبی اور معتبر گواہ نے بتایا ہے کہ شیخ شمیم اختلافات کے دنوں میں مرحوم لیڈر ہر صبح آئینہ کا مطالعہ خاص طور پر کیا کرتے تھے۔ سیاسی دنیا سے قطع نظر آل احمد سرور ہوں یا کرشن چندر، سلمیٰ صدیقی ہو یا ساحر لدھیانوی، اے جی نورانی ہوں یا رفیق زکریا، سبھی آئینہ کی تیکھی تحریروں اور شمیم کے بیباکانہ رویّے کے مدّاح اور معترف تھے۔ شمیم کی کس کس خوبی اور کس کس اَدا کو بیان کیا جائے۔ دُنیا میں لوگ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں، یہ دنیا کا دستور ہے لیکن بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں قدرت بیک وقت کئی طرح کے گن عطا کرتی ہے۔

شمیم خوبصورت تھا، شکیل و وجیہہ، متناسب اور گٹھا ہوا جسم، گول سرخ چہرہ، گوری رنگت، گھونگریالے بال، مناسب قد و قامت اور لباس کے حسن انتخاب نے اُسے مردانہ حُسن و وقار کا ایک دلفریب نمونہ بنا دیا تھا۔ اسی طرح قدرت نے اُسے ایک خوبصورت اور مترنم آواز بھی عطا کی تھی۔ وہ بات کرتا تھا تو یوں محسوس ہوتا جیسے کہ پھول جھڑ رہے، اس پر نستعلیقی طرزِ گفتار، چاہنے والے عش عش نہ کریں اور جلنے والے نہ جلیں تو............؟

غرض وہ گفتار ورفتار اور اطوار و کردار کے لحاظ سے آفت کا پرکالہ تھا۔ بولنے پر آتا تو گھنٹوں بولتا چلا جاتا اور سُننے والوں پر سحر طاری ہو جاتا۔ لکھنے کے لئے قلم ہاتھ میں اُٹھاتا تو یوں لگتا کہ بہتے دریا کی روانی ہے۔ شمیم کی کی کوئی بھی تحریر اُٹھا کر پڑھ لیجئے کہیں پر یہ احساس نہیں ہوگا کہ وہ لفظوں کے پیچھے بھاگتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ وہ سوار ہے اور الفاظ سواری۔ یہ سب کچھ کیا کم تھا کہ شمیم کی خود اعتمادی بلا کی حد تک بڑھی ہوئی تھی۔ وہ بے جا کسرِ نفسی سے کام لینا اپنی شان کے خلاف سمجھتا تھا۔ اُسے اپنی صلاحیتوں کا ادراک بھی تھا اور احساس بھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی بھی بڑے سے بڑے شخص کے سامنے سر اُٹھا کر بات کرتا تھا اور ضرورت پڑنے پر آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے سے بھی اُسے گریز نہ تھا۔ تاہم اُن کی ساری خود اعتمادی اور خود پسندی کے باوجود مرحوم غلام رسول نازکی کا یہ تجزیہ درست دکھائی دیتا ہے کہ ''شمیم خود بین ضرور ہے پر وہ بد بین ہرگز نہیں''۔ شمیم کی ایک اور خوبی کا بیان نہ کرنا زیادتی ہوگی کہ جہاں وہ اپنے سے طاقت ور حریفوں سے پنجہ آزمائی میں لطف حاصل کرتا تھا وہیں وہ تعلقات کی دنیا میں چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی خیال رکھتا تھا۔

۱۹۷۷ء کے الیکشن میں وہ ایک بار پھر شوپیان سے الیکشن لڑ رہے تھے۔ اب کی بار عبداللہ لہر میں سب کچھ بہہ نکلا۔ میں اُن دنوں شمیم کا حامی تھا جب کہ گھر کے بزرگ حسب روایت 'نیشنلی'۔ عجب اتفاق ہے کہ جو پولنگ بوتھ شمیم کے حوالے سے میرے چارج میں تھے' وہاں میرے تایا جان این سی کے ایجنٹ تھے۔ پولنگ کے روز کی بات ہے کہ دن کے بارہ بجے مجھے شمیم کی طرف سے ایک پرچہ ملا، جس پر اُنہوں نے تحریر فرمایا تھا۔ ''ہم الیکشن ہار چکے ہیں، تم سے صرف یہ کہنا ہے کہ بہادروں کی طرح اپنے آپ کو حالات کا سامنا کرنے کے لئے تیار کرلو۔ ہاں ایک

بات کا خیال رہے کوئی ایسی حرکت نہ کرنا جو تمہارے لئے اور دیگر ساتھیوں کے لئے کانٹوں کا باعث ثابت ہو''۔ الیکشن کے بعد میں شکست کی ذِلت سے بچنے کے لئے ٹھیکیداری کی آڑ میں لداخ چلا گیا۔ شمیم صاحب کی مروّت کا یہ عالم تھا کہ وہ روز نامہ آئینہ لیہہ سے ۳۵ کلومیٹر دور کارو میں بھی مجھے مسلسل بھیجتے رہے۔ میں نے لداخ کے بارے میں اپنا تاثر یوں لکھ کر بھیجا۔ ''لداخ کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی یوں محسوس ہوا کہ جیسے میں پہلی بار انسانوں کے بجائے خدا کی زمین پر آگیا ہوں، جہاں اپنی مرضی سے سانس لے سکتا ہوں کیونکہ یہاں نہ کوئی شیرِ کشمیر ہے نہ فخرِ کشمیر، نہ مفکرِ کشمیر اور نہ آفتابِ کشمیر''۔ اس پر اُن کا جواب تھا۔ ''لداخ کی بلندیوں سے پستیوں میں بسنے والے دوست کو یاد کرنے کے لئے شکریہ۔ تم نے لداخ کی کچھ اس طرح سے تعریف کی کہ جی چاہتا ہے سب کچھ چھوڑ کر تمہارے پاس چلا آوں لیکن کیا کروں پاپی پیٹ کا سوال ہے''۔ میں نے مولانا مسعودی کے بارے میں پوچھا تھا کہ اُن کا کیا حال ہے۔ شمیم صاحب کا جواب اس بارے میں یوں تھا۔ ''تم جانتے ہو کہ میں ہمیشہ سے مولانا کی درویشانہ زندگی' اُن کی سادگی' اُن کے علم و فضل اور اُن کی ذہانت و ذکاوت کا مداح رہا ہوں لیکن تم اس بات سے بھی بے خبر نہیں ہو سکتے کہ اُن کی بے جا مصلحت پسندی اونٹ کا گوشت ہے، جس کو ہضم کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ مولانا ہر بات میں کچھوے کی چال چلتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اُن کے کان میں کسی نے یہ بات ڈال دی ہو کہ وہ خضر کی عمر رکھتے ہیں۔ یہاں حالت دوسری ہے۔ میرے پاس نہ اتنی فرصت ہے اور نہ مہلت۔ کیڑے مکوڑوں کی طرح رینگ رینگ کر اور معذوروں کی طرح ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جینا مجھے ہرگز منظور نہیں''۔

نومبر ۱۹۷۷ء میں میری شادی تھی۔ شمیم صاحب ہمارے ہاں تشریف لائے۔ محمد یوسف ٹینگ بھی اُن کے ہمراہ تھے۔ ٹینگ صاحب کا نام تو میں نے سُن رکھا تھا' تاہم جان پہچان نہ تھی۔ رخصت ہوتے وقت میں گھر سے باہر قدرے دوری تک اُن کے ساتھ آیا۔ مجھ پر ایک نظر ڈالی۔ میرے سوٹ کی خوب تعریف کی۔ یاد رہے یہ سوٹ اُنہوں نے ہی سلوایا تھا۔ اس کے بعد ٹینگ صاحب سے مخاطب ہوئے اور کہا کہ ظفر کو کہیں اکادمی میں ایڈجسٹ کردو، اس سے پہلے کہ ٹینگ صاحب ہاں یا نہ کہیں' خود ہی بولے۔ نہیں میں نے تمہیں کہا ہے کہ نوکری ہرگز نہ کرنا۔ لیکن کِسے پتہ تھا کہ ۱۹۸۴ء میں مجھے کسی اور ہی وجہ سے اکادمی میں نوکری کرنا پڑے گی۔ بہر حال شمیم صاحب ہم سے رخصت ہوئے۔ تب کیا پتہ تھا کہ وہ ہمارے ہاں آخری بار آرہے ہیں۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد وہ کچھ ایسے بیمار ہوگئے کہ پھر صحت یاب نہ ہوسکے۔ اُن کی بیماری جان لیوا ہے یہ تو معلوم تھا لیکن نہ جانے دل کیوں یہ ماننے کے لئے تیار نہ تھا کہ شمیم بھی مر سکتا ہے لیکن موت نے کسے چھوڑا ہے جو شمیم کو چھوڑتی۔

نوٹ: مضمون ھذا ۱۱ اپریل ۲۰۰۰ء میں جموں کے پریس کلب میں شمیم احمد شمیم مرحوم کے بارے میں ایک تقریب پر پڑھا گیا تھا۔ (ادارہ)

عبدالعزیز زرگر

شمیم صاحب اور احتجاج

مرحوم شمیم احمد شمیم بیسویں صدی کے ایک بلند پایہ ادیب، سیاستداں، تنقید نگار اور ایک آزاد قلم کار ۲۸ مئی ۱۹۸۰ء کو ہم سے ہمیشہ کیلئے جُدا ہوئے۔ یہ جاں سوز جدائی نا قابلِ برداشت ہے شمیم صاحب کی بے وقت موت نے اپنے شناساؤں کے دلوں کو گہرے زخم لگا دیئے، شمیم صاحب نے میرے گاؤں منز گام نور آباد سے ایک کلومیٹر کی دوری پر اپنے آبائی گاؤں آسنور میں اپنے بچپن کا ایک اہم حصہ گذارا ہے اس لئے میری شناسائی ان سے بچپن سے ہی رہی۔ بچپن سے ہی اُن کی شخصیت میں درد مندی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی لیکن استحصال کرنے والے کے خلاف اُن کی زبان چلتی رہتی تھی۔ ہر قوم کی تاریخ شاہد ہے کہ اس دنیا میں انگنت شخصیتیں کسی نہ کسی وجہ کی بنیاد پر عظیم شخصیتیں قرار دی گئی ہیں اور اُن کی تابناک عظمت کے وجوہات بھی دیئے گئے ہیں، شمیم صاحب کا آئینہ، شمیم صاحب کا تخلیقی ذہن، اُن کی قلم کاری خود اُن کی عظمت کی ایک کھلی ہوئی کتاب ہے، شمیم صاحب ابھی عالم نوجوانی میں زندگی کے مختلف تجربات سے گزر رہے تھے کہ صحافتی دنیا کے لئے نئی راہوں اور نئی سمتوں کی نشاندہی کر کے ایک نئی قسم کی طرح ڈالی۔ کشمیر کا حاکم اعلیٰ ہو یا ہندو و پاک کا، اُن کی خامیوں کی نشاندہی کرنا شمیم صاحب

کا ایک باجرأت منفرد عمل رہا۔ یہی جمہوری قدروں کی ساکھ ہے۔شمیم صاحب کو ہم ہندو پاک کے ادبی علمبرداروں میں شمار کرتے ہیں، طبعی آزادی کی کیفیت نے شمیم کو ایک حقیقت پسند، ادیب، سیاسی رہنما کی حیثیت سے پروان چڑھایا اور ساتھ ہی ساتھ خاندانی روایات کے اثرات نے ان کے دل و دماغ میں ایک انفرادیت پسندی کا جذبہ بھر دیا۔ جہاں یہ جذبہ اپنی قابلیت کی بنا پر بڑھتا گیا وہاں اس نے اپنے زورِ قلم سے اپنے لئے ایک مقام بھی پیدا کر دیا۔شمیم صاحب کبھی کبھار جذباتی بن جاتے تھے لیکن یہ روش سچائی کی محرک ہوا کرتی تھی۔

شمیم صاحب کے" آئینہ" میں جو اُن کی اپنی تحریر ہوا کرتی وہ اُن کے صحیح احساسات کی حقیقی عکاس ہوتی تھی اُن کا یہ فن ایک اثر آفرین فن بن کر ہر پڑھنے والے کا دل موہ لیتا تھا۔ انہوں نے کبھی بھی تسلیم و نیاز کے فلسفے کو قبول نہیں کیا ہے، اگر کیا ہوتا تو انہیں اتنے شدید اور پر آشوب مصائب اور خطرات کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔

مرحوم شمیم صاحب جموں وکشمیر اسمبلی میں بطور ایک معزز آزاد ممبر کی حیثیت سے حزب اختلاف کا رول ادا کرتے رہے، میں اُن کے ساتھ ذاتی واقفیت کی بنا پر بلا کسی خوف و تردید کے کہہ سکتا ہوں کہ ریاست جموں وکشمیر میں ایک جمہوری مزاج کی بنیاد ڈالنے کا سہرا ان کے سر ہے اس جمہوری مزاج کو پروان چڑھانے میں سارا نہ سہی غالب ترین حصہ ان کا ہی ہے...... شمیم صاحب کے بہت سارے مقام ہیں۔ ان کا ایک مقام ایک ادیب کی حیثیت سے ہمارے سامنے ہے ایک صاف اور واضح شعور رکھنے والا فنکار خواہ وہ ادیب ہو یا مصور، زندگی کی سچی عکاسی کرتا ہے۔ حقائق کی کھوج نکالتا ہے اپنی محنت و تلاش سے زندگی کے عملی مشکلات کا حل ڈھونڈتا ہے، حل کی کئی راہیں تلاش کرتا ہے۔ اس کے پاس موضوع بھی اور مواد بھی

ہوتا ہے اس مواد کو ادبی صورت دے کر اصل حقائق کو دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ شمیم صاحب اسی ڈگر پر چلتے رہے، مشکلات اور مصائب کی پرواہ نہ کرتے ہوئے لوگوں کے سامنے زندگی کی تلخ حقائق پیش کرتے رہے۔ بہت سارے ملمع سازوں کی نقاب کشائی کرتے رہے، لوگ متاثر ہوتے رہے۔شمیم صاحب کا ایک اپنا نظام حیات تھا، ان کا یہ نظام حیات ایک عام انسان کے نظام حیات سے کلیتاً مماثلت رکھتا آیا ہے اور حکومت کے غلط خواہشات کا پردہ چاک کرتا آیا ہے۔شمیم صاحب نے زندگی کی تلخ حقیقتوں کو پردوں کے اندر سے پھاڑ کر باہر نکالا ہے، ان کے اخبار آئینہ میں تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں کی تڑپ، غذائی اجناس کے قیمتوں میں اضافہ، رشوت ستانی کی بڑھتی ہوئی لعنت کے خلاف شمیم صاحب کے احتجاج سے پُر اثر اداریئے دلوں کو چھو جاتے تھے۔ ہر غلط روش کے خلاف انکا احتجاج ہر صبح کے آئینے میں پڑھنے کو مل جاتا تھا، واقعی کسی صاحب نے مجلس ماتم کدہ میں فرمایا تھا کہ شمیم صاحب سراپا احتجاج تھے، احتجاج ظلم کے خلاف، احتجاج فرعونیت کے خلاف، احتجاج سماجی رسموں اور بدعتوں کے خلاف احتجاج سیاسی بد اعمالیوں اور معاشی عدم توازن کے خلاف۔

سیاسی طور سیکولرازم میں ان کا گہرا عقیدہ رہا ہے سوشلزم اور جمہوریت پر انکا نہ صرف اعتقاد تھا بلکہ اس قسم کے خیالات کو عملی جامہ پہنانا انہوں نے اپنا ایمان بنایا تھا اور اصولوں کے خاطر شمیم صاحب کو اگر دوستوں سے بھی جدا ہونا پڑتا تو گھاؤ بھی وہ سہہ لیتے۔

..........☆☆☆..........

عبدالغنی شیخ

سَراپا احتجاج

میں اُن لوگوں میں ہوں جو شمیم احمد شمیم (مرحوم) کو ان کی نگارشات اور تقریروں کے ذریعے جانتے ہیں۔ ہمارے تعلقات علیک سلیک سے آگے نہیں بڑھے۔۱۹۵۳ء کی بات ہے۔ میں پہلے پہل سری نگر آیا تھا، غالباً طلباء کا ایک کنونشن تھا۔ میں بھی ایک طالِب علم بن کر اجلاس میں جاملا۔ اناونسر نے شمیم احمد شمیم کا نام لیا۔ میرے سامنے بیٹھا ہوا خوبرولڑکا سٹیج پر گیا اور تقریر کرنی شروع کی۔ اس کے چشمے کی آڑ میں سے دو روشن آنکھوں سے ذہانت جھلک رہی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہ لڑکا اپنی گل فشانی اور جادو بیانی سے حاضرین پر چھا گیا ہے۔ کنونشن کے اختتام پر جب میں ہال سے باہر نکلا تو میرے ذہن پر صرف شمیم کی تقریر کی بازگشت تھی۔

۱۹۶۴ء میں شمیم احمد شمیم نے ہفت روزہ آئینہ اجرا کیا۔ کبھی کبھار ''آئینہ'' کا ایک آدھ پرچہ لیہہ آجاتا تھا۔ جب کبھی سری نگر آنے کا اتفاق ہوتا میں ''آئینہ'' ضرور پڑھتا تھا۔ اس دوران میں نے ''آئینہ'' کے کئی خصوصی شمارے اور نمبر حاصل کئے۔

۱۹۷۰ء سے میں ''آئینہ'' میں مرحوم، شمیم احمد شمیم کی تخلیقات اور نگارشات اُن کے تادمِ علالت بلاناغہ پڑھتا رہا، جب کبھی ہفتہ عشرہ کے لئے سری نگر سے باہر چلا جاتا، واپس آکر میں کسی ریڈنگ روم میں جا کر ''آئینہ'' کا فائل دیکھتا تھا۔ یہ غالباً اُن کی تحریر کا جادو تھا کہ سری نگر آکر میں نے ۱۹۷۰ء سے پہلے کے ''آئینہ'' کے پرانے فائل کھنگالے اور سارے دستیاب شمارے پڑھ لئے۔ شمیم کی تحریروں کے ایسے متعدد شیدا تھے۔ ایک مقامی نیوز ایجنٹ سے یہ سُن کر مجھے تعجب نہیں ہوا کہ کئی وزیر اور حاکم ''آئینہ'' کے مستقل خریدار تھے اور وہ باقاعدگی سے اسے پڑھتے تھے۔

میرا یہ تاثر ہے کہ ریاست کے کسی بھی وزیرِ اعلیٰ کے بعد لداخ میں جموں اور وادیٔ کشمیر کا کوئی فرد مشہور ہے تو وہ شمیم احمد شمیم کا نام ہے، پچھلے تیرہ چودہ سالوں میں لداخیوں نے اس نام کو بہت سنا ہے۔ وہ ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۱ء تک ریاستی اسمبلی میں حزبِ مخالف کی واحد آواز تھے۔ لوک سبھا میں وہ ایک شعلہ بیان مقرر تھے اور ان کی آواز کی بازگشت زوجی لا کے برفانی کہساروں کو پھاند کر لداخ کے پہاڑوں اور وادیوں میں بھی سنائی دیتی تھی۔ ان لداخیوں میں سے اکثر لوگوں نے شمیم کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ بہتوں کو اُردو بھی نہیں آتی تھی، اس کے باوجود اُن کا کہنا تھا کشمیر میں ایک وجیہہ نوجوان رہتا ہے جس کی زبان میں جادو ہے اور جس کے قلم میں تلوار کی لہر ہے۔ یہ اپنی زبان کی سحر کاری اور قلم کی تلوار کی کاٹ سے لوگوں کی خدمت کرتا ہے۔

گذشتہ سال بھی موسم سرما میں اکادکا لداخی سری نگر آتے رہے باتوں باتوں میں مجھے انہوں نے پوچھا شیم احمد شمیم کی کوئی خبر نہیں آرہی ہے۔ خیریت تو ہے نا؟''

''بھئی۔ وہ تو بسترِ علالت پر ہیں۔ ان کو تکلیف ہے'' کیا کہا؟''

ہر ایک پر بجلی سی گرتی تھی۔

"ہاں بھئی وہ کینسر کے موذی مرض کے شکار ہیں"!

شمیم احمد شمیم کی جوان مرگی کا ماتم کیا جائے یا اُن تخلیقات کا، جو ابھی شمیم نے پیش کرنی تھیں۔ جب انگریزی زبان کے خوش بیان شاعر کیٹس اٹھائیس برس کی عمر میں تپ دق سے مر گئے تو پوری انگریزی دنیا نے ماتم کیا۔ جب نوجوان رومانی شاعر شیلے کو سمندر کے پانی نے نگل لیا......تو سبھوں کو گہرا دکھ ہوا۔ جب خوش فکر اور خوش بیان شاعر اسرار الحق مجاز نے جوانی میں داغ مفارقت دیا تو ان کے لاکھوں پرستاروں کی آنکھوں میں آنسو آئے اور نقادوں نے کہا کہ اردو اپنے کیٹس سے محروم ہو گیا ہے شمیم احمد شمیم کی جوان مرگی نے بھی یہی کیفیت پیدا کی ہے، یہ ایک جوانِ رعنا کی موت نہیں۔ بلکہ ایک تخلیقی سرچشمہ کی موت ہے۔ ایک باغ و بہار شخصیت کی موت ہے، جس سے اردو صحافت کی دنیا میں ایک خلا پیدا ہوا ہے جو پُر ہوتا نظر نہیں آتا۔

شمیم احمد شمیم بڑے وجاہت پسند تھے۔ وہ ہمیشہ زندگی کے روشن رخ دیکھتے تھے۔ جب موت ان کے دروازے پر دستک دے رہی تھی، تب بھی اپنے فکر و ذہن میں اُٹھنے والی تخلیقی لہر کو وہ صفحہ قرطاس پر بکھیرنا چاہتے تھے۔ ان کو زندگی گزارنے کا سلیقہ آتا تھا۔ جب تک وہ زندہ تھے انہوں نے زندگی کے لوازمات کو خوبصورتی سے نبھایا۔ وہ ایک اچھی کتاب کو Miss نہیں کرتے تھے اور قارئین کو اپنے تجربات کا شریک کار بناتے تھے۔ وہ ایک اچھی معلوماتی فلم دیکھ لیتے تھے اور ہمیں بھی اپنے اخبار میں اسکے متعلق بتاتے.وہ ایک مشہور شخصیت کے حالات پڑھتے ہی نہیں تھے بلکہ موقعہ ملے تو ان سے ملاقات کرتے تھے۔ جب وہ کسی ملک کی سیاحت پر جاتے تو اس ملک کی بہترین چیزیں دیکھ لیتے۔ اس کی روایات اور کلچر کا مطالعہ کرتے اور

اپنے مشاہدات اور تاثرات ہمیں بھی بتادیتے۔ چاہے وہ لندن کا ہائیڈ پارک ہو یا امریکہ کا کوئی مشہور چلڈرن پارک ہو، مشہور میوزیم ہو یا علمی دانش گاہیں ہوں مجھے اعتراف ہے کہ مجھے اس انسان پر رشک آتا تھا کہ قدرت اس پر کتنی مہربان ہے۔ اس میں بہت ساری صلاحیتیں یکجا ہوئی ہیں اور اس کی ساری خواہش پوری ہو رہی ہیں۔

شمیم احمد شمیم کی تحریر کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قارئین کو اپنے ساتھ بہالے جاتی ہے اور قائل کرتی ہے۔ ان کے نظریات اور خیالات سے اختلاف کی گنجائش ہے لیکن وہ کسی بھی اختلافی اور متنازعہ مسئلے پر خامہ فرسائی کرتے تو اپنے طرزِ نگارش، اسلوبِ بیان، غیر معمولی قوتِ استدلال، شوخیانہ انداز اور طنز و ظرافت سے قاری کو اپنا ہم نوا بنادیتے۔

وہ جب زندہ تھے، ان کے مخالفین بھی تھے نکتہ چین بھی تھے جیسا کہ لائق آدمی کے ہوتے ہیں۔ ان کی تحریر کی نشتر زنی اور تقریر کے تیکھاپن کا سامنا کرنا بہت مشکل تھا لیکن میرا مشاہدہ ہے کہ جب وہ مر گئے تو لگ بھگ سبھوں کو صدمہ ہوا۔ سبھی سوچتے تھے کہ ایسے انسان کو ابھی مرنا نہیں چاہیے تھا۔ ایسے انسان کی ہمیشہ ضرورت ہوتی ہے۔

ہم ایک ایسے معاشرے میں رہ رہے ہیں، جس میں ہر ایک کو اپنے حلوہ مانڈے کی فکر ہے اور مفاد پرستی اور خوشامد ہر ایک کا شیوہ ہے، کمزوریاں ان میں بھی تھیں لیکن وہ سبھوں سے بالکل مختلف تھے۔ وہ عافیت پسند اور مصلحت کوش نہیں تھے۔ وہ Airon Chair دانشور نہیں تھے۔ وہ حالات سے سمجھوتہ کرنا نہیں جانتے تھے۔ کئی معنوں میں وہ سراپا احتجاج تھے۔ وہ تن تنہا چٹان سے سر ٹکراتے تھے اور بہت سارے لوگ مضبوط پناہ گاہوں میں بیٹھ کر دور سے تماشا دیکھتے تھے اور ان

کے قلم اور زبان سے اپنی غیر مرئی خواہشات کی تکمیل ہوتے دیکھتے تھے۔

اگر وہ سیاست میں نہ آتے یا صحافت کا پیشہ اختیار نہ کرتے تو برِ صغیر کے ایک عظیم ادیب بنتے۔ انہوں نے خود اپنے متعلق ایک جگہ لکھا ہے۔

"شمیم میں ایک اچھا ادیب بننے کی صلاحیتیں موجود ہیں...... لیکن ادب چونکہ ریاض، لگن اور توجہ چاہتا ہے اس لئے اس نے اپنے لئے صحافت کا راستہ اختیار کیا ہے۔"

وہ ایک عظیم صحافی تھے۔ آل احمد سرور نے کہا۔ "دیوان سنگھ مفتون کے بعد شمیم برِ صغیر کے سب سے مشہور اور موثر صحافی تھے لیکن ان کی صحافت میں ادبیت تھی، فن تھا"۔

وہ ایک شعلہ بیاں مقرر تھے۔ خشونت سنگھ نے لکھا۔ "شمیم پارلیمنٹ کے تین بہترین مقررین میں سے ایک مقرر ہیں" ان کی تقریر ایک دانشور کی تقریر تھی۔ ایک روایتی سیاست دان کی نہیں۔

وہ ہوا کا ایک لطیف جھونکا بھی تھے اور طوفان برف وباد بھی۔ اپنے نام کی مناسبت سے نازک ڈال پر ایک پھول بھی تھے اور سنگلاخ چٹانوں کے درمیان گھن گھرج سے بہنے والا ایک دریا بھی۔ سرور نے ان کو چٹان کہا اور کرشن چندر نے شعلہ وشبنم قرار دیا۔ تاریخ بتاتی ہے جو لوگ گھور اندھیر کھائیوں میں جانے کا حوصلہ رکھتے ہیں وہی لوگ ترقی کی معراج پر بھی جاتے ہیں۔ مرنے والے میں یہ خوبیاں تھیں لیکن زندگی نے وفا نہیں کی۔

ایسے انسان کی موت پر یقین کرنا مشکل ہوتا ہے۔ خود شمیم نے آج سے بارہ تیرہ سال پہلے اپنے ایک دوست عبدالقادر دیوان کی ناگہانی موت پر جو باتیں لکھی ہیں اوہ ان کی اپنی زندگی پر صادق آتی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"وہ مر کیسے سکتا ہے؟ یقیناً کسی دشمن کی اُڑائی ہوئی افواہ ہے۔ میں نے اپنے دل کو تسلی دینے کی کوشش کی.......... دیوان کا کھلتا ہوا چہرہ، عقابی آنکھیں....... میرے ذہن پر ایک تصویر ابھر آئی اور میں سوچنے لگا کہ سیمابی فطرت کا یہ گبرو نوجوان...... جس کی بے قرار روح کسی نامعلوم منزل کی تلاش میں ہمیشہ سرگرداں رہتی تھی جسے دیکھ کر زندگی کی بے ثباتی کا احساس کچھ دیر کے لئے مٹ جاتا تھا۔ وہ موت کے فولادی پنجے کی گرفت میں کیوں کر آ گیا؟...... کیوں کر......؟

"انکشاف" یہ خبر انتہائی رنج وغم کے ساتھ شائع کر رہا ہے کہ اردو کے نامور صحافی، ادیب، شاعر اور سابق ممبر پارلیمنٹ جناب شمیم احمد شمیم مدیر آئینہ سری نگر کشمیر' وفات پا گئے۔

مرحوم ایک باوقار انسان ہونے کے ساتھ قادر الکلام مقرر بھی تھے انتہائی مخلص اور دوست مزاج انسان تھے آل انڈیا اُردو ایڈیٹرس کانفرنس کی سنٹرل کمیٹی کے معزز رکن تھے۔

دعا ہے کہ حق تعالیٰ مرحوم کو جنت میں جگہ دے

"انکشاف"

جھانسی

☆★☆

پروفیسر جی۔آر۔ملک

شمیم....صاعقہ وشعلہ وسیماب

عظیم شعراء کے کچھ اشعار کبھی کبھی کچھ شخصیات پر اس طرح سے صادق آتے ہیں کہ گویا انہی کے لئے مخصوص طور پر عالمِ غیب سے نازل ہوئے ہوں۔ لیاقت علی خان مرحوم ومغفور کو جب گولیوں کا نشانہ بنا کر شہید کیا گیا تھا تو کسی صاحب نے بغیر کسی مُشقت وجستجو کے اقبال کے مصرعہ :

صلۂ شہید کیا ہے تب وتاب جاودانہ

سے اُنکی تاریخِ وفات نکالی تھی۔ شمیم صاحب جب ہمیں عین اسوقت داغِ مفارقت دے گئے، جب ان کا شعور پختگی کی منزلیں طے کرتا ہوا، ایک ایسے مقام پر پہنچ چکا تھا جہاں اُن کی قوم کو ان سے نئی امیدیں قائم ہوگئی تھیں...... عظیم ترکارناموں کی امیدیں، دوررس اور نتیجہ خیز قومی خدمات کی توقعات ...... تو اس سانحہ پر میر غلام رسول نازکی مرحوم نے برجستہ طور پر غالبؔ کے ایک مشہور مصرعہ سے اُنکی تاریخِ وفات برآمد کی تھی:

ہے صاعقہ وشعلہ وسیماب کا عالم

یہ شعر کا مصرعۂ اوّل ہے اور ایسا لگتا ہے کہ شمیم صاحب کی شخصیت کا اصل

جوہر اور لبِّ لباب بیان کرنے کے لئے ہی وارد ہوا ہے۔ پورا شعر پڑھ لیجئے اور اسے زندگی کی وُسعتوں، گہرائیوں اور پیچیدگیوں پر منطبق کیجئے، تو یہ حیاتِ انسانی کی اُس پُراسرار کیفیت کا آئینہ دار بن جاتا ہے جو آخری تجزیے میں ناقابلِ فہم بھی ہے اور الفاظ کی گرفت سے ماوراء بھی۔

ہے صاعقۂ وشعلۂ وسیماب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں نہیں آتا ہے گو آوے

خود غالب نے کئی مواقع پر زندگی کی محیّر العقول پیچیدگی کو دانش وعرفان دونوں کے لئے لاینحل قرار دیا ہے۔

لافِ دانش غلط ونفعِ عبادت معلوم
دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا وچہ دیں

☆

رازدانِ خوے دہرم کردہ اند
خندہ بر دانا و ناداں فی زنم

زندگی کے معمّوں میں سے ایک معمّہ یہ بھی ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو پھول گلستان میں سب سے اچھا ہو، نگاہِ گلچیں میں سب سے پہلے وہی سماتا ہے۔ ہم اپنے آپ کو لاکھ تسلّی دیں کہ :

Those whom the gods love die young.

مگر حقیقتِ صدرنگ کا یہ پہلو اپنی جگہ پر قائم ہے کہ۔

ایک معمّہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

Life is but a walking shadow , a poor player that struts and frets his hour upon the stage and then is heard no more .It is a tale told by an idiot, full of sound and fury , signifying nothing.

کہا جاتا ہے کہ جب آدمی چالیس سال کی عمر کو پہنچتا ہے تو یہ اس بات کا اعلان ہوتا ہے کہ اُسکی فہم وادراک کی قوّتیں پختگی کے مرحلے میں داخل ہوگئی ہیں۔ یہ کوئی کلیّہ نہیں مگر ایک بڑی حقیقت ضرور ہے۔ شمیم صاحب ابھی بمشکل زندگی کی چالیس بہاریں دیکھ چکے تھے جب ایک مہلک بیماری نے اپنی علامات دکھانا شروع کیں اور یہی بیماری بلآخر اُنکے انتقال کا ظاہری سبب بنی۔ چالیس سالہ زندگی کا آدھا حصہ بچپن اور لڑکپن میں گذر جاتا ہے اور شمیم صاحب جیسے چنچل اور سیماب صفت آدمی کے لئے نشاطِ عمر کا نشہ کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ گویا ایک صحافی اور سیاسی مدّبر کی حیثیت میں وہ اپنے معاشرے کے ساتھ عملاً کوئی بیس ایک سال تک وابستہ رہے اور مقدار کے اعتبار سے یہ کوئی بڑی مدّت نہیں مگر زندگی کی قدر و قیمت وقت کی مقدار سے نہیں ناپی جاتی بلکہ اس شدّت (Intensity)، معنویت اور انہماک کے پیمانوں سے ناپی جاتی ہے جن کے ساتھ آدمی نے زندگی کو گلے لگایا ہو اور اسے بھرپور طریقے پر جیا ہو۔

حیات گر چہ بہت مختصر تھی شبنم کی
گلوں کے ساتھ رہی رات بھر یہ کیا کم ہے

اس نقطۂ نظر سے کبھی کبھی ایک لمحہ صدیوں سے زیادہ قدر و قیمت کا

حاصل ہوتا ہے دیکھئے تو انسانی تاریخ بھی ایسے ہی فیصلہ کُن لمحات کی پیداوار ہے۔ عرفان کی زبان میں انھیں ابدیت اور وقت کے اہم اتصال کے لمحات (Moments of intersection between time and Eternity) ۱؎ کا نام دیا جاتا ہے۔ شمیم صاحب کی مقدار کے لحاظ سے مختصر مگر کیفیت اور تاثیر کے لحاظ سے عظیم زندگی ابھی تک کشمیر کے افق پر ظلِ ہما کی طرح سایہ فگن ہے اور ہمیشہ رہے گی۔

مجھے شمیم صاحب کا تعارف اپنے زمانۂ طالب علمی میں اُنکے مؤقر جریدے ہفت روز آئینہ کی وساطت سے ہوا۔ اس کا ایک شمارہ کیا دیکھا کہ میں اسی کا ہو کے رہ گیا اور فیصلہ کیا کہ اب اِس جریدے کے ہر شمارے کا بلاناغہ مطالعہ کرنا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ صرف میرا تجربہ ہے یا کوئی اور بھی اس میں میرا شریک ہے کہ کبھی کبھی کسی مصنّف یا صحافی کی کوئی ایک تحریر دیکھ کر آدمی یہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ ہو سکے تو اس قلم سے نکلے ہوئے لفظ لفظ کا مطالعہ کیا جانا چاہیئے۔ کچھ ایسا ہی فیصلہ میں نے 'آئینہ' کے بارے میں کیا تھا اور جب تک آئینہ ہفت روزہ رہا میں اس فیصلے پر قائم رہا۔

۱؎: Intersection کا لغوی ترجمہ بالخصوص ریاضی کی مناسبت سے تقاطع ہوگا مگر اس سے مفہوم ادا نہیں ہوتا لیکن عمل تقاطع کے دوران جو مختصر سا اتصال دو Intersect کرنے والی قوتوں میں پیدا ہوتا ہے وہی اتصال فیصلہ کُن ہوتا ہے۔

آئینہ نے اپنے اجراء کے چند ہی سال کے اندر ایک ایسا باوقار مقام حاصل کیا کہ مولانا عبدالماجد دریابادی کے ہفتہ وار 'صدقِ جدید' اور 'آئینہ' کا نام برِصغیر میں ایک ساتھ لیا جانے لگا۔ میں نے اِس دوران آئینہ کے لئے ایک دو بار لکھا بھی اور دونوں بار اپنے نام کے ساتھ بغرضِ تعارف طالبِ علم بھی لکھا (اُس وقت تک شمیم صاحب کو بالمشافہ دیکھنے کا موقعہ نہیں ملا تھا)۔ دونوں مرتبہ انھوں نے میری کم مایہ تحریروں کو نمایاں مقام دے کر شائع فرمایا۔ کئی سال بعد جب آئینہ کو روزنامہ میں تبدیل کیا گیا تو یہ میرے لئے ایک صدمہ سے کم نہیں تھا۔ ایسا لگا جیسے کوئی محبوب بے وفائی کرکے بیچ راستے کے چھوڑ گیا ہو، روزنامہ آئینہ کے چند شمارے دیکھے تو معلوم ہوا کہ اخبار کی ہیئت کذائی ہی بدل گئی ہے۔ اس بارے میں، میں نے اُن کے نام ایک شکایت آمیز عریضہ بھی ارسال کیا کہ یہ کیا ہوگیا۔ ممکن ہے کچھ اور دوستوں نے بھی لکھا ہو مگر ادب وصحافت سے عملی سیاست کی طرف ان کا سفر ایک ایسے مرحلے میں داخل ہو چکا تھا کہ جہاں روزنامہ زیادہ مفیدِ مطلب (Relevant) نظر آنے لگا تھا مگر بعد کے واقعات نے ثابت کردیا کہ ہفت روزہ آئینہ کا بند ہونا ایک روشن ستارے کے غروب سے کچھ کم نہیں تھا۔

ہفت روزہ آئینہ کی یادیں ذہن پر کچھ اس طرح سے مرتسم ہوگئی ہیں کہ اب مرتے دم تک ذہن وتخیل انکی مٹھاس سے لطف اندوز ہوتے رہیں گے۔ اُن کا ہر دلعزیز کالم ''چراغ بیگ کے قلم سے'' مہذب اور لطیف طنز ومزاح سے اسقدر مملو ہوتا تھا کہ جی کرتا تھا کہ اسے بار بار پڑھیں۔ انسانی آزادی اور فرد کے وقار کے تحفظ کے لئے شمیم کا قلم ایک طاقت ور ہتھیار سے کم نہ تھا۔ 'چیکوسلوا کیہ کی عصمت دری' کے عنوان سے انھوں نے آئینہ کے صفحہ اوّل پر سقوطِ چیکوسلواکیہ پر جو

زوردار مضمون تحریر فرمایا تھا اس کی صدائے بازگشت ذہن کے نہاں خانوں میں اب تک سنائی دے رہی ہے۔ انکی فطری اور طبعزاد (Origianal) ادبی بصیرت اور دقیقہ رسی کے سمجھنے کے لئے فیض احمد فیض سے لئے گئے اُنکے انٹرویو کی روداد کا مطالعہ کافی ہوگا۔ اس سلسلے میں اُنکے مُعاصر کشمیری شعراء کے تنقیدی جائزے غیروں سے من وعن مستعار لئے ہیں اور نہ فرسودہ روایات کے اسیر ہیں بلکہ ایک ایسی تنقیدی بصیرت کے آئینہ دار ہیں جو اصلاً شمیم کی اپنی ہے گو کہ اِس نے ادبی شاہپاروں کے درّاک وحساس مطالعہ سے مطلوبہ جلا پائی ہے۔

شمیم تخلیقی ملکہ سے بھی بہرہ ور تھے مگر صحافت وسیاست کی مصروفیتوں نے انھیں اس ملکہ کو بروئے کار لانے کا کما حقہ موقعہ ہی نہیں دیا۔ انکی بہت سی تحریریں جو بظاہر صحافت کے قبیل سے ہیں جذبۂ واحساس کی قوت سے ایک ایسی سحر انگیز جاذبیت سے مالا مال ہیں کہ ان کا شمار مستند ادب پاروں میں کیا جاسکتا ہے۔ غمِ ذات کو غمِ کائنات میں متبدّل کرنے کا تخلیقی کرشمہ دیکھنا ہو تو انکے بچپن کے دوست عبدالقادر دیوان کی المناک موت پر لکھا گیا ان کا مضمون دیکھئے۔ دیوان مرحوم تک ہی محدود نہیں شمیم صاحب کے شخصیات پر لکھے گئے مرقعے بالخصوص آئینہ کے شخصیات نمبر میں شامل مضامین اُنکے بیش بہا ادب پارے ہیں۔

مرورِ ایام کے ساتھ شمیم صاحب کی جو شبیہہ آہستہ آہستہ تعمیر ہوئی ہے اسکے ساتھ انکی شعلہ صفتی اور سیماب خوئی کی خصوصیات کچھ اس طرح سے منسلک ہوگئی ہیں کہ اب ان خصوصیات سے جدا کرکے اس شبیہہ کا تصوّر بھی نہیں کیا جاسکتا۔ بلاشبہ اس تاثر میں حق کا ایک غالب عُنصر شامل ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس سے انکی رنگارنگ شخصیت کے کئی ابعاد نگاہوں سے اوجھل ہوجاتے ہیں۔ قوسِ قزح

کی طرح رنگین اُنکی شخصیت میں صاعقہ وشعلۂ وسیماب کے ساتھ شبنم بھی برابر شامل ہے۔ شبنم جو دل کی گہرائیوں میں ٹھنڈک اتارتی ہے۔

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم

کشمیر کے مایہ ناز اردو شاعر شوریدہ کاشمیری مرحوم، شمیم صاحب کے بچپن کے استاد رہے تھے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب شوریدہ صاحب اسکول ٹیچر تھے۔ خود میں جس زمانے میں کالج کا طالب علم تھا شوریدہ صاحب کالج میں اردو کے پروفیسر ہوگئے تھے اسلئے مجھے بھی اُن سے ایک نوع کا تلمذ حاصل رہا۔ اگرچہ اردو زبان وادب میرے مضامین میں شامل نہیں تھا اسلئے کہ میں انگریزی ادب، تاریخ اور عربی کا طالب علم تھا تاہم اردو کے ساتھ میری دلچسپی اور محبت کا رشتہ اسکول کے ایام ہی میں قائم ہوا تھا اور الحمدللہ برابر قائم ودائم ہے۔ شوریدہ مرحوم نے مجھے انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو مباحثوں اور کالج میگزین کی ادارت کی خدمت میں بھی شامل فرمایا۔ بعد میں جب میں نے کالج میں انگریزی پڑھانا شروع کی تو کئی سال تک شوریدہ صاحب میرے ہم پیشہ بھی رہے۔ انھوں نے مجھ سے شمیم صاحب کے تعلق سے ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ سردی کے ایام تھے۔ شوریدہ صاحب کسی کام سے اننت ناگ سے سرینگر تشریف لائے تھے۔ یہاں انھیں کافی دیر ہوئی اور شام کو اننت ناگ واپس جانا ممکن نہ ہوسکا۔ شمیم صاحب ان دنوں ریذیڈنسی روڈ پر پرتاپ پارک کے قریب قیام پذیر تھے۔ شوریدہ مرحوم رات گئے ان کے یہاں پہنچے تو بقول انکے شمیم صاحب نے اُن کا کچھ اسطرح سے استقبال کیا کہ گویا ایک نعمتِ غیر مترقبہ انکے ہاتھ آگئی ہو، رات بھر خدمت کی۔ بستر گرم رکھنے کے لئے خود گرم پانی کی بوتل لاکر انکے پاؤں کے نیچے رکھدی۔ رات کے دوران دو دفعہ یہ دیکھنے کے لئے

اُن کے سونے کے کمرے میں آگئے کہ وہ آرام سے لیٹے ہیں کہ نہیں اور یہ کہ انھیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ کیا ہی خوش نصیب تھے وہ استاذ جنھیں ایسے شاگرد ملے تھے اور اس سے بڑھکر کیا خوش نصیبی، وہ شاگرد کہ جنھیں اپنے اساتذہ کی خدمت کا شرف حاصل ہوتا تھا۔ اب تو ایسا لگتا ہے کہ یہ سب خواب کی باتیں ہیں۔

شمیم صاحب کے ساتھ میری آخری ملاقات ۱۹۷۹ء میں ہوئی تھی۔ وہ ٹوٹے اور تھکے ہوئے تھے، بیماری نے اندر سے چاٹ لیا تھا مگر چہرے پر وہی دلنواز تبسم اور عقابی آنکھوں میں وہی گہرائیوں تک اتر جانے والا تجسس اور پورے کا پورا وجود خوابوں اور تمناؤں کی تلاش میں مستغرق گویا زبان حال سے کہہ رہے ہوں ؎

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

............☆☆☆............

غلام نبی خیالؔ

شمیم احمد شمیم

آج جب کشمیر کی ہم عصر صحافت پر من جملہ میری نظر پڑتی ہے۔ جب میں آج دورِ حاضر کی سیاسی سوجھ بوجھ اور حالات و واقعات کی تجزیہ نگاری کے معیار کو جانچتا ہوں۔ آج جب اُردو زبان میں بھی نام نہاد قلمکاروں کا سیلابِ رواں میری نظروں کے سامنے سے گذرتا ہے تو مجھے بے ساختہ شمیم احمد شمیم یاد آجاتا ہے۔

شمیم احمد شمیم کو جدید کشمیر کے منفرد اہلِ قلم، اہلِ زبان اور اہلِ دانش و بینش میں شمار کیا جاسکتا ہے جس نے ایک مختصر عرصے کے دوران ہی اپنی ذہانت اور فطانت کا لوہا منوایا۔ اُس نے اپنا قلم اٹھاتے ہی کئی دوسروں کا قلم توڑ کے رکھ دیا اور اس ضمن میں چند مقامی روزانہ اخباروں نے تلملاہٹ میں شمیم کے خلاف ہرزہ سرائی کا ایک بے ہنگم سلسلہ بھی کچھ دیر تک جاری رکھا۔

ایک فردِ واحد میں جب بہت زیادہ خصوصیات مجتمع ہو کر اس کی شخصیت کو دوسروں پر حاوی کرنے کا مؤجب بن جائیں تو رشک اور حسد کے نتیجے میں دشمنوں کی تعداد میں اضافہ ہونا ایک فطری امر ہے۔ شمیم اس تلخ حقیقت سے بخوبی واقف تھا لیکن اُس کا یہ بھی کہنا تھا کہ نادان دوستوں سے دانا دشمن بدرجہ بہتر ثابت ہوسکتے ہیں۔ اس سلسلے میں جو چند واقعات پیش آئے انہیں یہاں پر زیرِ تذکرہ لانے کی

ضرورت نہیں۔

ریاست سے باہر بھی شمیم احمد شمیم کی شخصیت کو ایک پروقار اور شاندار پذیرائی کا وصف حاصل ہوا اور یہ توصیف و تعریف اُس وقت دوبالا ہوگئی جب پارلیمنٹ میں اُس کی مرصع اور مسجع لیکن معنی خیز تقریروں نے سارے شمالی ہندوستان کی توجہ اُس کی طرف مبذول کرلی۔

انہی دنوں خشونت سنگھ کو کہنا پڑا کہ لوک سبھا میں سب سے اچھی ہندی اٹل بہاری واجپائی، سب سے بہتر انگریزی پیلو مودی اور سب سے خوبصورت اُردو شمیم احمد شمیم بولتے ہیں۔

شمیم کے ساتھ کسی بھی صحبت میں بیٹھ کر باتوں باتوں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ ظاہری طور پر کٹر مذہب پرست نہیں تھا لیکن ایک چھوٹے سے واقعہ سے اُس کے خدا ترس اور خدا پرست ہونے کی حقیقت سامنے آجاتی ہے۔

خشونت سنگھ ہندوستان ٹائمز کے ایڈیٹر تھے۔ ایک روز میں دہلی میں اُن کے دفتر میں بیٹھا تھا کہ باتوں باتوں میں مرحوم شمیم کا ذکر چھڑ گیا۔ تقدیر کے ہاتھوں نے ہمارے اس گلستان سے اُس بلبلِ ہزار داستان کو ہم سے چھین لیا تھا جو صرف دس سال بعد ایک جہنم زار بننے والا تھا۔

خشونت سنگھ نے مجھ سے کہا کہ کچھ ماہ قبل شمیم آیا تھا۔ دیر تک اپنے بارے میں، موت کے بارے میں اور آخرت کے بارے میں باتیں کرتا رہا اور جب مجھ سے رُخصت ہوا تو وہ جو میرے دفتر کی اُس دیوار پر اللہ کے نام کی خوبصورت تختی لگی ہوئی ہے اُسے دیر تک دیکھتا اور چھوتا رہا۔ پھر اپنے دونوں ہاتھوں کو چند لمحوں تک آنکھوں پر مَل کر مجھ سے کہنے لگا۔ اچھا بڑے بھائی! اب تو چلتے ہیں اور غالباً اب

کبھی نہیں ملیں گے۔

شمیم احمد شمیم کے ساتھ تیس سال کے عرصے پر پھیلا ہوا میرا تعلق محبت و عدوت کی کہانی نہیں، بلکہ یہ کہنا مناسب رہے گا، ایک طرح کی دوری اور نزدیکی کے رشتے پر مبنی تھا۔ کئی بار ہم ایک دوسرے سے اختلافات کے باوجود فوراً ہی اپنے اپنے نقطۂ نظر کا گلا گھونٹ کر پھر اُسی پیار اور شفقت کے سرمایہ سے بھرپور دوستی کا مظاہرہ کرتے جو شمیم کے ہونٹوں پر ہر وقت مسکراتی رہتی تھی۔

یہ کافی ہاؤس کے اُن دنوں کی بات ہے جب یہ قہوہ خانہ وادی کے ادیبوں، شاعروں، اخبار نویسوں، دانشوروں اور بیکار نوجوانوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اور جہاں صبح سے لے کر شام تک اپنے گھر کی، قلب ونظر کی اور دنیا بھر کی باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ شمیم جب بھی وہاں آجاتا تو ایسا لگتا تھا کہ ایک پرائمری کلاس میں کوئی مدبر اور پڑھا لکھا مدرس درس وتدریس کے لئے داخل ہوا ہے اور اس کا اندازِ کلام، برجستہ گفتگو اور بے ساختہ زبان دانی سننے والوں کو مسحور ومخمور کر دیتی تھی۔

شمیم احمد شمیم نے کلچرل فرنٹ کی ہفت روزہ میٹنگوں میں شمولیت سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ تو پہلے پہل وہ ایک دو ماہ تک صرف دوسروں کی سنتا رہا اور اُس کے اس انداز میں خاص طور پر بزرگوں کے لئے حدِ ادب کا پہلو نمایاں تھا لیکن جب وہ دینا ناتھ نادم، امین کامل، رحمان راہی، علی محمد لون، امر چند ولی اور دیگر بانیانِ کلچرل فرنٹ کے ساتھ گھل مل گیا تو پھر اُس نے ان نشستوں کی کارروائی میں بھرپور حصہ لیا۔

کلچرل فرنٹ میں چند اصحاب کے ساتھ نظریاتی اختلافات کی بناء پر شمیم اس انجمن سے الگ ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے سرکاری ملازمت اختیار کر لی اور محکمہ اطلاعات کے اُردو جریدے "تعمیر" کی ادارت سنبھالی۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا

کہ ان کی ادارت کے دوران تعمیر نے ایک شاندار اور معیاری ادبی ثقافتی رسالہ کی شکل اختیار کر لی اور اہلِ ذوق آج بھی اس کی ورق گردانی کر کے اپنی تحقیقی سرگرمیوں کے لئے مفید اور ممد تخلیقات سے استفادہ کرتے ہیں۔ "تعمیر" کی شان اور انفرادی حیثیت بلاشک شمیم کی فنی آگہی اور فکری استعداد کی آئینہ دار تھی۔

میری نظروں میں شمیم احمد شمیم نے جب اپنے مشہور ومقبول ہفت روزہ "آئینہ" کو ایک روزنامہ میں تبدیل کر لیا تو وہ اُس کا درست فیصلہ ثابت نہیں ہو سکا۔ شمیم ایک تخلیقی فن کار تھا۔ اس کے قلم میں رواں دواں دریاؤں کی رفتار اور بلند وبالا پہاڑوں کی جولانیاں تھیں۔ اپنے جذبات اور محسوسات کو وہ صرف ایک ہفتہ وار اخبار ہی کے ذریعے اظہار کی جامع صورت بخشنے میں ماہر تھا لیکن ایک روزنامہ میں اُس کا کام بہت حد تک ایک ایسے ثانوی عمل تک محدود ہو کے رہ گیا کہ وہ ناخواندہ سیاست دانوں، انگوٹھا چھاپ وزیروں اور عوام کا استحصال کرنے والی سیاسی شخصیتوں، تنظیموں اور راشی افسروں کے بیانات کی سرخیوں کی نوک پلک درست کر کے انہیں شائع کرے۔ اس بدزیب اور بے لذت کام میں اُس کے اپنے فطری بیان اور اظہار کو کوئی عمل دخل حاصل نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ روزنامہ "آئینہ" زیادہ دیر تک اپنی وہ ساکھ اور قبول عام برقرار نہیں رکھ سکا جو ہفت روزہ "آئینہ" کو ایک قلیل عرصے کے دوران ہی حاصل ہو چکا تھا۔

ایک بار جب شمیم ایک معروف روزانہ اخبار کے مدیر کے دفتر میں بیٹھا تھا تو اس ایڈیٹر نے طنزاً شمیم سے کہا "دیکھا! روزانہ اخبار چلانا کس قدر مشکل کام ہے۔ تم نے بھی تجربہ کر لیا جو نا کام ہو گیا"۔ شمیم نے فوراً جواب دیا: "آپ صحیح کہتے ہیں، لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ کشمیر میں اخبار پڑھنے والوں کو صرف میٹرک پاس ایڈیٹروں

کی عادت پڑگئی۔ پڑھے لکھے لوگ اخبار چلائیں تو وہ انہیں قبول نہیں کرتے''۔ظاہر ہے کہ اس بزرگ ایڈیٹر سے شمیم کے اس تیر بہدف طنز کا کوئی جواب بن نہیں پڑا۔

شمیم ایک بھرپور زندگی گذارنے کا متمنی تھا جو اسے نصیب نہیں ہو سکی لیکن اپنی جواں مرگی کے باوجود اس نے اپنی ذہنی برتری اور قلمی زیبائی سے تحریر وتقریر کے جو نقوش ہمارے دلوں اور ذہنوں پر ثبت کئے وہ تا ابد سرسبز رہیں گے۔

اخلاقی آداب واقدار کے احترام کے حوالے سے عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جو شخصیت اب ہم میں موجود نہیں اس کی خامیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی نہیں کی جانی چاہئے لیکن حقائق کے اجتناب سے انسانی ضمیر کو گمراہ کرنے کا خدشہ بھی لاحق ہوتا ہے۔لہٰذا ایسی باتیں اگر بر سبیل تذکرہ زیر بحث لائی بھی جائیں اُس سے مذکورہ شخصیت کی زندگی کے تمام پہلوؤں کی نقاب کشائی ہوتی ہے جو اس پر مزید تحقیقی کام کرنے والے طالب علم کے لئے بہر حال مفید ثابت ہو سکتی ہے۔

مہاتما گاندھی کے سوانح حیات میں لوئی فشر نے گاندھی کی ذاتی زندگی کے جن غیر اخلاقی واقعات کا تفصیلی ذکر کیا ہے اُن کے بارے میں اگر چہ ہندوستانی قوم پرستوں نے کسی حد تک اپنی احتجاجی آوازیں بلند بھی کیں لیکن بالآخر حقائق کو تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے۔ اسی طرح جواہر لال نہرو اور اندرا گاندھی کے بارے میں او۔پی۔ متھائی کی تحریریں بھی ایک زوردار بحث کو جنم دے سکتی ہیں اگر چہ مصنف نے ان کے بیان میں کسی مصلحت سے کام نہیں لیا ہے۔

ہندو قوم تو بہر حال ایک نرم اور صابر قوم ہے اس لئے وہ ان تحریروں کی نفی کرنے میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتی لیکن مسلمانوں کا حال اس سے بالکل مختلف ہے۔جب شورش کشمیری نے اپنی کتاب ''اُس بازار میں' علامہ شبلی اور علامہ اقبال

کے بارے میں یہ انکشاف کیا کہ یہ دونوں حضرات لاہور کی ہیرامنڈی میں سازو سرود کی محفلوں میں شریک ہوتے تھے تو پاکستانی مسلمانوں نے اس بیان کو ہرزہ سرائی، یاوہ گوئی اور بے ایمانی پر محمول کیا اور شورش کو مرتد اور کافر کے خطابات سے نوازا گیا۔اسی طرح اگر آج کوئی پاکستانی محمد علی جناح کے بارے میں کچھ تلخ حقائق بیان کرنے کی جسارت کرے تو اسے ''قائد اعظم'' کے ازلی دشمنوں میں شمار کر کے غالباً ملک بدر کیا جائے گا۔

شمیم احمد شمیم کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ بے حد خودسر تھا اور اپنے حریف کو نیچا دکھانے کے لئے کسی بھی حد تک جانے کے لئے فوراً کمربستہ ہو جاتا تھا۔شمیم کی خودسری کا یہ عالم اُس کے کئی احباب کو اُس کے دشمنوں میں تبدیل کرنے کا باعث بن گیا۔

لیکن ایسا بھی دیکھنے میں آیا کہ اگر اُس کا کوئی بدترین دشمن بھی بوقتِ ضرورت اُس کے لئے کسی امداد یا سفارش یا حلِ مشکل کے لئے آیا تو شمیم نے اس کا مسئلہ حل کرنے میں کسی بخل سے کام نہیں لیا۔

شمیم ہمارے خیال میں اقبال کے اس فلسفہ حیات کا ایک عکس جمیل تھا:

چہ کنم کہ فطرت من بمقام در نہ سازد
دل ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے
چو نظر قرار گیرد بہ نگارے خوب روئے
تپد آں زماں دل من پئے خوب تر نگارے
ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے
سرِ منزلے نہ دارم کہ بمیرم از قرارے

وہ ہمیشہ بہتر سے بہترین کی تلاش میں رہا اور اس جستجو نے اُس کی ہر حرکت کو ایک سیاسی شکل بخشی۔ اسے اگر کافی ہاؤس میں اطمینان کے ساتھ چند لمحے گذارنے ہوتے تو وہ اس محفل یاراں کی طرف اس طرح دوڑ پڑتا جیسے کافی ہاؤس میں آگ لگ گئی ہو اور وہ اسے بجھانے جا رہا ہو۔

شمیم احمد شمیم کو محض ایک صحافی کا درجہ دے کر اس کی ادبی شخصیت کو نظر انداز کرنا بعید از انصاف ہوگا۔ وہ ایک باشعور تجزیہ نگار تھا، اس کی مثال عبدالاحد آزاد کے بارے میں شمیم کے ان خیالات سے ملتی ہے جب وہ کہتا ہے:

”آزاد پر لکھتے وقت مجھے پہلی بار اپنی کوتاہ قلبی اور کم مائیگی کا احساس ہو رہا ہے۔ اس کے شعور کی بلندی اور اس کے ذہن کی وسعت کو الفاظ کی گرفت میں لانا میرے بس کی بات نہیں“۔

شمیم شاعر تو نہیں تھا لیکن ایک نبض شناس تھا۔ ایک بار علامہ اقبال کے ایک مصاحب منشی سراج الدین نے علامہ کے نام ایک خط میں اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ وہ علامہ کی طرح شاعر نہیں ہیں۔ اقبال نے اس خط کے جواب میں اپنے اس فہم و فراست والے معتقد کو لکھا کہ سخن گو سے زیادہ سخن شناس قابل تعظیم ہوتا ہے کیونکہ اسے شعر ذہن نشین کرنے کی صلاحیت حاصل ہوتی ہے۔

شمیم احمد شمیم ادبی دنیا میں بھی اسی قسم کا نبض شناس نقاد تھا۔ جہاں رسالہ ”تعمیر“ میں شائع شدہ کشمیری ناول پر لکھا ہوا اس کا مضمون بے لاگ اور بے باک تنقید کا ایک مثالی نمونہ ہے وہاں اختر محی الدین کے طویل اور بے مثال افسانے ”آدم چھ عجب ذات“ (”تعمیر“ نومبر، دسمبر ۱۹۵۹ء) پر جو بحث شمیم نے رحمان راہی کے ایک خط کے جواب میں چھیڑی وہ بھی کشمیری ادب و فن پر اُس کی گہری نظر

اور سنجیدہ مطالعہ کا ماحصل تھی۔ اس افسانہ پر راہی نے اسی جریدے میں کشمیری زبان میں تحریر کردہ ایک طویل مراسلے کے ذریعہ اختر کے افسانے پر چند اعتراضات کئے تھے جن کے جواب میں شمیم نے بھی اسی طرح کے ایک طویل جواب میں اختر کا دفاع کیا اور راہی کو مشورہ دیا کہ اختر کا افسانہ پڑھتے وقت جو باتیں اُس نے چھیڑی ہیں اُن سے نہ تو شمیم کا کوئی فائدہ ہوگا اور نہ ہی اختر اُن سے مستفید ہوگا بلکہ وہ صرف راہی کے لئے مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ بعد میں موتی لال ساقی اور ناجی منور نے ”تعمیر“ ہی کے حدیث دیگراں کالم میں اس افسانے کی خوب تعریفیں کیں۔ اُس وقت ”تعمیر“ کے نئے مدیر محمد یوسف ٹینگ نے اس افسانے پر پہلے ہی اپنی اس رائے کا اظہار کیا تھا کہ ”جب کشمیری افسانہ پختگی کی کئی منزلیں طے کر چکا ہوگا اُس وقت بھی ”آدم چھ عجب ذات“ کو کشمیری زبان کے بہترین افسانوں میں شمار کی جائے گا کیونکہ موضوع اور اسلوب دونوں کے بے باک حسن نے اس افسانے کو اختر کے فن کا سنگ میل بنا دیا ہے“۔

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم
چو غلام آفتابم ہمہ از آفتاب گویم

میں رات ہوں نہ ہی رات کا پجاری جو میں نیند کی اور سپنوں کی بات کروں، میں تو آفتاب کا پرستار ہوں اور سورج کی روشنی اور تمازت سے سرشار وہی باتیں کروں گا جن سے نور اور حرارت ٹپکتی ہو۔

شمیم احمد شمیم بھی رات کا نہیں دن کا ترجمان تھا۔ وہ آفتاب کا نقیب تھا اور آج بھی جب ہمیں اس کی یاد آجاتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک سیماب صفت فنکار، تجزیہ نگار، ادیب، سیاست دان اور شعلہ بار مقرر کو کھو کر سرزمین کشمیر نے بہت کچھ کھو دیا ہے۔

غلام نبی گوہرؔ

"سوکاٹلی پوش" ۱؎

۱۹۷۴ء میں مرحوم شمیم احمد شمیمؔ آوارہ گرد سیاست کی دشتگیری میں مُنہمک تھے اُنکی اہمیت کچھ زیادہ ہی بڑھ چکی تھی۔ اُن کے قلمی دوست کچھ اُنکی گردِ طواف تھے۔ مگر یہ مجھ جیسے نفسیاتی مریض قربت سے جھجکتے ہی رہے۔ وقت کے اُس رنگین مزاج نرالے "میاں جی" کو اپنی عدالت میں کھڑا پا کر حیرانی ہوئی مگر جج صاحبان کو بھی اپنی کرسی عدل پر براجمان ہو کر تاؤ اور غرور ہوتا ہے۔ ان دنوں میں عدالتِ مطالبہٗ خفیفہ کا افسرِ جلیس تھا۔ میں نے جمعدار کو ہدایت کی کہ شمیم صاحب کے لئے راقم کے چیمبر Chamber کا دروازہ وا کرے مگر موصوف کرسی عدل کے بالمقابل ایستادہ اپنے مخصوص انداز میں گویا ہوئے۔

"جناب فاضل جج صاحب میں اپنا تعارف کرتا ہوں، میں شمیم احمد شمیم ایڈوکیٹ ہائی کورٹ جموں و کشمیر آپ کی عدالت میں ایک دیوانی دعویٰ پیش کرنے کے لئے حاضر ہوں جو بحکم فاضل ڈسٹرکٹ جج صاحب آپکی عدالت کو بغرض سماعت تفویض ہوا ہے"

۱؎ سوکاٹلی پوش: جاڑے میں کبھی خلافِ توقع دھوپ نکلتی ہے اور عارضی حرارت سے کوئی پھول کھل آتا ہے جو فوراً غیر یقینیت میں مُرجھا جاتا ہے۔ کھلنا اور مرجھانا کوئی بھی نہیں دیکھتا ہے۔ (گوہر)

ہم نے چار ورقہ عرضی دعویٰ اور مشمولہ جات کا سرسری جائزہ لیا تا کہ سرشتہ سے رپورٹ طلب کرنے کا حکم لکھوں کہ عنوانِ دعویٰ پر نظر پڑی اور وکیل صاحب کی جانب متوجہ ہو کر ہم نے استفسار کیا:

"وکیل صاحب یہ مدعی شمیم احمد ولد مرحوم محمد یعقوب......کون ہیں؟"

"جناب والا مدعی شمیم، شمیم احمد ایڈوکیٹ کا موکل ہے"

اُس رومانی نوک جھونک کے بعد عبارت دعویٰ بہ غور پڑھی پایا کہ صحافت اور ادب کے پھول تو نچھاور ہوئے ہیں مگر قانونی لوازمات اور تکنیکی منطق سے عبارت عاری تھی اگر دعویٰ اُس صورت میں درج رجسٹر ہو کر سماعت کے لئے رکھا جاتا تو سرسری بحث کے بعد ترمیم دعویٰ کی درخواست پیش کرنا مدعی کے لئے لابدی امر بن جاتا۔ سوچا اسطرح سال بھر کا وقفہ وہی مرحلہ کھائے گا اور شیخ پا سیماب صفت چراغ بیگ، نظام انصاف کو 'آئینہ' میں ہدف تنقید بنا کر توہین کا مرتکب بھی بنے گا لیکن عام سائلان کی طرح اس حقیقت کو تسلیم نہیں کریگا کہ

' خشت اوّل چوں نہد معمار کج '

خیر ظہر کا وقت تھا۔ ظہرانہ کے لئے میں چیمبر میں اُس موکل وکیل، یا وکیلِ موکل، کے ہمراہ داخل ہوا۔ آنجہانی شری جانکی ناتھ لنگر ایڈوکیٹ بھی وہاں پر تھے۔ اُن سے میں نے کہا کہ وہ اُس دعویٰ کو تکنیکی فارمیٹ (Format) میں درست کر کے لائیں۔ مرممہ دعویٰ پڑھکر مرحوم کو عرفان حاصل ہوا کہ عدالت میں مالک جائیداد اپنے کرایہ دار سے محض رسمی مطالبہ دخل اندازی کر کے قبضۂ جائیداد کرایہ داری حاصل نہیں کر سکتا ہے بلکہ لوازمات کے لبادہ میں پیش کرنا ضروری بنتا ہے۔ یہ حقیقت اُن پر واشگاف ہونے سے مجھے اُس کثیر الجہت، مطلق العنان شخصیت کو

نصیحت نافذ کرنے کا سنہری موقع مل گیا'' شمیم صاحب کو کہ سیاست اور صحافت کا چولی دامن کا واسطہ ہے مگر وکالت خود غرض، مغرور اور شکی رفیقۂ حیات کی طرح نہ سوتن کو برداشت کرتی ہے نہ داشتہ کے ساتھ اپنے رفیق کو تعلق بڑھانے دیتی ہے۔ یا تو وکالت کے ہو جایئے یا اس بیچارہ پیشہ کے ساتھ رابطہ نہ بڑھائیں''۔

شمیم صاحب نے بالکل کوئی غور و خوض کئے بغیر بلکہ بنا سوچے ردِ عمل ظاہر کیا۔ شاید اُنہیں احساس تھا کہ اُنکی بہی خواہ ہونے کے ناطے میں ایسی نصیحت کروں گا، تو کہنے لگے: ''گوہر صاحب مجھے پورا احساس ہے مگر یہ بھی شدت سے احساس ہے کہ یہاں پر زندگی کے ہر شعبہ میں خلا ہے۔ شخصیات کا فقدان Lack of Human Resources بلکہ قحط الرّجال ہے مجھے یقین محکم ہے کہ یہ سب خلا Vacuum ایک ہی شخص پر کر سکتا ہے اور وہ شمیم احمد شمیم ہے''۔

مرحوم نے اس خود اعتمادی سے یہ مفروضہ ادا کیا کہ حقیقت لگنے لگا۔ مگر پھر بھی میں نے اُنہیں یہاں کے پولیٹکل کلچر کے بارہ میں اپنی مختصر مگر اہم سیاسی زندگی کے تجربات کا شریک بنایا۔ آپ کو علم ہے کہ ۱۹۵۸ سے لیکر ۱۹۶۰ تک تین سال میں جموں و کشمیر کی دو اہم سیاسی پارٹیز محاذ رائے شماری اور پولیٹکل کانفرنس کا واحد اثاثہ تھا۔ جناب شیر کشمیر، مرزا محمد افضل بیگ اور مولٰینا محمد سعید مسعودی کی سطح سے لیکر 'قبابلی پیر' اور 'غلام نبی اعلان' کی سطح تک محبوس قایدین اور کیڈرز کا واحد دفاعی کونسل تھا۔ اُس حوالہ سے اُنکی اور اُنکی وکلاء صفائی بلکہ اُن کے اور اُن کے رفقاء کے درمیان واحد کڑی تھا۔ ناپختگی کے باوجود ۲۲ سالہ جوان غلام نبی گوہر جونہی سپیشل جیل جموں جاتا تھا تو شیر کشمیر جیسی عظیم اور قدِ بالا شخصیت، مرحوم بیگ جیسی بذلہ سنج ہستی پیار سے مجھے گلے ملتے تھے اور اسطرح سرینگر جیل جونہی میں حضرت بل قتل

مقدمہ کی سماعت کے دوران پہونچتا تھا تو مفکر مولٰینا مسعودی اور مُجاہد ڈاکٹر شیخ عبدالمجید گرمجوشی سے میرے ساتھ بغلگیر ہوتے تھے۔ مگر جونہی ان کی اپنی جماعت کے نام نہاد وکلاء جیلوں سے چھوٹ نکل آنے لگے یا یونیورسٹی سے قانونی سندات لے کر میدان میں آئے تو یہی گوہر رفتہ رفتہ ان سبھی شخصیات کو غیر ضروری لگنے لگا۔ دیانت دار یا سیاسی لغت کے مطابق غیر سیاسی مگر پُرخلوص محمد امین آبی گذر (سابق ڈائریکٹر فوڈ) نے بھانپ لیا کہ شاید اس جذباتی نوجوان کو نہ صرف نظر انداز کیا جاتا ہے بلکہ وقت پرستی کا لیبل چسپاں کر کے بوکھلاہٹ کا شکار کیا جائے گا تو اس نے مجھے شفقت سے اُسی جذباتی ڈگر سے نیچے لا کر حقیقت پسند بنایا اور میں بڈگام عدالت میں وکالت کرنے کے لئے مستقل طور منتقل ہوا۔ جہاں سے میں نے سال ۱۹۶۳ء میں، کے سی ایس جوڈیشل، کا تقابلی امتحان پاس کر کے محکمہ انصاف کی ملازمت کا سہارا لیا کیوں کہ کشمیر کے مہلک سیاسی تمدن سے فوری فرار چاہتا تھا''۔ یہ مختصر مگر سبق آموز تجربہ سُن کر بہت غرور کے ساتھ مرحوم بول اُٹھے:

''آپ ایسے وکیل تھے جس میں آپ سے زیادہ تجربہ کار آپ کو پیچھے گھسیٹ سکتے تھے مگر میں وہ وکیل ہوں جس کا میرے مؤکلان کے پاس کوئی نعم البدل نہیں''

اسی طویل نشست میں جس میں چائے کے کئی دَور چلے اور افسر جلیس کو اورین ہوٹل سے نقدی میں منگوا کر چار لذیذ و لطیف کبابوں کا جرمانہ بھی ادا کرنا پڑا۔ موقعہ آیا کہ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں مرحوم کے ساتھ سازش میں شریک رہنے کے جرم کے لئے معافی طلب کروں مگر مرحوم کو اس معاملہ میں راقم پر شک نہ تھا نہ اُس واقعہ کو وہ بے جا مانتا تھا۔ مرحوم جرأت مند تھے اگر کوئی غلطی کی تھی اس سرزد ہونے کا انکار نہیں کرتا تھا نہ جواز پیدا کرتا تھا۔ بہادر کی طرح غلطی مان لینا اس کا حسین وصف

تھا۔ اس واقعہ کی وضاحت کے لئے ذرا ماضی میں جانا پڑیگا۔ ہم ۵۷۔۱۹۵۵ علی گڑھ دانش گاہ میں طالب علم تھے۔ مرحوم شمیم صاحب بھی ۱۹۵۶ میں وہاں داخل ہوئے تھے۔ جموں و کشمیر کی غیر یقینیت نے یہاں کے ہر طبقہ کو سیاست زدہ بنایا ہے۔ طالب علم طبقہ پر سیاسی جذباتیت زیادہ غالب رہتی ہے۔ ۱۹۵۵ کے اُخیری ایام میں سیکورٹی کونسل میں کشمیر معاملہ پر زبردست گرما گرم بحث چھڑگئی۔ برطانیہ اور سویڈن کی طرف سے مشترکہ قرارداد دس ایک تناسب سے پاس ہوا۔ اس سال اس دانشگاہ میں اکثریت کشمیری طلباء کے بعد ٹراون کوری Travancore طلباء کی تھی۔ جنوبی ہند کے طلباء کشمیری جذبات کے ساتھ شامل تھے مگر یوپی اور بہار کے طلباء ہر رنگ میں ہندوستانی موقف کی تائید میں سرگرم تھے۔ وہ سب سٹوڈنٹس فیڈریشن کے جھنڈے تلے جمع ہوئے جس کا جھکاؤ بائیں جانب تھا۔ ان کی قیادت جموں کے سردار جوگندر سنگھ اور کشمیر سے آر ایس ایس کے چالک ٹیکا لعل ٹپلو کرتے تھے۔ ایس ایف کے اہتمام سے ''آسمانی منزل'' میں زیر سرپرستی مرحوم پروفیسر حبیب اجلاس ہونے کا پروگرام مُشتہر ہوا، ہم سب کشمیری طلباء اُس اجلاس کو ناکام کرنے کے لئے جُتھ بندی کرنے لگے مگر جنوبی طلباء نے مشورہ دیا کہ ہم یعنی کشمیری اور جنوبی ہند کے سب لڑکے اجلاس میں شرکت کر کے اپنی اکثریت سے ایس ایف کے سوڈیڑھ سے لڑکوں کی رائے پر جمہوری طریقہ سے حاوی ہوجائینگے اور یہ مشورہ قبول کرتے ہوئے کوئی ہزار ڈیڑھ ہزار کی تعداد میں ہم وہاں پہونچے جب کہ اجلاس بُلانے والوں کی تعداد 150 طلباء اور دو تین پروفیسر صاحبان سے زیادہ نہ تھی۔ جوگندر سنگھ نے برطانیہ اور سویڈن کی قرارداد اور سیکورٹی کونسل کے خلاف مذہبی قرارداد پیش کی۔ مالابار کے میتھو جارج نے دس ممبروں کی متفقہ قرارداد پر روس کے ویٹو کرنے کے خلاف

جوابی قرارداد پیش کی مگر پروفیسر حبیب جیسے مقتدر اُستاد موقر سیاست دان اور معتبر مورخ نے جارج کی قرارداد کو پیش کرنے سے رکوایا اور ایک ہنگامہ بپا ہوا، جس میں موصوف نے جوگندر سنگھ کی پیش کردہ قرارداد کو باتفاق رائے پاس ہونے کا اعلان کیا۔ آسمان منزل اکھاڑہ بن گیا۔ قابل احترام اور طلباء کے محبوب اُستاد حبیب صاحب پر بھی مکّے مارے گئے۔ دوسرے روز اُس نے اپنے مُحب اور علی گڈھ یونیورسٹی کے دوسرے عظیم اُستاد ڈاکٹر ہادی حسن سے کشمیری طلباء کی زیادتی کے خلاف شکایت کی مگر ڈاکٹر صاحب نے اُسکو احساس دلایا کہ غلطی اُسی کی تھی۔ چنانچہ حبیب صاحب نے کچھ کشمیری طلباء کو گھر بُلا کر اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور کشمیری جذبات کو برحق مانا۔ مگر اسی واقعہ کے بعد سب کشمیری طلباء منظم بھی ہوگئے اور حساس بھی۔ اسی دوران کچھ مہینے کے بعد وزیر اعظم کشمیر مرحوم بخشی غلام محمد کے داماد میر نصر اللہ صاحب (جو اُن دنوں پروفیسر ہی تھے) علیگڈھ آئے، شمیم صاحب کے مہمان تھے اور افواہ اُڑ گئی کہ عثمانیہ ہوسٹل کے کمرے میں جہاں شمیم صاحب ٹھہرے تھے کئی کشمیری لڑکوں کو بلا کر کشمیر اتفاق میں رخنہ ڈالا جارہا تھا۔ گو کہ میں شمیم صاحب کا خاص دوست نہ تھا مگر ڈاکٹر غلام محی الدین وانی گوجہ پتھری کے توصل سے ہم ۵۲۔۱۹۵۱ سے ایکدوسرے کے قریب آئے تھے اس لئے گو کہ میں علیگڈھ میں کشمیری سیاست میں سرگرم تھا مگر مرحوم کے مقابل میں نہ آیا، پسِ پردہ اُکسانے کا عمل جو اُس وقت میں میرا محبوب مشغلہ تھا، روا رکھا۔ اگر اُس طوفان بدتمیزی کا مقابلہ شمیم فہم و فراست اور تدبر سے نہ کرتا، اُسکی مار پیٹ ہونا بلکہ علیگڈھ بدر ہونا لابدی بنتا۔ بزرگ کشمیری طالب علم مرحوم غلام رسول ملک کے پاس شمیم کی پیشی لگ

گئی۔ملک صاحب شمالی کشمیر کے جانے مانے ایڈوکیٹ تھے۔۱۹۹۰ میں ایم ایل سی تھے کہ فورسز اُس کے محلّہ کو ہندواڑہ میں نذرِآتش کر رہے تھے مرحوم نے مقامی مسجد کے دہلیز پر چڑھ کر اعلان کیا کہ وہ قانون ساز ہے، ایوان بالا میں ممبر ہے اس طور تاکید کی مسجد کو نہ جلایا جائے مگر گولی بالکل قریبی رینج سے چلی اور وہ خاک وخون میں دہلیز مسجد پر دم توڑ گیا۔ملک صاحب متحمل اور اشتعال سے بالاتر خلوص کے پیکر تھے۔اُنکے پاس شمیم نے تسلیم کیا کہ میر صاحب اُس کے استاد بھی رہے تھے قریبی دوست بھی اور مہمان بھی تھے مگر اُس نے کسی لڑکے کو اُسکے پاس آنے کی دعوت دی تھی بلکہ اُس نے قاضی محمد سعید، ستار احمد شاہد وغیرہ کے نام لئے جو بقول اُس کے خود بخود میر صاحب کے پاس آئے تھے۔اِس حقیقت بیانی پر ملک صاحب نے شمیم کو بری کر دیا اور اعلان کیا کہ اُس کے ساتھ قطع تعلق نہ کیا جائے،اپنے چیمبر کی نشست میں، میں نے موقعہ غنیمت جان کر اٹھارہ سال کے بعد اپنی صفائی شمیم کے پاس پیش کی کہ میں نے اس وقت کوئی خاص کردار اس واقعہ میں ادا نہ کیا تھا مگر مرحوم نے بلا تامل اقبال کرتے ہوئے تسلیم کیا کہ اُس نے کشمیری طلباء کو تقسیم کرنے کے فتنہ کو جنم دیا تھا بلکہ مان لیا کہ جو بعد میں سترہ لڑکوں کا کشمیر میں داخل ہونے کا پرمٹ بند کروایا تھا (جسمیں راقم بھی ایک تھا باقی مرحوم محی الدین شاہ بڈھ،مرزا محمد یعقوب بیگ،صمد اللہ خان بانہالی،مرحوم عبدالغنی میر،غلام قادر بچہ وغیرہ تھے) بلکہ یہ بھی مان لیا کہ بجائے عبدالغنی لون غلطی سے اُس نے عبدالغنی میر اور بجائے غلام رسول بچہ کے غلام قادر بچہ لکھا تھا۔مگر مرحوم لون صاحب اور مرحوم بچہ صاحب ہمارے ساتھ تب تک جلاوطن ہی رہے جب تک دیگر لڑکوں

کے پرمٹ [1] اجرا نہ ہوئے گو کہ اُن دو کے پرمٹ بند نہیں تھے مگر اُنہیں بھی احساس تھا کہ اُن کے بجائے میر اور غلام قادر ”بدرنگ“ میں پھنسے تھے۔

یہ سب اپنی مشترکہ تاریخ دہرانے کے دوران میں نے عدالتی کارروائی معرضِ التوا میں ڈالی اور چائے کے کئی دور بھی چلے۔

آخر پر مرحوم نے اپنا اور ذوالفقار بھٹو کا موازانہ کیا اور دعویٰ کیا کہ وہ جموں وکشمیر کے ذوالفقار بھٹو ہیں۔یا تو نادانستہ راقم جذبۂ حسد کا شکار ہوا یا فطری رقابت کی وجہ سے یا محض ایک غیبی ایقان سے پتہ نہیں کیوں اور کیسے میں نے بے اختیار ہو کر کہا کہ آپ دونوں (شمیم اور بھٹو) ”سوکالڈ پوش“ قبل از وقت کھلے ہوئے پھول ہو جنکا قبل از وقت مرجھانا مقدر ہے۔شمیم نے میرے اس منحوس کلام کا کوئی نوٹس لئے بِنا اپنا کلام جاری رکھا اور چار بجے ہم دونوں وہاں سے نکلے۔

چند سال ہی گذرے کہ شمیم صاحب کی بیماری کی خبریں ملیں اور ساتھ ہی اُنکے احباب میں اُنکی صحت کے بارے میں تشویش بڑھتی گئی۔ہم بھی عیادت کے لئے کئی بار چلے مگر اپنا وہ منحوس کلام زنجیر پا بن گیا اور اکثر آبی گذر کے کوچے میں پہونچکر اپنی نفسیات۔مجرمانہ نفسیات اُن کی گھر تک جانے میں مانع بن گئی ہفت روزہ آئینہ کے ایک شمارہ میں شمیم صاحب نے ”پیر صاحب کی کرامت“

---

[1]: اُن ایام میں جموں وکشمیر میں آنے اور یہاں سے جانے کے لئے پرمٹ سسٹم تھا۔ جانے والے کو متعلقہ پرمٹ اجرا ہوتا تھا اور اندر آنے کے لئے ۵ پرتھوی راج روڑ نئی دہلی سے جموں وکشمیر کا ٹریڈ کمشنر پرمٹ اجرا کرتا تھا۔

کے عنوان سے ایک کالم سپردِ قلم کیا تھا۔ پیر صاحب کی تصویر بھی نمایاں طور شائع ہوئی تھی۔ پیر صاحب موصوف میرے قریبی دوست تھے۔ بیگم شمیم کا چاچا بعارضۂ سرطان مبتلا تھا، AIMS دہلی سے نامراد واپس آئے تھے تو پٹن میں میرے دوست پیر غلام نبی جوہر نبہٖ صاَب ڈل نے ایک محفل سماع منعقد کی تھی اُنکی نعت خوانی کے طفیل اور سرورِ کائناتؐ کے فضل سے وہ اُس مہلک بیماری پر قابو پا گیا تو اُنکے داماد کو اس حیران کن ذاتی تجربہ کی تفصیلات حاصل ہوئیں اور تشہیر اُنکا فرض بنا۔ اب شمیم صاحب اسی مہلک مرض کے مریض ہوئے۔ زندگی سے پیار اور موت کا خوف انسانی کمزوری ہے خاص کر ایک ایسے نوجوان کے لئے جو خوب سے خوب تر کی تلاش میں کامیابی کی دہلیز پر پہونچا تھا۔

نبہٖ صاَب میرا دوست تھا اور بچپن میں ہم نے اُنکی ذاتِ گرامی میں کچھ ایسے نشانات نہ پائے تھے مگر ہمیں ایسے کئی شفایاب احباب سے ملاقاتیں تھیں جو نبہٖ صاَب کی کرامت کے معترف تھے اور دعویٰ کرتے تھے کہ مہلک امراض سے اسی پیر کی طفیل شفایاب ہوئے تھے۔ مجھے اعتبار کم تھا تو ایک روز اُن سے اس کرتب کے بارے میں پوچھا۔ مرحوم نے بلا جھجک مان لیا کہ وہ لمبے وظیفہ اذکار کا عادی نہ تھا نہ رُوحانی عظمت کا حامل تھا۔ ”ہاں گوہر صاحب خدا نے لحن داوُدی عطا کیا ہے۔ آہ و اشک میں خوش لحن اور موثر انداز میں دوبار حضور اقدسؐ میں رات کے پچھلے پہر نعت خوانی کر کے مخصوص بیماروں کے لئے دُعا مانگتا ہوں۔ ربِ جلیل اپنے محبوبؐ کو خوش کرنے کے لئے اس کی نعت خوانی کی لاج رکھتا ہے۔“

حیات کا دلدادہ، موت سے خائف، طالبِ شفا، شمیم اب عقل و استدلال کی اُلجھنوں سے بالاتر ہو کر منطق کے سب ورق پھاڑ کر نبہٖ صاَب کے دامن کو تھام لیتا

ہے۔ پیر صاحب کو اس شخص سے بہت محبت تھی اور اُس سے زیادہ اُنکی شفیق بہنوں کے اضطراب و اضطرار کو برداشت نہ کر پاسکا۔ درگاہ حضرت بل میں شب خوانی کر کے آنسوؤں میں غرق ہو کر نیم شب کو نعت رسولؐ کا نذرانہ اپنے مخصوص ترنّم میں پیش کیا۔ وہاں سے بہ دربارِ علمدارؒ چرار شریف جانے کا حکم مِلا۔ دوسرے شب جمعہ کو روضۂ علمدار کے اردگرد سلام بر سرورِ کائناتؐ خوش لحن پڑھکر حضرت جامیؒ کے نعت ادا کئے مگر ہدایت ہوئی کہ پکھر پورہ دربار سید علی عالیؒ میں جائے۔ وہاں بھی اپنا عمل جاری رکھا مگر صبح سویرے وہاں سے چالیس کلومیٹر کا سفر طے کر کے میرے گھر دُرجِ گوہر پہونچا۔ ناشتہ کر کے بادلِ ناخواستہ رُونی صورت بنا کر عازمِ سفر ہوا۔ ”میں خمریال لولاب جا رہا ہوں اگر شمیم کے گھر والے میرا پوچھیں لاعلمی ظاہر کرنا، میری بہنیں بھی مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں مگر شمیم کی بہنیں یہ صدمہ برداشت نہیں کر پائیں گی اور میں اُن کی بے کسی اور بے بسی دیکھنے کی جرأت نہیں رکھتا ہوں“۔ بعد میں معلوم ہوا کہ کسی پُر جلال کیفیت نے اُس کو آستانہ سید عالیؒ سے راتوں رات چلے جانے کا حکم کیا تھا۔ ہمارے ہاں سے جاتے جاتے پیر صاحب نے خواجہ اکرم دردمند (داُدی لدٕ کشمیری) کا یہ شعر پڑھا:

چھُ تدبیر شیشہ تہٕ تقدیر سنگ
مہ کر جُوش ناحق ھقس ہوش منگ ①

یہ سنکر ہمیں دیدار شمیم کی تڑپ زبردست پیدا ہوئی مگر اپنی نفسیات نے

ا: تقدیر آئینہ ہے تدبیر سنگ تدبیر کے لئے ناحق جوش و جنون سے کام لینا غلط ہے ایسے مرحلہ پر اللہ تعالیٰ سے ہوش حواس قائم رہنے کی دُعا کرنی چاہئے۔

اضطراری کیفیت میں لعل چوک میں سرگردان کیا۔ مرحوم پروفیسر حاجنیؔ نے میری کیفیت کو بھانپ کر توضیح مانگی۔ میری رُوئداد سنکر مجھے اپنے ساتھ پریس کالونی 'آئینہ خانہ' میں لیا جو سنگِ تقدیر کی زد میں آچکا تھا۔ یار کمر بستہ تیار بیٹھا تھا۔ علیک سلیک کے بعد ہم سے نبہ صاؔب کے بارے میں پوچھا۔ ہماری توضیح کے کھوکھلے پن کو بھانپ لیا اور فرمایا ''کہا قضا کے سامنے ہتھیار چھوڑ کر چلا گیا'' میں نہ جواب دے پایا۔ نہ اُس نے جواب کا انتظار کیا اور حاجنی کی طرف متوجہ ہوئے؟''

''آپ نے کوئی منحوس بات نہیں کہی تھی کہ شرمندگی چھا رہی ہے بلکہ آپ نے بشارت دی، باقی رہی بے وفا اور بے مروّت سیاسی کلچر کی بات، اُس سے اس جنت ارضی کا گلعذار لالہ زار ہی ہے''۔

اس لالہ زار میں پنا غلطیدنِ خاک وخون شمیم احمد شمیم بھی داغِ بے وفائی کا درس عبرت ہے۔

یہ دونوں قبل از فصل بہار کھلے ہوئے پھول کم وبیش ایک ہی سال کے دوران بکھر کر خاک ہوگئے مگر دیرپا زورآمدِ بہار کی مہک قائم کر گئے۔

..................☆☆☆..................

فیاض رفعتؔ

چند یادیں

میں شمیم احمد شمیم کو علی گڑھ یونیورسٹی کے تعلق سے جانتا ہوں۔ میری طالب علمی کے زمانے میں ''آئینہ'' خاصا مقبول تھا۔ ''آئینہ'' کے مدیر شمیم اپنی ساکھ بنا رہے تھے مجھے شروع سے لکھنے پڑھنے کا شوق تھا اور لکھنے پڑھنے والوں سے محبت۔ شمیم صاحب سے بالمشافہ اُن دِنوں کوئی ملاقات نہ ہوسکی۔ بس دیکھا تھا۔ اُن کی ذہین آنکھیں خوابوں کا سمندر تھیں۔ مجھے اُن کی آنکھوں میں جاگتی ہوئی روشنی بہت بھلی معلوم ہوتی تھی، اندھیروں کا سینہ چیرتی ہوئی نئے جزیروں کی متلاشی، ہنستی بولتی آنکھیں خاموش ہوگئیں، نامعلوم جزیروں میں کھوگئیں۔ ایسے جزیروں میں جہاں کی سیر کے لئے موت سے آنکھیں ملانا پڑتی ہیں۔ جسم کو بہر حال کسی نہ کسی دن معدوم ہونا ہی ہے۔ جس دھرتی کی بوباس ہمارے جسموں میں ہے۔ ہماری روحوں میں ہے، ہمیں سب کو اُسی دھرتی میں سمانا ہے۔

غالبًا یہ ۱۹۷۳ء کی بات ہے۔ لکھنو میں آل انڈیا اردو ایڈیٹرز کانفرنس تھی۔ دلی اسٹیشن پر شمیم صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اپنی تمام تر تازگی، توانائی اور سرمستی کے ساتھ دو ذہین آنکھوں نے مجھے تاڑا۔

''فیاض رفعت کہاں جارہے ہو!

''لکھنؤ''!

''ارے بھئی ٹکٹ کیوں لیا۔ میرے ساتھ چلتے ۔ بلاٹکٹ سفر کا مزہ لیتے ......اور سناؤ کیا ہو رہا ہے۔ میں زیرلب مسکراتا رہا۔ ویسے بھی میرے پاس سنانے کو کچھ نہیں تھا۔ شمیم صاحب کو سننے کا مزہ کچھ وہ لوگ ہی جانتے ہیں، جنہوں نے ان کی گل فشانی گفتار کے تیور دیکھے ہیں۔

باتیں ہماری یادرہیں پھر باتیں نہ ایسی سنیۓ گا
جو کہتے کسی کو سنیۓ گا تو دیر تلک سر دُھنیۓ گا

کانفرنس میں وزیراعظم مسز گاندھی تھیں۔ اُس وقت کے وزیراعلیٰ بہوگنا بھی تھے، کلدیپ نیّر، سلامت علی مہدی، عابدی الہ آبادی، غلام سرور، مولینا امداد صابری. ؎صدق جدید کے عہد ساز مدیر مولینا عبدالماجد دریابادی، غرض کہ سیاست دان، صحافی، عالم اپنے میدانوں کے دھنی موجود تھے۔ لیکن شمیم احمد شمیم کی سج دھج اور آن بان کے کیا کہنے!۔

اُس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلۂ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

ہر شخص کی نگاہوں کا مرکز شمیم صاحب تھے۔ اُن کی لذت تقریر نے وہ جادو جگایا کہ جیسے سارا مجمع اُن کا اسیر ہو گیا۔ شمیم صاحب نے جو کہا وہ دِل میں اتر گیا۔

شمیم صاحب پارلیمنٹ کے ممبر تھے۔ دلی میں اکثر کناٹ پیلس پر یا اِدھر اُدھر ملاقات ہو جاتی تھی۔ میں اُن دِنوں پیلومودی کے اخبار ''مارچ آف دی نیشن'' کے اِدارتی بورڈ میں شامل تھا۔ پیلومودی لوک سبھا میں انگریزی کے بہترین مقرر

تھے۔ اِدھر اُردو میں شمیم صاحب کا طوطی بولتا تھا۔ پیلومودی شمیم صاحب کے اور شمیم صاحب پیلومودی کے قائل تھے۔ شمیم صاحب آتے جاتے رہتے تھے۔ خوب قہقہے اڑاتے، طنز کے تیر پھینکتے، اور آزمائش کے لمحوں میں بھی مزاج کی شگفتگی اور تیکھے پن کو برقرار رکھتے! اپنی غضب کی فعالیت، ایسی خوداعتمادی، ایسی ذہانت، ایسی خطیبانہ صلاحیت، ایسی انشاپردازی، اُن کی عمر کے لوگوں میں، میں نے خال خال ہی دیکھی ہے۔

ریڈیو سے وابستہ ہونے کے بعد میں ۱۹۷۵ء میں سرینگر آ گیا۔ شمیم صاحب رواداری، خلوص اور گرم جوشی سے مِلے ۔ حال چال دریافت کیا۔ مجھے مکان کی ضرورت تھی اور میں ہاؤس بوٹ میں رہتا تھا۔ اکثر جب بھی اُن سے مکان کی ضرورت کا اظہار کیا۔ ہنس کر کہتے! فیاض رفعت ہاؤس بوٹ میں رہتے ہو۔ اکیلے آدمی تمہیں مکان کی کیا ضرورت ہے۔ نئے نئے کشمیر آئے ہو، ہاؤس بوٹ کی زندگی دیکھو، جب دِل بھر جائے، بتانا۔ اِنتظام ہو جائے گا۔

شمیم صاحب کو پارلیمنٹ کا ٹکٹ نہیں ملا۔ یہ صحیح ہے لیکن میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ وہ دل برداشتہ تھے۔ میں یہ بھی ماننے کے لئے تیار نہیں کہ اُن کا زوال شروع ہو چکا تھا......ذہین لوگ اپنے عہد میں ہوتے ہوئے بھی اپنے عہدے سے ماورا ہوتے ہیں۔ اور ایسے لوگوں کا کبھی زوال نہیں ہوتا۔ اچھا بُرا وقت آتا جاتا رہتا ہے۔ ویسے بھی وقت کی اچھائی بُرائی ایک اضافی صفت ہے۔ یہ صحیح ہے کہ شمیم صاحب (Ambitious) تھے (مگر اِس میں برائی کیا ہے) یہ بھی ٹھیک ہے کبھی کبھی ایسا لگتا تھا کہ شمیم صاحب کو بہت جلدی ہے وہ بڑی عجلت میں ہیں......دراصل وہ اپنا ایک لمحہ بھی ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اُن کے مزاج میں ٹھہراؤ کی کمی تھی۔ شاید اس لئے کہ اُن کے پاس وقت کم تھا۔ ۴۵ برس کی چھوٹی

سی عمر لیکر جو شخص آئے وہ بھلا چین سے کیسے بیٹھ سکتا تھا۔ اُس کا تو ایک ایک پل قیمتی تھا۔ کہ وہ گوہر نایاب اپنی روشنی بکھیر کر بس جانے ہی والا تھا۔

زندگی کے آخری تین چار سالوں میں شمیم صاحب سے بہت سی ملاقاتیں رہیں۔ اکثر ریذیڈنسی روڈ پر اخباروں کی دوکان پر کافی ہاؤس کے سامنے کھڑے نظر آتے۔ مجھے دیکھتے ہی آواز لگاتے۔

''فیاض رفعت میرے پچھتر روپے''۔

پہلی بار تو میں گڑ بڑا گیا۔ کون سے پچھتر روپے، میں نے تو کبھی قرضہ نہیں لیا شمیم صاحب سے؟'' انہوں نے مجھے پریشان دیکھ کر کہا۔'' کانٹریکٹ۔ پچھتر روپے کانٹریکٹ، جلدی اِنتظام کرو''۔

شمیم صاحب کا یہ پیار بھرا تقاضہ مجھے بہت بھلا لگتا تھا۔ اب مجھ سے کوئی اِسطرح کا تقاضہ کرتا ہے تو شمیم صاحب کی ذہین مسکراتی ہوئی آنکھیں مجھے بُک شاپ کے کارنر پر منڈلاتی ہوئی نظر آتی ہیں اور میں آب دیدہ ہو جاتا ہوں کہ جانے والے پھر کبھی پلٹ کر واپس نہیں آتے۔ بس اپنی یادیں چھوڑ جاتے ہیں۔

شمیم صاحب بیمار ہیں۔ شمیم صاحب کی آنکھ کا آپریشن بخیر و خوبی ہو گیا۔ وہ واپس سرینگر آئے۔ اُن کا سفرنامہ ''آئینہ'' میں شائع ہو رہا ہے۔ شمیم صاحب کا قلم اور اُس کے تیور! کافی ہاؤس میں تبصرے، دوستوں دشمنوں کی طرف سے داد بے داد کا سلسلہ، دونوں صورتوں میں شمیم صاحب قانع، ہنستے مسکراتے، چہچہاتے، لطیفے اور قہقہے لُٹاتے شمیم صاحب! اچانک سُنا کہ شمیم صاحب پھر بیمار ہیں۔ میں نے ظفر معراج کو فون کیا تھا۔ کہ شمیم صاحب کی ایک مباحثے میں ضرورت ہے۔ انہوں نے بتلایا یہ کہ اُنہیں زکام اور بخار ہے، نہیں آسکیں گے۔

شمیم صاحب امریکہ میں ڈھائی ماہ رہے اور سری نگر آ گئے۔ میں اور بشیر شاہ ایک دن چلے اُن سے ملنے کے لئے۔ وہ اُن دِنوں کم کم ہی لوگوں سے مِلا کرتے تھے۔ شاید اُنہیں رسمی عیادت پسند نہیں تھی۔ بشیر شاہ کے بعد بیگم شمیم نیچے آئیں اور مجھ سے کہا فیاض صاحب، شمیم صاحب آپکو بُلا رہے ہیں۔

میں اوپر گیا۔ شمیم صاحب نے اپنی خوبصورت آواز کے ساتھ بڑے اعتماد کے ساتھ کہا''......فیاض رفعت کیسے ہو؟

میں اُنہیں خالی خالی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ شمیم صاحب نے اطمینان کے ساتھ کمبل کو چاروں طرف سے لپٹا اور تکیہ کے ساتھ آرام سے پلنگ پر لیٹ گئے۔ پھر سُنا شمیم صاحب اچھے ہو رہے ہیں۔ اور پھر وہ سنا جو کان سننے کے لئے تیار نہ تھے۔ ذہن و دل قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔

پہلی مئی کو صبح ساڑھے دس بجے شمیم صاحب نے آئینہ کی بالائی منزل میں آخری سانس لی۔ مجھے خدائے برتر سے ایک ہی شکوہ ہے۔

O.........اے خدا کیا تو شمیم صاحب کو پانچ برس کی اور زندگی عطا نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اپنے حوصلے نکال پاتے۔ زندگی سے دو دو ہاتھ کر پاتے ......کاش......!

..........☆☆☆..........

کرشن چندر

چھٹتا نہیں ہے منہ سے کافر لگا ہوا

میں حتی الامکان آئینہ دیکھنے سے گریز کرتا ہوں۔ لیکن شمیم احمد شمیم نے جو "قدم آدم" آئینہ ایجاد کیا ہے، اُسے دیکھنے کی خواہش سے خود کو باز نہ رکھ سکا۔ یوں بھی کبھی کبھی آئینہ دیکھ لینا چاہیئے۔ ایسا کرنے سے اپنے خدوخال کو سنوارنے میں مدد ملتی ہے۔ اہلِ کشمیر کو ہر ہفتے شمیم کے آئینے میں اپنے سیاسی اور فکری خدوخال کو دیکھنے اور پرکھنے کے مواقع ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ دوستوں اور دشمنوں دونوں ہی کے لئے سودمند عمل ہے۔ اس لئے کہ آئینے کی ضرورت صرف حسینوں ہی کو نہیں پروانوں کو بھی پیش آتی رہتی ہے۔

شمیم احمد شمیم ایک نوجوان جرنلسٹ ہیں۔ ایک باشعور سیاسی کارکن ہیں۔ ایک کج بحث اور ذہین وکیل ہیں۔ ایک عمدہ ادیب اور ایک بے انتہا طباع انسان ہیں۔ اتنی چیزیں ایک جگہ جمع ہو جائیں تو شخصیت کی کیمیا میں ایک آنچ کی کمی بھی نہیں رہ جاتی ہے۔

شمیم کی تحریر دیکھنے سے پہلے میں اُن کی تقریر سُن چکا تھا۔ اور بڑے نازک وقت میں یہ تقریر سُن چکا تھا۔ بمبئی میں اردو کنونشن کے موقعے پر ہوم منسٹر شری چوان کی موجودگی میں جناب شمیم نے جو دھواں دھار تقریر فی البدیہہ فرمائی تھی اور جس صاف گوئی سے اردو کے سلسلے میں ہونے والی سیاسی دھاندلیوں کا پردہ چاک کیا تھا اور جس تقریر کی چنگاریاں صرف حکومتِ ہند ہی پر نہیں مجھ خاکسار پر بھی بکھر رہی تھیں۔ یہی وہ شعلہ بیانی تھی یا تقریر کا جادو تھا کہ کوئی گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا۔

"آئینہ" میں کشمیر کی جن سیاسی شخصیتوں کے بارے میں پڑھتا ہوں، ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے انہیں بہت قریب سے دیکھ چکا ہوں، حالانکہ بیشتر ایسی ہستیاں ان میں شامل ہیں جن سے ذاتی طور پر واقف نہیں ہوں۔ یہی اس شعلہ صفت انسان کا کارنامہ ہے جسے شمیم احمد شمیم کہا جاتا ہے۔ نام سُنئے تو لگتا ہے جیسے کوئی نہایت نرم و نازک مہکتا ہوا انسان ہوگا، ملاقات کیجئے تو جیسے دھکتا ہوا شعلہ، مدافعت کے سارے ہتھیاروں سے لیس ہو کے بیٹھے کون جانے کس وقت گویائی کا کارتوس، کس طرف چل جائے۔ بُری عادت پڑتے دیر نہیں لگتی۔ مجھے بھی "آئینہ" پڑھنے کی عادت سی ہوگئی ہے۔ اسی اخبار کے بارے میں شاید کہا گیا ہے "چھٹتا نہیں ہے منہ سے کافر لگا ہوا"۔

چنانچہ اس "کافر" کے لئے ایک اور 'کافر' کی یہی دُعا ہے کہ یہ "آئینہ" کشمیر کے سیاسی، علمی اور ادبی اُفق پر اسی آب وتاب سے چمکتا رہے اور ہر چہرے کے ملمع کو بے نقاب کرتا رہے۔

☆☆☆

کمال احمد صدیقی

تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

شمیم نے آئینہ کے شخصیات نمبر میں ان سب کے بارے میں لکھا، جس سے اُس کے مراسم تھے۔ بس مجھے بخش دیا۔ اس نے ایک بار نہیں، کئی بار یہ دھمکی دی تھی کہ میں تمہارے بارے میں مضمون نہیں، پوری کتاب لکھوں گا اور وہ کچھ لکھوں گا کہ دنیا عبرت پکڑے گی اور تم بہت دن تک زندہ رہو گے۔ شمیم کی بے وقت بیماری اور اس سے بھی زیادہ بے وقت موت نے اس کو اپنی اس دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کی مہلت نہیں دی۔ وہ جو کچھ لکھتا اس کو پڑھ کر میں رونے کے بجائے ہنستا، یا ہو سکتا ہے اُن کے قلم کی کاٹ واقعی مجھے رلا دیتی لیکن ایک بات جو اس وقت حقیقت ہے، یہ ہے کہ شمیم نے موت کو لبیک کہہ کر میرے بارے میں کچھ لکھے بغیر اپنی دھمکی پوری کر دی۔

اس نے کچھ ایسے رلایا ہے کہ دل جانے ہے۔ یہ رونا ایک دن کا نہیں ہے کچھ دنوں کا نہیں زندگی کی آخری ساعت تک کا سلسلہ ہے۔

شمیم کے میرے مراسم نہیں تعلقات کا سلسلہ لگ بھگ تین دہائیوں پر پھیلا

ہوا ہے جب میں تپ دق کا مریض تھا اور شمیم ایس پی کالج میں انٹرمیڈیٹ کا طالبعلم۔ اگر چہ شمیم سائینس کا طالب علم تھا لیکن ادب کا صاف ستھرا مذاق رکھتا تھا۔ ادب نے اس کو اپنے شکنجے میں ایسا کسا تھا کہ طبعیات، کیمیات اور حیاتیات کے جن سوالوں کا جواب اسے نہیں معلوم ہوتا اُن کا نمبر دے کر کوئی شعر لکھ دیتا (یہ بات بعد میں مجھے ایس پی کالج کے پروفیسر، پرنسپل جیالال کول نے بتائی، جو کالج سے سبکدوش ہونے کے بعد کچھ عرصے تک ریڈیو میں میرے رفیق کار رہے، شمیم نے بھی اس کی تصدیق کی۔)

زمانہ طالب علمی ہی میں شمیم احمد شمیم نے کشمیر کے ایک جانے مانے شاعر کی کتاب پر ایسا دھماکہ خیز تبصرہ کیا کہ سارے کشمیر میں اس کے چرچے ہوئے۔ یہ تبصرہ کم تھا اور ہونگ زیادہ۔ شمیم نے ہونگ کو کشمیر میں ایک فن کا درجہ دیا تھا اور وہ بھی کم عمری میں۔ عجیب اتفاق ہے کہ شمیم سے میری پہلی ملاقات کی وجہ "ہونگ" ہی ہے۔ ہوا یہ کہ پرتاپ پارک میں امن کانفرنس ہوئی۔ شاید ۱۹۵۳ء کی بات ہے۔ میں ٹنگمرگ سینی ٹوریم سے طلب کیا گیا، دن کا اجلاس خواجہ غلام محمد صادق کی صدارت میں ہوا۔ اس میں اور لوگوں کے علاوہ مرزا محمد افضل بیگ نے بھی تقریر کی (اُس زمانے میں شیخ محمد عبداللہ وزیر اعظم تھے اور ان کے کیمپ میں ریاستی دستور یہ کے صدر خواجہ غلام محمد صادق اور مشیر مال مرزا محمد افضل بیگ تھے، شیخ صاحب اپنے نائب وزیر اعظم اور وزیر داخلہ بخشی غلام محمد سے ذرا کھچے ہوئے تھے۔ یہ شہر کی افواہ تھی اور اس زمانے میں شہر کی ہر افواہ مصدقہ خبر ہوتی تھی، کیوں کہ کابینہ کے اراکین اور عوام میں براہ راست تعلقات تھے۔ شیخ صاحب، بخشی صاحب اور بیگ صاحب میں کسی ایک کی حق تلفی نہیں کرتے تھے۔ اوسطاً سال میں چھ مہینے بخشی

صاحب کو۔اپنی قربت کا شرف بخشتے تھے اور چھ مہینے بیگ صاحب کو اس طرح سے ایک توازن برقرار رہتا تھا۔رموزِ مملکت سے واقفیت رکھنے والوں نے اس کی بہت سے توجیہیں کیں لیکن اب یہ زندہ مسئلہ نہیں ہے، سیاسیاتِ کشمیر پر آئندہ جو لوگ تحقیق کریں گے وہ شاید اس پر روشنی ڈال سکیں۔اس وقت یہ میرا موضوع نہیں ہے اس لئے یہ یہ بات ادھوری چھوڑتا ہوں۔امن کانفرنس کا دوسرا اجلاس پرتاپ پارک ہی میں شام کو ہوا، دوسرے اجلاس کی صدارت کے فرائض مجھے سونپے گئے۔یہ ایک مشاعرہ تھا، جس میں کشمیری، ڈوگری، لداخی اور اردو کے شاعروں نے اپنا کلام شروع کیا۔اس زمانے میں رحمٰن راہی اور امین کاملؔ، دونوں اردو میں شاعری کرتے تھے۔راہیؔ کشمیری میں بھی شعر کہتے تھے اور کاملؔ صرف اردو میں۔یہ دونوں حضرات دینا ناتھ نادم، نور محمد روشنؔ، بنسی نردوش، سومناتھ زتشیؔ، مہندر ناتھ رینہ اور اکبر لداخی کی طرح ترقی پسند تحریک کے سرگرم حامیوں اور کارکنوں میں سے تھے۔یہ بہت کامیاب مشاعرہ تھا، حاضرین کی تعداد خاصی تھی سب بڑی توجہ سے شعراء کا کلام سن رہے تھے۔فقروں کے جو میزائیل آرہے تھے ان پر اینٹی میزائل پھینکنا میرے فرائض منصبی میں سے تھا نتیجہ یہ ہوا کہ ہوٹنگ کا کوئی فقرہ نشانے پر پہنچنے سے پہلے ہی نہ صرف تباہ ہوا بلکہ ہوٹنگ کرنے والے ہوٹ ہو گئے اور سامعین اس سے بھی محظوظ ہوئے۔مشاعرے کے بعد احباب نے بتایا کہ ہوٹنگ کرنے والے ماہرِ فن تھے اور پہلی بار اپنی سعی میں ناکام ہوئے دو روز کے بعد ایک نوجوان ملنے کے لئے ہوٹل آیا اور اپنا تعارف کرایا...... ''میرا نام شمیم احمد شمیم ہے اور میں ایس ،پی کالج میں پڑھتا ہوں۔آپ کا کلام رسالوں میں بہت پڑھا ہے لیکن اس کی وجہ سے آپ سے ملنے نہیں آیا ہوں اس لئے ملنے آیا ہوں، کہ پرسوں آپ نے مشاعرے میں کسی کو

ہوٹ نہیں ہونے دیا، میں شوپیاں گیا ہوا تھا اس لئے اس مشاعرے میں شرکت نہیں کرسکا۔آج تک کوئی ہماری جماعت کی ہوٹنگ کو پلٹ نہیں سکا۔لیکن آپ نے ہمارے ساتھیوں کی زبانیں بند کردیں۔آپ کے جو برجستہ فقرے، ہوٹنگ کے سوچے سمجھے اور ری ہرسل کئے ہوئے جملوں کے جواب میں تھے اگرچہ وہ باسی ہوکر مجھ تک پہنچے، لیکن انہوں نے مجھ میں اشتیاق پیدا کیا کہ آپ سے ملوں''۔

میں نے چائے منگائی۔یہ کہنے میں مجھے باک نہیں کہ ہم دونوں کے درمیان پر کشش باہمی تھا۔کشمیر میں میرے دوستوں کی تعداد ہزاروں میں ہے اور ان میں سماج کے ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں۔شمیم کو میں نے ان سب سے مختلف پایا اس اعتبار سے کہ یہ سہما سہما نہیں تھا۔ایک باغی نوجوان، جو نہ صرف اپنی فکر میں بے باک تھا بلکہ اپنے خیال کے برملا اظہار میں بھی بے باک تھا۔شمیم میرے اتنے قریب آگیا کہ عزیزوں سے زیادہ عزیز ہوگیا اور رفتہ رفتہ میری زندگی کا ایک حصہ بن گیا۔ایک ایسا حصہ کہ جسے میں خود سے الگ کرنا بھی چاہوں تو نہ ہو پھر مجھے کبھی کبھی الجھن ہونے لگی، میری والدہ اور میرے والد۔اور دوسرے عزیز بھی میرے ذاتی معاملات اس سے مشورے کرنے لگے۔میں کسی کے ذاتی معاملوں میں دخل نہیں دیتا، لیکن میں نے محسوس کیا کہ شمیم میرے ہر ذاتی معاملے میں دخل دے رہا ہے اور میں کچھ نہیں کرسکتا۔اس سے زیادہ دشوار بات یہ ہے کہ اس کے ذاتی معاملات میں مجھ سے مداخلت کرائی جاتی تھی۔آج جب شمیم نہیں ہے تو کوئی میرے معاملات میں دخل اندازی کرنے والا نہیں اور کل تک، جس مداخلت سے کبھی کبھی میں بے دماغ ہوجاتا تھا آج اس مداخلت کے امکان ختم ہو جانے پر مجھے ایک بڑی محرومی کا احساس ہو رہا ہے۔

شمیم کے قلم اور زبان کی تلواروں نے کس کو چھوڑا ہے وہ دشمنوں کے ساتھ ہی نہیں دوستوں کے ساتھ بھی سفاک تھا اور دونوں کو ایک صف میں ایک فائرنگ لائن میں کھڑا کرتا تھا۔ چند بدذوقوں کو چھوڑ کر، ہر ایک نے اس کے وار نہ صرف سہے بلکہ اُن کا خیر مقدم کیا اور اُن کو ایک تحفے کی طرح یادگار کے طور پر رکھا۔

آج شمیم ہم میں نہیں ہے تو سب تحفوں کو اپنی یادداشت کے خزانوں سے نکال کر دیکھ رہے ہیں اور پھر اپنے ذہنوں میں حفاظت کے ساتھ سجا کر رکھ رہے ہیں اس کے چلائے ہوئے تیروں کے زخم دوبارہ ہرے ہو رہے ہیں اور ان کی کسک میں ایک ایک لذت ایک میٹھے میٹھے درد کا تاثر ہے شاید ہم سب ایذا پرست ہیں۔ کیا شمیم کو ہم سب کی اس کمزوری کا پتہ تھا کہ وہ لوگ بھی اُس کے اُٹھ جانے پر روئیں گے جو اس کی تحریروں اور اس کی گفتگو کی چوٹیں کھا کر پہلے بھی رو چکے ہیں۔

ہائے کشمیر! تو نے صدیوں میں ایک باغی پیدا کیا تھا۔ ایک ایسا ذہن پیدا کیا تھا جو خود اپنے تلون سے زچ تھا جس کے شکار دوست دشمن ہی نہیں، خود اس کی اپنی ذات بھی تھی۔ شاید شمیم جیسے کسی دشمن جانی یار کی نوازشوں نے مرزا محمد رفیع سودا سے یہ شعر کہلایا تھا۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغِ قبلہ نما آشیانے میں

..........☆☆☆..........

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

خوابوں کا سوداگر

شمیم احمد شمیم شعلۂ مستعجل تھے، روشن ہوئے، بھڑکے اور خاموش ہوگئے۔ بے باکی، جرأت اور حق گوئی میں ان کے ہم عمروں میں کم لوگ وادیٔ کشمیر میں اس کے پائے کے ملیں گے۔ اور شاید یہی روشنی طبع ان کے لئے بلائے جان ثابت ہوئی۔ طبیعت میں بلا کا تحرک اور سیمابیت تھی۔ میں نے انہیں ایک جگہ پر قائم نہیں دیکھا۔ آج سے پچیس بَرس پہلے جب علی گڑھ میں ان سے ملاقات ہوئی تھی کون کہہ سکتا تھا کہ وہ سیاست کی پُر خار وادی میں قدم رکھیں گے۔ آندھی میں بگولہ بن کر اُڑیں گے۔ تحریر وتقریر دونوں کے بادشاہ تھے۔ جب پارلیمنٹ میں الیکشن جیت کر آئے تو اُن کا کیسا شہرہ تھا اور اُن کے چاہنے والے اُن کی امیدوں کے مستقبل سے کیسے سرشار نظر آتے تھے۔ پارلیمنٹ میں جب اُنہیں اظہار خیال کا موقعہ مِلا، اُن کی فہم وفراست اور طاقت لِسانی نے سب کو متاثر کیا۔ دہلی کے اَدبی اور تہذیبی اجتماعوں میں کبھی کبھی مُلاقات ہوجاتی تھی۔ اِسی زمانے میں خلیل الرّحمان اعظمی کی علالت اس حد تک پہنچی کہ اُنہیں آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں دِکھانا پڑا۔ اس کا انتظام شمیم صاحب ہی نے کیا تھا اوران کی

بیماری کے لاعلاج ہونے کی اِندوہ ناک خبر بھی سب سے پہلے اُنہوں ہی نے سُنائی تھی۔ تب کِسے معلوم تھا کہ چند برس میں وہ بھی اس سے ملتے جلتے عارضے کا شِکار ہوں گے اور معالجوں کی کوئی تدبیر انہیں بھی اُس راہ پر جانے سے روک نہ سکے گی، جس رَاہ پر جا کر کوئی بھی واپس نہیں آتا۔

اُردو صحافت میں ان کے قدموں کے نشان ہمیشہ باقی رہیں گے۔ ایک بے باک، نڈر اور حوصلہ مند صحافی کی حیثیت سے، اُنہوں نے جو خدمت انجام دی ہے اُسے بھلایا نہ جا سکے گا۔ اُنہوں نے ''آئینہ'' اِس شان سے نِکالا کہ دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے وادی کے اہم ترین جریدوں میں مقام حاصل کرلیا۔ پھر جب پانسہ پلٹا تو کیفیت دوسری تھی۔ بمبئی تک اِن کی آواز کی گونج تھی۔ ایک دو موقعوں پر شمیم سے میرا آمنا سامنا بھی ہوا جس کی یاد کبھی دِل سے محو نہ ہوگی۔ وہ اِس زمانے میں جنتا کی لہروں کے اَثر میں تھے، بلراج پوری اِن کے سَاتھ تھے اور جلسے کی صدارت کر رہے تھے۔ جموں کے ادیبوں اور شاعروں میں دونوں کی بات سننے کا اشتیاق تھا۔ جواب الجواب ہوئے اور شمیم نے بہت زور مارا لیکن وہ بحث کے اِس بنیادی نکتے کا جواب نہ لا سکے کہ سِیاست مصلحت وقت کے تابع ہوتی ہے اور حالات کے جھونکوں کے سَاتھ سَاتھ بَدلتی ہے جبکہ اَدب بالذات ہے، یہ سیاست سے متاثر ہوتا ہے، لیکن اس کا تابع نہیں ہوتا۔ شمیم میں حسِ مزاح بھی بے پناہ تھی، جس محفِل میں وہ ہوتے، ان کے وجود سے وہ زعفران زار بن جاتی۔ شام کی نشستیں ان کی موجودگی سے جگمگا اُٹھتی تھیں۔ جَب جَب سِرینگر جانا ہوتا ایک شام اِنکے ہاں ضرور گزرتی اور وہ یادگار شام ہوتی۔ اصل چیز ان کی اُمنگ اور ان کا ولولہ تھا، وہ کشمیر کے لئے، اپنے وطن کے لئے، اپنے لوگوں کے لئے بہت کچھ کرنا چاہتے تھے۔ اور

اُنہوں نے بہت کچھ کیا بھی! ایسا آدمی خواب دیکھتا بھی ہے اور دِکھاتا بھی ہے، ......اَیسے خواب جن کی تعبیر نِکلتی ہے اور اَیسے بھی جو شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتے۔ خوابوں کی یہ دولت ہی شمیم کا سب سے بڑا اَثر مایہ تھی اور اسکی وجہ سے وہ اپنے دوستوں کے دلوں میں زندہ رہیں گے۔

❁......❁......❁

☆ اپنی نِگارشات صاف صاف اور کاغذ کے ایک ہی طرف لکھیں۔ تبدیلی پتہ/یا فون نمبر بدلنے کی صورت میں ہمیں مطلع کرنا نہ بھولیں۔ (ادارہ)

..................☆☆☆..................

محمد شفیع خان

شمیم احمد شمیم

دانشورانہ صحافت کی تابندہ مثال

جب بھی شمیم احمد شمیم کے تئیں یادوں کو تازہ کرنے کی کوشش کی جائے، ایک ایسی ہمہ جہت شخصیت کا تصور اُبھر آتا ہے جو اپنے نرالے پن سے اُس وقت کے حوالہ سے ہی نہیں، جب وہ ہمارے یہاں سیاسی ،ادبی، تمدنی، علمی اور صحافی سرگرمیوں کے روحِ رواں تھے بلکہ آج کے خیال و جائزہ سے بھی یہ شخصیت بالکل الگ نظر آتی ہے......ایک ناقابلِ تقلید شخصیت، جس کے بارہ میں شاعر کا یہ خیال کہ مُدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے ،کتنا حقیقت کے قریب لگتا ہوا نظر آتا ہے۔ ہفتہ روزہ آئینہ کو ۱۹۶۴ میں معرضِ وجود میں لانے کے ساتھ ہی وہ کشمیر کی اُس وقت کی محدود صحافتی دُنیا میں جیسے ایک عالمِ خموشاں میں ایک زبردست گونج پیدا کرنیوالی آواز کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا۔ یہ آواز جوش و جذبہ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ صداقت کا بَرملا اظہار اِس کا طرۂ امتیاز تھا۔ بہت جلد ہفت روزہ آئینہ شمیم احمد شمیم کی شخصیت کی پہچان بن گیا......ایک ایسا شخص جو نہ صرف یہ کہ کشمیر کے پورے سیاسی، سماجی اور ثقافتی منظر کو آئینہ کر رہا ہے بلکہ وہ بھی جو فرسودہ خیالات ، ماضی

پرستی، پامال لا حاصل ذہنی رویوں اور تصورات و اعتقادات سے نبرد آزما ہو کر روشن خیالی کی مشعل کو فروزاں کر رہا ہے۔ اُس نے صحافت کو اپنے فن و ادب کا وسیلہ بنایا اور اِسی میڈیم سے وہ امید و آرزو کے منجمد سوتوں میں اِرتعاش پیدا کرنے کی سعی بلیغ کرتا رہا۔ وہ بامقصد، معیاری اور شائستہ صحافت کی آج بھی ایک شاندار علامت ہے۔ اُس نے جو کچھ لکھا اُس کا فکری محرک آج بھی ہمارے لئے نشانِ راہ ہے گو کہ واقعاتِ زمانہ نے پلٹا ہی کیوں نہ کھایا ہو۔ جدت اپنے جلو میں دشوار گذار مراحل بھی لے آتی ہے۔ پٹی ہوئی لکیر پر چلنا آسان ہے اور قرینِ مصلحت بھی اور ایک نئے راستہ پر پہلا قدم اُٹھانا ہی مشکل ......تقلید اور جدت میں راستے الگ الگ ہیں۔ جو فکر اور طبعی میلان ہی فرد کو نئے راستہ پر چلنے کا ولولہ اور حوصلہ عطا کرتے ہیں۔اقبال کا یہ پُرسوز شعر اِسی آرزو کا متقاضی ہے۔

تیری دعا ہے کہ تیری آرزو ہو پوری
میری دعا ہے کہ تیری آرزو بدل جائے

اُس نے آئینہ کے شخصیات نمبر میں خود اپنے آپ پر جو خاکہ لکھا وہ نقدِ ذات کی ایک ناقابلِ تقلید اور روشن مثال ہے۔ وہ اپنا پکٹوگراف اپنی کوہ جگر خود اعتمادی کے اعلامیہ پر یوں مکمل کر لیتا ہے۔ ''وہ سیاسی دُنیا کا سعادت حسن منٹو ہے جو چونکا دینے پر یقین رکھتا ہے۔ آپ شمیم سے نفرت کر سکتے ہیں۔ اُس کے خلاف سازش کر سکتے ہیں ۔ اُس کو گالی دے سکتے ہیں لیکن آپ اُسے نظر انداز نہیں کر سکتے۔'' نظر انداز وہ نہیں ہوتا جو تیل سے خالی پرانے چراغوں کی جگہ نئے چراغ جلاتا ہے جن سے اندھیرے میں راہیں روشن ہو جاتی ہیں۔ اِس خاکہ کی اُردو میں اگر کوئی نظیر ملتی ہے تو وہ اپنے بھائی کی موت پر عصمت چغتائی کا لکھا ہوا مضمون ہے

جس کا عنوان ہی 'دوزخی' تھا۔ اِس مضمون کو پڑھ کر منٹو کی بیوی نے منٹو سے کہا تھا کہ عصمت کو یہ کیا ہو گیا کہ بھائی پر ایسا کریہہ المنظر مضمون لِکھا۔ منٹو کا چونکا دینے والا جواب یہ تھا کہ 'اگر تم مجھ پر ایسا مضمون لِکھ سکو' قسم بخدا میں ابھی مرنے کو تیار رہوں'۔

کوئی بھی ذِی حِس اور بالغ نظر شخص باوجود اختِلاف کے شمیم کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ وجہ یہ کہ وہ محض ایک کالم نگار صحافی نہیں تھا' محض ایک سیاستکار نہیں تھا بلکہ تر و تازہ خیالات اور دانشورانہ فکر کا حامل ایک ادیب تھا۔ حدت اور شعلگی اور گھن گرج کے باوجود وہ ایک مقناطیسی کشش کا آدمی تھا۔ اُسے اپنی شخصیت کا لوہا منوانا آتا تھا۔ اُوپر سے زبان و قلم پر ایسی قدرت کاملہ کی بایدوشاید۔ جیسی تحریر ویسی تقریر۔ شمیم کی دانشوری پر بات تو ہو گی ہی لگے ہاتھوں راقم الحروف سے اُن کی پہلی الیکشن مہم کا یہ چھوٹا سا قصہ بھی سن لیجئے۔ جموں کشمیر اسمبلی کے لئے اُس نے پہلا الیکشن شوپیان سے ہی لڑا تھا اور بہ مشکل تمام بوجوہ فراڈ اور ووٹ چوری کے یہ الیکشن جیت لیا تھا۔ اُس وقت اندرا گاندھی ہندوستان کی وزیر اعظم تھیں۔ کشمیری سیاست میں آپ الیکشن جیتنا چاہیں تو ہندوستان کی مخالفت میں امیدوار کو کچھ نہ کچھ خواہ مخواہ کہنا ہی پڑتا ہے۔ یہ نسخہ بیگ صاحب بھی چناؤ جلسوں میں استعمال کرتے تھے۔ شمیم نے ایک جلسہ میں لوگوں کو اپنی طرف کرنے کے لئے کشمیری زبان و لہجہ میں کہا "میں اِندرا گاندھی کے بال نوچ لوں گا" سادہ لوح دیہاتیوں کے لئے یہ جملہ الیکشن ہنگامہ میں ایک مرغوب کلیشہ بن گیا تھا۔ جسے وہ مزہ لے کر دہراتے تھے۔ الیکشن جیتنے کے بعد جب وہ شوپیاں آیا تو اُس کا والہانہ اِستقبال ہوا۔ سارا بازار محرابوں سے دلہن کی طرح سج گیا۔ یاد رہے کہ اُس وقت مرزا افضل بیگ کا رائے شماری محاذ زندہ تھا اور شیخ صاحب عزت و آبرو کا مقام حاصل کرنے کے لئے

محبوس تھے۔ شوپیان کے قلعہ باغ میں ہزاروں لوگوں کے مجمع میں شمیم نے تقریر کرتے ہوئے کہا 'یاد رکھو پورے کشمیر میں سچے دل سے صرف دو ہندوستانی ہیں ایک شیخ محمد عبداللہ اور دوسرا شمیم احمد شمیم۔" اِسے سیاسی کرتب بازی کہیئے یا ٹائم سرونگ اپروچ، مگر یہ بھی تو دیکھئے کہ تاڑنے والے غضب کی نظر رکھتے ہیں۔ اُن کے ہاں قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں ہی نِکلتا ہے۔ گئے دنوں کا ایسا ہی ایک اور واقعہ ذہن میں آتا ہے۔ شمیم پہلی بار لندن گیا تھا۔ وہاں سے یہ بیان داغ دیا کہ محاذ رائے شماری محض ایک Bargaining counter ہے۔ اُن ہی دنوں محاذ کے بانی مرزا افضل بیگ علالت سے شفایاب ہو کر چشمہ شاہی کے قریب ایک ریسٹ ہاؤس میں صحت یابی کی خاطر آرام فرما رہے تھے۔ راقم الحروف بھی چند اور ساتھیوں کے ساتھ مزاج پرسی کے لئے گیا تھا۔ ہم کو دیکھتے ہی محاذ کے خلاف شمیم کا بیان بیگ صاحب کی زباں پر آیا۔ تیخ پا ہو کر بیگ صاحب ہم سے مخاطب ہو کر بولے "یہ شخص نہ تین میں ہے نہ تیرہ میں، اِس کے خلاف اخباروں میں اعلانِ جنگ کرنا چاہیئے۔ کیا محاذ ایک Bargaining counter ہے۔ کیا محاذ کے مجاہدوں نے مفت میں اپنی چمڑیاں انٹروگیشن سنٹروں میں اُدھیڑوائیں۔" اُنہی دنوں کی بات ہے شمیم نے آئینہ میں لِکھا "محاذ کے اکثر کارکن ایسے ہیں جنہیں آوارہ گردی کے جرم میں جیل بھیجا جا سکتا ہے" بہر کیف شمیم ہواؤں کو سونگھ کر حالات کا رُخ بتلانے والا آدمی تھا۔ اُس کی دانشوری میں جو بات متاثر کن تھی وہ یہ کہ وہ حقیقت سے آنکھیں چُرانے والا آدمی نہ تھا۔ وہ ایسی بات لوگوں کو ضرور سناتا جو وہ سننا نہیں چاہتے تھے۔ ایسی بدصورت تصویر کو ضرور دِکھاتا جو وہ دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ اُس نے آئینہ کے صفحات کو صرف سیاسی تبصروں تک محدود نہ رکھا۔ ہفت روزہ آئینہ اساسی

طور پر خبر کا نہیں نظر کا پرچہ تھا۔ اِس کے تیسرے صفحے پر چراغ بیگ کے قلم سے لکھے ہوئے شذرات ہمارے سماجی، ثقافتی، علمی اور ہماری روایات اور رسم و رواج کے کھوٹے اور کھرے پر آج بھی آئینہ نمائی کا عمل بہ خوبی انجام دے رہے ہیں۔

لفظ اردو محض ایک زبان کا نام نہیں بلکہ برِ صغیر میں پورے ایک تہذیبی عمل کا نامیاتی اظہار ہے۔ اُردو میں معیاری اور افادی صحافت کی ابتدا سر سید کے ''تہذیب الاخلاق'' نامی اخبار سے ہو جاتی ہے۔ جس کا اوّل نمبر دسمبر ۱۸۷۰ء میں شائع ہوا۔ اُردو میں دانشوری کی روایت بھی سر سید کی علی گڑھ تحریک سے شروع ہو جاتی ہے۔ سر سید کے سوانح نگار مولانا حالیؔ 'حیاتِ جاوید' میں اِس اخبار کے شانِ نزول کے بارہ میں لکھتے ہیں۔ ''اِس پرچہ کی تمام تر کوشش اِس بات میں تھی کہ جو خیالات مسلمانوں کی ترقی اور تمدن کے مذہبی مانع سمجھے جاتے ہیں اور درحقیقت مذہب سے کچھ علاقہ نہیں رکھتے اُن کو جہاں تک ہو سکے رفع کیا جائے۔ اِس کے سوا ورپ کی سیویلزیشن کے اصول و فروغ سے اور اُن اسباب سے جو یورپ کی رقی کے باعث ہوئے ہیں قوم کو آگاہ کیا جائے۔ بیہودہ اور مضر رسموں سے اُن کو فرت دلائی جائے۔ اخلاق و عادات میں جو بسبب قومی تنزل کی خرابیاں پیدا ہو گئی یں وہ بیان کی جائیں۔ علوم قدیمہ کی عظمت جو لوگوں کے دلوں میں حد سے زیادہ ٹھی ہوئی ہے جہاں تک اُس میں غلطی ہو اُس کو ظاہر کیا جائے۔ علومِ جدیدہ جن ے نفرت کی جاتی ہے اُن کی اصلی اور واقعی خوبیاں اور جو بدیہی نتائج دُنیا میں اُن ے پیدا ہوئے ہیں جتائے جائیں اور بجائے نفرت کے اُن کی طرف رغبت دلائی ائے''۔ برِ صغیر میں ہندی مسلمانوں کے انیسویں صدی کے دوسرے نصف حصہ ں زوال و انحطاط کا مایوس کن منظر نامہ ذہن میں لایئے تو مولانا حالی کے تہذیب

الاخلاق کے تئیں یہ باتیں ایک نئے طرزِ فکر و عمل کی جانب صریحاً اِشارہ کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اِس نظر سے شیم احمد شیم کے ہفت روزہ آئینہ کو دیکھئے تو لگتا ہے ممدوح نے کچھ ایسا ہی کام اپنے ذمہ لیا تھا۔

اردو صحافت میں سر سید کے بعد مولانا آزاد کا 'الہلال' اور 'البلاغ' نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اُن کی قد آور اور بصیرت افروز شخصیت کے بعد نیاز فتح پوری، عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت، سردار دیوان سنگھ مفتون اور آغا شورش کاشمیری کے نام ذہن میں آ جاتے ہیں۔ اِسی قبیل کے صحافی ہمارے شیم احمد شیم بھی تھے۔ ۴۵ سال کے ہی کم مدت حیات میں اِس شخص کے جوہر کھلے۔ رَخشِ عمر کی رَو کا کیا کیجئے کہ بقول غالب کب کا ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رِکاب میں۔ یہ شخص نوشتہ تقدیر میں درازیٔ عمر کی عطا لکھوا کے آیا ہوتا تو اندازہ کیجئے کہ یہ شمیمِ صحافت و ادب کہاں کہاں پھیل جاتی۔ کیا کیا اُس نے لکھا ہوتا۔ کشمیر ٹائمز میں ۲۵ ر اکتوبر کو خالد حسن کا چراغ حسن حسرت پر لکھا ہوا آرٹیکل آیا ہے۔ اخبار 'امروز' میں چراغ حسن حسرت کے کالموں کو یاد کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ آج تک کوئی بھی اُردو اخبار 'امروز' کے عمدہ معیار اور نفیس شائستہ ذوق کو چھو نہ سکا۔ آئینہ کے کالموں کے بارہ میں کسی بھی بے تعصب ناقد کی رائے ایسی ہی ہونے میں کوئی باک نہیں۔ خالد حسن لکھتا ہے کہ حسرت نے اپنے زمانہ کے پاکستانی کمینوں کو تین طبقوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ایک شلجمیے، دو اَمرودیے، تین چقندریے۔ شلجمیے وہ جو شلجم کی طرح باہر سرخ اور اندر سفید۔ دوسرے وہ جو امرود کی طرح باہر سے سفید اور اندر سرخ اور تیسرے چقندریے جو چقندر کی طرح اندر بھی سرخ اور باہر بھی سرخ۔ جن لوگوں کو شیم کے قلم سے نکلا ہوا 'جموں کشمیر کی سیاسی پارٹیوں کا کچھا چھٹا' یاد ہو گا وہ

اِسی نوعیت کا ایک معروضی تجزیہ تھا، جس میں ایسا ہی طنز اور مزید برآں ظرافت کی چاشنی بھی بدرجہ اُتم موجود تھی۔ ایسا ہی ایک شذرہ صادق صاحب کا چڑیا گھر ہے، یوں تو یہ ایک گیا گذرا معاملہ ہے۔ مگر آج بھی اِس کو پڑھ لیجئے تو سچی تصویر کشی کا لطف، طنز وظرافت کی رنگ آمیزی اور طرزِ تحریر کی دلکشی...... یہ سب ایک طرف۔ دوسری طرف یہ بات کہ آج بھی یہ ۲۶ جنوری ۱۹۷۰ کا لکھا ہوا کالم ہماری مضحکہ خیز سیاسی حالت پر دال آتا ہے اِس میں سے ایک چھوٹا سا اقتباس:

"ریاستی چڑیا گھر کا سب سے دلچسپ اور قابلِ دید شعبہ وہ ہے کہ جس پر ریاست کی آمدن کا اکثر حصہ صرف ہوتا ہے اور جسے وزیروں کا شعبہ کہتے ہیں۔ بخشی صاحب نے اپنے دورِ اقتدار میں اِس شعبے میں ہاتھی، گینڈے، گائے، بیل، گھوڑے اور بھیڑ جیسے کارآمد جانور جمع کر رکھے تھے۔ صادق صاحب نے چڑیا گھر کی رونق بڑھانے کے لئے بہت سے گدھے اور بندر بھی جمع کر دیئے ہیں اور بچوں کا دل بہلانے کے لئے مسخروں کی خدمات بھی حاصل کی ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ریاست کا یہ چڑیا گھر سال کے چھ ماہ جموں میں عوام کی دلچسپی کا باعث بنا رہتا ہے اور اِس لحاظ سے یہ دُنیا کا واحد متحرک چڑیا گھر ہے۔ صادق صاحب اِس بات کے لئے تعریف کے مستحق ہیں کہ اُنہوں نے اپنے چڑیا گھر میں ایک سے ایک نادر نمونہ جمع کر کر رکھا ہے۔"

اِس شذرہ کو پڑھ کر خیال کیجئے کہ وہ زندہ ہوتا تو رابڑی دیوی اور لالو پرشاد یادو پر کیا لکھتا۔ حالِ ہی میں جموں اور کشمیر کے درمیان ایک قطعہ زمین پر تصادم کے باب میں وہ کیا لکھتا۔ وہ بے خوف ہو کر اپنی بے لاگ رائے ظاہر کرنے کا عادی تھا۔ اُس کی دانشورانہ فکر کی ایک نادر مثال ۱۹۷۵ء میں اپنے مضمون "تقسیم

ملک کے مابعد اثرات" میں وہ یوں رقمطراز ہے۔

"ہندوستانی مسلمان کا مستقبل کیا ہے۔ اُسے کیا کرنا چاہیئے اور یا نہیں کرنا چاہیئے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا قطعیت کے ساتھ کوئی جواب دینا ممکن نہیں۔ لیکن ایک بات طے ہے اور وہ یہ کہ ہندوستانی مسلمان کا مستقبل خود ہندوستان کے ساتھ وابستہ ہے۔ اگر ہمارا ملک تعلیمی پسماندگی، ذہنی پستی، اقتصادی بدحالی اور سیاسی افراتفری کے اِس اندھیرے سے باہر نکل کر آگے بڑھنے میں کامیاب ہوا تو ہندوستان کا مسلمان بھی خوشحال اور آسودہ ہوگا کیوں کہ نئے ہندوستان میں مذہبی تعصب اور فرقہ دارانہ نفرت کیلئے کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ اِس کے برعکس اگر ہندوستان کی سیاسی قیادت اقتصادی محاذ پر ناکام ہو کر اِس ملک سے بھوک، غربت، افلاس اور لاچاری مٹانے میں کامیاب نہیں ہوئی تو پچپن کروڑ ہندوؤں کیساتھ چھ سات کروڑ مسلمان بھی ڈوب جائینگے۔ اِس لئے ہندوستانی مسلمانوں کا مستقبل گہرے طور پر اِس ملک کے مستقبل سے وابستہ ہے۔ اُنھیں کیا نہیں کرنا چاہیئے یہ میں نہیں کہہ سکتا لیکن انہیں کیا کرنا چاہیئے یہ میں کہہ سکتا ہوں۔ اُنہیں کسی قیمت پر بھی کسی فرقہ پرست جماعت کا آلہ کار نہیں بننا چاہیئے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے فرقہ پرست سیاست خودکشی کے مترادف ہے اور اسلام میں خودکشی گناہِ عظیم ہے۔"

صحافت روزمرہ کی پیداوار ہے۔ زندگی کیلئے سودمند دیرپا فکر ونظر کو سمونے کیلئے اِس میں وسعت نہیں۔ اِسے فوری نتائج کی تلاش ہے۔ یہ زیادہ دور نہیں چل پاتی۔ اِس کے تنگنائے مقاصد میں وقتی ضرورتوں کا پورا کرنا ہے۔ یہاں ہی ادب اور صحافت میں حدِ فاصل کھینچ جاتی ہے۔ صحافت کی اِس تنگ دامنی کیوجہ سے ہی آسکر وائیلڈ کا صحافت کے تئیں انتہا پسندانہ رویہ قابلِ ذکر ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"As for modrn journalism , it justifies its,own existence by the great Darwinian principle of the survival of the vulgarest.The differece between journalism and literature is that journalism is unreadable and literature is not red."

صحافت کا عامیانہ پن، اس کے غیر اہم سرسری تاثر کی جانب یہ الفاظ ہمارے خیال کو نہ چاہتے ہوئے بھی پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ کوئی بھی صحافتی کارنامہ بالآخر ردی کی ٹوکری میں چلا جاتا ہے۔ اور پھر Yellow Journalism میں سچائی ہمیشہ Sensational کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔ یہ راستہ مُضرت رساں ہے مگر چونکہ آسان ہے اِس لئے شاہراہ عام ہے۔ مگر کوئی فکر و خیال کا دُھنی ایسا بھی ہوتا ہے جو رو کے خلاف اپنی راہ الگ بنالیتا ہے جس پر یہ مصرعہ چست آتا ہے۔

شہر میں کھولی ہے حالی نے دوکاں سب سے الگ

ایسی حالت میں صحافت محض اطلاعات فراہم کرنے کے عمل سے اُوپر اُٹھ جاتی ہے تعمیری اور تخلیقی عناصر اس میں دَر آتے ہیں۔ ایسا صحافی سامنے کی دُنیا کا ہی نہیں بلکہ آگے بھی دیکھتا ہے۔ وہ ناہموار رائے عامہ کو مثبت فکر و عمل کے چوکھٹے میں ہموار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ شعور آگہی کی قندیلیں روشن کرتا ہے۔ ایسی ہی صحافت اور ایسے صحافی کی ضرورت مسلمہ ہے۔ شاذ ہی یہ شئے دستیاب ہوتی ہے۔ شمیم کے بعد ہمیں آج تک دوسرا شمیم نہ ملا اور شاید کبھی بھی نہ ملے۔ اُس کے باب

میں آسکر وائیلڈ کا Survival of the Vulgarest کا مفروضہ Survival of the fittest میں مبدّل ہوجاتا ہے۔ وہ ایسا اہلیت اور قابلیت ذہانت اور فطانت سے مالا مال فن کار تھا کہ اُس نے صحافت اور ادب کے بیچ لائن آف کنٹرول کو ختم کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ سیاست میں زور آزمائی کرتا رہا۔ ادب کا وہ ایک سنجیدہ قاری تھا اُس میں ایک منجھا ہوا ادب کا ناقد بھی تھا۔ مگر صحافت کے زمرہ میں ہی اُس نے جو کچھ لکھا اُسی سے وہ آج بھی ہمارے ذہنوں کے تہہ خانوں میں اپنی تمام تر جاذبیت اور اپنی ایک رومانی کیفیت کے پیکر خیالی میں موجود ہے۔ آج جب کشمیر کی اُردو صحافت میں اُس کا سن ۶۴ء میں قیامت خیز چال سے جلوہ گر ہونا یاد آجاتا ہے تو حالت اور منظر کچھ ایسا ہی معاملہ پیش کرتے ہیں جیسا کہ رحمان راہی کے اِس شعر سے سماں بندھ جاتا ہے۔

ترٛ ٹھہٕ وٕژھ تہٕ دُدیرٕ ویر سراپا اُنار گیو
اتھ ہور، سونتہٕ کالہٕ کراماتھ کرزہ کیاہ

شمیم کا ذِکر خیر تب تک اُدھورا ہی رہے گا جب تک کہ اُس کی چراغ بیگی ادا پر بات نہ کی جائے۔ چراغ بیگ شمیم کی ذات سے الگ ہو کر ایک پُر کشش کردار ہے۔ یہ ایک خوش طبع ظریفانہ کردار ہے جو تصور میں اپنی رعنائی خیال اور ایک خوبصورت پیکر میں آجاتا ہے۔ یہ خوش فکر بھی ہے اور خوش خصال بھی۔ زندگی سے متعلق ہر حسین شے سے اُسے پیار ہے۔ اُس کا ذوقِ جمال اعلیٰ درجہ کا ہے۔ بغدادی کہانیوں کے مُلا نصر الدین کی طرح یہ ہمیں اپنی ہی حماقتوں پر ہنساتا بھی ہے اور اُن سے چھٹکارا پانے کی ترغیب بھی دیتا ہے۔ چراغ بیگ کا تنقیدی شعور حد درجہ پختہ اور صائب ہے۔ چراغ بیگ کو آج بھی پڑھیئے تو اپنی ادائے خاص کی وجہ

سے وہ ہمیں پیارا لگتا ہے۔ سنجیدہ مزاح کی یہ حس چٹکیوں میں الجھے ہوئے مسائل کے عقدۂ لاینحل کھولنے میں کیسی یہ فطری روش ہے کہ دِل کھول کر ہم ہنس بھی لیں اور ساتھ ہی احساس بھی جاگ اُٹھے۔ چراغ بیگ کی حاضر جوابی اور چھوٹی سی بات میں ایک بڑی بات پیدا کرنے کا فن اپنی مثال آپ ہے۔ ایک معمولی بات ایسی ہی یوں ہے کہ چراغ بیگ زینہ کدل سے تانگے پر امیرا کدل آرہا تھا۔ تانگے والے نے خلافِ قانون ایک سواری اور زائد میں بٹھادی۔ چراغ بیگ نے احتجاج کیا۔ اِس پر چراغ بیگ اور تانگے والے میں گرم گفتاری ہوئی۔ اب یہ پرلطف تُرش کلامی سن لیجئے۔ ''تانگے والے نے چلانا شروع کر دیا کہ آپ کون ہوتے ہیں۔ تانگہ میرا ہے، میں نے جواب دیا تانگہ آپ کا ہے لیکن یہ ملک میرا ہے اِس کا فیصلہ میں خود کروں گا''۔ لطیفہ تو اپنی جگہ مگر ذرا سوچیئے کہ چراغ بیگ کیا سوچ رہا ہے۔ چراغ بیگ کی حیران کن مزاحی حس اس کے کردار کو بہت ہی رنگین بنادیتی ہے۔ اور یہ حس بقول آئینہ ساز زندگی اور ادب کے گہرے مطالعے سے پیدا ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں جب بھی تعمیری خوش گوار صحافت کی یاد تازہ کی جائے گی، جو زبان و بیان میں روزمرہ کی سادگی اور سلاست کے باوجود ادبی رنگ میں رچی ہوئی ہو، چراغ بیگ کی مثال ہمارے سامنے لامحالہ آجائیگی۔ بقول شاعر

یاد کے بےنشان جزیروں سے
تیری آواز آرہی ہے ابھی
شہر کی بے چراغ گلیوں میں
زندگی تجھ کو ڈھونڈتی ہے ابھی

.........☆☆☆.........

محمد یوسف ٹینگ

شمیم صاحب۔ چند بھولی بسری یادیں

شمیم کو میں نے اُس وقت دیکھا جب ہم دونوں پرائمری کلاسوں میں پڑھا کرتے تھے۔ یہ 1943ء کی بات ہے۔ میں اپنے حافظے کی گرد وغبار سے اَٹی ہوئی کتاب کو جھاڑنے کے بغیر بھی صاف صاف یاد کرسکتا ہوں کہ وہ اُس وقت بھی ''ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات'' کی ضرب المثل کا روشن نمونہ پیش کرتا تھا۔ اُس کے تربوزے کی مانند لمبوترے مگر سُرخ وسفید چہرے پر اُس وقت بھی اُسکی ذہانت موسمِ بہار کے قمری کی طرح چہکتی اور گُوگو کرتی نظر آتی تھی اور اُس کے اندر چھپے ہوئے شاندار آدمی کا اعلان کرتی تھی۔ باادب، باملاحظہ، ہوشیار۔ شمیم میرے قصبے شوپیان میں (جس کو وہاں کے لوگ سرائے کہہ کر پکارتے تھے کہ وہ پُرانی مغل شاہراہ کا ایک اہم پڑاؤ رہا تھا) نو دس کلومیٹر دور آسنور کے گاؤں سے آیا تھا۔ اُس کے والد مولوی محمد یعقوب اپنے زمانے کے کشمیر کی ہنگامہ خیز شخصیت مولوی عبداللہ وکیل کے سب سے بڑے فرزند تھے۔ مولوی عبداللہ وکیل، تحریکِ آزادیٔ کشمیر کے اوّلین حُدی خوانوں میں سے تھے۔ لیکن یہ وقت اُن کے متعلق تفصیل سے بات

کرنے کا نہیں ہے۔ مولوی یعقوب اپنے والد اور اپنے گاؤں کی اکثریت کے برعکس احمدی نہیں بلکہ فقہ حنفی کے پیرو تھے۔ وہ آسنور میں اپنی اہلیہ خدیجہ بیگم کے ساتھ مقیم تھے۔ وہاں اُنہوں نے ایک پُر فضا جگہ پر اپنا چھوٹا سا بنگلہ تعمیر کیا تھا۔ وہ خود میوے کا چھوٹا موٹا بیوپار کرتے تھے اُن کی اہلیہ سرکاری سکول میں اُستانی تھیں۔ پھر حالات نے کروٹ لی اور وہاں مسلکی تنازعہ ایسا بھڑک اُٹھا کہ مولوی صاحب کے لئے ہجرت لازمی بن گئی۔ مجھے یاد ہے کہ اُن کی اگوائی کرنے اور اُنہیں اپنے اہل وعیال کے ساتھ خیر وخوبی سے لانے کے لئے شوپیان کے اُس وقت کے اکابر کا ایک وفد اُن کے پاس گیا اِس وفد میں خواجہ غلام حسن خان، احسن میر ذیلدار، خواجہ عبدالرحمان طوری اور میرے مرحوم والد خواجہ عبدالرزاق ٹینگ بھی تھے۔ مولوی یعقوب کو شوپیان کے مشرقی کونے میں مرحوم لسہ ملک کے کشادہ مکان میں ٹھہرایا گیا، جہاں اُن کی نیک اہلیہ کے لئے پردے کا پورا انتظام تھا۔ مولوی صاحب کو یہاں زیر تعمیر جامع مسجد کے معتمد کی اسامی سونپ دی گئی۔ وہ بڑے حاضر جواب اور بذلہ سنج تھے، کسی نے اُن سے ایک دِن سوال کیا کہ مولوی صاحب! آپ اِس مسجد میں بیٹھ کر کِس چیز کی تنخواہ پاتے ہیں؟ اُنہوں نے فوراً جواب دیا" امامِ مسجد کی ٹر بازی خاموشی سے سُننے اور پھر چپ چاپ رہنے کی۔ کوئی دوسرا ہوتا تو وہ اِس مشکل کام کے لئے سینکڑوں کے بجائے ہزاروں مانگتا"......اُن دِنوں شوپیاں میں شیخ محمد عبداللہ کی نیشنل کانفرنس کو مولوی عبداللہ شاہ کے مسلم کانفرنس میں شامل ہونے کی وجہ سے بڑا چیلنج درپیش تھا۔ چوک بازار میں ہر دوسری تیسری شام کو نیشنل کانفرنس کے چھوٹے چھوٹے جلسے ہوا کرتے۔ مولوی یعقوب اِن دنوں بڑی پُر لطف تقریریں کیا کرتے اور لوگ صرف اُن کی تقریر سُننے کے لئے دور دور سے آتے

اور دیر تک جلسہ گاہ میں لگے رہتے۔ مجھے خود اُن کی ان تقریروں کا چسکہ پڑ گیا تھا۔ شمیم کو میں نے اپنے گھر سے باہر بادامی باغ میں پہلی بار دیکھا۔ وہ نکر اور قمیض پہنے اور سر پر ایک ہیٹ لگائے ہوئے بادام کے درختوں کی ٹہنیوں سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا اور بہت سی باتیں اور بہت سا شور۔ لیکن اُسمیں ایک عجیب کشش تھی۔ جیسے ہماری چھوٹی سی بستی میں ایک رنگین پروں والا طاؤس آگیا ہو...... ہر شخص اُس کے روبرو ہونے اور اُس سے بات کرنے کے لئے پہل کرنا چاہتا تھا۔

چند دِنوں میں شمیم ہمارے سکول پہونچ گیا۔ وہ پانچویں جماعت میں درج ہوا...... میں چوتھی جماعت میں پڑھ رہا تھا...... اُسکی باتیں، اُسکی گھاتیں اور اُسکا سب کچھ ایسا تھا۔ جیسے ہمارے مڈل سکول میں ایک طوفان آگیا ہو۔ ہمارا سکول اُس وقت بازار کے ایک طرف بہت لمبی چوڑی عمارت میں واقع تھا جو سورگیہ امبر چند بہرو کی ملکیت تھی۔ شمیم ہر وقت لڑکوں کے جھرمٹ میں رہتا اور سکول کے سارے ٹر بولنے والے اُس کے دوست بن گئے۔ بلکہ اُسکی تیزی طراری، شوخی اور خوش کلامی کا شُہرہ باہر بھی پھیل گیا۔ اِس طرح قصبے کے بڑے بڑے تاجر دوکاندار وغیرہ جن میں مرحوم غلام رسول گتو، مرحوم عبدالرحمٰن وانی وغیرہ شامل تھے اُسکو شوق سے بُلانے لگے۔ لیکن اِن میں مرحوم عبدالقادر دیوان سب سے شائستہ مذاق اور ادب وشعر کے رسیا تھے۔ اُن کی دوکان شمیم کی حسبِ منشاء جلوہ گاہ بن گئی اور درسگاہ بھی۔

اُدھر آہستہ آہستہ سکول میں میرا شمیم کے ساتھ ربط بڑھنے لگا۔ وہاں ایک چھوٹی سی لائبریری تھی جس کے اِنچارج ایک بہت تُرش رُو لیکن شیریں دِل اُستاد مادھو رام تھے۔ اُن دِنوں شمیم اور میں دونوں مُنشی پریم چند کے دیوانے تھے۔ جب

میں ماسٹر جی سے کسی کتاب کا تقاضہ کرتا تو وہ کہتے کہ وہ شمیم نے لی ہے۔ اور جب شمیم کسی کتاب کی تلاش کرتا تو وہ میری تحویل میں ہوتی۔ بہر حال مُنشی پریم چند کے ہم دونوں بلکہ دیوان صاحب کے سمیت تینوں فریفتہ تھے۔ ہم نے اُن ہی دِنوں پریم چند کی میدانِ عمل، چوگانِ ہستی، پردہ مجاز، نرملا، بیوہ، کربلا، پریم پچیسی وغیرہ پڑھ لیں۔ ہمارے اپنے اپنے پسندیدہ کردار تھے اور کبھی کبھی ہم اپنی اپنی ہیروئنوں کی تعریف میں ایک دوسرے سے لڑ پڑتے اور کئی کئی دِن بات چیت ترک کرتے۔

اُنہی دِنوں ہمیں حکم دیا گیا کہ ہم ایک ڈرامہ کھیلیں۔ اب ڈرامہ لائیں تو کہاں سے؟ اُن دِنوں لاہور کے اخبار کشمیر میں آیا کرتے تھے۔ میرے والد، جو میوے کی تجارت کے سلسلے میں جاڑہ لاہور میں گذارا کرتے وہاں کے اُردو اخباروں کا چندہ بھر کے شوپیان میں اُن کا لطف اُٹھاتے تھے..... اُن دِنوں یہ اخبار ڈاک سے آتے اور تیسرے چوتھے دِن وصول ہوتے تھے۔ روز نامہ زمیندار، روز نامہ احسان، جنگ، روز نامہ نوائے وقت وغیرہ ..... شمیم کے لئے میرے گھر آنے کی بڑی کشش یہ اخبار بھی تھے اور کبھی کبھی وہ اِن کو اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ بہر حال۔ اُنہی دِنوں زمیندار کا ایک ہفت روزہ ایڈیشن بھی چھپتا تھا جسمیں شعر وادب سے تعلق رکھنے والی چیزیں بھی شامل ہوتی تھیں۔ ایک ایسے ہی سنڈے ایڈیشن میں میری نظر ایک ڈرامچے، تیس مار خان، پر پڑی۔ اس میں ایک شیخی باز انسان کی خوب عکاسی کی گئی تھی اور ساتھ ہی ایک لڑکے لڑکی کی عشق بازی کی داستان بھی مرچ مصالحے کے ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ ہمارے ناپختہ ذہنوں کو یہ اچھا لگا اور ہم نے اِسکو سٹیج پر پیش کرنے کی ٹھان لی۔ ڈرامے میں ہیروین یعنی لڑکی کا

رول مجھے مِلا اور ہیرو یعنی عاشق کا شمیم کو۔ ایک منظر میں ہیروئین ہیرو کو مُرغا بنا کر اُسکی پیٹھ پر سوار ہو کر اُسے چلنے کو کہتی تھی۔ اِس سین میں میں عام طور شمیم کو خوب تازیانے مارتا تھا کہ وہ اور تیز چلے۔ اُس نے کئی بار دبے الفاظ میں اِس مار پیٹ پر ناراضگی کا اظہار بھی کیا...... لیکن اصل زندگی میں اُس سے مات کھانے کے بعد اس نقلی زندگی میں اُس کو پیٹنے کی لذت بہت زبردست ہوتی تھی۔ بہر حال ڈرامہ سٹیج ہونے کی باری آئی...... آرم باغ کے وسیع میدان میں ایک شامیانہ تانا گیا۔ چھوٹا موٹا سٹیج تیار کیا گیا۔ بجلی تو خیر پنسٹھ ستر سال کے بعد اب بھی آنکھ مچولی کھیلتی ہے۔ اُس وقت اُس کا ایڈریس بھی معلوم نہ تھا۔ چند Petromax گیس جلائے گئے۔ اور ناٹک شروع...... اُستاد۔ ہم جماعت وغیرہ تو موجود تھے ہی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے قصبہ کے چند رئیس حضرات کو بھی بُلایا تھا۔ ڈرامہ چلتا رہا۔ لوگ ننھے ننھے بچوں کی حرکات وسکنات اور اُچھلنے کودنے کا لطف اُٹھاتے رہے اور تالیاں بجاتے رہے...... اِتنے میں گھوڑا بننے بنانے کا منظر آ گیا مجھے زنانہ کپڑے پہنائے گئے تھے اور چُنری سجائی گئی تھی۔ میرا رنگ وروپ بھی تازہ تازہ اور نکھرا تھا۔ میں اپنے گھوڑے یعنی شمیم پر سوار ہوا۔ گھوڑا چلنے لگا اور تالیوں کا شور مچ گیا۔ مجھے جوش آ گیا اور میں گھوڑے کو زور زور سے مارنے لگا۔ کچھ دیر تو معاملہ چلتا رہا۔ لیکن اچانک بساط پلٹ گئی۔ شمیم کی برداشت جواب دے گئی۔ اُس نے مجھے اپنی پیٹھ سے پٹخ دیا۔ میں ابھی اپنے آپ کو سنبھال ہی رہا تھا کہ اُس نے مجھے زور سے گھونسہ مارا، جس سے صفِ سامعین میں شور مچ گیا۔ دوسرے دِن سکول میں ہم دونوں کی خوب خبر لی گئی۔ دونوں کو چند آنوں کا جرمانہ دینا پڑا۔ لیکن کچھ دِنوں کے بعد بات بھلا دی گئی۔ دِن گزرتے گئے۔ شمیم اور میں دیوان صاحب کی سرپرستی میں ایک

دوسرے کے نزدیک تر آتے گئے ۔اب دیوان صاحب نے اُردو شاعروں کے دیوان ہدیہ بخشنا شروع کئے۔اور ہم منشی پریم چند کے بعد علامہ اِقبال،میر تقی میر اور مرزا غالب کے دائروں میں قدم رکھتے گئے ۔دیوان صاحب ایک صاحب ثروت تاجر تھے۔اُن دِنوں اتوار کو دوکانیں بند کرنے کا بکھیڑا نہیں تھا۔وہ اپنے گھر میں ہماری دعوت کرتے ۔پہلے بیت بازی کی مشق کراتے ۔اُنکا سب سے بڑا انعام اُنکا بے حد بلند،موسیقی ریز اور بے لوث قہقہہ ہوا کرتا تھا۔ہم میں سے جو جیت جاتا ۔وہ اُس کے ہاتھ پر زور سے ہاتھ مارتے اور قہقہہ ایسے بلند کرتے جیسے کسی بادشاہی بینڈ باجے کے طبل پر بیک وقت کئی ہاتھ پڑیں ۔اپنی جوانی میں مجھے سینکڑوں خوبصورت اشعار یاد تھے۔جو اِن ہی مقابلوں کا صدقہ تھا۔شاید یہ اب چھوٹا منہ بڑی بات لگے مگر سچ ہے کہ اِن مقابلوں میں شمیم پیچھے رہ جاتے تھے۔ اِس حد تک کہ ایک وقت اُس نے اِن میں حصہ لینے سے صاف اِنکار کردیا۔بہر حال ان یادوں کی فلم بحرِ طویل کی طرح کھل رہی ہے لیکن مضمون کی حدود تنگ ہیں۔ بہر حال یہ ذکر شاید مناسب رہے کہ شمیم نے اپنا پہلا تخلص نیّر رکھا۔شمیم احمد نیّر یہ اُس وقت بچوں کے مشہور شاعر شفیع الدین نیر کے اثر میں آکر کہا گیا تھا لیکن بعد میں شمیم احمد شمیم بن گئے ۔ شمیم صاحب کے والد کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ وہ دمے کے مریض تھے۔اِس لئے علاج معالجے کے لئے وہ اہل وعیال کے ساتھ سرینگر منتقل ہو گئے وہاں مولوی عبداللہ وکیل کے اصل مکان کے سامنے والا مکان صابر منزل اُن کا ٹھکانا بنا۔اُن کے دوسرے برادروں کے ساتھ مولوی ایوب صابر علی پاکستان چلے گئے تھے۔شمیم اور میرے درمیان دوستی کا سلسلہ خاصا مضبوط ہوگیا تھا۔لہذا اُس کے سرینگر چلے جانے کے بعد خط و کتابت کا سلسلہ زور وشور سے ہونے لگا۔وہ

اپنے خطوط میں اپنی فلم بینی کا خاص طور ذکر کرتے اور میں اُسکی خوش نصیبی پر لوٹ پوٹ ہوجاتا۔کبھی کبھی میں اپنے والد کی تجارتی سرگرمیوں کے سلسلے میں سرینگر آجاتا اور یہیں سرینگر میں ایس پی کالج میں داخل ہوا اور وہیں کے ہوسٹل میں مقیم۔لیکن وہ دور کشمیر میں شدید غذائی قلت کا تھا۔اِسکا اثر ہوسٹل کی زندگی پر بھی پڑا اور مجھے ہوسٹل چھوڑ دینا پڑا۔شمیم کے والد کا انتقال ہو چکا تھا اور اُس کی والدہ پھر شوپیان چلی گئی تھیں ۔ہم نے صابر منزل میں ڈیرہ جمالیا۔شمیم اور میرے ساتھ مرحوم غلام نبی ہاگرو صاحب بھی تھے جن کے ساتھ شمیم کی دوستی ہوگئی تھی ۔اور وہ اُن کے ہم جماعت بن گئے تھے۔ہم سب ایک ایک دن کھانا پکاتے تھے۔صبح جلدی جانا ہوتا تھا اِس لئے سویرے اُٹھنا اور پکانا پڑتا تھا۔اب ہم میں دوڑ لگ گئی کہ کون کتنے سویرے اُٹھتا ہے۔لیکن شمیم اور مجھ کو ہمیں ہار کا سامنا کرنا پڑا کہ ہاگرو صاحب ایک دِن اذان سے پہلے جاگ گئے اور کھانا بنالیا۔جب صبح شمیم اور میں جاگ اُٹھے تو ہم نے ہاگرو صاحب کو اپنے بستر میں خراٹے مارتے دیکھا۔ہم بدحواس ہوگئے کہ شاید ہاگرو صاحب کو نیند کی مستی نے لاچار کردیا ہے اور اب ہمیں بھوکے پیٹ کالج جانا پڑیگا۔جب ہم نے غصے بیزاری سے ہاگرو صاحب کو جگایا اور اُن پر برسنے لگے تو وہ ستم ظریفانہ مُسکراہٹ کے ساتھ خاموش رہے۔پھر اچانک اُٹھے۔ ہمارے ہاتھ پکڑ کر باورچی خانے میں لے گئے اور گرما گرم دیگچی سے ڈھکن اُٹھا لیا۔بھات کی سوندھی سوندھی خوشبو اُٹھی تو شمیم اور میں اپنے سے منہ لے کر رہ گئے۔ اِس کچن میچ میں ہاگرو صاحب نے ہمیں بُری طرح پچھاڑ دیا تھا۔

اُن دِنوں شمیم اور میں ایس پی کالج میں پڑھتے تھے۔فرصت کے اوقات میں ہم ضرور کوئی فلم دیکھتے۔اُن دنوں ثریا ہماری محبوب اداکارہ تھی۔ مجھے یاد ہے کہ

جب میری شادی ہوئی تو اُس وقت ثریا کا گانا ''میں تیرا چاند تو میری چاندنی'' ریڈیو پر بج رہا تھا۔ یہ عبدالرشید کاردار کی فلم 'دُلاری' کا گانا تھا۔ شمیم مجھے فلمی میگزینوں میں سے بھی اُس کی تصویروں کے تراشے بھیجا کرتا اور میں جواب میں شکرگذاری کے بے شمار خط بھیجا کرتا۔ اُنہی دِنوں کی بات ہے کہ میرے والد نے Zenith کمپنی کا ایک ریڈیو خرید کر لایا۔ یہ شوپیان میں تیسرا یا چوتھا ریڈیو سیٹ تھا۔ اب میں دِن رات فلمی گانے سُنتا، سر دُھنتا اور دوستوں کو بُلا کر بڑے ٹھاٹھ سے ریڈیو سُنایا کرتا۔ وہ بچارے مجھے اُس طرح رشک سے دیکھتے جیسے میرے پاس جام جمشید آ گیا ہو۔ وہ میری تعظیم کرنے لگے اور کبھی کبھی گھر میں دعوت پر بُلانے لگے۔ شمیم نے یہ بات سُنی تو مبارکبادی کا ایک خط لِکھا جسمیں مجھے مبارک باد دے کر کہا کہ یہ بہت بڑی خوش خبری ہے اور آپ خوش قسمت ہو۔ مجھے اُس خط کا یہ جملہ اب تک یاد ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اِس کارنامے کو میری زندگی کا اہم معرکہ مانتا تھا۔

We long for better days till we end.

اِس دوران شمیم نے مجھے جو خط لکھے۔ وہ میرا بڑا سرمایہ ہیں اور اس بات کی شہادت کہ اُس چھوٹی عمر میں بھی اُس کی مکتوب نگاری حدِ کمال کو چھوتی تھی۔ ۱۹۵۱ء میں میں نے میٹرک پاس کیا تو سرینگر چلا آیا کہ اُن دِنوں ساری وادی میں صرف سرینگر میں ہی کالج نام کی کوئی چیز تھی۔ دو درجہ مجھ سے آگے تھے لیکن ہم صبح

ا: اس دوران شمیم کی دیوان صاحب کے نام خط و کتابت زیادہ بہتر سرمایہ تھی۔ مجھے معلوم نہیں کہ شمیم کے دیوان کے خط اب کہاں ہیں۔ لیکن دیوان صاحب کے خط شمیم کی اہلیہ سکینہ کے پاس میں نے دیکھے ہیں۔ ان میں علم و ادب کے بہترین نکتے بیان ہوئے ہیں۔ کاش یہ شائع ہو جائیں۔ (م۔ے۔ث)

اِکٹھے کالج روانہ ہوتے۔ ایس پی کالج تک کوئی آدھے گھنٹے کی مسافت تھی۔ شمیم راستے میں کبھی دوستوں اور کبھی واقف کاروں کو دیکھتے تو اُن پر مزے مزے کے جُملے کستے اور مخاطب اُنکا تُرکی بہ تُرکی جواب تو نہ دے سکتے مگر بہت خوش ہوتے۔ اِسی دوران میں نے شمیم کی حُسن شناسی کی پہلی گل ریزیاں بھی دیکھیں۔ اُنہی دِنوں کی بات ہے کہ پاکستان میں فیض احمد فیض کو گرفتار کر لیا گیا۔ ہم دونوں فیض کے کلام سے آشنا ہو گئے تھے لیکن گرفتاری نے فیض کو ادیبوں اور نوجوانوں کا Icon بنا دیا۔ مجھے یاد ہے کہ اُن دِنوں ریذیڈنسی روڑ پر کپور اینڈ سنز اور پرتاپ پارک کے نواح میں نشاط پریس واقع تھے۔ ہم میں اِتنی گنجائش نہ تھی کہ پیسہ دے کر رسالہ یا اخبار خرید سکتے۔ آتے جاتے ڈرتے ڈرتے Brozing کا لطف اُٹھاتے۔ لیکن اگر کسی رسالے یا اخبار میں فیض کی کوئی تازہ غزل یا نظم آتی تو اپنے اثاثے کی کوئی چیز بیچ کر اُس کو خرید کر گھر میں نشاط مطالعہ سے سرشار ہوتے۔ ایک وقت ایک ایسے ہی رسالے کی خرید کے لئے شمیم نے اپنی Zoology کی نصابی کتاب کم قیمت پر بیچ ڈالی۔

کالج میں شمیم کے ایک اُستاد پروفیسر نصر اللہ تھے جو بعد میں ریاست کے چیف سیکریٹری کے عہدے سے ریٹائیر ہوئے۔ وہ بھی شمیم کے ذہانت و فطانت سے چندھیا گئے اور اپنے طالبِ علم کے مُشتاق دوست بن گئے۔ میر نصر اللہ صاحب اردو شاعری کا بہت پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں اور ایک وقت اُنہیں غالب اور اِقبال کے بے شمار شعر یاد تھے۔ کالج میں اُنکی وجہ سے شمیم کی قدر و منزلت بہت بڑھ گئی اور شمیم اُونچی اُونچی محفلوں میں شریک ہونے لگے۔ اُن دِنوں صابر منزل میں ہماری عید اُس دِن ہوتی تھی جب دیوان صاحب کا اپنے کاروبار کے سلسلے میں

سرینگر آنا پڑتا تھا۔ وہ ازراہِ مہربانی صابر منزل میں ہمارے ہی ساتھ قیام کرتے تھے کہ اُنہیں عبادت اور کاروبار کے بعد اپنی فرصت میں سوئپ (Sweep) کا تاش کھیلنے میں لطف آتا تھا اور صابر منزل میں شمیم اور میرے ساتھ رات گئے تک اِس سے لطف اٹھاتے تھے لیکن اُن کے ساتھ ہمارے کچن میں گوشت بھی آجاتا۔ مُرغے بھی اور دودھ دہی اور دوسری لوازمات بھی۔ ہم اِفلاس وغُربت کے اُن دِنوں میں خوب کھاتے پیتے اور نہال ہوجاتے۔ اُس صاحب ذوق تاجر کو ہماری اِس تشنہ کامی کا پورا احساس تھا۔ وہ کبھی ہمیں سینما لے جاتے اور کبھی ہوٹل میں چائے پلاتے۔ کچھ دِنوں کے بعد جب وہ شوپیان چلے جاتے تو ہم پھر تسبیح کے دانوں کی طرح دِنوں کا شمار شروع کرتے اور انتظار کرتے کہ کب تسبیح کے زمرد پر ہاتھ پڑتا ہے اور دیوان صاحب کی سواری صابر منزل کے عُسرت کدہ کو پھر بزمِ چراغاں میں تبدیل کرتی ہے۔ شمیم کے ساتھ اُس کے بعد بہت سال گذرے یہاں تک کہ وہ میرے خوابوں کا حصہ بن گئے اور اب بھی سپنوں میں مجھے شاداب کرتے ہیں ؎

تمہارے بعد اندھیرا ہے بزمِ ہستی میں
بہت چراغ جلائے تھے روشنی کے لئے

.....☆☆☆..........

مرزا غلام قادر بیگ عارف

شمیم احمد شمیم کی یاد میں

بہ جنازہ گر نہ آئی بہ مزار خواہی آمد

سکاٹ لینڈ کے پہاڑی علاقہ میں ایک چٹان کی اوٹ میں جھاڑیوں کے اندر نوجوان شکاری تاک لگائے چھپا بیٹھا تھا، سخت سردی کا موسم تھا۔ فضاء میں ہلکی سی کہر چھائی تھی۔ اسی گز کے فاصلے پر وہ عظیم الشان بارہ سینگا کھڑا ہو گیا، جس کی مدت سے شکاریوں کو تلاش تھی، ساتھی نے اشارہ سے کہا "ایسا نادر موقعہ پھر کبھی نصیب نہیں ہوگا" شکاری نے رائفل اُٹھا کر نشانہ باندھا پھر کچھ خیال آیا۔ بندوق نیچے رکھ کر نوٹ بک اٹھایا اور پنسل سے تصویر بنانے میں قیمتی لمحے صرف کر دئے' بارہ سینگا نظر سے اوجھل ہو گیا، ساتھی نے شکاری کو پاگل خیال کیا، جس نے عمر بھر کا چانس ایک کاغذ کے پرزے کے لئے کھودیا۔ اس کاغذ کے پرزے نے برطانوی مصوری کی تواریخ مین یادگار زمانہ کی حیثیت حاصل کرلی اور جنگل کا تاجدار کہلایا، شکاری وکٹورین زمانے کا مشہور عالم مصور ایڈون لینڈ سیئر تھا۔ ۱۸۵۰ء میں آپ سر ایڈون ہو گئے۔ معمولی گھرانے میں پیدا ہونے کے باوجود آپ نے ملکہ وکٹوریہ

کے مصاحبوں میں اعلیٰ رتبہ پایا۔ دولت مند ہونے کے بعد بھی آپ عوام میں ہر دلعزیز رہے، وفات پر آپ کو پورے اعزاز کے ساتھ لندن کے شیٹ پالی کھڈرل میں دفن کیا گیا، سنگ مزار پر یہ الفاظ کندہ ہیں ''حیوانات کی تصویریں بنانے والا بہترین شکاری'' اس چھوکرے نے قدم اٹھانے کے ساتھ ہی تصویر کشی بھی سیکھ لی تھی۔ چار سال میں وہ عمر کے لحاظ سے بہترین ڈرافٹس بناتا۔ تیرہ سال کی عمر میں آپ کی بنائی ہوئی گدھے کی تصویر۔ رائل اکیڈیمی میں لٹکائی گئی ۔ کتوں کی تصویریں بنانے میں آپ کو خاص شغف تھا۔ موجودہ زمانے کے محقق پچھلی صدی کے کتوں کی نسلوں کے متعلق آپ کی کھینچی ہوئی تصویروں سے سند حاصل کرتے ہیں، سولہ سال کی عمر میں آپ نے لڑتے ہوئے کتوں کی وہ تصویر بنائی جس نے لندن کے اہل نظر کو حیرت میں ڈال دیا، اس تصویر میں حیوانی جذبات ٹپکتے نظر آتے ہیں۔ اکثر شوقین مالکوں کو اپنے کُتے کی تصویر بنانے کیلئے لمبا انتظار کرنا پڑتا تھا ایک کتے کے مرنے کے دو سال بعد لینڈ سیئر نے اس کی ایسی تصویر بنائی کہ مالک حیران ہو گیا، اس مصور نے اس کتے کو صرف ایک دفعہ دیکھا تھا۔ اسی لئے لینڈ سیئر کو کتوں کا شکسپیر کہا جاتا ہے۔ اعلیٰ دعوتوں کے موقعوں پر مہمانوں کی کشش کے لئے فخراً لکھا جاتا تھا کہ لینڈ سیئر رونقِ محفل ہوں گے۔ آپ کو تصویروں کی کاپی رائٹ کیلئے صرف ایک خریدار سے دس لاکھ بیاسی ہزار چار سو روپے ملا۔ موجودہ افراط زر کے زمانہ میں اتنی بڑی دولت کا حساب لگانا بھی مشکل ہے ملکہ وکٹوریہ نے آپ کی بنائی ہوئی چھ تصویروں کو کندہ کاری میں منتقل کر کے آپ کی عظمت کی داد دی ہے، آپ کی بنائی ہوئی تصویریں اس زمانہ میں ۷،۵۷،۶،۶۸ روپیہ تک فروخت ہوئی اس ملکہ کی وکٹوریہ کی تصویر آج سے دس سال قبل ۲،۴۶،۲۴۰ روپیہ میں فروخت ہوئی

ہے۔ دھات کے بنائے ہوئے آپ کے چار شیر ببر ۱۸۶۷ء میں کٹرا فلگر چوک تندی میں نصب کئے گئے ہیں۔ ۱۸۷۳ء میں آپ کی وفات پر ان شیروں کو سیاہ رنگ کے ہار پہنائے گئے ہیں۔ ہسٹری میں سب سے زیادہ تصویریں ان ہی شیروں کی لی گئی ہیں۔

مہذب قوموں نے اس طرح اپنے فن کاروں کی عزت افزائی کر کے اپنے اپنے ملک کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ آسنور تحصیل کولگام کشمیر میں میرے دوست محمد یعقوب کے گھر میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ جس کا نام شمیم احمد رکھا گیا بالغ ہو کر اس نے اپنا پورا نام شمیم احمد شمیم کیا۔ میں آپ کے باپ دادا دونوں کو جانتا ہوں۔ شمیم کو حاضر جوابی اور بے باکی وراثت میں ملی تھی۔ طویل قید و بند کے بعد ۱۹۶۴ء میں کسی کام سے میں خواجہ غلام نبی المعروف نبہ جی ٹرانسپورٹ کمشنر کے دفتر پر گیا۔ وہاں ایک خوبصورت لڑکا موجود تھا۔ خواجہ صاحب نے شمیم احمد شمیم کے نام سے تعارف کرایا۔ ساتھ بتایا کہ آپ ''آئینہ'' کے نام سے ایک ہفت روزہ اخبار جاری کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ میں نے آپ کے والد کی بے باکی اور حاضر جوابی کا ایک واقعہ سنایا اور امید ظاہر کی کہ یہ سرمایہ ان کو ضرور وراثت میں ملا ہوگا۔

شمیم صاحب کو سر لینڈ سیئر پر فوقیت حاصل ہے کہ جہاں لینڈ سیئر حیوانات کے خدوخال سے ان کے جذبات کی عکاسی کرتا تھا وہاں شمیم صاحب نے سیاست کاروں کے قول و فعل کو قلمبند کر کے ان کی حیوانیت کو اس طرح پیش کیا ہے کہ حلیہ بگاڑے بغیر ان کی شکل آئینے میں نظر آتی ہے۔ درندوں اور پرندوں کی وہ منہ بولتی تصویریں کھینچی ہیں، جس سے حیوانی وجوہات کی پوری عکاسی ہوتی ہے ان میں شیر بکرے، گدھے گدھ، بھیڑ اور بھیڑئے سب شامل ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے

کہ ان تصویروں کو ایک البم میں جمع کیا جائے تا کہ آئندہ آنے والے محقق اور مورخ سند پائیں۔ اور سیاسی بصیرت حاصل کریں یہ البم قومی متاع کا درجہ حاصل کرسکتا ہے اور شمیم کی موت کی بہترین یادگار ہوگا۔ شمیم صاحب کی مصوری کو یہ کمال حاصل ہے کہ ایک ایسی تصویر میں شیر اور لومڑی کی دو متضاد نفسیات کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ اگر شمیم صاحب کو سیاست کاروں کا شیکسپیر کہا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا شوپیان کے اسمبلی انتخاب میں شمیم نے ایک بار کہا تھا کہ مرتے وقت میرا اثاثہ ایک جھونپڑی اور ایک ٹوٹی ہوئی سائیکل کے سوا کچھ بھی نہیں ہوگا شمیم کی موت کے بعد نہ تو جھونپڑی ہے اور نہ ہی غالباً سائیکل ۔

یوں پھریں اہل کمال آشفتہ حال افسوس ہے
ہے کمال افسوس، تجھ پر کمال افسوس ہے

☆☆☆

مشتاق احمد فاروق

شمیم احمد شمیم بھی رخصت ہوئے

مندرجہ ذیل مضمون مولوی محمد عبداللہ شاہ مرحوم کے صاحبزادے اور شمیم صاحب کے چچا مشتاق احمد فاروق نے تحریر کیا ہے کہ جو گزشتہ ۳۳ برس سے سرحد کے اُس پار رہ رہے ہیں، یہ مضمون مظفر آباد سے شائع ہونے والے ہفت روزہ "انصاف" میں شائع ہوا تھا اور ہم اسے من وعن شائع کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

یکم مئی ۱۹۸۰ء میں دوپہر کے بعد عدالت سے فارغ ہو کر گھر جا رہا تھا۔ راستے میں ایک محب دوست نے میرے بھتیجے شمیم صاحب کی بیماری کے بارے میں دریافت کیا۔ شمیم صاحب ایک سال سے سرطان کی بیماری کا شکار تھے۔ ابھی میں مایوسی کے عالم میں جواب دے رہا تھا کہ انہوں نے اطلاع دی کہ دہلی ریڈیو نے اندرا گاندھی کا ایک طویل تعزیتی پیغام نشر کیا جس سے شمیم کی وفات کی تصدیق ہوئی۔

اناللہ وانا الیہ راجعون۔ ہم چھ بھائی تھے اور ۵ رداعی اجل کو ۱۹۴۷ء سے سال ۱۹۷۹ء تک لبیک کہہ چکے، میری اہلیہ کو اکثر میں اپنی موت کا تصور دے کر ذہنی طور سے تیار کرتا رہا۔ اور ان کے لئے شمیم کا وجود ہی ان کے آسرے کا باعث تھا کیوں

کہ جہاں اللہ تعالیٰ نے تین دختر ان عطا کیں وہاں اولاد نرینہ نہ تھی اور ہم شمیم کو ہی اپنا بیٹا سمجھتے تھے۔ مجھ پر جو گذری مگر اہلیہ کے لئے یہ خبر برق بن کر گری اور وہ اور میری بڑی دختر جو ابھی نابالغ ہے، غم سے نڈھال ہو گئیں مگر صبر کے سوا کیا چارہ تھا۔ یکم مئی کی شام کو سری نگر ریڈیو سے ہم نے خود ان کے تجہیز و تکفین کے بارے میں تفصیلات سنیں۔ ہزاروں لوگوں نے جنازہ پڑھا اور وادی میں مکمل سوگ منایا گیا۔ ہمارے خاندان کا ذہنی تعلق قانون اور صحافت سے رہا ہے۔ ۱۹۳۱ء کی تحریک کے نتیجہ میں جب کشمیر میں پریس کا افتتاح ہوا تو مرحوم کے برادر اکبر مولوی عبدالرحیم نے ''اخبار صداقت'' کا اجراء کیا، جو کشمیر میں پہلا مسلمان اخبار تھا، ان سے پنڈت بزاز نے ''وتستا'' جاری کیا تھا۔ ۱۹۲۶ء کے بعد جب کہ میر واعظ مرحوم کے اعتراض پر بھائی مرحوم کو سیاست سے الگ ہونا پڑا اور وہ جوڈیشل سروس میں بہ حیثیت سب جج متعین ہوئے۔ دوسرے برادر ایم اے صبا مرحوم نے ہفتہ روزہ ''البرق'' کا اجراء کیا۔ جو تقسیم ملک تک جاری رہا۔ جب کہ ان کو پاکستان ہجرت کرنا پڑی۔ اس وقت جب کہ ہمارے مکان پر فوج اور پولیس کا پہرہ تھا۔ شمیم صاحب نابالغ تھے اور یہ بعد تقسیم شعور کی عمر کو پہنچے تو انہوں نے ہفت روزہ ''آئینہ'' کا اجراء کیا جو روز نامہ بن کر ان کی وفات تک جاری رہا۔ شمیم صاحب نے علیگڑھ سے قانون کی ڈگری اعزاز کے ساتھ حاصل کر کے پہلے کچھ عرصہ وکالت کی۔ اگر چہ وکالت کامیاب رہی مگر سیاسی دل چسپی کے علاوہ انقلابی طبع کے باعث صحافت مستقل طور سے اختیار کی۔ شمیم صاحب اگر چہ ٹھوس نظریات کے مالک تھے مگر وہ فلسفہ حکمت عملی کو زیادہ قیمت دیتے تھے۔ ۱۹۶۹ء میں جب عارضی ویزا پر یہاں تشریف لائے تو کوئی تین گھنٹہ تک راقم کے ساتھ اس موضوع پر بحث کی، اگر چہ راقم نے ان کو یہ

تاثر دیا کہ راقم قائل نہیں ہوا مگر در حقیقت ان کے وزن دار دلائل اور قوت بیان نے مجھے زبردست قائل کیا اور یہ تصور کہ حکمت عملی منافقت کا نام ہے میرے ذہن سے کافور ہوا۔ منافقت اور حکمت عملی دو الگ چیزیں ہیں اور حکمت عملی کا الگ فلسفہ ہے۔ کانٹ کی کتاب پریکٹیکل ریزن اس پر کافی مبسوط ہے حالاں کہ کانٹ یورپ میں نہ صرف عظیم اخلاقی اقدار کا علمبردار تھا بلکہ پوری زندگی مجسمہ اخلاق تھا۔ شمیم کے قلم میں برقی قوت تھی اور ان کی تحریر دلائل کے ذخیرہ لے کر ظاہر ہوتی تھی اور عقل کو اس قدر پرزور اپیل کرتی تھی کہ تنگ نظری اور شدت عقیدت کے پردے پھاڑ دیا کرتی تھی زبان سلیس، شیرین اور قوت سے پُر تھی۔ مظفر آباد میں آمد پر جب راقم نے وکلاء اور ججوں کو مدعو ہو کر کے ان سے ملاقات کرائی تو گفتگو کا انداز چالس ڈکنز کی کتاب Tale of two cites کے مطابق تھا۔ محتاط اور بلا تبصرہ، مگر انہوں نے سب کو یکساں متاثر کیا۔ اپنے پاکستان کے دور میں وہ پاکستانی قوم کی جرأت رندانہ سے بہت زیادہ متاثر ہوئے مگر پاکستانی قیادت سے بے حد مایوس ہوئے۔ شمیم بلا کا ذہین تھا، ایوب خان کی سادہ اور پُر خلوص شخصیت سے وہ بہت متاثر ہوئے اور سب اسلام آباد کی سیر کی تو بے ساختہ بولے یہ قوم احسان فراموش ہے اگر اور کچھ نہیں تو اسلام آباد کی تعمیر میں پاکستان پر ایک عظیم احسان ہے، ان دنوں ایوب خان کے خلاف ایجی ٹیشن زوروں پر تھی۔ ایک تو جو ایوب کے خلاف ٹھاٹھیں مارے ہوئے مال روڈ سے گذرا اس کو جب شورش کشمیری نے خطاب کیا۔ تو شمیم صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے کہ اس مخلص اور بے مثال قربانی دینے والی قوم کو کس طرح لیڈر کو ایکسپلائٹ کر کے ان کی قوتوں کو تباہ و برباد کر رہے ہیں اس سے پہلے وہ شورش سے ملاقات کیلئے بے صبر تھے اس کے

بعد نہ صرف خواہش ترک کہ بلکہ اس بارہ میں انقباض بھی پیدا ہو۔ ہمارے دوست انصاری صاحب کے خلوص نے ان کو بے حد متاثر کیا مگر انہوں نے یہ پیش گوئی کی تھی، کہ یہ بے باکی اور خلوص دینی پرچار میں تو ضروری ہے مگر عملی سیاست کے میدان میں یہ ان کے اعصاب کو ختم کردے گی۔

وادی کشمیر میں شمیم صاحب بے حد مقبول تھے۔ بخشی غلام محمد مرحوم کو بطور آزاد امیدوار لوک سبھا کے الیکشن میں ۵۶ ہزار ووٹوں سے شکست دی۔ اپنی گرجدار آواز اور جرأت رندانہ سے نہ صرف سرکاری ایوانوں کو لرزدیا بلکہ سرحدوں پر بھارتی افواج کی زیادتیوں پر برس پڑتے تھے جس پر ایک مرتبہ سپیکر سے چپقلش ہوئی ان کو باہر نکالا گیا مگر وہ دروازہ تک لاؤڈ سپیکر کو گھسیٹ کر شعلہ بیانی جاری رکھتے رہے اور کچھ عرصہ لوک سبھا میں داخلہ پر پابندی لگی۔ سال گزشتہ دوبارہ ویزا کی کوشش کی کیوں کہ اپنی بیماری کی وجہ سے موت کا اندازہ ہوگیا تھا مگر اجازت نہ ملی، یوں سمجھ لیں ان کی وفات اگرچہ اب ہوئی اور اپنی قوم سے ۱۹۸۰ء میں جدا ہوئے مگر ہم سے ۱۹۶۹ء میں ہی ہمیشہ کے لئے جدا ہوئے اگر سیز فائر کی منحوس لائن پر آنے جائے کی پابندی نہ ہوتی تو یکم مئی کو مجھے خبر ملی، اگر میں تین بجے موٹر میں سوار ہوتا تو براستہ اوڑی اسی روز 1/2 5 بجے یا 6 بجے جنازہ میں شریک ہوسکتا مگر....؟

..........☆☆☆..........

مشعل سلطانپوری

شمیم احمد شمیم

اپنی تنقیدوں کی روشنی میں

ہمارے ریاست کے اب تک جتنے بھی مایہ ناز سپوت گزرے ہیں، اُن کی صف میں شمیم مرحوم کو شامل نہ کرنا زیادتی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ وہ ایک ''شعلہ مستعجل'' تھا، واقعی اس مصرعہ کی دلآویز شرح۔

خوش درخشید ولے شعلہ مستعجل بود

یک بیک چمک اُٹھا، تھوڑی دیر دیکھنے والوں کی آنکھوں کو چندھیانے والی روشنی پھیلا کر ٹمٹمایا اور اپنی لو میں سما گیا۔ صرف ایک شخص میں بہت سی صلاحیتیں اور گوناگوں اہلیتیں دیکھ کر قدرت کی کاریگری پر ایمان پختہ ہوجاتا ہے۔ شمیم ایک ایسا ہی شخص تھا لیکن وہ ان ساری صلاحیتوں سے بیک وقت کام لینا چاہتا تھا جو نہایت دشوار معاملہ ہے اس لئے کئی صلاحیتوں کے صرف جلوے ہی دکھا سکا اس کے لئے اُن کی سیمابی طبیعت کو بھی ذمہ دار گردانا جاتا ہے۔ وہ سیماب پا ہی نہیں سیماب پیکر بھی تھے، اس وجہ سے کسی ایک مقام پر نہ ٹھہر سکے۔ علامہ اقبال مرحوم کا یہ شعر اُن پر پورا صادق آتا ہے۔

چہ کنم کہ ایں دل من بہ مقام درنہ سازد
سرِ منزلے نہ دارم کہ بمیرم از قرارے

حصول علم، ادب ملازمت، صحافت، سیاست، کسی ایک میدان کے ہوکر رہنا سراسر اُن کی طبیعت کے خلاف تھا۔ لیکن کئی میدانوں میں انہوں نے ایسے جھنڈے گاڑھے کہ دیرتک اُن کی یادتازہ رہے گی۔ اُن کی ادبی صلاحیتوں کواُن کی صحافت اور اُن کی صوفیانہ لاثانیت کواُن کی سیاست نے نقصان پہنچایا۔ جولوگ انہیں صرف آئینہ کی وساطت سے جانتے ہیں یا بھارتی پارلیمنٹ میں اُن کی تقریروں کے حوالے سے اُن سے واقف ہیں وہ اُن کی ادبی صلاحیتوں کا اندازہ نہیں کرسکتے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۸۱ء کے آئینہ کے یادگاری شمارہ میں جن لوگوں نے اُن کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کئے ہیں وہ مرحوم کی زندگی کے اس پہلو کو نظرانداز ہی کر گئے ہیں۔ آل احمد سرور، گوپی چند نارنگ، بلراج پوری، رحمان راہی، غلام رسول نازکی، میرزا عارف، شہریار، شوریدہ کشمیری، جن میں سے کچھ لوگ اُن کے بہت قریب رہے ہیں، انہوں نے بھی مرحوم کی ادبی کاوشوں کوشاید قابل ذکر نہیں سمجھا ہے۔

شمیم کی نہایت مصروف زندگی کوزیرنظر رکھ کر اُن کے ذوق ادب اور وسیع مطالعہ پر حیرت ہوتی ہے۔ وہ نہ صرف دوسری زبانوں کے ادب کے قابل ذکر قاری تھے بلکہ اپنی مادری زبان کشمیری کے ادب سے گہری دلچسپی رکھتے تھے وہ بھی اس زمانے میں جب مختلف وجوہات کی بنا پر لوگ اسے قابل توجہ نہ سمجھتے تھے۔ کشمیری زبان کا ادب، یا جو کچھ بھی اس زبان میں شائع ہوتا تھا، صرف کشمیری ادیبوں کے مطالعہ میں آتا تھا (اوراب بھی صورت حال کچھ زیادہ مختلف ہوں)۔

شمیم، انگریزی، اردو اور کشمیری ادب کے نہایت ذہین قاری تھے اور جو چیز اُن کے مطالعہ میں آتی تھی، اس کے بارے میں تحریری یا زبانی اپنے تاثرات کا اظہار بھی کرتے تھے۔

شمیم نے طالب علمی کے زمانے ہی سے لکھنے کی ابتدا کی۔ نثر ونظم، دونوں میں طبع آزمائی کرنا چاہی لیکن اُن کے استاد پروفیسر شوریدہ کاشمیری کے بقول، انہوں نے محمد یوسف ٹینگ اور شمیم دونوں کونثر لکھنے کا مشورہ دیا۔ کالج میں زیر تعلیم ہونے کے دوران اُن کی اردو میں لکھنے کی صلاحیت سے اس وقت پردہ اُٹھنے لگا جب وہ پرتاپ میگزین کے اردو سیکشن کے ایڈیٹر ہوئے۔ شمیم شعر بھی کہنا چاہتے تھے لیکن اُن کی طبیعت کو نثر ہی راس آئی۔ انہوں نے نثر لکھنے میں فکشن سے شروعات کرنے کی بجائے تنقیدی جائزوں، تبصروں اور دوسرں کی تحریروں پر رائے زنی کرنے سے اس کا آغاز کیا۔ ظاہر ہوتا ہے کہ تنقید ہی سے اِن کی طبیعت کو مناسبتِ ازلی تھی۔ جو آگے چل کر تصدیق کی مہر ثبت ہوئی۔

شمیم تحریر وتقریر دونوں میدانوں کے شہسوار تھے لیکن کمیت کے اعتبار سے تقدیروں کے مقابلے میں اُن کی تحریروں کا پلہ بھاری نہیں اور تحریری سرمائے میں بھی صحافیانہ حصہ بہت زیادہ اور ادبی بہت کم۔ مقدار کے لحاظ سے اُن کی تنقیدیں بھی کچھ زیادہ نہیں۔ ہم انہیں اس لحاظ سے نقاد نہیں مان سکتے کہ اُن کے تنقیدی مضامین کے مجموعے شائع ہوئے ہیں یا تنقید میں کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ انہوں نے گنے چُنے تنقیدی مضامین ان کی نقادانہ اہلیت، اُن کے تنقیدی شعور اور فن تنقید پر ان کے پورے دسترس کے ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ آغاز جوانی سے ہی شمیم ستاروں پر کمند ڈالنے کی کوشش کرتے تھے۔ اُن کی نظریں کنجشک وحمام کی

بجائے جبرئیل و اسرافیل کی طرف اُٹھتی تھیں اور اُسے فضا کی کوئی تاریکی نہیں ڈرا سکتی تھی۔ وہ حد درجہ بیباک اور گستاخ ہونے کی حد تک منہ پھٹ تھے۔ سیاست اور صحافت ہی میں اُن کی مہم جوئی قابل ذکر نہیں، ادب میں خاص طور ادبی تنقید میں بھی اُن کی مہم جو فطرت خطر پسند دکھائی دیتی ہے۔ جس کا ثبوت برصغیر کے اشعر الشعراء مرزا غالب کی شاعری پر ''ہم سخن فہم ہیں'' عنوان سے لکھے گئے ان کے، شاید پہلے تنقیدی مضمون سے ملتا ہے جو دسمبر ۱۹۵۲ء میں ایس پی کالج سری نگر کے ترجمان رسالہ ''پرتاپ'' میں شائع ہوا۔ میگزین کے نگران پروفیسر محمد طیب صدیقی نے اس کے آغاز میں لکھا ہے کہ یہ ''کلام غالب اور جناب غالب پر ایک تنقیدی حملہ ہے جو جارحانہ ہونے کے ساتھ ساتھ وحشیانہ بھی ہے۔'' اگر چہ یہ مضمون پروفیسر صدیقی کے نام سے شائع ہوا لیکن اس میں صرف شمیم ہی بولتا نظر آتا ہے۔ اس کا اعتراف آئینہ کے تیسرے یادگاری شمارہ میں خود میگزین کے نگران نے بھی کیا ہے۔

ایس پی کالج میں زیر تعلیم ہونے کے علاوہ شمیم ترقی پسندوں کے نرغے میں تھے۔ صرف شمیم ہی کیا، نوجوان طالب علموں کی ایک بڑی تعداد جو شعر و ادب سے شغف رکھتی تھی بلکہ وہ بھی جنہیں ادب سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا، ترقی پسند ادیبوں کی میٹنگوں، ان کے جلسوں میں شریک ہو کر یہ طالب علم اُن کے مباحث سے متاثر ہوتے رہے اور ادب کو اسی عینک سے دیکھنے لگے۔ خود شمیم کے بقول ''عوامی ادب کے نام پر ادیبوں سے وہ تقاضے ہونے لگے کہ ادیب کی آزادی، انفرادیت اور شخصیت دب کر رہ گئی۔ ۱۹۸۳ء کے بعد کلچرل کانگریس کے نام سے ایک غیر سرکاری انجمن وجود میں آئی اور ادبی احتساب کا کام زیادہ منظم طور ہونے لگا۔'' اس رو میں بہہ جانے کے نتیجے میں جب تک کا ادب جاگیردارانہ اصول کی پیداوار سمجھ کر

نا قابل اعتنا قرار پایا۔ ادبی اقدار سے زیادہ طبقاتی کردار اہم سمجھا جانے لگا۔ اسی کے زیر اثر شمیم جیسے باغی نوجوان نے مرزا غالب کے شاعرانہ کردار پر ''ہاتھ اُٹھانے'' کی جسارت کی۔ لیکن یہ جسارت اُن کے طرز استدلال اور انداز بیان سے قابل توجہ سمجھ کر گوارا کر لی گئی۔ شمیم وار پر وار کرتے گئے اُن کی شکل وصورت اُن کی زندگی، اُن کے عادات واطوار، اُن کی شاعری، سب کچھ اس زد میں آ گیا۔ ان فقروں پر غور کیجئے۔ ''غالب پرستوں نے جذبہ عقیدت سے اثر پذیر ہو کر غالب کو ایک آئیڈیل شخصیت بنا دیا ہے۔ اس کی شکل وصورت، عادات وفضائل اور کردار پر کچھ اس انداز سے حاشیہ آرائی کی گئی ہے کہ غالب کی سوانح حیات سے واقفیت نہ رکھنے والے قاری کو وہ ایک فرشتہ سیرت، وجیہہ صورت، مکمل اور جامع شخصیت نظر آتے ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مرزا کی جو عام تصاویر ملتی ہیں۔ ان کو دیکھ کر اُنہیں خوبصورت کہنا جمالیاتی ذوق کی توہین اور پرے درجے کی بد مذاقی ہے جہاں تک اُن کی سیرت کا تعلق ہے، میری رائے میں اُن کی سیرت میں کوئی ایسی غیر معمولی خصوصیت نہیں ہے جو اُنہیں عام انسانوں سے ممتاز کر سکتی ہو۔'' وہ غالب شناسوں کو غالب پرست قرار دے کر انہیں بھی اپنے نشانے پر لے آتے ہیں ملاحظہ ہو۔ ''جس طرح حافظ شیرازی کے مداح اُن کی شراب نوشی کو بادۂ معرفت اور، اُن کی عشق بازی کو عشق حقیقی سے تعبیر کر کے اُن کی شاعرانہ عظمت اور برتری کے دعویدار ہیں ٹھیک اسی طرح غالب پرست بھی کلام غالب کی دور از کار تاویلات اور توضیحات کر کے ان کے مہمل اور معمولی اشعار کو بھی غیر معمولی اہمیت دے رہے ہیں۔''

شمیم فنِ شعر میں غالب کی استادانہ حیثیت کے قائل تو ہیں، انہیں یہ

اعتراف بھی ہے کہ غالب کے ہاں معنی آفرینی ، نازک خیالی ، لفظی صناعی ، شوخی، حرارت اور روانی ہے، لیکن ان کے کلام کو صرف واردات عشق کے بیان تک محدود سمجھتے ہیں، اُن کے خیال میں دوسرے مضامین محض ضمناً آ گئے ہیں۔ انہیں اس بات سے بالکل اتفاق نہیں کہ اُن کے فلسفۂ عشق کو فلسفۂ زندگی سے تعبیر کیا جائے۔ شمیم بے دھڑک ہو کے لکھتا ہے کہ غالب کے ہاں ''زندگی کا کوئی واضح تصور نہیں ملتا۔'' اُن کے خیال میں غالب زندگی کا ایک واضح شعور بھی نہ رکھتے تھے۔ انہیں غالب کے کلام میں کوئی مقصدیت نظر نہیں آتی وہ اسے اُن کے لئے ذہنی تعیش کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اس دوران شاعر کو شمیم پہلوانوں کا اکھاڑا'' جیسی پھبتی کستے ہیں اور غالب کو فنی کرتبوں سے اپنے ہم عصروں میں ممتاز ثابت کرنے کی کوششوں کا قصور وار گردانتے ہیں اور دلیل کے طور پر اُن کے ابتدائی کلام کی مشکل پسندی کی طرف اشارہ کرتے ہیں وہ غالب کے معترضین اور مخالفین کے اشعار کا حوالہ دے کر اپنے دعویٰ کو حق بہ جانب ٹھہراتے ہیں۔ شمیم کلام غالب سے مثالیں تلاش کر کے اُن سے اپنے شکار پر چلائے جانے والے تیروں کا کام لیتے ہیں۔ کسی شعر سے اُن کے کلام کو سطحی جذباتیت کا آئینہ دار بتاتے ہیں تو کسی سے اُن پر قنوطیت کا فتویٰ لگا کر اُنہیں زندگی سے فرار کی تعلیم دینے کا مجرم قرار دیتے ہیں۔

کلام غالب پر شمیم احمد شمیم نے اپنی تنقید کو کسی حد تک متوازن بنانے کی کوشش بھی کی ہے مثال کے طور پر ایسے اشعار کی طرف اشارہ کر کے جو خودداری، اخلاقی بلندی تصوف پسندی کے غماز ہیں لیکن وہ ایسے مضامین کو دانستہ نہیں، مشق شعر کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ اُنہوں نے ڈاکٹر بجنوری کے دیوان غالب کو الہامی کتاب قرار دینے کے دعوے کے طنزیہ طور پر تشریح معکوس کی ہے۔ لکھتے ہیں۔ ''ان کے

اسی دعویٰ میں ایک تلخ حقیقت پوشیدہ ہے، دیوان غالب واقعی الہامی کتاب ہے کیوں کہ اس میں خاکی دنیا کا کوئی ذکر نہیں۔ اس میں تصور اور تخیل کی بوقلمونی تو ہے لیکن حقیقت کی رنگ آمیزی کہیں نہیں۔'' شمیم کس نقطہ نظر سے کلام غالب پر تنقیدی نظر ڈالتا ہے، اس مضمون کے مطالعہ سے اس کا سراغ بھی ملتا ہے۔ کسی شاعر کے کلام کی قدر و قیمت کن معیاروں سے معلوم کی جاتی تھی، کن اصولوں کے مطابق ہوگا۔ ملاحظہ ہو'' غالب کی شاعری قطب صاحب کی لاٹ ہے۔ جس کی تاریخی اہمیت سے انکار تو نہیں کیا جا سکتا لیکن جس کی افادیت قطب الدین ایبک کے سوا شاید کوئی نہ جانتا ہو۔ ہمیں اچھے اور بُرے ادب میں فرق کرنے کے لئے ہیئت اور اسلوب کی پرکھ کو مقدم نہ سمجھنا چاہیئے بلکہ مواد کو مقدم رکھنا چاہیئے۔ ہوسکتا ہے کہ غیر صحت مند مواد کی ہیئت اور اسلوب خوشنما ہو لیکن صرف ہیئت کی خوشنمائی سے ہی مواد کی غیر صحت مندی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔''

اب اس بات میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ یہ وہی معیار ہیں جو ترقی پسند تنقید کے لئے مقرر کئے گئے تھے اور جس کا اطلاق ہر قسم کے ادب پر کیا جاتا تھا۔

علی گڑھ سے لوٹنے پر شمیم احمد شمیم محکمہ اطلاعات میں ملازم ہو گئے اور ماہنامہ ''تعمیر'' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ ریاست کے وزیراعظم بخشی غلام محمد کی سیاسی زندگی کا سورج نصف النہار پر تھا اور شمیم اُن کے منظورِ نظر لوگوں میں تھے۔ اب کچھ بین الاقوامی اور کچھ برصغیر کے سیاسی حالات کے نئے تقاضوں کی وجہ سے ترقی پسندی کا زور گھٹنے لگا تھا۔ ریاست کے ادیبوں کی سوچ میں بھی تبدیلی آ رہی تھی۔ حامدی کشمیری نے گو اپنے ادبی سفر کا آغاز شعر گوئی سے کیا تھا لیکن اب وہ فکشن کی طرف آ رہے تھے۔ اُن کے اردو افسانوں کا مجموعہ'' وادی کے پھول'' شائع ہوا تھا

اور شمیم کے مطالعہ میں آ گیا تھا۔ اُن کے قلم سے نکلا ہوا مضمون" وادی کے پھول۔ ایک تنقیدی جائزہ" ماہ نامہ تعمیر کے جنوری ۱۹۵۸ء کے شمارہ میں شائع ہوا جو شمیم کے شعر وادب کے دوسرے اصناف کے ساتھ ساتھ فکشن کے گہرے مطالعہ کا احساس دلاتا تھا۔ انہوں نے افسانہ کی تعمیر، اس کی بافت اور اس کے دوسرے لوازمات یعنے تمام اجزاء ترکیبی کو ذہن میں رکھ کر اس مجموعہ میں شامل افسانوں پر اظہار خیال کیا۔ حامدی صاحب کے لکھے ہوئے افسانوں کے اس مجموعہ کا تعارف پروفیسر شکیل الرحمان نے لکھا تھا، جس میں ان کو بہت سراہا گیا تھا مثال کے طور پر یہ فقرے۔" یہاں کا ماحول ان کے افسانوں میں ہر جگہ موجود ہے۔ مقامی لوگ نے ان کے افسانوں میں جان ڈال دی ہے...... ان کے کردار جیتے جاگتے ہیں اور یہاں کی فضاء میں سانس لیتے ہوئے کردار ہیں۔"

شمیم نے یار برادری، ذاتی تعلقات اور دوسری تمام مصلحتوں سے اوپر اُٹھ کر تنقید نگار کے فرائض کو اہمیت دیتے ہوئے شکیل الرحمان کی دی ہوئی رائے سے اختلاف کیا اور اُن سے یوں مخاطب ہوئے۔" میں تعارف نگاری کی مشکلات اور مجبوریوں کا اندازہ کر سکتا ہوں لیکن اگر ان مجبوریوں اور معذوریوں سے کوئی بہت بڑی غلط فہمی پیدا ہونے کا اندیشہ ہو تو تکلف بر طرف، تعارف نگار کو اس موقع پر بڑے حوصلے سے کام لینا ہوگا۔ میں شکیل صاحب کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ جس طرح کوئی فلم اپنی ہیروئین یا ہیرو کو اسلامی نام دینے کی وجہ سے ہی اسلامی تحفہ قرار نہیں دیا جا سکتا، اسی طرح ایک افسانہ، امیرا کدل، نشاط باغ، بادام واری یا اہرہ بل کے ذکر سے کشمیری ماحول کا نمائندہ نہیں بنتا۔ صرف اپنے کرداروں کے نام شعبان کرم دین، زونی اور نورہ رکھنے سے ان کے صحیح کشمیری کردار ہونے کی شرط پوری نہیں ہو سکتی۔

اس کے لئے اس روح کی گہرائیوں کو پیش کرنا پڑتا ہے جو اس ماحول اور ان کرداروں میں کارفرما ہو۔ شکیل صاحب نے ٹھیک کہا ہے کہ جنہوں نے کشمیر کو دیکھا ہے اور دیکھنے کے لئے بصارت ہی نہیں، بصیرت کی بھی ضرورت ہے...... حامدی کے ہاں یہی بصارت نہیں ملتی۔"

شمیم کشمیر کے اُردو شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات کے نہایت ذہین قاری اور گہری نظر رکھنے والے پارکھ ہونے کے شواہد فراہم کرتے ہیں۔ یہاں کی سیاسی اور سماجی صورت حال کے ساتھ ساتھ ادبی صورت حال پر برابر نظر رکھے ہوئے تھے لکھتے ہیں۔" کشمیری زبان کی ترقی اور ترویج کے لئے جہاں بہت سے اردو ادیبوں نے کشمیری میں لکھنا شروع کر دیا ہے، وہاں اُردو کو نئے لکھنے والوں کا ایک سرگرم اور پر جوش گروہ مل گیا ہے جو بڑی سرعت کے ساتھ یہاں کی ادبی فضا پر چھا رہا ہے۔ اس وقت اُردو شاعری کی صف میں شہ زور، تنہا انصاری، رسا جاودانی، شوریدہ کشمیری اور حامدی کے علاوہ کوئی ایسا نام نظر نہیں آتا جو یہاں کے ادبی حلقوں سے متعارف ہو۔ (اسی قد و قامت کے دو شاعر میر غلام رسول نازکی اور غ۔ م طاؤس جانے کیوں طاق نسیاں پر رہ گئے) لیکن وادی کے ہر گوشے میں ننھے ننھے ذرات کی چمک دمک سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ ذرے بھی بہت جلد ستارے بننے والے ہیں۔"

افسانوی ادب کے حوالے سے وہ یہاں کے افسانہ نگاروں کی کوششوں کو نہ صرف سراہتے ہیں بلکہ انہیں بیرون ریاست کے نامور افسانہ نگاروں کا ہم پلہ قرار دیتے ہیں۔ وہ پریم ناتھ پردیسی اور پریم ناتھ در کے افسانوں سے متاثر ہی نہیں، اُن کے مداح بھی ہیں، ان کے بقول ان افسانوں نے اردو افسانے کی دنیا میں

ایک ہلچل مچادی تھی، اس لئے کہ ''انہوں نے پہلی بار کشمیر کی صحیح سماجی زندگی کی تصویر پیش کی تھی، یہ تصویر حقیقی بھی تھی اور فنکارانہ بھی'' اس کے برعکس وہ حامدی کے افسانوں سے مایوس ہیں ۔ یہ افسانے ان کی توقعات پر پورے نہیں اُترتے۔ کم سے کم جن سے بردیسی اور درکی قائم کی ہوئی روایت ہی آگے بڑھتی، ایسا بھی نہیں۔ شمیم جب کچھ کہتا ہے کچھ لکھتا ہے تو ہوا میں تیر نہیں مارتا، اس کے لئے ٹھوس بنیاد فراہم کرتا ہے۔ لہذا اُس کی تردید میں قلم اُٹھانے کی کسی کو ہمت نہیں ہوتی۔ حامدی کے یہ افسانے اُن کی اوّلین کوشش کے طور پر سامنے آئے تھے لیکن شمیم کے لئے یہ بھی کوئی اور رعایت کی بات نہ تھی۔ ایسی تنقیدوں سے، تنقید کے منصب کا، ادب کے لئے تنقید کی ضرورت کا اور ادیب وشاعر کے وجود کے ساتھ ساتھ نقاد کے وجود کا احساس ہوتا ہے۔ ادب کو صحیح راستے پر ڈالنے میں تنقید کا رول کتنا اہم ہے۔ افسانوں اور کہانیوں کے نام پر کشمیر کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا اس کی قدر و قیمت پر اظہار خیال کرتے ہوئے اگر شمیم ایسے تیکھے جملے بھی لکھتا ہے ''کشمیر کے تعلق دلی اور بمبئی میں بیٹھ کر بڑے بڑے فنکاروں نے کشمیر پر کہانیاں لکھی ہیں۔ اور اس وادی کے حسن و جمال سے مسحور ہو کر ایک تمثیلی دنیا آباد کی ہے۔ یہاں کی ہانجن، بھکارن اور کسان زادی کو اپنے افسانوں کی ہیروئن بنا کر ان لوگوں نے کافی مال کھرا کر لیا لیکن کشمیر کی روح اور اس کی صحیح تصویر یہ لوگ کبھی پیش نہ کر سکے اور میرا خیال ہے کہ یہاں کی سماجی زندگی، بدلتے ہوئے ڈھانچے اور ایک نئی اُبھرتی ہوئی زندگی کا مطالعہ حامدی نے بھی خود اپنی آنکھوں سے نہیں کیا ہے۔''

شمیم کے خیال میں حامدی کے ان افسانوں میں کہیں یہاں کا ماحول نظر آتا

ہے نہ ان کے کردار کشمیری لگتے ہیں اور اگر ان میں یہ چیز نہیں پائی جاتی تو یہ کشمیر کی نمائندگی کیسے کر سکتے ہیں، انہیں حقیقت کے قریب کیسے سمجھا جاسکتا ہے؟ جن لوگوں کو یہ افسانے پڑھنے کا موقع ملا ہے وہ شمیم کی رائے سے اختلاف نہیں کر سکتے اور جنہوں نے ان کا مطالعہ نہیں کیا ہے وہ بھی ان کے دلائل پر مبنی بیان سے مطمئن ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ شمیم لکھتے ہیں۔ ''وادی کے پھول'' میں جو دُنیا آباد ہے، کشمیر میں رہتے ہوئے مجھے یہ دنیا کہیں نظر نہیں آتی۔ اس میں جو کردار ہیں وہ کبھی مجھے گوشت اور پوست کے انسانوں کی شکل میں نظر نہیں آتے۔ یہ کردار اپنی فطرت، اپنے مزاج اور اپنے کردار سے مجھے کشمیری نظر نہیں آتے۔ مجھے تو ہر لمحہ یہی احساس ہوتا ہے کہ یہ افسانے کسی ایسے ادیب کی تخلیق ہیں جو خود کبھی کشمیر نہیں آیا ہے لیکن جس نے کسی رومانی سیاح کی زبان سے یہاں کی داستانیں سُن سُن کر اپنے تخیل کی دنیا آباد کی ہے۔'' نقاد نے بجا طور ایسے افسانوں کے نقصان پہنچانے والے نتائج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا کہ ''یہ کتاب جب کشمیر کی سرحدوں کو پھاند کر دنیا کے سامنے پیش ہوگی تو اپنی تمام فنی خامیوں کے باوجود اسے کشمیر کی تصویر سمجھا جائے گا۔'' ان افسانوں پر مجموعی طور اظہار خیال کرنے اور یہ کہنے کہ حامدی نے جس کشمیر کی تصویر پیش کی ہے اس میں صرف بھوکے، ننگے اور دق کے مریض رہتے ہیں'' کے بعد وہ اس مجموعے میں شامل کئی کہانیوں کو الگ الگ زیر بحث لاتا ہے مثلاً ''زلزلے'' کے غیر فطری کلائمکس کے لئے شعبان چاچا کو پاگل کا روپ دینا، بہار اور خون'' کی حسین بھکارن کا طوائفانہ انداز، ''آنسو اور شعلہ'' میں ایک پھول چننے والی دیہاتن کا بمبئی کی کسی ایکسٹرا گرل کا سا انداز عشق، یہ تمام مصنوعی ہے اور حقیقت سے دُور۔

شمیم حامدی سے مخاطب ہو کر پوچھتے ہیں کہ "اگر انہوں اپنے افسانوں کی بھکارنوں کو کہیں دیکھا ہے تو ان کے افسانوں میں ان تضادات اور اس سماجی عمل کی کوئی ہلکی سی جھلک کیوں نہیں ملتی جو ان کے وجود میں آنے کے لئے ذمہ دار ہوتا ہے اور میں یہ جاننا چاہوں گا کہ ان کے افسانوں کی بھکارن ہمیشہ حسن و جمال کی پیکر کیوں ہوتی ہے؟ میں نے پرتاپ پارک، امیرا کدل اور سنیما کے قرب و جوار میں جو بھکارنیں دیکھی ہیں وہ تو بڑی بدصورت اور جسمانی لحاظ سے عموماً ناکارہ ہوا کرتی ہے۔" یہاں شمیم خود بھی یہ بھول جاتے ہیں کہ بھکارنیں عموماً مسجدوں اور زیارتوں کے آس پاس نظر آتی ہیں، سینماؤں کے نہیں۔ خیر اُن کا اعتراض بالکل صحیح ہے، ایسی بھکارنیں صرف تخیل کی دنیا میں ہو سکتی ہیں، حقیقی دنیا میں نہیں۔ شمیم افسانہ نگار کے لئے حقائق کا احساس ہی نہیں ان کا ادراک اور شعور بھی لازمی سمجھتے ہیں۔ وہ ادب کو صرف تخیلی دنیا کی پیداوار نہیں سمجھتا۔ شمیم ادب میں حقیقت نگاری کا قائل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ترقی پسند تنقیدی نظرئے کو ذہن میں رکھا کر "وادی کے پھول" میں شامل افسانوں کو جانچتا ہے۔ کئی جملے اس بات کے غماز ہیں مثلاً "میں یہ اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں کہ دُنیا کو بتا دوں کہ وادی کے پھول، وادی کے پھول نہیں ہیں بلکہ قنوطی ادیبوں کے تصور پرست ذہنوں کی پیداوار جن کے حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔" ایسے افسانے شمیم کے لئے مایوسی کی دُھند تو پیدا کرتے ہیں لیکن جلد ہی یہ دُھند چھٹنے لگتی ہے جب انہیں کشمیر کے دوسرے حقیقت پسند افسانہ نگاروں کا خیال آتا ہے ہے جیسے تیج بہادر بھان، پُشکر ناتھ، ہری کرشن کول، اُمیش کول، دیپک کول اور بھارتی جو شمیم کے الفاظ میں "حقیقی کشمیر کی ترجمانی کر کے وادی کے پھولوں کی مہک سارے ہندوستان میں پھیلا رہے

ہیں۔" وہ ان فنکاروں کو مشورہ دیتے ہیں کہ "ان تمام فنکاروں کو حامدی کے خام تجربوں سے اور Romantic Idealism سے بچنا چاہیئے۔ ایسا ہی جملہ انہوں نے مضمون کے پہلے حصے میں لکھا تھا۔" حامدی اپنے روحانی تصورات اور نیم پختہ شعور کی دلدل میں پھنس کر آگے بڑھے ۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۵ء تک شمیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایل ایل بی کے طالب علم رہے۔ قانون کی ڈگری تو پوری کی لیکن ایم اے اردو صرف پریوس ہی پاس کیا، فائنل نہ کر سکے اسی دوران سری نگر سے ۱۹۶۴ء میں اُردو زبان میں ہفتہ وار آئینہ جاری کیا۔ صحافت کے ساتھ ساتھ اُن کی ادبی تحریریں اب یا تو اُن کے اپنے اخبار آئینہ میں شائع ہوتی تھیں، یا دوسرے رسائل و جرائد خصوصاً کلچرل اکیڈیمی جموں و کشمیر کے اردو رسالہ "شیرازہ" محکمہ اطلاعات کے جریدہ "تعمیر" میں۔ ان میں سے چند مضامین تنقیدی نوعیت کے تھے۔ اس قسم کے قابل ذکر مضامین میں اہم تنقیدی مضمون مشہور اُردو شاعر فیض احمد فیض کی شاعری پر لکھا گیا تھا۔ اس مضمون کے مطالعہ سے شمیم کے تنقیدی بصیرت پر کافی روشنی پڑتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شعر فہمی، دقیقہ رسی اور قدر سنجی اُن کی گھٹی میں پڑی تھی۔ یہ مضمون اُس زمانے میں لکھا گیا جب فیض راولپنڈی سازش کیس کے ایک معتوب کی حیثیت سے جیل میں سزا بھگت رہے تھے۔ ابھی اُن کی شاعری کے دو ایک مجموعے ہی شائع ہوئے تھے لیکن ان کی شاعری کا ڈنکا پورے برصغیر میں بجنے لگا تھا۔ اُن کی آواز ایک ترقی پسند شاعر کی آواز ہونے کی باوجود ایک مختلف آواز تھی، یہاں فن کی قیمت پر کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں ہوا تھا۔ شمیم نے فیض کے اس وقت تک کے کلام کا تنقیدی جائزہ لیا ہے مجموعی طور پر نہیں، ایک ایک نظم شعر پارہ سے متعلق اظہار خیال کیا ہے۔ لیکن جن معیاروں کے پیش نظر انہوں نے فیض کے کلام پر نظر

ڈائی ہے وہ ترقی پسند تنقید ہی کے معیار ہیں۔ لگتا ہے کہ اُس وقت تک ترقی پسندی کا سکہ ہی چلتا تھا۔ روحانیت کو سماجی حقیقت نگاری کے مقابلے مریضانہ ذہنیت سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ لیکن اب رفتہ رفتہ ایک تبدیلی کی آمد کا احساس جاگنے لگا تھا جس کے عطر بیز ہواؤں کے جھونکے چلنے کی خنکی اس مضمون میں بھی محسوس ہوتی ہے۔ ادیب اور شاعر ترقی پسند تحریک کے حسن و قبح، اس کے آغاز و انجام، کے مثبت اور منفی اثرات پر سوچنے لگے تھے۔ اس سلسلے میں شمیم لکھتے ہیں۔ ''ترقی پسندی کی یہ تحریک بھی چونکہ مغربی اثرات کی رہین منت تھی اس لئے ہمارے یہاں ادیبوں کے ہاں اس کا کوئی واضح تصور نہ تھا۔ نوجوان طبقہ نے ترقی پسندی کی قدروں اور حدود کا تعین کئے بغیر اس تحریک کا خیر مقدم کیا۔ اُن کے ہاں ترقی پسندی کا صحیح مفہوم تمام روایات سے وحشیانہ بغاوت کرنا ٹھہرا۔ موضوع، مواد، ہیئت میں نئے نئے تجربے ہوئے۔ عرصہ سے پابندیوں کے غلام رہنے کے بعد یہ لوگ محسوس کر رہے تھے کہ ان بندشوں کو توڑ دیا جائے، ترقی پسند تحریک ان کے درد کا مداوا بن گئی۔ انہوں نے ترقی پسندی کی آڑ میں فنی دائروں سے تجاوز کیا۔ فن کا احترام والتزام ان کے ہاں ثانوی حیثیت اختیار کر گیا۔ بلکہ بیشتر شعرا کے یہاں فن کا سرے سے کوئی وجود ہی نہ رہا، نتیجہ کے طور پر ترقی پسندی کے سیلاب کے ساتھ جو غلاظت اور قابل اعتراض چیزیں آ گئی تھیں وہ ہمارے ادب کا ایک جزو ہو گئیں۔ فنی بداحتیاطی اور قدیم روایات سے عملاً وقصداً بلا کسی ضرورت کے بغاوت اس دور کے ادب کی دو ممتاز خصوصیات ہیں۔''

اس سیلاب میں تو ہر کہہ ومہہ بہہ گیا، جو بہنا نہیں چاہتا تھا اُسے بھی بہالے گیا لیکن اکادکا ادیب یا شاعر ایسے بھی تھے جو اپنی انفرادیت کو قائم رکھنے میں ثابت

قدم رہے۔ اگرچہ ایسے لوگوں کو ترقی پسندوں نے مجرم گردانا اور اپنی صفوں سے نکال دیا لیکن انہوں نے اس کی پروانہ کی۔ صف اول کے ترقی پسندوں میں شمار کئے جانے کے باوجود فیض احمد فیض جیسے لوگ اپنے فن کی عصمت بچانے میں کامیاب رہے۔ شمیم احمد شمیم کا لکھا ہوا یہ مضمون اُسی دور سے تعلق رکھتا ہے یعنی وہ اپنے ایک ہم عصر شاعر کی شاعری اور اُس کے فن کے بارے میں لکھ رہے تھے، اس لئے اُن کا بیان زمانہ حال سے تعلق رکھتا تھا۔ اُن کے یہ الفاظ مبنی پر صداقت ہیں کہ ''فیض اس خون آشام دور میں بھی حسن وعشق کے گیت گا رہا ہے۔ اس کے ہاں وہی بندشیں، وہی ترکیبیں، وہی موضوع اور وہی فارم ہے جس سے اُن کے ہم عصر ساتھی بغاوت کر رہے ہیں، فیض کی انفرادیت اسلوب بیان کی شگفتگی، اس قدر واضح اور نمایاں ہے کہ اس کے ہمعصر شعراء میں کہیں بھی نہیں مل سکتی۔ اس کا اپنا ایک مقام ہے، اس کے سوچنے، سمجھنے اور کہنے کا ڈھنگ اپنے ہم عصروں سے قطعاً مختلف ہے۔ وہ عملاً روایات کا باغی نہیں۔ خیالات کی پختگی اور فارم کی غنائیت نے اُس کے کلام کو موسیقیت اور شعریت کا مرکب بنا دیا ہے۔'' شمیم اپنی تنقید میں فیض کے کلام کے مختلف پہلوؤں پر بحث لاتے ہیں، اس کے یہاں کس قسم کی رومانیت نے بار پایا، پھر کیسے حقیقت نگاری کی طرف آ گئے۔ وہ اپنے ہم عصروں سے ممتاز اور منفرد کیسے ہوتے گئے۔ اُن کے کلام میں وہ خصوصیات کیسے پیدا ہوئیں جن کی وجہ سے فیض کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ مثلاً جب وہ اُن کی نظم ''انجام'' کو لیتے ہیں تو اشعار کا حوالہ دیکر لکھتے ہیں کہ ''گو یہاں تخیل براؤننگ (انگریزی شاعر) سے لیا گیا ہے مگر مخصوص اور دلکشی طرز بیان اور فنی باریکیوں سے اس میں ایک originality آ گئی ہے۔'' اسی طرح ''انتظار'' نظم سے متعلق لکھتے ہیں کہ ''اس میں شدت

جذبات اور خلوص کے لطف واحساس نے ایک غیر مرئی حسن پیدا کر دیا ہے۔'' شمیم کے خیال میں فیض ''تین منظر'' نظم میں ''محبت کی عظیم اور طویل تاریخ کا احاطہ کیا ہے اور یہ احاطہ ہر لحاظ سے کامیاب اور مکمل ہے۔'' ''آج کی رات'' میں بقول شمیم ''شاعر جذبات سے مغلوب ہو کر زندگی سے فراریت کی حد تک پہنچ چکا ہے۔ زندگی کی تلخیوں سے تنگ آ کر شاعر جذبات کے اُڑن کھٹولے پر ایک ایسی فضا میں پہنچنا چاہتا ہے جہاں وہ تمام افسانے اور الم کو بھول جائے یہاں اس کے لہجے میں ایک نیاز آمیز التجا جھلکتی ہے۔'' شمیم نے جس نظم پر جو بات کی ہے اس کے ثبوت میں اُس نظم سے اشعار کا حوالہ بھی دیا ہے۔ ''موضوع سخن'' نظم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس میں نفسیاتی گہرائی ہے اور اس سے ''شاعر کے بے پایاں ذہنی تجربے کا پتہ چلتا، حسن محبوب کا سیال تصور اور ''دہکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق'' آپس میں متصادم ہو کر شاعر کے لئے ایک اُلجھن پیدا کر دیتی ہے، موضوع کی تلاش میں یہ خود ایک سوال بن جاتا ہے، شہروں کی فراواں مخلوق اور حسین کھیتوں کا جو بن اس کے سامنے کئی سوالیہ نشان بن کر آ جاتے ہیں۔''

شمیم اپنے اس مضمون میں اعتراف کرتا ہے کہ فیض کے ہاں قاتل، رقیب، محبوب اور اسی قسم کی دوسری فرسودہ علامتیں پائی جاتی ہیں، انہوں نے بحروں، قافیوں اور ہیئت سخن میں بھی کوئی قابل ذکر تبدیلی نہیں کی ہے، لیکن انہیں اندیشہ ہے کہ شاید اسی وجہ سے فیض دور حاضر کا سب سے بڑا ترقی پسند شاعر ہے۔ وہ سلجھے ہوئے سماجی شعور کا مالک ہے، اُس کے ہاں فن کا بڑا احترام ملتا ہے، اُس کی تقدیس، سنجیدگی اور شیریں دیوانگی نے اس کے کلام میں عامیانہ پن نہیں آنے دیا ہے۔ اس کے ہاں ہمیں ترقی پسندی کا ایک واضح اور تعمیری تصور ملتا ہے وہ اس میں

قدیم روایات سے بغاوت نہیں کرتا، فیض صحیح معنوں میں ترقی پسند ہے۔ اُس کے یہاں ہمیں طوائف، مزدور اور کسان پر نظمیں نہیں ملتیں۔ وہ اپنی شاعری میں مارکسزم کا پروپیگنڈا نہیں کرتا لیکن سماج کے ناسوروں سے بہتی پیپ سونگھ کر وہ ایک کامیاب سرجن کی طرح ان کو نشتر سے چیرتا ہے۔ فیض پرانا ہوتے ہوئے بھی نیا ہے، بالکل نیا۔''

یہاں بین السطور شمیم کی یہ پریشانی سامنے آتی ہے کہ فیض کو شاید ترقی پسند شاعر نہ سمجھا جائے، اسی لئے بار بار اُن کے ترقی پسند ہونے کا ذکر کیا جاتا ہے کیا شاعر اور ادیب کا مرتبہ جانچنے کے لئے صرف یہی ایک کسوٹی رہ گئی تھی کہ وہ ترقی پسند ہو۔ شمیم کے دو تنقیدی مضامین ایک مرزا غالب پر اور دوسرا فیض پر کا تقابلی مطالعہ اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ اُن دنوں شمیم کے پاس ترقی پسندی سب سے اہم معیار تھا شعر و ادب جانچنے کا، ورنہ کہاں غالب کے کلام پر لکھا ہوا مضمون جو مجموعی طور تنقیصی ہے اور فیض کے کلام پر جو مجموعی طور توصیفی ہی ہے۔

..........☆☆☆..........

مظہر امام

کشمیر کا شہاب ثاقب

شمیم احمد شمیم کے نام سے میری پہلی شناسائی ڈاکٹر شکیل الرحمان کے ایک خط سے ہوئی۔ وہ تازہ تازہ کشمیر آئے تھے اور شاید شمیم ان کے ابتدائی دوستوں میں تھے، شمیم احمد شمیم ان دنوں ''تعمیر'' کے ایڈیٹر تھے اُن سے تھوڑی بہت خط و کتابت ہوئی اور اکتوبر ۱۹۵۷ء کے ''تعمیر'' میں انہوں نے میری ایک غزل شائع کی۔ پھر اس جریدے سے وہ علٰحیدہ ہو گئے اور ایک عرصے تک مجھے اُن کی کوئی خبر نہ مل سکی، میں خود کلکتہ سے کٹک، کٹک سے گوہاٹی اور گوہاٹی سے پٹنہ کی خاک چھانتا رہا۔ شمیم نے ''آئینہ'' کا اجراء کیا اور اس کی دھوم مچی۔ وہ ایک بلند پایہ صحافی کی حیثیت سے سامنے آئے پھر پارلیمنٹ میں اُن کی آواز کی گھن گرج سناتی دیتی رہی۔ پٹنہ میں سہیل عظیم آبادی سے کبھی کبھی اُن کا ذکر آتا۔ حتیٰ کہ میں خود ۱۹۷۵ء کے اواخر میں تبدیل ہو کر سری نگر آ گیا۔

سری نگر میں شمیم احمد شمیم ایک طرح میرے پڑوسی تھے، کیوں کی اُن کے خاندان کے بیشتر افراد اسی طرف رہتے ہیں۔ ''آئینہ'' کا دفتر بھی یہیں ہے۔ شمیم اُن دنوں پارلیمنٹ کے ممبر تھے اس لئے اُن کا مستقل قیام دہلی میں تھا لیکن وہ

پابندی سے وقفے وقفے پر کشمیر آتے رہتے اور اُن کا کافی وقت اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ گذرتا۔ وہ اپنے دوست کمال احمد صدیقی کے یہاں بھی باقاعدگی سے آتے، جو میرے فلیٹ کے نیچے رہتے تھے۔ شمیم احمد شمیم سے جب ملاقات ہوتی وہ کوئی نہ کوئی جملہ ضرور پھینکتے۔ ایسا لگتا تھا کہ اُن کی رگ ظرافت ہر وقت پھڑکتی رہتی ہے، ایسے خوش طبع، زندگی کی مستی سے سرشار شخص کو موت کی لہر بھی چھو سکتی ہے اس کا تصور تک نہیں کیا جاسکتا تھا۔

شمیم احمد شمیم کی تحریروں میں شگفتگی اور حسِ مزاح کے ساتھ ایسی نشتریت اور کاٹ تھی کہ بڑے بڑے سیاسی سورماؤں کے گشتے کے پشتے لگ جاتے تھے، لیکن ان کا کمال یہ تھا کہ وہ صرف زخم لگانے کے فن سے ہی نہیں، رسمِ چارہ سازی سے بھی پوری طرح واقف تھے، میں ان کی تحریروں کے لئے ہمیشہ چشم براہ رہتا۔ شمیم احمد شمیم کو بے باک صحافی اور شعلہ بیان مقرر کہا گیا ہے۔ اس باب میں ان کی شگفتہ اور دل نشین نثر کا قائل رہا ہوں۔ اردو میں لکھنے والے بہت ہیں۔ لیکن اردو دیکھنے والے بہت کم ہیں۔ میں شمیم احمد شمیم کو اسی اقلیت میں شمار کرتا رہا ہوں، شاعری کی طرح نثر بھی الفاظ ہی کی بازی گری ہے جس پر حرف و لفظ کے اسرار و رموز منکشف نہ ہوئے ہوں وہ نہ اچھی شاعری کر سکتا ہے اور نہ اچھی نثر کہہ سکتا ہے۔ شمیم احمد شمیم الفاظ کے مزاج دان تھے۔ لفظوں کے دھنک سے خیالات اور جذبات کی تصویریں بنانا شمیم احمد شمیم کا مخصوص فن تھا، ایسے دور میں جب اردو زبان دانی کا معیار روز بہ روز گرتا رہتا ہے اُن کی تحریریں پڑھ کر مجھے یک گونہ مسرت ہوتی تھی اور اردو زبان کے مستقبل کی بابت حوصلہ ملتا تھا۔

''آئینہ'' اُن کی توجہ کا خصوصی مرکز تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ شمیم احمد شمیم کا دوسرا

نام ''آئینہ'' بھی رہا ہے شاید اس لئے کہ آئینہ کا کام سچ بولنا ہے اور شمیم کسی لاگ لپٹ کے بغیر وہ سب برملا کہتے تھے جسے وہ اپنے خیال میں سچ سمجھتے تھے۔

شمیم احمد شمیم شہاب ثاقب کی طرح کشمیر کے افق پر چمکے اور دیکھتے دیکھتے ان خلاؤں کی جانب سفر کر گئے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا لیکن انہوں نے اپنی مختصر عمر میں جو کارنامے انجام دیے ہیں وہ انہیں زندہ جاوید بنانے کے لئے کافی ہے ادب، صحافت، سیاست ...... ان کے فکر و عمل کی جولاں گاہ اتنی وسیع تھی کہ اُن سب کا احاطہ کرنا خود اُن کے لئے دشوار ہوگیا۔ ایک قلم کار، ایک سیاستدان، ایک دانشور، ایک عاشق، ایک دوست۔ اُن کے کتنے رُوپ تھے اور ہر رُوپ اپنی رعنائی، دلنوازی اور سحر آفرینی کا شاہد تھا۔

......☆☆☆............

معراج الدین

تجھ سا کہاں سے لاؤں!

سرزمین کشمیر کو اس بات پر ہمیشہ فخر رہا ہے کہ یہاں مقتدر ادباء، شعراء، فلسفیوں، مورخین اور قلمکاروں نے جنم لیا ہے، جنہوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے نہ صرف وادیٔ کشمیر کا نام روشن کیا بلکہ قومی سطح پر بھی کار ہائے نمایاں انجام دیئے۔ کسی بھی شخصیت کو پروان چڑھانے میں جو عناصر کارفرما ہوتے ہیں ان میں خاندان، تعلیم اور ماحول ایک اہم رول ادا کرتا ہے۔ کیونکہ ہر شخصیت کی خمیر میں خاندانی اثرات بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

ان ہی شخصیات میں مایہ ناز ادیب، مقبول اور معروف صحافی، سیاست دان، شعلہ بیان مقرر جناب شمیم احمد شمیم قابل ذکر ہیں۔ اللہ نے انہیں بے پناہ صلاحیتیں عطا کیں تھیں، جن میں ان کی بذلہ سنجی اور حاضر جوابی قابل ذکر ہیں۔

میں فتح کدل قلمدان پورہ کے محلے میں رہتا تھا۔ ہمارا گھر مولوی عبداللہ وکیل کے گھر سے قریباً پندرہ مکان دور تھا اور اس محلّہ کو ''کاچگری مسجد'' کہا جاتا ہے۔ گھر میں جگہ کی تنگی کی وجہ سے ہم لوگ نئے گھر کی تلاش میں تھے کہ اسی اثناء میں ہم نے مولوی محمد عبداللہ کا مکان خرید لیا۔ اسی مکان کے مدمقابل ایم۔اے

صابر کا مکان بھی تھا، جو مولوی عبداللہ کا فرزند تھا۔ جب ہم نئے مکان میں رہنے لگے، تو صابر صاحب کے مکان میں چند نوجوان سرینگر میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے مقیم تھے، ان میں شمیم احمد شمیم اور ڈاکٹر غلام محی الدین، جو گوگجہ پتھری کے رہنے والے تھے اور آجکل امریکہ میں رہائش پذیر ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد اس مکان میں شمیم صاحب کے باقی افراد خانہ رہائش پذیر ہوئے، جن میں شمیم صاحب کی والدہ ماجدہ اور ہمشیرہ شامل تھیں۔ میں اس وقت چھٹی جماعت کا طالب علم تھا اور ایم۔ پی ہائی سکول باغ دلاور خان میں داخلہ لیا تھا۔ اسی دوران دونوں گھرانوں میں تعارف ہوا اور آپسی تال میل سے نزدیکی تعلقات قائم ہوئے۔ آپسی رشتہ استوار کرنے کے لئے ہم نے دیوار کا ایک حصہ بھی منہدم کر دیا، جس سے دونوں گھرانوں میں ایسی چھل پہل ہوئی کہ جیسے ایک ہی گھر کے افراد خانہ ہوں، اس طرح کا رشتہ آج دو بھائیوں میں بھی مفقود ہوتا ہے۔ بظاہر ہم ایک دوسرے سے بہت دور ہو گئے مگر آج بھی ہمارے گھروں میں اس خلوص و محبت بھرے رشتے کے تبصرے ہوتے ہیں۔

اُس زمانے میں، میں ایم پی سکول میں چھٹی جماعت کا طالب علم تھا اور شمیم صاحب مجھ کو گھر پر پڑھانے آتے تھے جب بھی سکول میں بحث و مباحثہ ہوتا تو شمیم صاحب مجھے اس کے لئے تیار کرتے، تو میں محفلوں میں شرکت کرنے کے لائق بنتا۔ بات یہی تک محدود نہیں تھی بلکہ اس دور میں جو بھی ثقافتی سرگرمیاں ہوتیں تھیں، شمیم صاحب ان میں شرکت کرنے کی غرض سے اجازت نامہ بھی لاتے تھے۔ چاہے وہ آل انڈیا مشاعرہ ہو یا فلمی اداکاروں کے پروگرام۔ ان دنوں نیڈوز ہوٹل میں ''یمبرزل'' ڈراما کھیلا گیا، جس کو مجھے دیکھنے کا موقعہ نصیب ہوا۔ ہمارے اسکول

میں ٹیچرس ڈے پر ایک ڈراما 'حبہ خاتون'' کھیلا گیا۔ جس میں میں نے یوسف شاہ چک کا کردار ادا کیا اور بنسی کول، جو آجکل ٹی، وی سینٹر میں کام کرتا ہے نے حبہ خاتون کا کردار نبھایا۔ پنڈت شیام لال صراف اس خاص موقعہ پر مہمان خصوصی تھے اور ہم نے ڈراما پیش کیا۔ وہ بہت ہی محظوظ ہوئے اور انعامات کا اعلان کر دیا، جس میں مجھے اور بنسی کول کو تیس تیس روپے اور سکول کلب کے لئے پانچ سو روپے دینے کا اعلان کیا گیا۔ ۲۹/مارچ سکول کا چپراسی مجھے یہ پیغام دے گیا کہ سکول کے پرنسپل صاحب نے یاد فرمایا ہے۔ جوں ہی میں نے پرنسپل صاحب کی خدمت میں حاضری دی، تو انہوں نے مجھے کہا کہ تمہارا انعام اور اسکول ڈرامیٹک کلب کا انعام سرکار نے واگذار کر دیا ہے، لیکن یہ رقم کل تک سرکاری خزانہ سے نکالنی مقصود ہے، اگر تمہارے پاس کوئی سفارش ہے تو ہم کلرک کو خزانہ عامرہ پر بھیج دیں گے، جو تم کو وہیں پر ملے گا۔ جب میں نے گھر پہنچ کر رات کو شمیم صاحب سے یہ معاملہ اُٹھایا تو انہوں نے یقین دلایا کہ وہ یہ کام صبح کو کرنے کی کوشش کرینگے۔ صبح انہوں نے مجھے سائیکل پر اپنے ساتھ لیا، ہم اولڈ سکریٹریٹ پہنچ گئے جہاں ان دنوں اکونٹنٹ جنرل کا دفتر ہوا کرتا تھا، پھر وہ ڈپٹی اکونٹنٹ جنرل جناب علی محمد لنکر صاحب کے کمرے میں گئے۔ لنکر صاحب نے دفتر کا ایک چپراسی میرے ہم راہ روانہ کر دیا، وہاں سکول کا متعلقہ کلرک پہلے ہی پہنچ گیا تھا۔ اس طرح ہم نے انعامات کی رقم خزانہ عامرہ سے نکال لی۔

میں نے میٹرک پاس کرنے کے بعد ایس، پی کالج میں ایف۔ اے میں داخلہ لیا تھا۔ مجھے گھر والوں نے کالج جانے کے لئے Blue Star بائیسکل لائی تھی۔ ایک دن میرے چھوٹے بھائی نے اجازت کے بغیر سائیکل نکال لے لی۔

جب وہ واپس آیا تو میں نے غصہ میں اس کو زور سے لات ماردی تو وہ بے ہوش ہو گیا اور اس کو ہسپتال پہنچایا گیا۔ والد صاحب نے مجھے اس حرکت پر بہت ڈانٹا، جس کی مجھے عادت نہیں تھی بلکہ مجھے بے عزتی کا احساس ہوا۔ میں سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا اور کپڑے اور کتابیں بغل میں دابے گھر کے پچھواڑے سے بھاگ گیا۔ اب میں کالج سے سیدھا چشمہ شاہی چلا جاتا اور ہاوس بوٹ میں قیام کرنے لگا۔ اسی دوران گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں تو میں اپنے دوست کے ساتھ پہلگام چلا گیا۔ چھٹیاں ختم ہوتے ہی میں کالج جانے لگا، تو اچانک واپسی پر شمیم صاحب سے ریذیڈنسی روڈ پر ملاقات ہوئی۔ انہوں نے مجھے چائے پلانے کی غرض سے گرینڈ ہوٹل کا رخ کیا، جہاں چائے کے علاوہ کباب اور شامی کباب سے خاطر تواضع کی۔ بیرا (ویٹر) نے کچھ اور لانے کے لئے کہا تو شمیم صاحب نے اس کو بھنا ہوا گوشت لانے کے لئے کہا کہ کیا پتہ برخوردار کتنے دنوں سے فاقہ مست گھوم رہے ہیں۔

میرے بڑے بھائی صاحب کی آنکھوں میں سخت تکلیف تھی اور شمیم صاحب سے ڈاکٹر صاحب سے صلاح ومشورہ کرنے اور دوا لانے کے لئے تگ ودو کرنے میں مصروف ہو گئے اور اُن کی والدہ محترمہ تیمارداری میں مشغول ہو گئیں۔

جن دِنوں میری شادی تھی شمیم صاحب ممبر پارلیمنٹ تھے اور رات کو اُن کو گاڑی چلانے میں دِقت محسوس ہوتی تھی۔ پھر بھی وہ برات کے ساتھ ترال آ گئے۔

میں نے خود شمیم صاحب کو ریاستی اسمبلی اور پارلیمنٹ میں تقریر کرتے سُنا۔ جب وہ بولنے کے لئے اٹھتے تو سب ممبران اُن کی تقریر ہمہ تن وگوش ہو کر سنتے، تو اکثر ممبران ششدر رہ جاتے۔

شمیم صاحب اور صوفی غلام محمد نے اپنے اپنے اخباروں میں ایک دوسرے

کے لئے معرکہ کھولا تھا جس میں دونوں ایک دوسرے کے خلاف لکھتے۔ ایک دِن میں اور شمیم صاحب بنڈ پر چہل قدمی کر رہے تھے تو میں نے بات چھیڑتے ہوئے کہا آپ اور صوفی صاحب دانشور ہیں تو یہ اچھا نہیں لگتا کہ آپ ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوں۔ آپ جیسے لوگ قوم کی رہبری کرتے ہیں اگر آپ مناسب جانیں میں آپ کو اور صوفی صاحب کے لئے گھر پر دعوت کا اہتمام کروں تا کہ آپ دونوں کے بیچ جو کدورت ہے وہ دُور ہو جائے بات کاٹتے ہوئے اُنہوں نے کہا ”اس کی کوئی ضرورت نہیں۔“

ایک دِن میں عدالت کے باہر سے گذر رہا تھا کہ پیچھے سے گاڑی کی ہارن سُنی۔ جونہی میں نے نظر گھمائی تو شمیم صاحب کی گاڑی تھی۔ اُنہوں نے کہا چلو گاڑی میں چڑھو ہم اس کی ہمشیرہ کی عیادت کے لئے اسپتال چلے آئے ہیں۔ راستے میں میں نے اُن کی توجہ اُس بیان کی طرف مبذول کی جو انہوں نے پارلیمنٹ میں بنگلہ دیش پاکستان کے علاحدہ ہونے پر کی تھی۔ اس تقریر سے عام کشمیریوں کے دِل رنجیدہ ہو گئے تھے ہر جگہ اِس موضوع پر چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ اکثر وبیشتر شمیم صاحب کے خلاف زہر اُگل رہے تھے جو میری برداشت سے باہر تھا۔ جب میں نے اُن کو اِس طرف توجہ دِلائی کہ کل آپ کو پھر لوگوں کے سامنے ووٹ مانگنے جانا ہے تو در جواب اُنہوں نے کہا لوگ کون ہوتے ہیں مجھے شیر کشمیر کا آشرواد ہونا چاہیئے۔ اُن کی اس بات میں عوامی سوچ کے خلاف ایک ایسا طنز تھا، جس میں زہر کی کاٹ تھی۔

شمیم صاحب مطمئن تھے کہ اُن کو نیشنل کانفرنس کی طرف سے سرینگر پارلیمانی حلقہ کے لئے منڈیٹ ملے گا لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا اور منڈیٹ

بیگم شیخ محمد عبداللہ کے حق میں دیا گیا۔ یہ بات شمیم صاحب کی طبیعت کو ناگوار گذری۔ اِس بارے میں شیر کشمیر کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ جمہوریت میں آزادی رائے کی بہت اہمیت ہے۔

اگر چہ شیر کشمیر کی ذاتی خواہش شمیم صاحب کے حق میں تھی مگر ووٹ ڈالنے کے وقت سوائے شیخ صاحب کے سارے ووٹ شمیم صاحب کے خلاف پڑ گئے۔ اس طرح شیر کشمیر اور شمیم صاحب کے درمیان ایک خلیج پیدا ہوگئی۔ یہ ایک دوسرے کے قریب ہونے کے باوجود دور ہوتے گئے۔

بیگم عبداللہ نے منڈیٹ حاصل کرنے کے بعد پہلا اجلاس شیر کشمیر پارک میں کیا تو میں بھی ان کی تقریر سننے کے لئے وہاں پہنچ گیا۔ ابھی تقریر ہو رہی تھی کہ میں نے واپسی کی راہ لی۔ تو میں حیران رہ گیا کہ شمیم صاحب نفس نفیس پارک کے ایک کونے سے بیگم صاحبہ کی تقریر سُن رہے ہیں۔ سلام ودعا کے بعد میں نے ان کو کہا کہ آپ نے جلد بازی سے کام لیا۔ اگر میری بات مان لیں تو سیاسی نظریات ایک طرف رکھیں۔ آپ بیگم صاحبہ کے حق میں رائے عامہ ہموار کریں کیونکہ جب آپ نے بخشی غلام محمد کے خلاف الیکشن لڑا، تو اُس وقت بیگم صاحبہ آپ کے لئے لوگوں کے سامنے ووٹ مانگنے کے لئے دامن پھیلایا۔ میری بات کو سنی اَن سنی کرتے ہوئے بولے چلو مجھے آئیس کریم کھلاؤ۔ ہم نے احدوز ہوٹل کا رُخ کیا اور آئیس کریم کھائی۔

شمیم صاحب کے علاقے مانلو شوپیاں کے ایک طالب علم کا ڈیرا ہمارے گھر میں تھا۔ یہ طالب علم ایس پی کالج میں زیر تعلیم تھا۔ ایک دِن اُس نے مجھے اور میرے بھائی کو مانلو (شوپیاں) آنے کی دعوت دی تو گھر والوں کی اجازت سے ہم

نے کے، ایم ، ڈی بس اڈے کا رُخ کیا۔ جونہی ہم مانلو جانے والی بس میں سوار ہوگئے تو بس میں صرف دو سیٹیں تھیں۔ تو میں نے اُن سے کہا کہ تم اِس بس میں سفر کرو، میں سرکاری بس میں آجاؤں گا۔ میری بس شوپیان پہنچ گئی تو وہ طالب علم اور میرا بڑا بھائی مانلو روانہ ہو چکے تھے میں حیران و پریشان سوچ رہا تھا کہ اب کیا کردں لیکن میری نظر شمیم صاحب اور غلام رسول نازکی صاحب پر پڑی۔ دونوں شوپیاں میں سڑک پر چہل قدمی فرما رہے تھے، تو میری جان میں جان آگئی۔ جونہی شمیم صاحب نے مجھے دیکھا تو انکو حیرت تھی کہ میں یہاں کیسے پہنچ گیا۔ انہوں نے کہا کہ راستہ کھٹن ہے اور جنگل کے بیچوں بیچ گزرنا ہے۔ اس لئے تم میرے ساتھ چلو۔ جب میں اِن کے ہمراہ چلا تو وہ مرحوم عبدالرزاق ٹینگ صاحب کے گھر روانہ ہوئے۔ اس دن ٹینگ صاحب کی دختر کی شادی تھی۔ وہاں شہر سے ہی بہت مہمان آئے تھے۔ کچھ مہمان خاص کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جس میں ہم لوگ بھی داخل ہوگئے۔ اس کمرے میں ایک نفاست پسند اور خوش پسند آدمی قراقلی پہنے بیٹھا تھا جس کے متعلق مجھے بعد میں پتہ چلا کہ یہ غلام محمد راجپوری ہے۔ باتوں باتوں میں شمیم صاحب نے مزاحیہ انداز میں کہا کہ شہر کے لوگ بن بلائے مہمان ہوتے ہیں۔ مجھے لگا شمیم صاحب میری طرف اشارہ کررہے ہیں۔

ایک دِن ہمارے یہاں مچھلیاں پکی تھیں۔ ہم سب بہت خوش تھے کہ آج رات ہمیں پکی ہوئی مچھلی ملے گی۔ اسی اثناء میں شمیم صاحب کے یہاں سہیل عظیم آبادی اور کمال احمد صدیقی مہمان بن کر آئے تھے۔ اس لئے خاطر تواضع کرنے کے لئے کچھ میسر نہ تھا۔ شمیم صاحب سیدھے ہمارے گھر آئے اور والدہ صاحبہ سے جو کچھ گھر میں پکا ہوا ہے مانگ لیا۔ والدہ نے پکی ہوئی سب مچھلیاں شمیم صاحب

کو دے دیں۔ جب ہم رات کو کھانا کھانے کا وقت آیا تو ہم نے احتجاج کیا کہ ہمیں مچھلی نہیں ملی لیکن دوسرے دِن شمیم صاحب ایک آئیس کیک لائے جو ہم سبوں نے مزے لے لے کر کھایا۔ (کشمیری سے ترجمہ: سلیم سالک)

☆☆☆

ابھی ابھی ریڈیو سے یہ دردناک خبر سنی کہ کشمیر کا مایہ ناز سپوت شمیم احمد شمیم اب ہمارے بیچ نہیں رہا، آج کا دن ایک سیاہ دن ہے۔ کشمیری نوجوان پود ایک بہادر اور نڈر رہنما سے محروم ہوگئی۔ میں شمیم صاحب کو ۵۵ء سے جانتا تھا جب کہ کشمیر کے طلباء نے شمیم صاحب کی قیادت میں مفت تعلیم کیلئے ایجی ٹیشن شروع کی تھی۔ سارے کالجوں اور سارے سکولوں کے طالب علموں کی رہنمائی کرتے ہوئے اور نعرے لگاتے ہوئے "ہوگئی تعلیم مہنگی۔یہ نیا کشمیر ہے"۔

شمیم صاحب نے عوام کے دلوں میں ایک جگہ بنائی تھی اور آنے والے وقت کی ایک پیشن گوئی کی تھی۔ یہ بہت دکھ کی بات ہے کہ یہ بہادر سپوت جوانی کے عالم میں ہم سب سے بچھڑ گیا۔ سیاسی اور سماجی زندگی میں ایک خلا چھوڑ گیا۔ بھگوان جانے کس کی نظر لگ گئی، یہ مرنے والا نوجوان نہیں تھا۔ مرتا وہ ہے جس کا دل مر چکا ہو، شمیم کی رگ رگ میں انقلاب کی چنگاریاں بھری ہوئی تھیں۔ میں کسی دوست کی وساطت سے شمیم صاحب کی بیماری کی خبر سنتا رہا لیکن میں جان بوجھ کر مزاج پرسی کے لئے نہیں گیا۔ اپنے والد بھی اس بیماری کا شکار ہوئے، سات مہینے پہلے ہم کو اناتھ بنا کر چھوڑ گئے، ہمت ہی نہیں ہوئی کہ شمیم صاحب کو بیماری کی شدت میں دیکھ لوں آج میرا دل پھر مر گیا، ڈاکٹر شنکر رینہ پھر شہید ہوگیا نوجوانوں کے سپنے شہید ہوگئے جواب بچ گیا، بھگوان اُسے بچنے دے شمیم کے ارمانوں کی خاطر۔

منوہر لال پنڈت

سٹیشن ڈائریکٹر آل انڈیا ریڈیو۔ متھرا...... یوپی

☆☆☆

منظور انجم

شمیم احمد شمیم کو دریافت کرنا ہوگا

بیسویں صدی نے کشمیر کو بہت سے زخم دیئے اور کئی سوغاتیں بھی دیں۔ گزری ہوئی وہ پُر آشوب صدی جس نے دنیا کو دوسری جنگ عظیم کا سانحہ دیا ریاست جموں وکشمیر کے لئے غیر معمولی تغیرات اور اتھل پتھل کی صدی ثابت ہوئی۔ ایک طرف سیاسی بیداری کی لہر نے صدیوں کی غلامی کا طوق توڑ کے رکھ دیا تو دوسری طرف ریاست دو حصوں میں تقسیم ہوئی اور مسئلہ کشمیر کا ناسور پیدا ہوا۔ حالات کے ان طوفانوں کے درمیان زندگی کے ہر شعبے میں بڑی اور عظیم شخصیات نے جنم لیا۔ سیاسی دنیا میں بھی کئی تاریخ ساز شخصیات نے جنم لیا۔ ادبی میدان میں بھی بہت نام شہرت کی بلندیوں کو چھو گئے اور صحافت کی دنیا میں بھی کئی شخصیتوں نے اپنی عظمت کا لوہا منوایا۔ شمیم احمد شمیم ان میں سب سے نمایاں اور منفرد نام ہے، جس کی شہرت کشمیر کی سرحدوں تک ہی محدود نہ رہ سکی بلکہ منہ زور ہوا کی طرح بلند و بالا پہاڑوں کو چیرتی ہوئی برصغیر سے بھی بہت آگے نکل گئی۔ شمیم احمد شمیم کشمیر کو بیسویں صدی کا وہ تحفہ تھا جسے سیاست، صحافت اور خطابت کے بے پناہ کمالات کی

وجہ سے ریاست کی تاریخ ہمیشہ یادرکھے گی۔ وہ لوگ ابھی زندہ ہیں جنہوں نے شمیم احمد شمیم کو خود دیکھا' سنا اور پڑھا ہے اور اُس کی آواز کا وہ سحر' اُس کی اداؤں کا وہ جارحانہ پن اور اس کے لفظوں کی جادوگری کا خمار ابھی بھی ان پر طاری ہے۔ وہ جواں دلوں میں ولولے بھرتا تھا لیکن اس طرح نہیں کہ توڑ پھوڑ اور مارا ماری ان کا مقصد بن کر رہ جائے۔ وہ سوچنے اور سمجھنے پر مجبور کرتا تھا مگر اپنے فیصلے نہیں ٹھونستا تھا۔ اس کے اپنے کوئی منصوبے نہیں تھے اور نہ اس کے پیچھے کوئی منصوبہ ساز کھڑا تھا۔ وہ آزاد ہواؤں کا پنچھی تھا۔ نہ ہندوستان کا غلام تھا نہ پاکستان کا دُم چھلا تھا۔ نہ وہ نیشنل کانفرنسی تھا نہ کانگریسی، وہ ان سب سے بڑا تھا۔ اس لئے آج اس کی برسی کسی اہتمام کے ساتھ نہیں منائی جاتی۔ صرف اس کے چاہنے والے، اس کے دوست، اس کے رفیق اور اس کی بہنیں اس کا نام زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ یہ اس لئے ہے کہ یہ دور ہی بڑے اور عظیم لوگوں کا قدرداں نہیں۔ اس دور کی تقدیر میں جہالت، تنگ نظری، نفرت، عداوت اور حرص وہوس کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس لئے یہ دور اِن ہی لوگوں کی پذیرائی کرتا ہے اور ان ہی لوگوں کو یاد کرتا ہے جو زندگی کو انتشار کے سوا کچھ نہیں دے سکتے۔ شمیم احمد شمیم کوئی مکمل وجود نہیں تھا، اس میں بھی بہت ساری خامیاں تھیں۔ اس نے بھی بہت ساری غلطیاں کیں، اس کی ہر ایک بات درست نہیں تھی، وہ غلط باتیں بھی کرتا تھا لیکن وہ ان لوگوں میں سے تھا جو خود کو تقدس کی انتہاؤں پر لے جا کر حرف آخر نہیں بناتے ہیں۔ اسے نہ عالم ہونے کا دعویٰ تھا، نہ مقدس ہستی ہونے کا۔ شمیم میں بھی بے قراری تھی ٹھہراؤ نہیں تھا۔ شاید حقیقی دانشور ایسا ہی ہوتا ہے۔ سچا عالم بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہ روایتوں اور رسموں کا قیدی بن کر نہیں رہ سکتا۔ انسان ہی کی طرح جیتا تھا۔ وہ اُٹھتا تھا، گرتا تھا، سنبھلتا تھا،

کامیاب ہوتا تھا، ناکام ہوتا تھا ان سب چیزوں کی اسے کوئی پرواہ نہیں تھی اسے صرف سرگرم عمل رہنے اور اپنی مرضی سے جینے کی خواہش تھی۔ حالانکہ وہ اپنے آپ کو ایک ایسی پوزیشن پر لے جاچکا تھا جہاں قیام کر کے اور وفا کی رسمیں نبھا کے وہ خود کو ایسا بت ضرور بنا سکتا تھا۔ شمیم احمد شمیم پہلے دانشور تھا، اس کے بعد سیاست دان تھا اور پھر صحافی تھا۔ اسکی دانش نے اسے کامیاب سیاست دان بننے نہیں دیا اور اس کی سیاست نے اسے کامیابی کے عام معنوں میں کامیاب صحافی بننے نہیں دیا۔ اس کے وجود کے اندر کئی بلندیوں کا ٹکراؤ تھا جو اسے توڑتا پھوڑتا رہتا تھا لیکن اس جنگ میں زیادہ تر دانشور ہی فتح یاب ہوتا تھا اور اسی کی بالادستی اکثر قائم رہتی تھی۔

میں نے بہت سے موضوعات پر شمیم کی بہت ساری تقریریں سنیں اور بہت سارے موضوعات پر اس کی تحریریں پڑھی ہیں اور یہ دعویٰ کرکے میں کوئی غلطی نہیں کر رہا ہوں کہ وہ ایک ایسا دانشور تھا جو ہر موضوع کے ایسے پہلو دریافت کرنے کی قدرت رکھتا تھا جو اس سے پہلے کسی کی نگاہ تک نہ پہنچ پاتے۔ اقبال سے متعلق ان کی تقریروں کو اگر کتابی صورت مل گئی ہوتی تو اقبال اور اقبالیات کا مستند آئینہ ہوتی۔

میں شمیم احمد شمیم کے بہت قریب نہیں رہا ہوں لیکن اس کی ذات سے مجھے بڑی دلچسپی رہی ہے جو آئینہ کی تحریروں سے شروع ہوئی اور یہ تحریریں میں نے اس وقت پڑھیں جب میں بالغ نہیں تھا۔ انہی دنوں معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ شوپیان میں پیدا ہونے والا شمیم احمد شمیم گریجویشن کرنے کے بعد سرکاری ملازم ہو گیا تھا اور محکمہ اطلاعات کے ماہنامہ "تعمیر" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے اُس وقت کے وزیر اعظم بخشی غلام محمد کے قرابت داروں میں بھی شامل ہوا تھا لیکن ایک روز

اچانک نوکری چھوڑ کر علی گڑھ پہنچا اور قانون کی ڈگری لے کر واپس لوٹا لیکن وہ عدالت میں نہیں گیا، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے دفتر پر اخبار کے اجراء کی درخواست لے کر گیا۔ اس طرح کشمیر کی تاریخ کا پہلا مقبول ترین اور اثر انگیز اخبار" آئینہ" وجود میں آیا۔ میں ان دنوں سکول میں پڑھتا تھا۔ ادب سے میرا بالکل کوئی تعلق نہیں تھا۔ زبان میں ابھی سیکھ رہا تھا۔ سیاست اور صحافت کی بالکل کوئی سمجھ نہیں تھی۔ اتفاقاً آئینہ میرے ہاتھ لگ گیا۔ حادثتاً میں نے پڑھنے کی کوشش کی اور میں آج تک یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ مجھے اس کی تحریروں سے ایسا عشق کیوں ہوا کہ باپ کی جیب سے پیسے چرا کر ہر ہفتے باقاعدگی سے زینہ کدل جاتا تھا اور آئینہ خرید کر لاتا تھا۔ اس "بے راہ روی" نے مجھے الفاظ کے استعمال کا سلیقہ بھی دیا اور میری سیاسی معلومات میں بھی اضافہ کیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ خواجہ غلام محمد صادق ایک شریف اور وضع دار کمیونسٹ ہے جو ریاست کا وزیر اعلیٰ ہے، اس نے یہ کرسی بخشی غلام محمد سے چھین لی ہے۔ آئینہ کے تحریری سٹائل اور شعور نے مجھے ہی نہیں میری پوری نسل کو بہت گہرائی تک متاثر کیا۔ میں خود اس بات کا گواہ ہوں کہ قدیم شہر میں بہت سے اَن پڑھ دکاندار بھی آئینہ خریدتے تھے اور دوسروں سے پڑھا کر محظوظ ہوتے تھے۔ حالانکہ آئینہ کا بیان ان کے عقیدوں اور جذبوں کو بہت ٹھیس پہنچاتا تھا مگر کہیں نہ کہیں وہ انہیں تسکین بھی دیتا تھا۔ اس لئے وہ اسے پڑھا سنا کرتے تھے۔

آئینہ شہرت کی بلندیوں کو چھو رہا تھا کہ ایک روز یہ اعلان ہوا کہ شمیم احمد شمیم حلقہ انتخاب سرینگر سے سابق وزیر اعظم بخشی غلام محمد کے خلاف آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخاب لڑ رہا ہے اور شیخ محمد عبداللہ اس کی حمایت کر رہے ہیں۔ یہ کشمیر کی تاریخ کے ایک نئے باب کا آغاز تھا۔ کہا جاتا ہے کہ شمیم احمد شمیم نے خود جیل میں شیخ

صاحب سے ملاقات کر کے انہیں قائل کیا تھا کہ بخشی غلام محمد کو سیاسی طور نابود کرنا شیخ صاحب اور ان کے سیاسی مقاصد کے لئے ہی نہیں بلکہ کشمیر کے لئے ضروری ہے۔ چنانچہ شیخ صاحب نے شمیم احمد شمیم کو ہی مولانا محمد سعید مسعودی کے پاس روانہ کیا تھا کہ اسے بحیثیت اُمیدوار بخشی غلام محمد کے مد مقابل کھڑا ہونے پر آمادہ کیا جائے لیکن مولانا نے انکار کر دیا، اس کے بعد جو دوسرے نام زیر بحث آئے وہ بھی انتخاب لڑنے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ بخشی غلام محمد اور ان کی نیشنل کانفرنس کا حکومت چھن جانے کے بعد بھی کشمیر میں زبردست دبدبہ تھا۔ یہ وجہ تھی یا دیگر اندیشے اور مصلحتیں بخشی غلام محمد کا مقابلہ کرنے کے لئے کوئی تیار نہیں تھا۔ شیخ صاحب مایوس ہوئے تو شمیم احمد شمیم نے اپنا نام پیش کر دیا۔ خانیار پبلک پارک میں محاذ رائے شماری کا جلسہ عام ہوا۔ بیگم شیخ محمد عبداللہ نے شمیم احمد شمیم کا ہاتھ کھڑا کر کے انہیں شیخ صاحب کا امیدوار قرار دیا۔ یہ لمحہ کشمیر کی تاریخ کا ایک نیا موڑ تھا کیونکہ یہاں سے ہی محاذ رائے شماری کی بائیکاٹ سیاست کے خاتمے کا آغاز ہوا۔ شمیم احمد شمیم اس بات کے قائل پہلے ہی سے تھے کہ بائیکاٹ سیاست کشمیر کے لئے خودکشی کی سیاست ہے کیونکہ اس کی آڑ میں نااہل اور بد عمل قضا و قدر کے مالک ہو جاتے ہیں زندگی کے ہر شعبے پر جمود چھا جاتا ہے، وسائل کا استحصال ہوتا ہے اور ترقی کا عمل رک جاتا ہے۔ اس لئے انہوں نے اس سیاست کو بدلنے میں اہم کردار ادا کیا لیکن ان کی کبھی یہ خواہش نہیں تھی کہ شیخ صاحب اپنے سیاسی قد و قامت کی بلندی سے اس حد تک نیچے اتر آئیں کہ کشمیری شکست اور ہزیمت کے احساس سے ٹوٹ جائیں۔ شیخ صاحب کو بدلنے اور پھر سنبھالنے کے لئے انہوں نے کیا کیا، اس پر کچھ نہیں لکھا گیا ہے حالانکہ یہ شمیم صاحب کی زندگی کا بہت اہم پہلو ہے جس پر

ایک پوری کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ان کا سیاسی کردار ان کے ادبی اور صحافتی کردار سے بھی بڑا ہے جو آج تک نظر انداز ہوا ہے۔ان پر لکھنے والوں نے ان کے سیاسی کردار کو پارلیمنٹ میں ان کے زور خطابت تک محدود کردیا ہے جبکہ وہ تاریخ کا دھارا بدلنے والے کئی معاملات میں تخلیق کار کی حیثیت رکھتے ہیں۔شمیم نے کئی سیاسی روایتوں کو بدل دیا اور سوچ کی سرحدیں تبدیل کردیں۔ہم نے ابھی شمیم پر کوئی تحقیق نہیں کی ہے اس لئے ہم شمیم کی اصلیت اور حقیقت کو آج تک پہچان نہیں پائے ہیں۔سرسری مطالعے سے ہم نے جس شمیم کو پایا ہے اصل شمیم اس سے کہیں بڑھ کر ہے اس لئے ہمیں اصل شمیم کو دریافت کرنا پڑے گا۔اصل شمیم کو دریافت کرکے ہم اپنی کچھ کھوئی ہوئی متاع بھی پاسکتے ہیں۔

☆☆☆

میر غلام رسول ناز کی

سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں

ایک ذہین اور فطین انسان کا دماغ ہمیشہ کھوج میں رہتا ہے، وہ رعایت پسند نہیں ہوتا، بلکہ خود تحقیق کرنے کے بعد اصول اور عقائد وضع کرتا ہے۔اس تلاش و جستجو میں اُسے مختلف مراحل اور منازل سے گذرنا پڑتا ہے وہ تشکیک کی وادیوں میں سرگرداں ہوجاتا ہے اور مسلسل تلاش کے بعد آخر کار ایک وقت ایسا بھی آجاتا ہے جب وہ اپنی تحقیق پر مطمئن ہوکر بیٹھ جاتا ہے۔اس اطمینان کے دو پہلو ہوتے ہیں، مثبت اور منفی۔اکثر لوگ منفی پہلو کو اختیار کرجاتے ہیں اور اپنی ذہانت اور فطانت کے باوجود راہ سے بھٹک جاتے ہیں۔

انسان کی سب سے بڑی تلاش، تلاشِ حق ہے۔انسانی ذہن ایک لمحہ بھی بیکار نہیں رہتا اور ہر وقت ایک نہ ایک معبود تراشتا رہتا ہے۔اگر اللہ کا فضل شاملِ حال ہو، تو ایک روز وہ لا ادریت کی وادی سے نکل کر اللہ تعالیٰ کے وجود کا قائل ہوجاتا ہے اللہ تعالیٰ کے وجود کو ثابت کرنے کے لئے دلائل سے کام لینا بے کار ہے لیکن وہ لوگ جن کے مقدر میں ہدایت ہو، وہ شواہد کو دلیل بنا کر وجود باری تعالیٰ کے قائل ہوجاتے ہیں۔

شمیم ایک ضرورت سے زیادہ ذہین انسان تھا اور ظاہر ہے کہ اُس کا ذہن

ایک لمحہ کے لئے بھی بے کار نہیں بیٹھ سکتا تھا، میں اُسے سالہا سال سے جانتا تھا، میری اور اُس کی عمر میں کم وبیش ۲۵ یا ۲۶ سال کا فرق تھا، مگر ذہنی طور پر وہ اپنی ظاہری عمر کے مقابلے میں بہت زیادہ بالغ تھا اور اس کا شعور، اکثر رسل و رسائل رکھنے والے پڑھے لکھے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ پختہ تھا، اس لئے عمر کی ظاہری تفاوت کے باوجود میری اور اُس کی شناسائی صرف شناسائی تک محدود نہ تھی۔ ابتداء میں وہ میرے مذہبی رجحان کا مذاق اُڑاتا تھا، اور کبھی کبھی ان اُمور پر میرے اور اُس کے درمیان بڑی گرما گرم بحث ہوتی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وہ ابھی تشکیک کی گھاٹیوں میں آوارہ گردی کرتا تھا اور وہ میرے اندازے کے مطابق لا ادری یعنی Agnostic تھا، میں اُس سے مایوس نہ تھا، کیونکہ میں اُس کی ذہنی صلاحیتوں سے واقف تھا اور میں چاہتا تھا کہ ایک روز وہ ضرور شواہد کی بنا پر اس بات کا قائل ہو جائے گا کہ کائنات کا نظام چلانے کے لئے کسی زبردست طاقت کا ہونا ضروری ہے اور اس طرح سے وہ اُس زبردست طاقت کا قائل ہو جائے گا جسے لوگ خدا کہتے ہیں۔

مجھے یاد ہے ایک روز بڑی دیر تک ہم اسم ذات اللہ کے معنی پر بات کر رہے تھے، میں نے اُسے بتایا کہ عربی زبان میں خدا کا یہ اِسم ذات اسلام کے وجود میں آنے سے بہت پہلے موجود تھا۔ محققین کا اندازہ ہے کہ بعثت اسلام سے پہلے یہ لفظ کم از کم چار ہزار سال پہلے عربی زبان میں موجود تھا اس کے معنوں کی تحقیقات کے سلسلے میں ان چار ہزار برس میں اُس زمانے کے علماء، فضلا اور دانشوروں نے بہت سی دماغ سوزیاں کیں اور اکثر علماء کا اتفاق اِس بات پر ہے کہ اللہ کے معنی تحیّر ہیں۔ خلافِ معمول وہ خاموش رہا اور میں نے محسوس کیا کہ یہ بات اُس کے

دل کو لگی۔

روایتی معنوں میں وہ مذہبی آدمی نہ تھا وہ رسمی مذہب کا قائل نہ تھا، بلکہ وہ رسوم اور رواج کے خلاف بڑی شدت سے بولتا تھا۔ رسول خُدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وقت کے ذہین شاعر اُمیہ ابن ا لصلت کے بارے میں فرمایا تھا...... اس کا قلب مومن ہے مگر اس کی زبان کافر ہے اور اقبالؒ نے یہی مضمون نطشے پر چسپاں کرتے ہوئے کہا تھا۔

قلب اومومن دماغش کافراست

میں نے محسوس کیا کہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اُس کے فکر و نظر میں ایک انقلاب آ گیا ہے اور وہ ایمان کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے اُس کی روح مومن تھی، مگر وہ مذہب کے ٹھیکیداروں اور خدائی فوجداروں کا دشمن تھا۔ تخریب پرور گروہ بندی اور معمولی قسم کی رسم و رسوم پر شدید اختلافات کا سخت مخالف تھا۔ اُس کی روح اس سے بغاوت کرتی تھی اور اس سے اس کو وحشت ہوتی تھی۔ ان لوگوں کے خلاف اُس کی زبان اور قلم دونوں شمشیر بنکر چلتے تھے۔ ظاہر میں لوگ حکم لگاتے تھے کہ اُس کا خدائے واحد پر بھی ایمان نہیں۔

آخر وہ مرحلہ آیا جب وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مُبتلا ہو گیا۔ وہ ایک ایسے مرض میں گرفتار ہوا جس سے جانبر ہونا ممکن نہیں۔ قدرتی طور پر مجھے سخت صدمہ ہوا، علالت کے ابتدائی ایام میں، میں اُس کے پاس آتا رہا، مگر جب میں نے دیکھا کہ یہ آدمی بتدریج بجھتا جا رہا ہے تو دل نے بہت سمجھانے بجھانے کے باوجود اُس کو اس حالت میں دیکھنا پسند نہ کیا۔ وہ غالباً اگست ۷۹ء میں امریکہ علاج کے لئے روانہ ہوا تو میں نے اُسے ایک خط لکھا اور اُس میں کہہ دیا کہ میں ایک ہنستے

بولتے اور چہکتے مہکتے شمیم کو دیکھنے کا عادی ہوں، ایک علیل اور بجھے ہوئے شمیم کو دیکھنے کے لئے میرے دماغ اور میرے دل کے اندر بڑی کشمکش رہی، مگر آخر یہی جذبہ غالب آیا کہ میں ایک جانے والے شمیم کو نہیں دیکھ سکتا، یہی وجہ ہے کہ تمہاری شدید علالت کا علم ہونے کے باوجود میں تمہارے پاس نہیں آیا، اب تم امریکہ علاج کے لئے جارہے ہو، میری دعا ہے کہ تم صحت یاب ہوکر واپس آؤ تاکہ پُرانی محفلیں پھر سے آباد اور بارونق ہوجائیں۔ ضمناً میں نے یہ بھی کہا تھا کہ میرا یقین ہے کہ تم خدائے بزرگ و برتر کی ذات پر اعتماد رکھتے ہو اور انشاء اللہ یہ اعتماد تمہارا سب سے بڑا سہارا ثابت ہوگا۔ وہ امریکہ گیا اور وہاں سے میرے اس خط کا جواب لکھا۔ جسے میں ذیل میں درج کرتا ہوں، تاکہ دنیا والے بھی اس بات کے گواہ رہیں کہ وہ شمیم جواب اپنے مالک و مولٰے سے جاملا ہے۔ اس دنیا میں بھی اپنی آزاد خیالی کے باوجود توحید باری تعالیٰ کا قائل تھا اور یہی گواہی انشاء اللہ اُس کے نجاتِ آخروی کا سبب بنے گی۔ خط کا اقتباس یہ ہے:۔

ہوسٹن ٹیکساس

۳؍ستمبر ۷۹ء

محترم نازکی صاحب، السلام علیکم

سری نگر میں اپنی طویل علالت کے دوران میں بار بار سوچتا رہا کہ آپ کبھی بھولے سے بھی میری خبر و خیریت پوچھنے نہیں آئے لیکن میں نے حرف شکایت کبھی زبان پر نہیں لایا، پھر عین روانگی کے وقت کسی نے آپ کا ایک خط دیا، جو مجھے ہوائی جہاز میں تقریباً بیس ہزار فٹ کی بلندی پر پڑھنے کا موقعہ ملا، خط پڑھ کر یہ مصرع زبان پر آگیا۔

سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں

میں نے زندگی میں بڑی بڑی لڑائیاں لڑی ہیں، پہلے اپنے ماحول سے، پھر انتہائی غربت اور بے سروسامانی سے، اس کے بعد اپنے سے چھوٹے انسانوں سے اور پھر بڑے بڑے شاہوں، بادشاہوں اور شہنشاہوں سے، غرض زندگی کا ہر لمحہ لڑائی میں گذرا ہے لیکن آج جس لڑائی سے دو چار ہوں۔ یہ بڑی صبر آزما اور فیصلہ کُن ثابت ہوگی۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہو چکا ہوگا کہ میں ایک طرح کے مرض الموت میں مُبتلا ہوں اور مجھے ادویات اور علاج معالجے سے زیادہ خدائے قدوس کی قدرت اور اُس کی رحیمی ہی اس مرض کے انجام سے نجات دلا سکتی ہے۔

میں نے خدا کے وجود، اُس کی بے پناہ، لامحدود اور حیرت ناک قوت سے کبھی انکار نہیں کیا ہے، اِس دور میں بھی کہ جب ایسا کرنا فیشن میں شامل تھا، میرے لئے ایسا کرنا اس لئے ممکن نہ تھا کہ میں نے بچپن سے ہی اُس کے ایسے ایسے مظاہر دیکھے تھے کہ اُن کو دیکھ کر اُس کے وجود سے انکار کرنا اپنے وجود سے اِنکار کرنے کے مترادف تھا، میں نے اپنی آنکھوں سے اُس کے معجزے دیکھے ہیں اور آج میں خود اپنے حق میں اُس کے ایک معجزے کا منتظر ہوں۔ دیکھئے میرے مقدر میں کیا ہے۔

مجھے اُمید واثق ہے کہ آپ اپنی دُعاؤں میں مجھے اسی طرح یاد کرتے ہوں گے جس طرح ایک باپ اپنے بیٹے کو ابتلا میں دیکھ کر کرتا ہے۔

والدہ محترمہ کی خدمت میں السلام علیکم اور درخواست دُعا۔

آپ کا مخلص

☆......شمیم

شمیم آج اس دنیا میں نہیں ہے، آج ایک سال سے وہ آسودہ خواب ہے اور اس کی گھن گرج خاموش ہے، میں کبھی کبھی اُس راہ سے گذرتا ہوں جہاں وہ محوِ استراحت ہے، تو چند منٹ اُس کی قبر پر کھڑا رہتا ہوں اور اُس کی مغفرت کی دعا مانگتا ہوں، مجھے یقین سا ہے کہ جس خدا کے وجود، اُس کی بے پناہ لامحدود اور حیرتناک قوت سے اُس نے اپنی مختصر زندگی میں کبھی اِنکار نہیں کیا ہے اُس کے بچپن سے ہی ایسے مظاہرے دیکھے تھے اُس کے وجود سے انکار کرنا اس کے لئے اپنے وجود سے انکار کے مترادف تھا وہ خدا عفو مجسم بن کر اُس کی لغزشوں کو معاف فرما چکا ہوگا اور اُسے اپنے دامانِ رحمت میں ایسی پُرسکون زندگی عطا فرمائی ہوگی جو دامانِ مادر سے بھی ہزار درجہ راحت بخش اور لاکھ درجہ فرحت رساں ہے۔

آسمان اُس کی لحد پر شبنم افشانی کرے

محمد شفیع خان

اَدب، سیاست اور شمیم

زندگی حادثات سے عبارت ہے۔ ادب کی دُنیا میں بھی حادثات رونما ہوتے رہے ہیں۔ مجاز فطرتاً رومان پسند تھے مگر ترقی پسند بھیڑیئے اُسے اُٹھا کر لے گئے۔ منٹو افسانہ نگار تھے لیکن حادثہ ہوا اور اُنہیں ایڈیٹری بھی کرنا پڑی۔ بائرن شاعر تھے لیکن اٹلی کی جنگِ آزادی میں اُنہیں تلوار ہاتھ میں لینا پڑی اور پھر بے وقت موت کا حادثہ ادبی دُنیا میں ناقابلِ تلافی نقصان کا باعث بنتا رہا ہے۔ کیٹس، بائرن، شیلی، منٹو، عبدالاحد آزاد، مجاز اور نہ جانے کتنے دُرِ نایاب اپنے ضیاپاش جوہر کا صرف پرتو دِکھا کر اہلِ ذوق کی نگاہوں کو خیرہ کر کے عدم آباد میں رونق افروز ہوگئے۔ شمیم احمد شمیم کی موت دُنیائے ادب کے ساتھ ایک ایسا ہی حادثہ ہے۔ ادبی دُنیا کی ان شخصیتوں کی جوانمرگی کو ذہن میں رکھے اور اقبال کے اس شعر کی معنویت پر غور کیجئے۔

پریشان ہو کے آخر مری خاکِ دِل نہ بن جائے
جو مشکل اب ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے

شمیم احمد شمیم صحافی کی حیثیت سے مطلعِ ادب پر ظاہر ہوئے۔ صحافت ادب کی سرحدوں تک اگر جاتی ہو پھر بھی اصناف ادب میں اس کا وہ مقام نہیں جو شاعری افسانہ نویسی یا ناول نگاری کے فن کو حاصل ہے۔ اردو ادب میں گِنے چُنے ہی ایسے فنکار ہوں گے جنہوں نے صحافی کی حیثیت سے نام پایا ہو۔ صحافت میں تخلیق کے عمل کا بہت کم دخل ہوتا ہے۔ انسانی زندگی کے سماجی، سیاسی اور اقتصادی محرکات کی گہری بصیرت ہو اور پھر خلوص اور دیانتداری کے ساتھ ایسا پیرایۂ بیان اختیار کیا جائے کہ جو ایک منفرد اسلوب لئے ہوئے ہو تو یہ اچھی اور معیاری صحافت کی جان ہے۔ صحافت حالات و واقعات کی زبان ہے، روزمرہ کی زبان ہے لہٰذا ادب کی کائنات میں اِس کا وہ سکوپ نہیں ہوسکتا جو شاعری یا کسی دوسری صنفِ ادب کا ہو سکتا ہے۔ البتہ صحافتی ادب کو احساس کی گہرائی، جذبے کی شدت اور زورِ بیان سے اسقدر آراستہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ شاعری کی طرح جاذبِ نظر آنے لگے۔ صحافت کا مقصد فوری نوعیت کا ہوتا ہے۔ کامیاب ترین صحافی کا ہاتھ ہر دم وقت کی نبض پر ہوتا ہے۔ تب ہی وہ رائے عامہ کو ایک تعمیری رول ادا کرنے کے لئے ہموار کرسکتا ہے۔ صحافت کا خام مواد کسی بھی نوعیت کے وقتی مسائل کا حاصل ہوتا ہے۔ عظیم ادب کی تخلیق کے لئے عصری آگہی اور میلان ضروری تو ہے لیکن اِس کے باوجود ادب زمان ومکان کی قید سے آزاد ہے۔ وہاں ادیب کا کینوس لامتناہی وسعتوں تک پھیل سکتا ہے۔ لیکن یہاں جغرافیائی حد بندیوں، مخصوص قسم کے سماجی ماحول، اقتصادی اور ثقافتی محرکات سے زیادہ دوٗر صحافی کے تخیل کا پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ صحافت کے مقاصد محدوٗد ہیں۔ لیکن ادب وقت کا پابند نہیں۔ غالب کا شعر وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ حسین سے حسین تر ہوتا چلا جارہا ہے۔ لیکن اس کا یہ مقصد نہیں کہ ادب اور

صحافت کا آپس میں کوئی رشتہ ہی نہیں۔ خالص ادب اور صحافتی ادب میں ایک حدِ فاصل ہے۔ لیکن صحافت اگر معیاری نہ ہو بلکہ بہترین علمی اور فنی لیاقت، اعلیٰ ترین ادراک اور شعور کی آئینہ دار ہو تو ادب کے بہت قریب ہوسکتی ہے۔ صحافت اگر اچھی اور معیاری ہو تو قارئین کے ہاں اُس ذوقِ سلیم کی تربیت ہوسکتی ہے۔ جو ادب عالیہ کی پہچان، اِسے لُطف اندوز ہونے اور عرفان حاصل کرنے کا سلیقہ بخشتی ہے۔ اس بحث کے ضمن میں آسکر وایلڈ (Oscar Wilde) کی انتہا پسندی دیکھئے۔ وہ کہتا ہے کہ صحافت اور ادب میں فرق صرف یہ ہے کہ صحافت مطالعہ کے لائق نہیں ہوتی اور ادب کا مطالعہ (جو کہ کیا جانا چاہیے) کیا نہیں جاتا۔ یعنی کہ صحافت اتنی پھیکی ہوتی ہے کہ ذوقِ سلیم اس کو منہ لگانے سے کتراتا ہے۔ اور ادب کا پکوان اعلیٰ ترین شعور، ادراک اور بصیرت کی ہلکی آنچ سے اتنا مزیدار ہوتا ہے کہ صرف ذہنی طور سرمایہ دار لوگ ہی اس لذیذ کھانے کے چٹخارے لے سکتے ہیں۔

شمیم احمد شمیم سیاست کے رسیا تھے، وہ سیاست کی بُلندیوں تک جانا چاہتے تھے جس کا اُن میں حوصلہ بھی تھا اور ولولہ بھی۔ مگر آزادی کے بعد ہندوستان میں سیاست خباثت میں تبدیل ہوگئی اور وادیٔ کشمیر میں یہ عمل زیادہ ہی زوردار اور جاندار رہا۔ یہاں سیاست کو ثروت کی بلندیوں تک جانے کے لئے بطور ایک سیڑھی کے استعمال کیا گیا۔ یہاں تک کہ سیاست رُسوا ہوگئی۔ سیاست کے اِس آشو (Chros) میں جب شمیم کود پڑے تو اس سے چار سال پہلے انہوں نے آئینہ کا اجراء کیا تھا۔ انہوں نے آئینہ کے ذریعہ ہی یہاں کے سیاسی پہلوانوں کی منفی سوچ کا پوسٹ مارٹم کیا اور ابتداء سے ہی تعمیری صحافت کی طرح کشمیر میں ڈالی۔ وہ پبلک لائف میں بڑی شان کے ساتھ ”آئینہ“ ہاتھ میں لئے بحیثیت ایک صحافی کے ظاہر

ہوئے۔سیاست کی چمک دمک نے اُنہیں ابتداء میں ہی ہتھیا لیا تھا لیکن اُن کی سرشت میں جو اعلیٰ پایہ کا ادیب تھا اُس نے اُنہیں قلم ہاتھ میں لینے کے لئے مجبور کیا۔سیاست اور صحافت کی سرحدیں ملتی ہیں اس لئے اُنہوں نے صحافت ہی کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنالیا۔صحافتی ادب اور خالص ادب دو الگ چیزیں سہی ،لیکن شمیم احمد شمیم نے منفرد اسلوب اور انفرادیت وضع کر کے صحافتی ادب اور خالص ادب کی حد فاصل کو تقریباً ختم کر ڈالا۔اُن کے بہت سارے صحافتی ادب پارے ایسے ہیں جن کو خالص ادب پاروں کے کھاتے میں رکھا جاسکتا ہے۔صحافت اور ادب کے متعلق آسکر وایلڈ کا قول ایک تلخ سچائی ہے مگر شمیم کی صحافت پر یہ قول صادق نہیں آتا۔وہ جب لکھتے تو جیسے بھنورے پھولوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں تو اُسی طرح اہل نظر آئینہ کو ہاتھوں ہاتھ لیتے۔شمیم بنیادی طور پر ادیب تھے،ایک فنکار تھے۔ادب کو وہ اگر اپنی جلیل وجمیل ذہنی صلاحیتوں کا ذریعہ اظہار بنالیتے تو اردو کو ان میں ایک برٹرینڈرسل مل جاتا۔شمیم کے پاس خیالات تھے۔زمانے کے تقاضوں کے مطابق پختہ سوچ تھی۔یہ سائنسی نقطۂ نظر سے زندگی کی گتھیوں کو سمجھنے اور حل کرنے کا حوصلہ تھا۔تحقیق ،تنقید اور تجربہ کے بغیر......مسلّمہ صداقتوں سے انکار کی خو تھی۔وہ ایک اعلیٰ پایہ کے انشاء پرداز ہو سکتے تھے۔ادب کے بہترین نقاد ہو سکتے تھے۔اُن کے قلم سے تاریخ کو قابلِ قدر حصہ مل سکتا تھا۔فلسفی تو وہ نظر نہیں آتے تھے اور نہ اُن پر یہ تہمت لگائی جاسکتی ہے۔لیکن مُفکر ضرور ہو سکتے تھے۔مگر اے وائے موجِ حوادث !شمیم تو پیدائشی ادیب تھے،مُفکر تھے۔مگر چلتے چلتے سیاست کی پری پر اسقدر عاشق ہوئے کہ کبھی کبھار اپنی سب سے پیاری متاع یعنی آئینہ کو بھی بھول جاتے۔کاش !ایسا نہ ہوتا،کاش !یہ حادثہ نہ ہوا ہوتا اور پھر وہ جانکاہ

حادثہ جس نے جرأت اور اظہار کے اِس آتش فشاں پہاڑ کے عناصر کو ہی فضاؤں میں تحلیل کر دیا!

ذاکر حسین لکھتے ہیں کہ سیاست ایک پہاڑی نالہ ہے جو آناً فاناً چڑھتا ہے اور آناً فاناً اُترتا ہے۔اِس کے اُتار و چڑھاؤ کے ساتھ ہی ایک سیاسی شخصیت کا شہرہ وقت کی عمیق گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہے اور کوئی دوسری شخصیت اِس کے تند و تیز پانیوں کی سطح پر اُبھر آتی ہے۔سیاست کے شہسوار ریاست کی وقتی تزئین و زیبائش کو مطمح نظر بنا سکتے ہیں اور ہمارے یہاں سیاست کی دوکان لوگ محض اس وجہ سے لگاتے ہیں کہ اپنے لئے زندگی کا راستہ ایسا ہموار کر لیا جائے کہ کلفتوں کا ایک بھی سنگریزہ نہ رہنے پائے۔سیاست سے اُن کے خاندانوں میں اتنی فراوانی ہو کہ نسل در نسل اس کا فیض جاری رہے۔سیاست سماجی زندگی کا ایک مسلسل عمل سہی مگر اس میں ہرگز آفاقیت نہیں آسکتی۔صحافت کی طرح سیاست بھی زمان و مکان کی پابند ہے وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ سیاسی ڈھانچے بھی بدلتے رہتے ہیں۔اس کے ساتھ ہی اُن شخصیتوں کی تابناکی بھی ماند پڑ جاتی ہے جنہوں نے اِن ڈھانچوں کو پروان چڑھانے کے لئے اپنی زندگی داؤ پر لگائی ہوتی ہے۔روم کے جرنیلوں کے مُقابلے میں یونان کے مفکر نوعِ انسانیت کی فتوحات کا سلسلہ آج بھی جاری رکھے ہوئے ہیں۔یہ تو سیاست کی عمومی نہج ہے۔لیکن یہاں بھی کچھ شخصیتیں استثنیٰ کے زُمرے میں آتی ہیں۔ابراہیم لنکن ،لنن ،مُصطفےٰ کمال،مہاتما گاندھی اور ماوزے تنگ جیسی شخصیتیں انسانی تاریخ میں آج بھی زندہ ہیں اور رہتی دنیا تک رہیں گی۔اس قبیل کے سیاست دان سیاست کو قومی زندگی کی تعمیر نو کا بس ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔اِن کی سرشت ایک مُفکر ،ایک شاعر،ایک باغی کی طبیعتوں کی ضمیر سے اُٹھی ہوئی

ہوتی ہے۔ سیاست کو وہ اپنے خوابوں کی دُنیا تعمیر کرنے کے لئے محض ایک آلہ کار سمجھتے ہیں۔ سیاست کی اس کسوٹی پر شمیم احمد شمیم کو جانچنا اُن کے ساتھ ظلم کرنا ہوگا ستی سر کی جھیل کو جب بھونچال کا حادثہ پیش آیا تو وادیٔ کشمیر وقت کے بطن سے نمودار ہوئی۔ تب سے آج تک ایسا کوئی سیاست دان یہاں پیدا نہ ہوسکا۔ البتہ شمیم ایسے سیاست دان بھی نہ تھے جو سیاست کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں اور ادب، تعلیم، اخلاق اور ثقافت کو اِس کے تابع کردیتے ہیں۔ سیاست میں اُن کا مسلک صاف ستھری جمہوریت تھا۔ وہ اُس جمہوریت کے قائل تھے جس کا آئین ہند آئینہ دار ہے۔ لیلائے جمہوریت کو وہ اُسی حسن اور اُن ہی اداؤں کے ساتھ یہاں دیکھنا چاہتے تھے۔ کہ جن کے ساتھ وہ مملکت ملکہ الزبتھ دوم میں جلوہ گر ہے۔ ضمیر کی آزادی کے وہ علمبردار تھے اور اِس کو برقرار رکھنے کے لئے اپنا تمام تر زورِ خطابت، قوتِ استدلال اور اپنے طرزِ نگارش کی تمام تر رعنائیاں ایسے لٹاتے تھے کہ جیسے کوئی کروڑ پتی دادِ عیش دیتے ہوئے اپنا کیسہ بے دریغ لٹاتا ہے۔ آئینہ کا ایک خصوصی شمارہ ۹؍اگست ۷۸ء کو جاری ہوا۔ اس کا انتساب ہماری اس گھٹا ٹوپ اندھیروں کی وادی میں آزادیٔ ضمیر کے پروانوں کیلئے مدتوں تک فیضان کا باعث بنا رہے گا۔ شمیم لکھتے ہیں۔

۹؍اگست کا یہ خصوصی شمارہ میں کشمیر کی اُن دو عظیم شخصیتوں کے نام معنون کرتا ہوں کہ جنھوں نے میری ذہنی، فکری، سیاسی اور صحافتی زندگی کی تعمیر میں غیر معمولی حصہ ادا کیا ہے۔ ایک میرے دادا مولوی عبداللہ وکیل کہ جنھوں نے مجھے ذہن اور ضمیر کی آزادی اور حق گوئی و بے باکی کی لذتوں سے آشنا کیا۔ جن کی زندگی سے میں نے پہاڑوں سے ٹکرانے، طوفانوں سے لڑنے، بادشاہوں کو للکارنے اور

خُدا کے بغیر کسی کے آگے سر نہ جھکانے کا حوصلہ پایا۔ دوسرے شیخ محمد عبداللہ جن کی قیادت اور جدوجہد کے نتیجے میں مجھے آج اظہارِ خیال کی آزادی نصیب ہے۔ جن کی بے مثال قربانیوں اور بے لوث خدمات نے مجھے بغیر کسی خوف کے قلم اٹھانے اور چلانے کا سلیقہ اور حوصلہ بخشا ہے۔"

خشونت سنگھ نے شمیم کو Maverick سیاست دان کہا ہے۔ سیاست میں تو شمیم صاحب Non-Conformist تھے۔ خود اپنے بارے میں لکھتے ہیں۔

"شمیم احمد شمیم کے متعلق بہت دیر تک ایک ہی رائے پر قائم رہنا ذرا مشکل ہے لیکن شمیم کی سیاست پر کوئی فیصلہ صادر کرنے سے پہلے ہمیں ہندوستان میں آزادی کے بعد کی سیاسی فضاء کو عمومی طور اور کشمیر کی سیاسی بساط کو خصوصی طور ذہن میں رکھنا ہوگا۔ ہر سیاسی جماعت کسی نہ کسی ازم اور آئیڈیل کی حامی نظر آئے گی۔ سیکولرازم، سوشلزم اور جمہوریت کے الفاظ سیاسی شاطروں کی زبان پر اتنے عام ہوگئے کہ وہ پامال نظر آنے لگے۔ نہرو جی کی مکسڈ اِکانومی کے تصور کو اتنا بگاڑ دیا گیا کہ ہندوستانی عوام کا اعتقاد ہی جمہوریت سے اٹھنے لگا۔ اور کشمیر کی سیاسی فضا ۴۷ء کے آسیب زدہ ہنگامے کے بعد اتنی مسموم ہوتی چلی گئی کہ اس کا احاطہ مزاح کی بھرپور رنگ آمیزی کے ساتھ صرف شمیم اور شمیم کا قلم ہی کرسکا۔ ملاحظہ ہو آئینہ کے سالنامہ ۶۶ء میں چراغ بیگ عرف کلہن ثانی کے قلم سے لکھا ہوا مضمون "جدید تاریخ کشمیر" ایک طرف یہ مذموم سیاست کاری ذہن میں رکھئے اور دوسری طرف شمیم کی ذات جو سیاست، تنگ نظری اور مصلحتوں سے عبارت ہو، جہاں سیاسی بساط پر جمے رہنے کے لئے قدم قدم پر اصولوں کو نظر انداز کرکے سمجھوتے کرنا پڑتے ہوں۔ وہاں آپ حُریتِ فکر کے پجاری، ضمیر کی آواز پر لبیک کہنے والے مجاہد اور ایک باغی کو کس خانے میں رکھیں

گے؟ بندھے ٹکے اصول ایسے سیماب صفت آدمی کے لئے نہیں ہوتے۔ وہ ہر اُس فرسودہ روایت سے بغاوت کرتا ہے کہ جس سے وہی بدبو آتی ہے جو ٹھہرے ہوئے پانیوں سے آتی ہے۔ وہ ان غلیظ اور بیماری پھیلانے والے Cesspools کے لئے نکاس کا ذریعہ تلاش کر ہی لیتا ہے۔ رہی ازم اور آئیڈیل کی بات، تو شمیمؔ انسانیت کے قائل تھے۔ اُن کا آئیڈیل صاف، ستھری جمہوریت تھا۔ وہ برِصغیر میں صرف دو سیاسی شخصیتوں سے متاثر تھے اور وہ شخصیتیں پنڈت نہرو اور ابوالکلام آزاد ہیں۔ بُلبُل ہند سروجنی نائیڈو کو جب اُتر پردیش کا گورنر بنایا گیا تو اُس نے کہا۔ ایک ترنم ریز پرندے کو پنجرے میں بند کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ دراصل نری سیاست ادب کے سامنے کھڑا ہو کر اس سے آنکھیں نہیں لڑا سکتی۔ ادب زندگی کا مکمل احاطہ کرتا ہے۔ اس کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا اور بھی زمانے ہیں۔ جن کا کوئی نام نہیں ہے۔ ابتدائے آفرینش سے زندگی کے ہاتھوں ادب کی تخلیق ہوتی رہی ہے۔ اور برابر وہاں سے ہی ادب زندگی کے خوب سے خوب تر سانچے بنانے میں مصروف رہا ہے۔ نقشِ حیات بن بن کے بگڑتا ہے۔ اس کے ہر نئے نقش کی تشکیل میں ادب کا بھی حصہ رہا ہے۔ ادب تفسیرِ حیات بھی رہا ہے، اور نقدِ حیات بھی، خالق بھی ہے اور مخلوق بھی۔ سیاست انسانی زندگی کا صرف ایک پہلو ہے۔ سیاست کی تنگنائے میں ادب سما نہیں سکتا۔ اگر ایسا کیا گیا تو ادیب کا دم گھٹنے لگے گا۔ شاعر کا نغمہ معنویت، جذبہ اور تاثیر سے خالی ہو جائے گا۔ ادب اور دیگر شعبہ ہائے زندگی میں جو تعلق ہے اُس کے متعلق اردو ادب کے نقاد پروفیسر آلِ احمد سرور لکھتے ہیں: ''ادب سیاسی، مذہبی اور اخلاقی موضوعات سے مدد لیتا ہے مگر یہ مذہب کا خادم ہے نہ سیاست کا نقیب، نہ اخلاق کا نائب۔ ادب ہرجائی ہے اور ادب کا ہرجائی پن

ہی اس کی دولت ہے۔'' ظاہر ہے کہ سیاست ادب کا موضوع ہو سکتی ہے۔ ناظم حکمت اور فیض احمد فیضؔ جیسے شاعر، شاعری کے ذریعے ایک واضح سیاسی تصور انسان کے سامنے لاتے ہیں مگر اس کے باوجود وہ سیاست کے نقیب نہیں، شاعری کے نغمہ خواں ہیں۔ لیکن ایک ہی شخصیت میں جب ادب اور سیاست گڈمڈ ہو جاتے ہیں تو نہ ادب کے لئے یہ شگون نیک ہے اور نہ ہی سیاست کے لئے۔ جہاں تک میری فہم و فراست مجھے لے جاتی ہے میں پھر اسی رائے پر پہنچتا ہوں کہ شمیم فطرتاً ایک ادیب تھے، ایک ایسے ادیب جن کے باغ میں گلہائے رنگارنگ سے بوقلمونی تھی۔ شاید وہ محض اپنی انا کی تسکین کے لئے میدانِ سیاست میں کود پڑے۔ بہرکیف میرے نزدیک (لالے کے پھول کے مصنف سے معذرت کے ساتھ) ادیب شمیمؔ، ادب نواز شمیمؔ، سخن فہم شمیم، نکتہ شناس شمیمؔ، آئینہ ساز شمیم، سیاست دان شمیم سے عظیم ہے...... اور بہت عظیم ہے۔

آیئے! اب ادیب شمیم احمد شمیمؔ کا ذکر چھیڑیں۔ جی چاہتا ہے کہ آغاز سے پہلے صفیؔ کا یہ شعر آپ کو سُنا دوں۔

غزل اُس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

شمیم احمد شمیمؔ! کتنا پیارا نام ہے۔ ایک خوبصورت ادیب کا خوبصورت نام۔ جہاں نام ہی ذہن پر ایک جمالیاتی تاثر قائم کرتا ہے۔ وہاں جمالِ خامہ فرسائی کے کمالِ فن کو دیکھئے۔!

''تاریخ کی پُراسرار قوتوں کی سازش سے ۴۷ء میں عین اس وقت ہمارے قومی قافلے پر شب خون پڑا، جب ہم جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں جلا کر نجات دیدہ

ودل کی گھڑی سے ہمکنار ہونے والے تھے۔ آزادی کی ہیمال تو ہمیں مل گئی۔ مگر اُس وقت جب ناگرائے کے جسم کے کئی ٹکڑے شبستان میں بکھرے پڑے تھے۔ ملک تقسیم ہوگیا۔ اس تقسیم کی کاری ضرب جن محبوب اور مقبول چیزوں پر پڑی اُن میں اردو زبان کے متاعِ سرِ فہرست ہے۔ یہ بڑی ستم ظریفی کی بات ہے کہ جو زبان عرب اور عجم کی دو حسین و جمیل تہذیبی دھاراؤں کے وصل سے وجود میں آئی تھی وہ اِن تہذیبی دھاراؤں کے فصل کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھادی گئی، اردو کی حالتِ زار کا رونا پھر سُنیئے !''سرزمین ہند کی نازوں سے پالی ہوئی اس لاڈلی بیٹی کا جس اجنبی ملک کے ساتھ جبری نکاح کیا گیا تھا اُس نے چند ہی مہینوں کے بعد اِسکو پناہ دینے سے انکار کرنے کا آغاز شروع کردیا۔ جس کا انجام آج کوئٹہ سے کراچی تک ہر جگہ لسانی فسادات کے آتش فشاں شعلوں کی صورت میں نظر آرہا ہے اور یہ زبان جیسے کسی تُہمت زدہ سیتا کی طرح اپنی اِس بے گناہ دُرگت پر فریاد کناں کرتی ہوئی یہ گنگنا رہی ہے ۔

'' وأرِوبن ستِ وارِ چھس نو
چارہ کر میون مالینو ہو''

ہندوستانی مسلمان کے مرض کی تشخیص یوں کرتے ہیں۔

''ہندوستانی مسلمان کی جان عذاب میں ہے اور وہ ایک شدید قسم کے ذہنی کرب میں مبتلا ہے۔ تاریخ نے اس کے ساتھ ایک بے رحم مذاق کیا ہے وہ بغیر کسی گناہ کا ارتکاب کئے شدید قسم کے احساسِ گناہ کا شکار ہے۔ اُس کا دِل دماغ نفسیاتی کشمکش کی آماجگاہ ہے کہ جس نے اُس کی شخصیت کو مجموعہ اضداد بنادیا ہے اور وہ بیک وقت دو ملکوں کا شہری، دو مخالف قوتوں کا وفادار، دو متضاد فلسفوں کا پرستار اور

دو جسموں میں بٹی ہوئی ایک روح ہے۔''

تعصب کی عینک اُتاریئے۔ عبارت کے اِن نمونوں میں شمیم کے اصلی جوہر کو پہچانیے۔ وہ ایک صاحب طرز ادیب ہیں۔ حلاوت، سادگی اور متانت کی حسین آمیزش نگارشات شمیم میں جگہ جگہ نظروں کو طراوت بخشتی ہے۔ شمیم عبارت آرائی سے کوسوں دور بھاگتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور اپنی نگارشات میں صداقت کا برملا اور برجستہ اظہار کرتے ہیں۔ ان میں احساس کی گہرائی، خلوص اور معاملہ فہمی کا تاثر دور سے ہی ذہن پر قائم ہوجاتا ہے۔ جذبے کی ہلکی رنگ آمیزی سے ان میں حُسنِ تحریر دور سے ہی چھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔

شمیم کی ادبی صلاحیتوں کا والہانہ اظہار چراغ بیگ کے کردار میں ہوا ہے۔ جی ہاں، چراغ بیگ آئینہ کا ایک ایسا کردار ہے جو ادب کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چراغ بیگ ایک حیوانِ ظریف ہے۔ چراغ بیگ ہنسوڑ ہے۔ چراغ بیگ باتونی ہے، منہ پھٹ ہے، شوخ اور طباع ہے۔ اس کے سامنے کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو فوراً پگڑی اُچھال دے گا۔ چراغ بیگ خود کہتا ہے کہ لوگ اُس کے بارے میں یہی سوچتے ہوں گے کہ اُس کو بڑی شخصیتوں کے کمزور پہلو ابھارنے میں ایک مریضانہ لذت کا احساس ہوتا ہے۔ چراغ بیگ کو یہ سب کچھ ہوتا ہو مگر انصاف ہے کہ حکم عقوبت سے پیشتر ایکبار سوئے دامن یوسف ہم بھی دیکھیں۔ چراغ بیگ حد سے زیادہ حساس ہے۔ اُس کے ذہنی کرب کا اندازہ کیجئے کہ جب سے اُس نے آنکھ کھولی، یہاں سیاست کی دنیا عجیب الخلقت جانوروں سے ہی آباد رہی۔ یہاں کی سیاسی ابتری کی تصویر چراغ بیگ نے یوں پیش کی ہے۔

پچھلے سترہ اٹھارہ برسوں میں جس کسی نے بھی سیاست کے گندے تالاب

میں ہاتھ دھوئے ہیں اُس کا دامن داغدار اور اس کی قبا تار تار ہوگئی ہے۔اقتدار سے وابستہ یا اقتدار کی تلاش میں بھٹکنے والوں نے تہذیب، شرافت، اخلاق اور مروت کی قدروں کو پامال کر کے ایک نئے ضابطۂ اخلاق کو جنم دیا، اس ضابطے کی رو سے اقتدار سے بہر حال وابستہ رہنا دانشمندی اور دانشوری کی سب سے بڑی علامت سمجھا گیا۔یہی وجہ ہے کہ جدوجہدِ آزادی کی بھٹی میں پگھل کر پختہ شعور والے سیاسی کارکن بھی ٹکے کے بھاؤ بک گئے۔کمیونزم اور مارکس کے شیدائیوں نے ایک ایک روٹ پرمٹ کی خاطر انقلاب کو نیلام کیا۔اشتراکیت اور پرولتاری، انقلاب کے علمبرداروں نے ہر نازک مرحلے پر بدترین سامراج کے سامنے سر جھکا دیا۔ مزدوروں اور غریبوں کے غمخواروں نے اپنے لئے تاج محل بنائے اور غریبوں کی کٹیا کو پھونک کر اِس کا تماشہ دیکھتے رہے" کتنی منہ بولتی بے لاگ اور سچی تصویر ہے۔

کاش! ہم چراغ بیگ کو جھٹلا سکتے۔ سیاسی بے شعوری، کساد بازاری، رشوت ستانی، افسر شاہی، انسانی قدروں کی پامالی اور جملہ خرابیاں جب کسی سماج کی نس نس میں سرایت کر جاتی ہیں تو ادب کو نہ صرف ایک شاعر چاہئے جو اس خرابے پر ایسے ماتم کناں ہوتا کہ خوابیدہ احساس کو جھنجھوڑ کر رکھ دے، کوئی تو آنکھ کھولے اور پھر سے زندگی کی شیرازہ بندی کرنے لگے۔ بلکہ ایک Satirist بھی چاہیئے۔جو طنز کے نشتر چلا کر اس خوابیدہ احساس کو جھنجھوڑ کر رکھ دے۔طنز نگار کا ہر نشتر احساس کی بھٹی میں تپ کر آنا چاہیئے۔تا کہ رِستے ہوئے ناسوروں سے غلیظ مادہ پھوٹ پڑے۔وہ ہماری خامیوں، ہماری سیاہ کاریوں اور ہمارے عیبوں سے اپنے نشتر کی نوک سے پردہ اٹھاتا ہے۔دیکھنے والے قہقہہ لگاتے ہیں اور کیوں نہ لگائیں۔پردے کے اندر ہم کیا ہیں اور باہر کیا؟ گذشتہ تین دہائیوں پر پھیلے ہوئے سیاسی اور سماجی

انحطاط کو ذہن میں رکھئے تو چراغ بیگ کے کردار کے خدوخال صاف بنتے ہوئے نظر آتے ہیں۔وہ اپنی تیز بین نگاہ سے ہماری خود غرضیوں کی نشاندہی کرتا ہے۔وہ بہت ہی بے خوف ہے۔اُس کے وجود میں شعلگی ہے۔طمطراقی ہے، تڑپ ہے صحن گل میں اُس کو کوئی بھی ہاتھ زیادتیاں کرتا ہوا نظر آئے گا تو اُس سے رہا نہیں جاتا۔ وہ تیر و تفنگ سے لیس اُسے قلم کرنے کے لئے آگے بڑھتا ہے اور جب صبر و قرار کھو دیتا ہے۔تو مجاز کی زبان سے بے اختیار ہو کر پکار اُٹھتا ہے۔

بڑھ کے اِس اندر سبھا کا ساز و سامان پھونک دوں
اِس کا گلشن پھونک دوں اُس کا شبستان پھونک دوں
تختِ سلطان کیا؟ میں سارا قصرِ سلطان پھونک دوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دِل کیا کروں

چراغ بیگ کی رگ رگ میں ہی اضطراب ہے۔اس کی تحریر کی رگ رگ میں ٹیس اٹھتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔یوں تو وہ مُسکراتا بھی ہے۔مگر اس ادا میں طنز کا نشتر زیادہ ہی چھبتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ چراغ بیگ ہر فن مولا ہے۔وہ کسی بھی شجر ممنوعہ کی طرف ہاتھ بڑھا سکتا ہے۔اُس کی آنکھوں میں شوخ شرارت کے شعلے لپک رہے ہیں۔زندگی کی دوڑ میں وہ کسی کو کہنی مار کر، کسی کو دولتی اور کسی پر رُعب جما کر سب سے آگے نکلنا چاہتا ہے۔اُس کا تو اسٹائل ہی نرالا ہے۔خود اپنے خالق شمیم احمد شمیم کا خاکہ کھینچتے ہوئے لکھتا ہے" وہ بڑا بے ایمان ہے۔وہ ایک نمبر کا فراڈ ہے۔وہ باتوں کا سوداگر ہے.......... وہ سچ بول کر لوگوں کو دھوکا دے رہا ہے...... اُس میں تعمیر کی بے پناہ صلاحیتیں ہیں لیکن اُس نے اپنی تمام قوتیں تخریب میں صرف کر رکھی ہیں...... وہ سیاسی دنیا کا سعادت حسن منٹو ہے جو چونکا دینے پر یقین

رکھتا ہے۔ شمیم صاحب میں ایک اچھا ادیب بننے کی صلاحیتیں موجود ہیں لیکن ادب چونکہ زیادہ ریاض، لگن اور توجہ چاہتا ہے۔ اس لئے شمیم صاحب نے اپنے لئے صحافت کا راستہ اختیار کیا ہے"۔

شمیم احمد شمیم کے کھینچے ہوئے خاکے اور مرقعے اردو ادب میں ایک نادر اضافہ ہیں۔ آئینہ کے شخصیات نمبر میں کشمیر کی تاریخ ساز اور علم و ادب کی دنیا میں معروف شخصیتوں کے خاکے کھینچے گئے ہیں۔ پروفیسر احتشام حسین کی رائے میں یہ سوانح نگاری نہیں تاثراتی خاکہ نگاری ہے۔ اس نمبر میں یوں تو ہر خاکہ شمیم کے دلفریب طرزِ نگارش، اُن کی باریک نظر، بے باکی اور بذلہ سنجی کا دیدہ زیب اشتہار ہے۔ لیکن کمالِ فن کی داد دینا ہو، تو مولینا فاروق اور پروفیسر محی الدین حاجنی کی شخصیت کے خاکے اور عبدالقادر دیوان (جو شمیم کے ایک قریبی دوست تھے اور اُن ہی کی طرح عالم شباب میں بجلی گرنے سے راہی عدم ہوگئے) کی موت پر لکھا ہوا مضمون پڑھیے۔ اس نمبر میں گاندربلی صاحب کا تعارف بھی مستقبل میں کشمیر کی تاریخ کے طالب علم کو اس طویل سیاہ رات کا احاطہ کرنے میں مددگار ثابت ہوگا کہ جو اس رشکِ پری خانہ چمن پر مسلط کی گئی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری یہ رائے ہرگز مبالغہ نہیں کہ مستقبل کا مورخ جب کشمیر کی تاریخ مرتب کرے گا۔ تو شخصیات نمبر کے علاوہ اُسے آئینہ کی فائلوں سے گرد کی تہیں صاف کرکے حقائق کی تلاش کیلئے بہ نظرِ غائر اُن کا نوٹس لینا ہوگا اور آخر میں اس مضمون کے عنوان کے حرف آخر کی نکہت جانفزا سے ایک بار پھر اپنی محدود بساط کے مطابق، ہواؤں کو عطر بیز کرنے کو جی چاہتا ہے۔ شمیم احمد شمیم ایک ہمہ جہت شخصیت کا نام تھا۔ جس میں مختلف النوع صفات یکجا ہوئی تھیں۔ بمبئی سے شائع ہونے والے ماہنامہ "گگن" کے ہندوستانی

مسلمان نمبر میں شمس کنول (گگن کے ایڈیٹر) ایک تعارفی نوٹ میں لکھتے ہیں۔

> "حسن وہ ہے جس کا اعتراف سوتن بھی کرے۔ شمیم کے مخالف بھی شمیم کے حسن تقریر اور حسن تحریر کے معترف ہیں...... شمیم کو صحافت میں مہارت حاصل ہے۔ یا فنِ خطابت میں کمال؟ یہ جاننا مشکل ہے۔ دراصل وہ ان دونوں خوبیوں کے حامل ہیں...... شمیم پُرگو ہیں، خوش گو ہیں اور منہ پھٹ ہونے کی حد تک صاف گو ہیں...... شمیم انتہائی روشن خیال، ترقی پسند اور حقیقت شناس، قلمکار اور سیاست دان ہیں"۔

ادب، سیاست، صحافت اور فکر و دانش کے لحاظ سے شمیم احمد شمیم کی شخصیت ایک محشرستانِ امکانات تھی۔ اتنی کم عمر پا کر بھی وہ اپنی شخصیت کا جو قد حاصل کر سکے کم اونچا نہیں۔ پیمانہ حیات اتنی جلد لبریز نہ ہوتا تو کیا کیا رفعتیں ہوتیں۔ شمیم جاندار (Powerful) مصنف ہونے کے ساتھ ایک شعلہ بیان مقرر بھی تھے۔ سیاست دان بھی تھے، صاحب نظر اور صاحب الرائے دانشور بھی۔ بُت تراش بھی تھے اور بُت شکن بھی۔ بقول پروفیسر آلِ احمد سرور "شمیم سردار دیوان سنگھ مفتون کے ہم پلہ صحافی بھی تھے" اور بقول ایک عینی شاہد کے (جس نے شمیم کو اپنے ضبط شدہ مکان کے کیس میں ریاستی عدالتِ عالیہ میں بحث کرتے ہوئے سُنا ہے۔ اور وہ بھی تب جب اُن کے قویٰ بوجہ بیماری مضمحل ہونا شروع ہوگئے تھے) ایک بہترین وکیل بھی۔ گرم گفتار تو وہ تھے ہی لیکن طنز و مزاح سے اپنے انداز گفتگو کو دلچسپ بنانے میں وہ ایشیا کے چمپین تھے۔ شمیم صاحب کی بذلہ سنجی محفلوں میں جان ڈالتی۔ شریکِ محفل جو بھی ہوتا وہ بس یہی چاہتا کہ یہ پیکرِ لطف و ظرافت بس بولتا ہی رہے۔ شمیم صاحب کے انتقال کے بعد (کتنا منحوس جملہ ہے) بہت دنوں تک مجھے اکثر

اُن کے لطیفے، اُن کے قلم سے چھوٹی ہوئی پھلجھڑیاں اور بذلہ سنجیاں بسوں میں سُننے کا اتفاق ہوا۔ کوئی نہ کوئی ہوتا جو دیدۂ غمناک سے ذکرِ شمیم زبان پر لاتے لاتے بات اُن کی کسی پھلجھڑی یا لطیفے پر ختم کرتا۔ شمیمؔ صاحب کی تحریر باغ و بہار تھی، تقریر باغ و بہار تھی۔ کلام باغ و بہار تھا حوصلہ بلند تھا اور عزائم بلند تھے۔ مصلحت ناشناس، مزاج کے ساتھ ساتھ انہی خصائص نے اُن کی شخصیت میں غضب کی دلآویزی پیدا کردی تھی۔ غالبؔ کی شخصیت کا ایک پُرکشش پہلو یہ بھی ہے کہ اُن کی شوخیِ طبع زمانے کی ستم ظریفی اور آلام روزگار کے پے در پے حملوں کے باوجود نہ دب سکی بلکہ ایسے خوش کُن اشعار کی شکل میں ڈھلتی رہی۔

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائیگی ہماری فاقہ مستی ایک دن

اپنی مختصر سی زندگی میں شمیمؔ ماسوائے چند نسبتاً خوشحال برسوں کے ہمیشہ نامساعد حالات سے برسرِ پیکار رہے لیکن اُن کی شوخیِ طبع مجروح نہ ہونے پائی۔ آئینہ پر یہ اعتراض کیا جاتا تھا کہ شمیمؔ اِسے ذاتی پبلسٹی کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اِس کے جواب میں صحافتی ادب کی زبان میں یہ رُباعی مُلاحظہ ہو۔

"اپنی مدد آپ!

شمیم احمد شمیمؔ سے کسی نے پوچھا کہ آپ خود اپنی پبلسٹی کیوں کرتے ہیں؟ اُس نے جواب دیا کہ غریب آدمی ہوں، ملازم رکھ نہیں سکتا۔ اس لئے یہ کام بھی خود ہی سنبھال لیا ہے۔"

شمیم عمر کی پینتالیس بہاریں ہی دیکھ پائے تھے کہ زندگی کی شام ہونے کو آئی...... اور شام بھی وہ جو تلخابۂ حیات میں خاطر شکن زہر گھول کر لائی تھی لیکن شمیم

کے ہاتھ کپکپائے نہیں۔ اپنی شوخیِ طبع اور بلند حوصلہ کو برقرار رکھتے ہوئے فیصلہ خداوندی کو سُنتے ہی، پیالہ ہونٹوں سے لگالیا۔

شمیمؔ مرے نہیں زندہ ہیں کیونکہ شمیم کی زندگی احسان دانش کے اس شعر کی مکمل تفسیر تھی۔

میرے سب حریف گل چیں، میرے گل فروش دُشمن
میں چمن کا ماتمی ہوں، غمِ آشیاں نہیں ہے

مرزا غلام قادر بیگ عارف

وہ غازی جیا اور شہید مرا

"رنج وغم سے معمور دلو! خون آشام آنسوؤں سے لبریز آنکھو! دبی ہوئی آہ بکا سے بھری ہوئی چھاتیو! تم خاموش داستانِ غم کی ترجمان ہو جو گزرنے والے کے سوگ میں تمہاری گہری محبت اور اُس کی عظمت کی دلیل ہے!"

یہ اندوہ ناک کیفیت کِتنے سفرِ آخرت پر جانے والے مسافروں کی قِسمت میں ہوتی ہے!

شمیم احمد شمیم ان کمیاب شخصیتوں میں سے ایک تھے۔ نہ اُس کے پاس ثروّت تھی نہ اقتدار تھا۔ نہ وہ امام تھا نہ واعظ، نہ مندر کا گھڑیال تھا نہ مسجد کا مؤذن نہ لیڈر تھا نہ حاکم۔ وہ فقط زبان اور قلم تھا۔ اپنے دل ودماغ کا ذریعہ اظہار جس میں گہرائی بھی تھی گیرائی بھی۔ جس میں شدّت کا سوز بھی تھا اور بلا کا ترنّم آفریں ساز بھی! جو اپنی مثال آپ تھا! وہ چاہتا تو خاک کو ہمدوشِ ثریا کر دیتا۔ ہمالیہ کو ذرّہ خاک میں تبدیل کر دیتا۔ شیروں کو لومڑیوں کی صف میں لا کھڑا کرتا۔ عوام کے ضمیر کی عدالت کے سامنے بڑے سے بڑے گنہگار کو پیش کرتا۔ اور بڑی بے دردی سے

انصاف کا چھرا ظالم کے حلق پر چلاتا۔

اُس کی بے باکی اور بے جگری جبلّی تھی۔ وہ شعلوں سے لپٹنے میں لذّت پاتا تھا۔ وہ قلم سے تیر ونشتر کا کام لیتا تھا۔ وہ ہر نمرود وفرعون کے سامنے خلیل وموسیٰ بن کر بھری محفل میں صداقت کے طمانچے رسید کرتا تھا۔ وہ مجاہد تھا اور حق وصداقت کے اِسی بے باکانہ جہاد میں کام آیا۔ وہ غازی جیا اور شہید مرا!

کاش فطرت اپنے اٹل قانون میں ذرا سی ڈھیل روا رکھتی اور مرحوم کو اپنا مرثیہ آپ لکھنے کی مہلت دیتی۔ تو دُنیا دیکھتی کہ یہ موت وحیات کا کھیل کیسے کھیلا جا سکتا ہے۔ اور پسِ پردہ کیسے کیسے ان جانے ڈراونے خوابوں کی تعبیریں چھپی ہوئی ہیں۔ کِتنی حسین آرزوؤں کے مزار ہیں اور کتنی ناتمام خواہشوں کے جنازے نکلتے ہیں۔

جس خارا شگاف اور فلک پیما قلم نے رُوحوں کے بیان لکھے' اُن کے خطوط زندوں کے نام قلم بند کئے۔ جنّت سے دُنیا کے لئے پیغامات لائے، وہی آج اپنی خبر تک نہ بھیجنے کا پابند ہے۔

شمیم اسی دِل وگردے سے عاری فطرت کے قانون کے ماتحت اس دُنیا میں روتے ہوئے وارد ہوا' ہنستے ہوئے جیا اور ہزاروں چاہنے والے دِلوں کو رُلوا کے رخصت ہوا۔ انا للہ وَ انا الیہ راجعُون

اے فلک پیر جواں تھا ابھی مرحوم
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دِن اور

مشعل سلطانپوری

شمیم احمد شمیم

کشمیری ادب کے ایک نقاد کی حیثیت سے

ابتدا میں کشمیری ادب سے متعلق تنقید کے نام پر جو کچھ لکھا جاتا رہا اُس کے لئے اُردو زبان سے ہی کام لیا گیا۔ اس قسم کے کچھ ہلکے پھلکے مضامین پنڈت پریم ناتھ بزاز کے اخبار ''ہمدرد'' میں شائع ہوئے اور کچھ ایس پی کالج کے ترجمان ''پرتاپ'' میگزین میں۔ کونگ پوش اور گلریز جیسے ماہناموں کی اشاعت کے بعد اس طرف کچھ اور توجہ ہوئی۔ کونگ پوش میں تو ذریعہ اظہار کشمیری ہی بنا لیکن گلریز میں اس قسم کے مضامین اُردو ہی میں لکھے گئے۔ مثال کے طور پر پروفیسر محی الدین حاجنی کے وہاب پرے کی شاعری سے متعلق مضامین۔ اس کے بعد ریاستی سرکار کے محکمہ اطلاعات سے ''تعمیر'' نام کا رسالہ منظر عام پر آیا اور انہی برسوں میں جموں وکشمیر کلچرل اکیڈیمی وجود میں آئی۔ اکیڈیمی کی طرف سے کشمیری زبان میں لکھے گئے نظم ونثر کے انتخاب پر مشتمل ''سون ادب'' اور اُردو ادب کے انتخاب پر مشتمل ''ہمارا ادب'' نام کے سالنامے شائع ہونا شروع ہوئے اور پھر دونوں زبانوں میں ''شیرازہ'' نام کے جریدے

بھی۔ اس کے علاوہ نثر ونظم میں جو کتابیں شائع ہونے لگیں، اُن کے دیباچے یا اُن پر تبصرے بھی تنقیدی آمیزش لئے ہوئے تھے۔ اس ساری صورت حال سے کشمیری ادب کی تنقید کا پودا نشو ونما پانے لگا۔

یوں تو کشمیری ادب میں تنقید کی شروعات کا سہرا عبدالاحد آزاد کے سر بندھ جاتا ہے۔ جس کی لکھی ہوئی ''کشمیری زبان اور شاعری'' کے نام کی کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا مسودہ اگرچہ عبدالاحد آزاد نے ۱۹۴۸ء سے پہلے ہی سپرد قلم کیا تھا لیکن اس کی اشاعت ۱۹۵۹ء سے پہلے ممکن نہ ہوسکی یہ کتاب یوں تو کشمیری زبان اور شاعری کی تاریخ ہے لیکن شعراء کی حالات زندگی کے ساتھ ساتھ اُن کے کلام پر جو رائے دی گئی ہے وہ تنقید کے ذیل میں آجاتی ہے۔ یہ پوری کتاب اُردو زبان میں لکھی گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ کشمیری شاعری سے متعلق تنقید بھی اُردو ہی میں ہے۔

کشمیری ادب میں شعری سرمایہ یوں تو پہلے سے موجود تھا لیکن نثر کی طرف توجہ دینے کا زمانہ شخصی راج کے خاتمہ کے بعد ہی شروع ہوا۔ یہ برصغیر میں ترقی پسند ادبی تحریک کا زمانہ تھا۔ اگرچہ ملک میں اس کا زور اب کچھ کچھ گھٹنے لگا تھا لیکن ہماری ریاست میں یہ اپنے عروج پر تھی۔ علاقائی زبانوں کے ادب کی نشو ونما کی طرف توجہ مبذول کرانے میں اس تحریک کا اہم رول رہا ہے۔ یہاں ادب کی مختلف اصناف میں قلمی کاوشوں کی ابتدا اسی تحریک کے دم سے ہوئی۔ خاص طور پر فکشن، تنقید، رپورتاژ، ترجمہ کاری وغیرہ کا میلان اسی کا فیض ہے۔ ترقی پسند ادبی تحریک کے جلسوں اور نشستوں میں عملی تنقید ہی کا پلڑا بھاری رہتا تھا، چاہے اس میں کتنی ہی خامیاں کیوں نہ ہوں۔ کشمیری ادب میں جن قلمکاروں،

ادیبوں، شاعروں، افسانہ نگاروں اور نقادوں نے آگے چل کر خوب نام پایا، اُن کی تربیت ان ہی نشستوں اور جلسوں میں ہوئی۔ جو کچھ لکھا گیا، اسی تحریک کے زیر اثر لکھا گیا۔

شمیم احمد شمیم یہاں اس تحریک کے عروج کے دنوں میں سری نگر کے ایس پی کالج میں زیر تعلیم تھے اور ترقی پسندوں کے ادبی جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ وہ ایک عام طالب علم نہ تھے۔ ذوق مطالعہ، ذہانت اور ادب شناسی میں اپنے اُستادوں کے ہم پلہ تھے۔

اسی بنا پر ''پرتاپ'' میگزین کے اُردو سیکشن کے مدیر ہونے کا شرف پایا اور ''پرتاپ'' میں اردو زبان میں تنقیدی مضامین لکھنے لگے۔ شمیم کی اُن دنوں کی ادبی سرگرمیوں کے بارے میں پروفیسر شوریدہ اپنے مضمون بعنوان ''کشمیر کا بھٹو'' مشمولہ یادگاری شمارہ آئینہ بابت مئی ۱۹۸۱ء میں رقم طراز ہیں۔ ''شمیم نے پہلے مرزا غالب اور پھر میر غلام رسول نازکی صاحب کے کلام پر سخت تنقیدی مضامین شائع کئے۔ یگانہ چنگیزی کی طرح غالب شکنی کی، پھر نازکی صاحب کے مجموعہ کلام ''دیدۂ تر'' کو تختہ مشق بتایا۔ یاران محفل کو بڑا لطف آیا۔ لیکن میں نے ایک دن شمیم سے کہا ''بھئی! یہ کاہے کی تنقید ہے؟ آپ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے'' جواب میں برجستہ بولا۔ ''میں دراصل لکھنے کی مشق کرتا ہوں۔''

شمیم کی ایسی تنقیدیں ترقی پسند ادب اور ترقی پسند تنقید کے اثرات کا ہی نتیجہ تھیں۔ شمیم نڈر تھے اور گستاخ ہونے کی حد تک بیباک، اُن کا قلم بھی خوب چلتا تھا اور زبان بھی۔ تحریر و تقریر دونوں میں صناع ازل سے برابر کی اہلیت پائی تھی۔ مزاج میں شگفتگی تو تھی ہی، کبھی کبھی طنز کی کاٹ دوسروں کے لئے ناقابل

برداشت ہوتی تھی۔ مختلف زبانوں کا ادب اُن کے زیر مطالعہ رہتا تھا نہ صرف اُردو، بلکہ انگریزی، فارسی، اور کشمیری ادب بھی۔ انہیں اُردو کے ساتھ ساتھ کشمیری ادب سے والہانہ لگاؤ تھا۔ وہ دِنوں کے اس پودے کو برسوں کے تناور درخت کی صورت میں دیکھنا چاہتے تھے۔ اس لئے اس زبان کے ادب میں جو کچھ شائع ہوتا یا ادبی نشستوں میں پڑھا جاتا تھا اُس میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ کشمیری ادب سے متعلق جو تنقیدیں اُن کے قلم سے نکلی ہیں، وہ اب بھی اس دلچسپی کی بولتی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔

ہم اس مضمون میں کشمیری ادب سے متعلق اُن کی تنقیدی بصیرت پر روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ بیسویں صدی کی چھٹی دہائی کے آخری برسوں میں ریاستی محکمہ اطلاعات نے ''تعمیر'' کے نام سے ایک جریدہ جاری کیا تھا۔ جس میں اُردو کے ساتھ ساتھ چند صفحات کشمیری کے لئے وقف تھے۔ ۱۹۵۹ء میں شمیم احمد شمیم اس کے ایڈیٹر تھے۔ کشمیری ادب سے متعلق اُن کے کئی تنقیدی مضامین پہلے اسی رسالہ میں شائع ہوئے۔ اس سلسلہ کا پہلا مضمون ''کشمیری ناول۔ ایک جائزہ'' کے عنوان سے لکھا گیا، جو ماہنامہ ''تعمیر'' کے ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۹ء کے شمارہ میں شائع ہوا۔ اس میں شمیم، کشمیری ناول کے تاریخی تناظر کا ذکر کئے بغیر، پہلے کچھ، خود اس صنف کے بارے میں تحریر کرتے ہیں اور پھر کشمیری زبان میں اُس زمانے میں لکھے گئے دو تین ناولوں سے متعلق اپنے خیالات سپرد قلم کرتے ہیں۔

''کشمیری زبان میں ناول لکھنے کی ابتداء بقول اوتار کشن رہبر، پروفیسر سری کنٹھ توشخانی نے کی۔ ان کے کشمیری زبان میں لکھے گئے مضمون بہ عنوان ''

"کأشر ناول" شائع شدہ ،سون ادب ۱۹۷۶ء، "کأشر زبان تہٕ ادب نمبر" سے یہ چند سطور ملاحظہ ہوں " ۱۹۲۳۔۱۹۲۴ء منس منز کریٚیہ پروفیسر سری کنٹھ توشخانی لوہوٗر رٕکس اردو رسالہٕ بہار کشمیرس" منز اکھ قسط وار کأشر ناول "ژٕ کی پھیر" یا "لیلا" لیکھنٕ شوٗرو۔ مگر مساما آسہٕن زٕ ے ژورے قسط چھپے مِتیٚ" بہار کشمیر" گو بند تہٕ اتھ ناولہ تہٕ لوٗگ پٕٹھ گرٕ نڈم" ۔اس کا اردو ترجمہ ہے۔ " ۱۹۲۳۔۱۹۲۴ء میں پروفیسر سری کنٹھ توشخانی نے "بہار کشمیر" نام کے لاہور سے شائع ہونے والے اُردو رسالہ میں "ژٕ کی پھیر" یا "لیلا" نام سے قسط وار ایک کشمیری ناول لکھنا شروع کیا تھا لیکن دو چار قسطوں کے چھپنے کے بعد "بہار کشمیر" بند ہوا اور اسی کے ساتھ یہ ناول بھی دم توڑ گیا"۔ سرینگر سے "کونگ پوش" رسالہ جاری ہونے سے کشمیری زبان میں تخلیقات شائع ہونے کا ایک اچھا موقع فراہم ہوا۔ اسیٰ رسالہ میں حبیب کامران "ذات بترات" نام سے ایک ناول قسط وار لکھنے لگا۔ دو ایک قسطوں کے بعد حبیب کامران نے نہ صرف یہ کہ یہ سلسلہ بند کیا بلکہ لکھے ہوئے مسودہ کو بھی حدیث دیگراں کے مطابق ضائع کر دیا۔ اس کے بعد کشمیری زبان کا اس زمانے کا پہلا ناول "دۄد تہٕ دگ" کے نام سے اختر محی الدین نے لکھا۔ ان ہی برسوں میں امین کامل نے "گٹہ منز گاش" اور علی محمد لون نے "أسی تہٕ چھے انسان" نام کے ناول لکھے۔ شمیم احمد شمیم کا مضمون "اُردو ناول ۔ایک جائزہ" ان ہی ناولوں سے تعلق رکھتا ہے۔

اُردو ناول ہو یا انگریزی ناول یہ کسی دوسری زبان کے فکشن میں یہ صنف، اس کی تعریف، ٹیکنیک، زبان اور دوسرے لوازمات یا اس کے اجزائے ترکیبی سے متعلق ان کے خیالات ادب کے دوسرے نقادوں سے مختلف نہیں اور یہ بھی

کوئی نئی بات نہیں۔ جب وہ یہ کہتے ہیں کہ "ناول پوری زندگی پر حاوی ہوتا ہے اور افسانہ زندگی کے ایک شعبے، ایک واقعے یا سانحہ سے متعلق ہوتا ہے" یا یہ کہ "ناول لکھنے کے لئے زندہ رہنا اور زندگی کا مطالعہ کرنا ہی ضروری نہیں بلکہ پوری زندگی پر حاوی ہونا بھی بہت اہم ہے۔" لیکن یہ بات کہ "ناول کی کامیابی کا راز کینو اس کی وسعت سے زیادہ تاثر کی شدت میں مضمر ہے" شمیم کی اپنی سوچ کا نتیجہ ہے۔ کشمیری ناول سے متعلق بحیثیت مجموعی اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "کشمیری زبان میں "ناول تو کیا، افسانے کی ابتدائی شکل کی تلاش کرنا بھی لاحاصل ہے"۔ لیکن جب وہ اسی اقتباس میں آگے چل کر امید آفرینی کے یہ الفاظ نوک قلم پر لاتا ہے کہ "اختر محی الدین، علی محمد لون، صوفی غلام محمد، امیش کول، بھارتی اور دیگر نوجوان فن کاروں کی کاوشوں نے کشمیری افسانے کے شاندار مستقبل کے لئے راہیں ہموار کر دی ہیں۔" تو معاملہ تضاد بیانی کی ذیل میں آجاتا ہے۔ کشمیری نثر کی اُن دنوں کی صورت حال کے بارے میں اُن کی یہ رائے مبنی بر صداقت ہے کہ "ابھی تک کشمیری نثر کا کوئی واضح اسلوب یا اسٹائل نہیں اُبھرا ہے۔ ہر رنگ ایک انفرادیت لئے ہوئے ہے اور ہر نقش ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ رنگوں کی یہ قوس قزح دلکش اور دلفریب ضرور ہے لیکن اس میں توازن کی کمی ہے۔ نثر کیلئے جس پُر وقار سنجیدگی کا ہونا ضروری ہے، وہ ابھی تک پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ اُس زمانے میں کشمیری ادب سے روشناس لوگ اس بات سے بے خبر نہیں کہ ایسی "پُر وقار سنجیدگی" سے ترقی پسند ادب کا دُور دُور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ اس کے علاوہ اس وصف کی توقع اگر علمی مضامین یا تحقیقی و تنقیدی مقالات سے رکھی جائے تو اس سے انکار نہیں، فکشن یا دوسری ہلکی پھلکی اصناف

میں یہ چیز تلاش کرنا بے معنی ہوگا۔ اس کے علاوہ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ ہر ادیب کا اپنا ایک خاص اسلوب یا اسٹائل ہوتا ہے اس میں ہر نقش ایک دوسرے سے مختلف تو ہوگا ہی۔ اگر شمیم صاحب نے تمام نثر نگاروں کے لئے ایک واضح اسلوب کی ضرورت محسوس کی تو اسے حق بہ جانب کیسے سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن جب وہ یہ کہتے ہیں کہ ''اس میں توازن کی کمی ہے'' تو اس کی تردید ممکن نہیں۔ اُن کی یہ رائے بھی کافی وزن رکھتی ہے کہ ''خود ادیبوں میں ایک بے چینی اور بے صبری کی کیفیت پائی جاتی ہے اور وہ صدیوں کی محرومی اور نامرادی کی تلافی چند سال میں کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ایک جست میں اس منزل کو پالینا چاہتے ہیں جس کے لئے دیگر زبانوں کو صدیوں ریاض کرنا پڑا''۔ بے صبری کی جس کیفیت کی طرف شمیم نے اشارہ کیا ہے جب سے پچاس برس گزرنے کے باوجود وہ کیفیت کشمیری ادیبوں میں اب بھی پائی جاتی ہے اور شاید اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم ادب کے کئی شعبوں میں آج دوسری کئی زبانوں سے آگے نہیں تو اُن کی سطح پر ضرور آگئے ہیں۔

شمیم ادب میں تجربوں کے مخالف نہیں لیکن وہ تجربے کو اُسی وقت مفید سمجھتے ہیں جب وہ حالات کا تقاضا ہو اور پڑھنے والوں کے مزاج پر ناگوار نہ گزرے اس سلسلے میں لکھتے ہیں۔ ''پڑھنے والوں کے مزاج اور وقت کے تقاضوں کو نظر انداز کر کے صرف جدت پسندی کے لئے کوئی تجربہ کرنا، ادب میں کوئی صحت مند رُجحان قرار نہیں دیا جا سکتا۔'' وہ ادب کی سربلندی کے لئے کسی زبان میں ناول کے وجود کی اہمیت سے انکار نہیں کرتے لیکن اُن کے خیال میں ہمارا مزاج کشمیری ناول کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ وہ اس حقیقت کا

اعتراف کرنے سے نہیں جھجکتے کہ ''ناول میں خیالات کے اظہار اور واقعات کے بیان کرنے کے لئے زبان میں جو وسعت، گہرائی اور گیرائی ہونی چاہئے وہ کشمیری زبان میں ابھی تک پیدا نہیں ہو سکی ہے۔'' اس کے علاوہ وہ ماحول کو اس لئے بھی سازگار نہیں سمجھتے کہ ناول لکھنے پڑھنے والے دونوں ابھی اس قابل نہیں کیونکہ ناول صرف ناول نگار سے ہی ریاض نہیں چاہتا، پڑھنے والے سے بھی صبر اور سکون کا تقاضا کرتا ہے۔ کشمیری پڑھنے والا قاری ابھی اس صبر آزما مطالعے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ صرف اوّلیت کا اعزاز حاصل کرنے کے لئے ناول کا تجربہ ادب کے لئے بُرا نہیں لیکن ادیب کے لئے نقصان دہ ضرور ہے۔ اس طرح فن کار فن کو ثانوی درجہ دے کر تاریخی اہمیت حاصل کرنا چاہتا ہے۔'' ان باتوں کو ذہن میں رکھ کر وہ کشمیری ادب میں ناول نویسی کا جائزہ لیتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کشمیری زبان کے یہ ابتدائی ناول پیش نظر رکھ کر ہی انہوں نے ایک رائے قائم کی ہے اور جو اصول ناولوں کے مطالعہ ناول نگاروں کے خیالات اور ناول کے ناقدوں کے تحریروں سے اُن کے ذہن میں قائم ہوئے ہیں۔ کشمیری زبان میں لکھے گئے پہلے تین ناولوں کے مطالعہ کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ناول نگاروں نے فنی اصولوں کی پاسداری پر کم اور اس دوڑ میں ایک دوسرے پر سبقت لے کر تاریخی اہمیت کے حصول پر زیادہ توجہ دی ہے۔ لکھتے ہیں ''اختر محی الدین کا دود دگ'' اور امین کامل کا ''گٹہ منز گاش'' تاریخی اعتبار سے ایک اہم کارنامہ ہے لیکن ان کی فنی اور ادبی قدر و قیمت بہت زیادہ نہیں ہے۔ اختر محی الدین کے ناول (اسے ناولٹ کہنا زیادہ موزوں ہوگا) میں ایک ادبی کارنامہ بننے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں لیکن اختر کی جلد بازی اور سہل

پسندی نے اسے ایک تیسرے درجہ کی ادبی تخلیق بنا دیا ہے۔ شمیم اس تخلیق کی خصوصیات کا اعتراف کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتے۔ ملاحظہ ہو" دوددگ" کا موضوع اوراس کے کردار ہماری جیتی جاگتی زندگی کا ایک مرقع ہے۔اس میں ہماری زندگی کا تعفن اوراس کی پاکیزگی ، ہمارے سماج کی صحیح روح اور اس کا غازہ، ہمارے کردار کی بلندی اور پستی ، ہمارے شعور کی پیچیدگیاں اور ہمارے لاشعور کی بھول بھلیاں سبھی کچھ ہے۔" یہاں قاری کی ذہن میں ایک سوال اُبھر سکتا ہے کہ ان خصوصیات کے ہوتے ہوئے شمیم نے اسے تیسرے درجے کی چیز قرار کیوں دیا۔اس کا جواب ایک عیاں حقیقت میں مضمر ہے کہ یہ ناول اُس سرزمین سے رشتہ جوڑنے میں کامیاب نہ ہوسکا، جس سے یہ تعلق رکھتا ہے۔ شمیم ناول کی خصوصیات کے ذکر کے بعد واضح طور پر کہتے ہیں کہ" ہماری معاشرت اور ہماری زندگی کی تصویر نہیں۔" اختر زندگی سے اتنے قریب ہونے کے باوجود زندگی کو نہیں پاسکے۔یہ اس کے خلوص کا نہیں اس کے فن کا عجز ہے۔" اس کے بعد شمیم نے امین کامل کے ناول" گٹہ منز گاش" کا مفصل جائزہ لیا ہے کیوں کہ اُس کے اپنے قول کے مطابق اس نے اسی عنوان پہ قلم اُٹھایا ہے۔اس کے ابتدائیہ سے کامل کے بیان کردہ باتوں کے بعد مختصر طور پر ناول کے پلاٹ کا ذکر کیا ہے اور کامل کے اس دعویٰ کو کہ اس میں داستان گوئی کا انداز اختیار کیا گیا ہے دہراتے ہوئے سوال پوچھتے ہیں کہ ناول میں داستان گو ہے کون؟ یعنی یہ گتھی تو ناول میں سلجھنے سے رہ گئی ہے۔ اگر ماسٹر عبدالسلام کو داستان گو مانا جائے تو کیسے وہ اپنے حدود سے باہر ہو کر خود کہانی کے کردار بن جاتے ہیں۔" اس کے ساتھ ہی شمیم ناول کی تمام خامیوں کا الگ الگ ذکر کرتے ہیں۔ پہلے ٹائم پیریڈ یعنی

زمانہ واردات کو لیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ" یہ ساری کہانی صرف چند گھنٹوں میں مکمل ہوتی ہے اور اس کے مکمل کرنے میں واقعات کی رفتار سے زیادہ مصنف نے اپنے گفتار سے کام لیا ہے"۔اس ناول کے پلاٹ میں واقعات سے زیادہ اتفاقات کا کار فرما ہونا شمیم کو کھٹکتا ہے کیوں کہ یہ ناول کی ایک خامی ہے۔ مصنف کا بانڈی پور سے گاڑی میں سفر، راستے میں گاڑی کا خراب ہونا اور اسی گاڑی میں سوار ماسٹر عبدالسلام سے ملاقات اور داستان کے ختم ہونے کے ساتھ ہی گاڑی کا ہارن بجنا۔ اس صورت حال کے بارے میں یوں رقم طراز ہے"۔ ہوسکتا ہے اڑھائی تین گھنٹے میں یہ سب ممکن ہوسکتا ہو لیکن پڑھنے والا یہ سب کچھ قبول نہیں کرسکتا کیوں کہ وہ اتفاقات سے زیادہ واقعات اور حادثات پر یقین کرلیتا ہے اور جب سارا ناول اتفاقات سے بھرپور ہو تو ناول کا ارتقا واقعات سے زیادہ مصنف کے زور قلم کا ہی مرہون منت ہو جاتا ہے اور گٹہ منز گاش میں یہ ستم کافی نمایاں ہے۔"

اس ناول کے مرکزی خیال یا نفس مضمون کے بارے میں مذہبی رواداری ، بھائی چارے اور سماجی انصاف کے ضمن میں کشمیری لوگوں کا کئی امتحانات میں کامیاب ہونا اور بہت سی آزمائشوں میں سرخرو ہو کر نکلنے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ" روایات چند سال میں قائم نہیں ہوئیں۔ان کی بنیادیں اس تہذیب اور کلچر میں نظر آئیں گی جسے لل دید، شیخ نند رشی، پرمانند، رسول میر اور مہجور نے اپنے خون جگر سے سینچا تھا"...... اور آگے چل کر" کامل صاحب اپنے خلوص اور اپنی دیانت کے باوجود اس جذبے کو کامیابی کے ساتھ پیش کرنے میں کامیاب نہیں رہے ہیں۔" پس منظر اتنا عظیم الشان ہے کہ کامل صاحب کی

کاوشیں بڑی حقیر اور ناچیز نظر آ رہی ہیں۔ اس جذبے کو کرداروں کے ذریعے ابھارنے کی کوششوں کی طرف اشارہ کر کے لکھتے ہیں کہ۔ ''کامل صاحب نے فاطمہ اور رام کرشن کو ہندو مسلم اتحاد کا مظہر بنا کر پیش کیا ہے لیکن مجھے افسوس ہے کہ نہ فاطمہ اس روح کی نمائندہ ہے اور نہ رام کرشن اس جذبے کا مظہر۔'' اس ناول میں کردار نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے مختلف کرداروں کی کمزوریوں کے بارے میں بڑے قابل غور جملے لکھتے ہیں۔ مثلاً۔ ''فاطمہ میں عام لڑکیوں سی کوئی بات نہیں پائی جاتی۔ وہ ایک سنجیدہ، متین اور بڑی خاموش سی لڑکی ہے۔ نوجوانی میں جو شوخی، ترنگ اور شرارت آمیز حیا لڑکیوں میں ہوتی ہے وہ اس سے بالکل عاری ہے...... فاطمہ کی زندگی میں کوئی تلاطم، کوئی ہیجان، کوئی کشمکش یا اونچ نیچ نہیں۔'' حسہ لالہ کو فاطمہ کے لکھے ہوئے خط کے بارے میں ان کے دوٹوک الفاظ یہ ہیں۔ ''فاطمہ کی عمر کی نوجوان لڑکی ایسا خط نہیں لکھ سکتی۔ یہ میرا ایمان ہے۔'' پھر فاطمہ کے پورے کردار کی جراحی کرنے کے بعد شمیم کا یہ فتویٰ کہ ''وہ ہمارے ماحول کی صحیح نمائندہ قرار نہیں دی جاسکتی۔'' اسی کردار میں پائے جانے والے تضاد کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں ''اس شریف الطبع اور مذہب کی پابند لڑکی سے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اپنی عزت و آبرو کو خطرے میں ڈالنے کے لئے تیار ہو جائے اور اپنے منگیتر کے ساتھ جانے کے لئے تیار نہ ہو'' جب فاطمہ رام کرشن کو اپنا خاوند بتاتی ہے تو شمیم اس واقعے کی نسبت سوال پوچھتے ہیں کہ اس سارے واقعے کی منطقی توجیہہ کیوں کر کی جاسکتی ہے؟ فاطمہ رام کرشن کو اپنا بھائی بھی ظاہر کر سکتی تھی۔ اس کے رام کرشن کو اپنا خاوند ظاہر کرنے سے کہانی کا کلائمکس تو بن گیا لیکن خود فاطمہ کے کردار میں کئی گرہیں پڑ گئیں...... اسے کشمیری عورت

کے کردار کی عکاسی کہنا ایک ناقابل قبول مبالغہ ہوگا۔'' بحیثیت مجموعی وہ اس ناول کو ایک طویل افسانہ قرار دیتے ہیں، ناول نہیں۔

۱۹۵۹ء میں اختر محی الدین کا ایک اہم افسانہ ''آدم چھ عجب ذات'' ماہنامہ تعمیر سری نگر کے نومبر، دسمبر شمارہ میں شائع ہوا اور زبردست بحث کا موضوع بنا۔ بقول شمیم ''اختر کے کسی افسانہ پر آج تک اتنی لے دے نہیں ہوئی ہے بلکہ کشمیری زبان کے کسی افسانہ پر آج تک اتنی متضاد، مختلف اور متفرق رائیں قائم نہیں ہوئی ہیں۔ ادبی مجلسوں، نجی گفتگو اور ادیبوں کی غیر رسمی محفلوں میں افسانہ گزشتہ چار مہینوں سے موضوع بحث بنا ہوا ہے۔'' (شمیم نے اس افسانے سے متعلق جو مضمون لکھا۔ وہ ماہنامہ تعمیر کے مارچ ۱۹۶۵ء کے شمارہ میں شائع ہوا۔ مندرجہ بالا جملوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس افسانہ کی ماہنامہ تعمیر میں اشاعت کے صرف چار ماہ بعد ہی یہ مضمون لکھا گیا ہے۔ اس لحاظ سے تعمیر کے مارچ ۱۹۶۰ء شمارہ میں اس کی اشاعت ہونا چاہئے تھی توثیق کے لئے باوجود کوشش کے تعمیر کا فائل مجھے دستیاب نہ ہوسکا)۔

اس افسانے سے متعلق مختلف اور متضاد آرا کا خلاصہ اپنے لفظوں میں یوں بیان کیا ہے۔ ''بعض ادبی محتسبوں نے افسانے کو طنز اور تمسخر کا نشانہ بنا کر اس پر سنجیدگی سے بحث کرنے سے گریز کیا۔ کچھ ''ترقی پسند'' اختر پر رجعت، گریز اور فرار کے الزامات عائد کر کے اپنے فرائض سے سبکدوش ہو گئے اور چند خدا دوست بزرگوں نے اس افسانہ کو فلسفہ تصوف کی تفسیر سمجھ کر مصنف کے حق میں دُعائے خیر کی''

بوقت اشاعت یہ افسانہ مدیر تعمیر کے اس اشاعتی نوٹ کے ساتھ شائع ہوا

تھا۔" اختر کے اس افسانہ سے متعلق صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ ابھی، جب کہ کشمیری افسانے کی عمر جمعہ جمعہ آٹھ دِن بھی نہیں ہوئی، وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ جب کشمیری افسانہ پختگی کی بہت بہت منزلیں طے کر چکا ہوگا۔ اُس وقت بھی " آدم چھُ عجب ذات" کشمیری زبان کے بہترین افسانوں میں شمار ہوگا موضوع اور اسلوب دونوں کے بے باک حسن نے اسے اختر کے فن کا سنگِ میل بنادیا ہے۔"

علی محمد لون نے "انڈین لٹریچر" میں اسے اختر کے بہترین افسانوں میں شمار کیا۔ نور محمد بٹ نے اس کے کرداروں کو غیر فطری قرار دیا۔ دینا ناتھ نادم نے اس پر حقیقت سے گریز کا لیبل لگایا۔ امین کامل نے اختر کے نظریہ حسن کو غیر صحت مند اور ماورائی بتایا۔ رحمان راہی نے ان تمام اعتراضات کو بقول شمیم احمد شمیم "ایڈیٹر تعمیر کے نام اپنے ایک خط نما مقالے میں بڑی خوبصورتی سے سمیٹا۔"

شمیم کا مقالہ بعنوان "کشمیری ادب میں رومانوی رجحانات" اصل میں راہی صاحب کے اسی "خط نما مقالے" سے تحریک پا کر نہ صرف اس میں درج اعتراضات کے جواب میں لکھا گیا ہے بلکہ اس افسانہ سے متعلق اظہار خیال کرنے والے تمام لوگوں کی طرف سے اُبھارے گئے نکتوں کے پیش نظر قلمبند ہوا ہے۔ شمیم صاحب رحمان راہی کے مقالے کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "میں ان اعتراضات کا مفصل جواب دینے سے قبل جناب راہی صاحب کو ان کے سنجیدہ تنقیدی مطالعہ کے لئے مبارک باد دیتا ہوں۔ یہ پہلا تنقیدی مطالعہ ہے جو زبان اسلوب کے لحاظ سے "کشمیری تنقید کا اولین نمونہ کہا جاسکتا ہے۔"

اسکے بعد اس افسانہ میں بیان کئے ہوئے قصے کو مختصر طور پر قلم بند کر کے

اس کے حسن وقبح سے متعلق بات کی ہے۔ آئیے دیکھیں کہ شمیم کا نکتہ رس ذہن اُس کے تنقیدی مطالعہ کے آئینے میں کیسے جھلکتا ہے۔" آدم چھ عجب ذات" میں پلاٹ کو اتنی اہمیت حاصل نہیں ہے جتنی ماحول اور فضا کو، بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ افسانہ پلاٹ سے نہیں بلکہ ماحول اور فضا سے تشکیل پاتا ہے۔" یہ نقاد کا پہلا ریمارک ہے۔

وہ معترضین کو ادبی اصناف کی اصلیت جاننے اور ہر صنف ادب کے خصوصیات پیش نظر رکھ کر تنقیدی تقاضوں پر پورا اُترنے کی کوشش کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ اُن کے خیال میں افسانے کی حقیقت کو سمجھا ہی نہیں گیا ہے۔ یعنی قارئین اس کی اصلیت سمجھنے میں ناکام رہے ہیں۔ مجموعی طور سے تنقید سے متعلق لکھتے ہیں کہ " یہ صحیح ہے کہ سائنسی تنقید کی اساس عقلیت، توازن اور پختہ سماجی شعور پر ہے، لیکن ہر صنف ادب کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے۔ اور اس مزاج کی اصلیت اور ان کے عناصر ترکیبی اور اس کی کیفیت سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ نقاد اپنے شعور کو فن کار کے شعور سے ہم آہنگ کردے...... اور اپنے نظریئے کو فن کار کی نظر سے ہم آغوش کردے۔" اور اس کے بعد راہی صاحب اور دوسروں کی پیش کردہ آراء کو زیر بحث لاتے ہوئے بڑی بیباکی سے بیان کرتے ہیں کہ جناب رحمان راہی نے ایک رومانوی افسانے کو مروجہ حقیقت نگاری کے اصول نقد پر رکھ کر اپنے نظریات اختر کے " نظریئے پر مسلط کرنے کی کوشش کی ہے۔" اس کے بعد شمیم رومانیت کی اصطلاح کی وضاحت کرتے ہوئے، اُردو ادب میں اس کی تاریخ اور رومانوی ادیبوں کے بارے میں مختصر طور پر اظہار خیال کر کے اس کے ڈانڈے اختر محی الدین کے زیر بحث افسانے

سے ملاتے ہیں۔ ان کے اس مختصر اقتباس سے رومانی تحریک کے بارے میں کئی پتے کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ "رومانیت کلاسکیت کے مروجہ ضابطوں اور اصولوں کے خلاف احتجاج کے طور پر پیدا ہوئی۔" رومانوی ادیبوں نے عقلیت، توازن، تقلید اور میانہ روی کی بنیادی قدروں کو اپنے پاؤں کی زنجیریں سمجھ کر انہیں توڑنے کی کوشش کی۔" یا یہ بات کہ "اس کے نزدیک عقل چراغ رہ گزر سے زیادہ نہیں اور جذبات اور وجدان ہی وہ آگ پیدا کرتے ہیں جو کائنات کو نئے اصولوں سے روشناس کرتی ہے۔"

اور جب وہ اختر کے افسانے "آدم چھُ عجب ذات" کی طرف آتے ہیں تو لکھتے ہیں کہ "کشمیری ادب کے نقادوں نے اس افسانے کو حقیقت نگاری کے مروجہ اصول نقد اور معیار پر پرکھ کر کچھ گمراہ کن فتویٰ صادر کردیے ہیں۔ اختر کا زیر بحث افسانہ چونکہ کشمیری زبان کا پہلا عظیم رومانوی افسانہ ہے، اس لئے اس کے تجزیے میں سب نقادوں نے یہ بنیادی غلطی کی ہے۔ یہ اجتماعی فروگزاشت ادبی رومانیت کی تحریک اور تاریخ سے ناواقفیت کی وجہ سے سرزد ہوئی ہے۔"

شمیم نے اختر کے افسانے پر کھل کر بحث کرنے سے پہلے کشمیری ادب میں رومانیت کے پس منظر کا اختصار سے جائزہ لیا ہے۔ اُن کے خیال میں مہجور اور آزاد کے ہاں "رومان اور حقیقت کا بڑا ہی حسین سنگم" نظر آتا ہے اسکے باوجود وہ یہ رائے رکھتے ہیں کہ "کشمیری ادیب میں رومانویت بحیثیت تحریک کے پروان نہیں چڑھ سکی" ...... کشمیر کے لکھنے والے جب اردو ادبی تحریکات سے متاثر ہونا شروع ہوئے تو اردو میں رومانویت کا زور ختم ہو کر حقیقت نگاری کا مکتبہ فکر ایک تحریک بن کر اُردو پر چھا گیا تھا۔" یہی وجہ ہے کہ "انگریزی اور اردو ادب کی

روایات اور تاریخ کے برعکس کشمیری ادب میں صرف کلاسکیت اور حقیقت نگاری کے نظریات کو ہی فروغ ملا۔" ظاہر ہے کہ کوئی بھی صائب الرائے شمیم کے خیالات کی تردید نہیں کرسکتا خاص طور پر وہ لوگ جو ادبی تحریکوں کی تاریخ اور مختلف زبانوں کے ادب میں ان کے اثرات کی واقفیت رکھتے ہیں۔

شمیم احمد شمیم نے اپنے اس مدلل اور مفصل مقالے میں کشمیری ادب کا تاریخی جائزہ بھی لیا ہے تاکہ وہ اختر کے افسانہ پر بات کرنے سے پہلے قارئین کے ذہنوں کی زمین تیار کرے۔ اس تاریخی جائزہ کو جب وہ مارکسی حقیقت نگاری تک پہنچاتے ہیں تو مندرجہ ذیل دلفریب اور شگفتہ انداز میں۔ جس طرح کلاسکیت کا بُت توڑنے کے لئے رومانوی سرفروشوں نے اپنا خون دیا تھا اسی طرح "رومانوی ہوابازوں" کو زمین پر اُتارنے کے لئے حقیقت پسندوں نے بھی ایک زبردست جنگ لڑی ہے۔ رومانوی بغاوت جو عقلیت اور اصول پرستی کا ردّعمل تھی، بہت جلد بے راہ رو اور بے اصولی کا مظہر بن گئی اور اسی لئے حقیقت نگاروں کو منظم ہو کر پھر زندگی اور ادب میں کچھ ضابطے، اصول اور راہیں متعین کرنا پڑیں۔ اتفاق سے یہ ضابطے متعین کرنے کا کام مارکسی حقیقت نگاروں کے ہاتھوں میں پڑ گیا اور ان آئین سازوں نے جو مارکسی زیادہ تھے اور حقیقت نگار کم، ادب اور زندگی کے وہ آداب مقرر کئے کہ زندگی سمٹ کر "ضابطہ فوجداری" ہو کر رہ گئی۔" کلچرل کانگریس کے ذریعے ادبی احتساب کس شدت سے ہوتا تھا، ادیب کیسے مارکسی نظریات کے تابع تھے اور وہ کس طرح بعد میں مارکسی مبلغ ہو کر رہ گئے اور پھر کلچرل کانگریس ٹوٹنے پر کس انداز سے ادیبوں کا شیرازہ بکھر گیا اور بڑے بڑے ادیب بددلی کا شکار ہوگئے بعد میں ان کی

تخلیقات میں کس قسم کی خصوصیات نظر آنے لگیں، اس ساری صورت حال کا ذکر کرتے ہوئے وہ ۱۹۶۰ء میں کشمیری ادب کے منظرنامے پر روشنی ڈالتے ہیں۔

ملاحظہ ہو۔ ''حقیقت پسندی کے خلاف ایک سرکل پیدا ہو گیا اور شاعروں کے ہاں یہ ردِّعمل ایک لطیف رومانویت کی شکل اختیار کر گیا۔ راہی، کاملؔ، فراق اور خود نادم کے ہاں یہ رومانیت ایک مخصوص لب ولہجہ کے ساتھ نظر آئے گی۔ ان کے ہاں کی رومانیت بغاوت کی شکل میں نہیں بلکہ ایک فطری ردِّعمل کے نتیجے کے طور پر پیدا ہوئی ہے اور یہ ردِّعمل اُس نِظامِ فِکر کے خلاف ہے جس نے ادیبوں کو سیاسی مبلغوں کے طور پر استعمال کر کے اُن کی شخصیت اور آزادی کو غصب کرنا چاہا۔'' اس وقت کے کشمیری ادب کے تناظر میں شمیم احمد شمیم اخترؔ کے اس افسانے کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ''آدم چھُ عجب ذات'' اس بغاوت کا بے باک ترجمان ہے جو بنے بنائے مفروضوں اور نظریاتی کُلیوں کے خلاف ایک عرصہ سے شعوری اور غیر شعوری طور کشمیری فن کاروں میں پرورش پا رہی ہے۔'' اُن کے خیال میں اس افسانے سے متعلق رحمان راہی کا ''تنقیدی مقالہ اُسی ذہنیت اور اُسی ''ضابطہ فوجداری'' کی پیداوار ہے، جس کے خلاف یہ افسانہ ایک فنکارانہ صدائے احتجاج ہے۔''

شمیم، رحمان راہی کے تنقیدی مقالہ میں اُٹھائے گئے مختلف اعتراضات کو تختۂ مشق بناتے ہیں اور اس ضمن میں اُن کی تحریر سے حوالے بھی دیئے ہیں۔ راہی صاحب نے اس افسانے کے زبان، اس کی ہئیت، اس کی کردار نگاری اور افسانہ نگار کے مشاہدہ کی داد دی ہے۔ پھر اعتراض کی گنجائش کہاں؟ شمیم نے سب سے پہلے اس افسانہ کے موضوع سے متعلق راہیؔ کے اس خیال سے

اختلاف کیا ہے کہ افسانہ کا موضوع حسن فطری ہے اُن کے الفاظ میں ''حسن فطرت اور اس کے تئیں انسان کا ردِّعمل''۔ شمیم کی رائے یہ ہے کہ افسانہ کا موضوع، انسان ہے یعنی آدم چھُ عجب ذات اور حسن فطرت محض ایک ذریعہ Medium۔ شمیم، اخترؔ کی فِکر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''اخترؔ نظریات پر اعتقاد رکھنے کے ساتھ ساتھ بڑی گہری نظر بھی رکھتا ہے۔ وہ فطرت انسانی کی گہرائیوں میں اتر کر دیکھتا ہیں تو اسے کچھ ایسے بھی رازہائے سربستہ نظر آتے ہیں کہ وہ بے اختیار کہہ اُٹھتا ہے'' آدم چھُ عجب ذات'' (انسان بھی کیا عظیم شے ہے) اخترؔ کا یہ تحیّر اس کے ذہن میں ایک صحت مند تشکیک پیدا کرتا ہے اور یہ تشکیک ''اسے رومانیت کی طرف لے جاتی ہے''۔ اس افسانے کے بارے میں راہی صاحب نے جو اظہارِ خیال کیا ہے اور اخترؔ کے نظریات میں جس شے کو پانے کی کوشش ہے، اس کے حوالے سے شمیم کی نوکِ قلم پر یہ الفاظ آئے'' راہی صاحب نے جس انداز سے اخترؔ کی نظریات کی تلاش میں میم صاحب اور رمضانے کے کردار کو کھنگالا ہے، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک افسانے کا ہر کردار اپنے خالق کا پبلسٹی افسر ہوتا ہے۔ راہی صاحب نے رمضانا اور میم کے کردار کو اخترؔ کا نمائندہ سمجھ کر اختر کے نظریات کو غیر صحت مند قرار دیا ہے۔ راہی صاحب کا یہ تنقیدی نظریہ بجائے خود بہت ہی غیر صحت مند اور غیر ادبی ہے۔ افسانے اور ناول میں کردار فن کار کی تخلیق کے باوجود اپنی ایک انفرادیت، شخصیت اور کردار رکھتے ہیں...... وہ تھانے دار نہیں ہوتا ہے وہ فن کار کے تجربات، اس کی مسرتوں اور اس کی حسرتوں میں شریک ہو کر اس ذہنی انبساط کو عام کر دیتا ہے جو اس کی تخلیق میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ حقیقی معنوں میں یہی نقاد کا

منصب ہے اور تنقید کا بنیادی مدعا بھی''۔ اس کے بعد شمیم بات کو یوں آگے بڑھاتے ہیں۔ ''اُن کے اعتراضات پر بحث کرنے سے پہلے میں اُن سے پوچھنا چاہوں گا کہ کیا زندگی میں توازن اور تناسب ہے؟ کیا ہم سب نارمل انسان ہیں اور کیا ہماری زندگی میں اعتدال اور تسکین ہے جس کا وہ رمضانا سے تقاضا کرتے ہیں؟'' شمیم رمضانا کے کردار کی گہرائی میں اُترتا معلوم ہوتا ہے ملاحظہ ہو۔ ''اُس کی روح میں کوشش اور بے چینی نمایاں ہے۔ وہ اپنے ماحول سے مطمئن ہونے کے باوجود اضطرار اور اضطراب کا شکار ہے۔ وہ ایک پرندے کی طرح اپنے آپ کو پہاڑوں کی چار دیواری میں مقید محسوس کرتا ہے۔ اس کا انداز فکر ایک عام اور نارمل انسان کا سا نہیں ہے۔'' رمضانا کے کردار کو جاندار اور فطری قرار دینے کے لئے شمیم ایسے دلائل سے کام لیتا ہے جو ٹھوس بنیاد رکھتے ہیں۔ رمضانا چونکہ اس افسانے کا مرکزی کردار ہے اس لئے وہی تمام اعتراضات کا نشانہ بھی بنتا ہے۔ اور شمیم کیل کانٹے سے لیس ہو کر اُس کا دفاع کرتے ہیں۔ اور جب میم صاحب کے کردار کو کمزور بتایا جاتا ہے تو شمیم بول اُٹھتا ہے کہ ''میم صاحب کا کردار رمضانا کے کردار کو اُبھارنے اور اس کے اُن جذبات، احساسات و کیفیات کو سمجھانے کی ایک کوشش ہے جو رمضانا اپنے عجزِ بیان کی وجہ سے ملہ سجان اور پڑھنے والوں کو اپنی زندگی میں نہیں سمجھا سکا۔'' جب راہی صاحب میم صاحب کے کردار کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ ''حُسن دیکھ کر آدمی کھو نہیں جاتا۔'' تو شمیم بے دھڑک خود راہی صاحب سے متعلق یوں لب کُشا ہوتے ہیں کہ یہ ''ایک شاعر، ایک نقاد اور ایک ادیب سے زیادہ ایک سائینس دان کی رائے معلوم ہوتی ہے جو انسانی ذہن کو جذبات کی بجائے آلات سے

جانچتا ہے اور اگر واقعی راہی صاحب حسن کو دیکھ کر کھوتے نہیں تو کہنا پڑے گا۔

زنقص تشنہ لبی دان بعقل خویش مناز

دلت فریب گر از جلوۂ سراب نخورد

میم صاحب کے کردار کے بارے میں راہی صاحب کے ہر اعتراض کا جواب شمیم نے ایسے تشفی بخش انداز میں دیا ہے جس سے خود اُن کے بارے میں ادب کے ایک نکتہ رس قاری ہونے اور تنقیدی بصیرت رکھنے کی سند پر مہر تصدیق ثبت ہوتی ہے۔ جب افسانہ نگار میم صاحب کے حسن فطرت سے مبہوت ہونے، اُس کے تحیر اور استعجاب کے لئے لفظ ''پریشانی'' کا استعمال کرتا ہے اور اُس کا نقاد اسے بے محل سمجھتا ہے یا اس سے شکست اور افسردگی مراد لیتا ہے تو شمیم ان الفاظ میں اس کا دفاع کرتا ہے ''افسانہ نگار نے میم صاحب کے مسرت، حیرت استعجاب اور Ecstacy کے لئے پریشانی کا لفظ استعمال کیا ہے اور برمحل استعمال کیا ہے۔ یہاں پریشانی کا لفظ ان معنوں میں استعمال نہیں ہوا ہے جن معنوں میں یہ شکست، افسردگی، کشمکش اور اُلجھنوں سے پیدا شدہ ذہنی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ یہاں یہ اضطرار، بے چینی، مسرت اور جذبات کی اس شدت کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے جو حسن کی سحر طرازیوں سے پیدا ہو جاتی ہے۔'' شمیم صرف اپنی اہلیت اور علمیت کی دھاک بٹھانے کی کوشش نہیں کرتے، اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں کا اعتراف بھی کرتے ہیں جو محض کسر نفسی نہیں ہوتی۔ وہ مصلحت پسندی سے کوسوں دور ہیں۔ اپنی کوتاہیوں کیساتھ ساتھ معترضوں کی کوتاہیوں کی بھی واقفیت رکھتے ہیں۔ مثلاً راہی صاحب کے ایک اعتراض کے سلسلے میں وان گاگ سے متعلق شمیم کے یہ الفاظ کہ ''وان گاگ کے نام سے

میرے ذہن میں صرف ایک مصور کی تصویر آجاتی ہے اور اس کی زندگی کے بارے میں بہت کچھ جاننے کے باوجود مجھے صرف اس کا فن ہی اپنی جانب متوجہ کرلیتا ہے۔ مجھ میں وان گاک کے فن سے محظوظ ہونے کی صلاحیت نہیں ہے بالکل اسی طرح جس طرح راہی صاحب میں بھی نہیں ہے۔"

راہی صاحب کے اعتراضات کا جواب دینے کے بعد اپنی بحث کو سمیٹتے ہوئے "آدم چھ عجب ذات" افسانہ پر شمیم کی مجموعی رائے بڑی حوصلہ افزا ہے۔ یہ مقالہ بے لاگ تنقید کا ایک روشن اور قابل تقلید نمونہ ہے۔ آخر پر اس مقالہ کے یہ جملے بطور حوالہ پیش کرنا مناسب ہوگا۔

"یہ زندگی کی رعنائیوں، اس کے تنوع اور اس کی رنگارنگی کی دلیل ہے کہ اس میں عظیم کرداروں کے ساتھ ساتھ عجیب کردار بھی ملتے ہیں اور اختر نے انسان کی عظمت پر تقریر کرنے کی بجائے ہمیں یہ بتایا ہے کہ زندگی کو خانوں میں نہیں بانٹا جاسکتا۔ انسانوں کو مشینوں کی طرح خانہ بندی نہیں کیا جاسکتا۔ فن کار زندگی کے اچھے اور بُرے پہلوؤں پر فیصلہ صادر نہیں کرتا، وہ انہیں صرف پیش کرتا ہے اور اس طور پیش کرتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو اس زندگی اور ماحول کا ایک حصہ سمجھنے لگتے ہیں اور پیش کرنے کا عمل اتنا سطحی نہیں ہوتا جتنا بظاہر کچھ لوگ سمجھتے ہیں۔"

کشمیری زبان میں افسانہ نویسی کے سلسلہ میں ان کا ایک اور مضمون بنسی نردوش کے کشمیری افسانوں کے دو مجموعوں "بال مرأیو" اور "آدم چھے یتھے بدنام" میں شامل کہانیوں سے متعلق جنوری ۱۹۶۳ء میں کلچرل اکیڈیمی کے اُردو رسالہ "شیرازہ" میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کی ابتداء ان سطور سے ہوتی ہے۔

"میں کشمیری افسانے کی موجودہ رفتار سے مطمئن نہیں ہوں۔ یکے بعد دیگرے کئی افسانوی مجموعوں کی اشاعت اگرچہ اس بات کی دلیل ہے کہ کشمیری زبان میں افسانے بہ کثرت لکھے جارہے ہیں لیکن فنی اعتبار سے کشمیری افسانہ ابھی گھٹنوں کے بل چل رہا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض افسانہ نگاروں نے کچھ اہم افسانے لکھے ہیں لیکن میری نگاہیں "عظیم" افسانوں کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔" ان جملوں میں کشمیری زبان کے تئیں ان کے درد بھرے پیار اور اس کی ترقی کے لئے اُن کے اضطراب کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ادبی اقدار کی دُنیا میں وہ جھوٹے موتیوں کے نہیں سچے ہیروں کے متلاشی ہیں اور یہ بات اُن کے ان الفاظ سے ظاہر ہوتی ہے۔ "میں ابدی زندگی کا قائل نہیں ہوں لیکن ادب میں دائمی و دوامی اقدار میں یقین رکھتا ہوں۔ کشمیری افسانے کی محدود سی کائنات میں مجھے زندگی تو نظر آتی ہے لیکن وہ دائمی اور دوامی قدریں ابھی ناپید ہیں جو زندگی کو اعلیٰ فن کے شیشے میں اُتارتی ہیں۔ میں مستقبل سے مایوس نہیں لیکن حال کی افراتفری سے پریشاں ضروری ہوں۔" یہ تو بحیثیت مجموعی ادب سے متعلق اُن کے انداز فکر اور اس کے ضمن میں اُن دنوں کے کشمیری افسانے کے پورے تناظر پر اُن کی ناقدانہ نظر کی بات ہے۔ لیکن جسے وہ افراتفری کا نام دیتے ہیں اُس کے وجوہات بھی تو ہیں اور وہ وجوہات بیان کرنے سے وہ ہچکچاتے نہیں۔ لکھتے ہیں۔ "ہمارے ہاں کے بہت سے افسانہ نگار افسانے کی ہئیت، تکنیک اور تقاضوں کو سمجھے بغیر افسانہ نگاری کا شغل اختیار کرتے ہیں اور جس طرح شاعروں کی کثرت کو تہذیب وتمدن کے زوال کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح میں افسانہ نگاروں کی اس کثرت کو کشمیری زبان کے لئے ایک خطرہ سمجھتا

ہوں۔''

بنسی نردوش کے افسانوں کے بارے میں شمیم کا اپنا تنقیدی رویہ برابر قائم رہتا ہے وہ تنقید میں صرف تنقیص یا توصیف جیسے عام تبصراتی طریق کار سے الگ پرکھنے کا اپنا انداز رکھتے ہیں اور آل احمد سرور کے لفظوں میں تنقید سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرنا مراد لیتے ہیں۔ شمیم، نردوش کے افسانوں پر نظر ڈال کر پہلے اُن کی افسانہ نگاری کے بارے میں مجموعی طور لکھتے ہیں کہ ''نردوش جدید افسانے کے تقاضوں کو سمجھتے ہیں اور اُن سے حتی المقدور عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔'' پھر ان دونوں مجموعوں کو ''کشمیری زبان کے افسانوی ادب میں ایک خوشگوار اضافہ'' سمجھتے ہیں۔ پھر الگ الگ ان سے متعلق اظہار خیال کرتے ہوں۔ ''بال مرآیو'' مجموعہ نردوش کی پہلی پیش کش ہے۔ ان میں شامل افسانوں کے بارے میں شمیم کی رائے یہ ہے کہ ''ان کہانیوں میں کوئی نئی بات نہیں۔ ان کے موضوعات کافی فرسودہ ہیں اور ان کے ٹریٹ منٹ میں بھی کوئی جدت نہیں''، لیکن اس کے باوجود وہ نردوش کے قلم کی دوسری خوبیوں سے آنکھیں نہیں موندتے، اُن کی دلکشی، ان کے حسن کا اعتراف کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایسے جملے کہ ''یہ نردوش کے انداز بیان کا اعجاز ہے، ان کی زبان میں داستان گوؤں کی لذت اور لہجے میں وہ بے ساختگی ہے کہ کہانی پڑھتے ہوئے ایک طلسم سا بندھ جاتا ہے۔'' شمیم نے اس کے دوسرے افسانوی مجموعے ''آدم چھے بتھے بدنام'' کے افسانے کو نردوش کے ''فنی نکھار اور اس کی فکری پختگی کی عمدہ مثال'' قرار دیا ہے۔ فاضل نقاد نے الگ الگ افسانوں پر بھی رائے زنی کی ہے۔ مثلاً ''جافر خان''، ''شروک'' اور ''کس لوگ داؤس'' جیسے

افسانوں سے متعلق یہ کہنا کہ یہ ''اوسط درجہ کی کہانیاں ہیں'' ان میں زمان کا چٹخارہ اور انداز بیان کی دلکشی ضرور ہے لیکن کوئی ایسی کیفیت نہیں جو روح کو تازگی بخشے یا ذہن کو دعوت فکر دے۔ یہ دلچسپ ہیں، دل نشین نہیں۔ ان کہانیوں میں تخلیق کی روح سے زیادہ ترتیب کا سلیقہ نظر آتا ہے۔'' آخری جملہ صرف شمیم کا قلم ہی لکھ سکتا ہے۔ دوسرے مجموعے کی کہانی ''اُتی رب اُتی سب'' کو وہ سب سے کمزور کہانی سمجھتے ہیں۔ کیوں کہ اس کا کوئی مرکزی خیال نہیں، خوہ مخواہ کہانی کو غیر ضروری طول دیا گیا ہے۔ ''تقصیر گس'' کو وہ موضوع اور مواد کے اعتبار سے ایک جاندار کہانی سمجھتے ہیں لیکن ''غیر معمولی ڈرامائیت پیدا کرنے کے لئے نردوش نے ایسے واقعات کا سہارا لیا ہے جن سے کہانی کی ساری فضا مصنوعی اور غیر حقیقی ہو کر رہ گئی ہے۔'' ''کانسہ موراُون شورے پان'' میں شمیم ''دامودھر کا کردار بڑی خوبی سے نبھاتے'' اور اس کی، پوری نفسیات کو کانتا کے پس منظر میں بڑی خوبی سے پیش کرنے کو بہت سراہتے ہیں۔ اس مجموعے کی دو کہانیوں ''کھوژن'' اور ''براتھ'' کو وہ ''نردوش کی نہیں بلکہ کشمیری زبان کی'' بہترین کہانیوں میں شمار کرتے ہیں۔ اور انہوں نے دونوں کی الگ الگ چھان پھٹک کی ہے اور نردوش کی کہانیوں کے ماحول ان کے کرداروں، ان کی زبان کے حسن و قبح پر گہری نظر ڈالی ہے اور بطور خاص اس لئے نردوش کی تعریف کی ہے کہ ''اُس کے کردار طبقاتی کردار ہو کر نہیں رہ گئے ہیں۔ بلکہ پوری زندگی پر حاوی ہو گئے ہیں'' اور اس لئے کہ وہ ''کسی خاص مکتبہ فکر یا ادبی نظریے کا قائل نہیں۔ انہوں نے واضح کیا ہے کہ جو لوگ ادب کو افادیت اور مقصدیت کے آئینے میں دیکھنے کے خواہش مند ہیں انہیں نردوش کے افسانے پڑھ کر مایوسی ہوگی'' مضمون

کے آخر پر یہ ناقدانہ مشورہ یہ باور کراتا ہے کہ شمیم کو لکھنے والے سے گہری ہمدردی ہے اور وہ اُسے تضیع اوقات سے بچانا چاہتا ہے۔ ایک سچے نقاد میں یہ خوبی ضرور پائی جاتی ہے۔ اُن کا یہ مشورہ متوازن بھی ہے اور سنجیدہ بھی۔ ملاحظہ ہو۔ ''وہ بڑا ذہین اور محنتی ہے۔ اُس کے ہاں زور بیان بھی ہے اور ذوق سلیم بھی لیکن ابھی اُس کے تجربات میں وہ گہرائی پیدا نہیں ہوئی ہے جو اعلیٰ درجہ کی فنی تخلیق کے لئے غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے، مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں نردوش کی زودنویسی اُسے اُس محنت اور ریاض سے محروم نہ کردے جس کے بغیر اچھے ادب کی تخلیق ممکن نہیں۔''

''کشمیری ادب اور ادیب'' کے عنوان سے شمیم کا ایک مضمون ہفت روزہ ''آئینہ'' کے ۲۲ر جنوری ۱۹۶۶ء کے شمارہ میں شائع ہوا۔ جس میں انہوں نے اپنی اُس وقت تک کی تنقیدوں کے بارے میں قارئین کے دلوں میں کچھ شبہات پیدا کردئے۔ انہوں نے مضمون کے آغاز میں جب یہ لکھا کہ'' آج تک موجودہ کشمیری ادب کے متعلق ہم نے مبالغہ آرائی بھی کی اور بہت سے ادیبوں کی شان میں قصیدے بھی پڑھے'' یعنے انہوں نے خود اپنی تنقیدوں پر غیر متوازن، یک طرفہ اور جانبدارانہ ہونے کا الزام عائد کیا۔ شاید اُن کی نظروں میں یہ کوئی گناہ نہ تھا بلکہ کشمیری ادب کو اس دور میں قدم جمانے اور ادیبوں کو زبردست حوصلہ افزائی کی ضرورت تھی۔ اس لئے اب جب کہ یہ گاڑی بڑی خوبی سے چل پڑی تھی تو صاف گوئی سے کام لینے کا وقت آگیا تھا لیکن حق تو یہ ہے کہ یہ صرف شمیم کا ایک پینترا ہے۔ ورنہ اُس نے کسی بھی مرحلے پر صاف گوئی سے کام لینا نہیں چھوڑا جس کا ثبوت اُن کے مضامین سے مل سکتا ہے بہرحال اس مضمون میں وہ قارئین کی توجہ چند امور کی طرف مبذول کرتے ہیں اور انہیں غور و فکر کی دعوت

دیتے ہیں ایک تنقید کی ضرورت اور اہمیت، دوسرے ادیب اور شاعر کی محنت اور ریاض (تیسری بات صحیح تناظر کی پہچان اور ادبی اقدار کی جانکاری) حالات اور ماحول کے تقاضے وغیرہ۔ شمیم نے کچھ اہم ادیب اور شاعر اپنے قلم کے نشانہ پر لائے ہیں۔ زبان اُن کے باقی مضامین کی نسبت زیادہ تیکھی ہے اور بات حسب معمول دوٹوک۔ یہ سطور ملاحظہ ہوں۔ ''کشمیری زبان ابھی تنقید سے ناآشنا ہے۔ ادیبوں کو اپنے فرض منصبی کا احساس دلانے والا اور ادبی کارناموں کو پرکھنے والا کوئی بھی ناقد موجود نہیں۔ نتیجہ یہ کہ اپنی ابتدائی منزل میں ہی اس زبان کا ادب مائل بہ پستی ہے۔ ہر وہ شخص جو گلہ اور حسنہ کی بات کرتا ہے افسانہ نگار ہے اور ہر وہ نوجوان جو چار قافیے جوڑتا ہے شاعر کہلاتا ہے۔ حالات کی رفتار یہی رہی تو زبان بھی گئی اور ادب کا جنازہ بھی نکل چکا۔''

اس کے بعد وہ کئی ادیبوں سے متعلق اپنی رائے دیتے ہیں۔ یہ رائے جچی تلی ہے، وزن رکھتی ہے، معقول ہے اور متوازن ہے۔ نہ صرف ادیب کی دین بلکہ اُس کی ذات کے بارے میں بھی کچھ معلومات بہم پہنچاتی ہے۔ مثلاً علی محمد لون کے متعلق یہ کہنا کہ'' ان کے ڈرامے اوریجنل ہونے کی بجائے غیر ملکی ڈراموں کے چربے ہیں اور اُن کے افسانے محض افسانے بن کر رہ گئے ہیں۔'' اختر محی الدین کے بارے میں یہ بات کہ اُن کے چار پانچ درجن افسانوں میں کوئی تین سنجیدہ افسانوں کے زمرے میں اور باقی مزاحیہ ادب کی ذیل میں آتے ہیں۔'' امیش کول کی نسبت یہ کہ پندرہ سال میں مشکل سے پانچ افسانے لکھے ہیں اور'' انہی چند افسانوں کو لے کر کشمیری ادب میں اپنے مقام کی فکر میں لگے ہیں۔'' امین کامل کے تئیں یہ رائے کہ'' وہ سب کچھ ہیں جو کشمیری زبان کے

سارے ادیب مل ملا کے ہیں......انہوں نے ایک ناول لکھا جو بُری طرح سے ناکام ہوا......کوئی ڈرامہ معیاری تو کیا گوارا حد تک بھی ڈرامہ نہ بن سکا......البتہ افسانہ نگاری میں ان کی اپنی انفرادیت ہے اور اُن کا ہر افسانہ افسانہ ہے۔'' بنسی نردوش پر یہ الزام کہ وہ ''تاریکی میں تیر مارتا ہے جن میں کوئی نشانہ پر بیٹھ گیا تو بیٹھ گیا۔'' صوفی غلام محمد سے متعلق یہ جملے کہ وہ اپنی طرف سے افسانے لکھتا ہے۔ لیکن جب دوسروں سے سُنتا ہے کہ یہ افسانے نہیں بن پائے ہیں تو انہیں خاکہ کا نام دینے لگتا ہے۔''

کشمیری ادب میں تنقید کے کچھ اشارے تو عبدالاحد آزاد کے یہاں نظر آتے ہیں لیکن اس سلسلے میں شمیم کے مضامین کا جائزہ لینے سے بلاخوف تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ کشمیری ادب کا پہلا سنجیدہ اور اہم تنقید نگار کہلانے کا مستحق ہے۔ میں اسے اُردو اور کشمیری ادب کی انتہائی بدنصیبی سمجھتا ہوں کہ پہلے اُسے سیاست نے اپنی آغوش میں لیا اور اس کے فوراً بعد موت نے۔ ورنہ ان کے ہاتھوں تنقید کی ایسی روایت قائم ہوتی جو آنے والے کشمیری تنقید نگاروں کے لئے روشنی کے ایک بلند مینار کی حیثیت اختیار کر لیتی۔

......☆☆☆......

غلام رسول نازکی

شمیم کے نام ایک خط

شمیم! حسبِ معمول تم نے اس دفعہ بھی بہت جلد بازی سے کام لیا۔ تم نے اپنی فطرت کا تقاضا پورا کرلیا۔ مگر یہ نہ سوچا کہ تم سے ملنے والوں کے لئے تمہارے بعد یہاں رہنا کِتنا مشکل ہوگیا ہے۔ میں تمہاری خوبیوں کی تفصیل نہیں بتاؤں گا۔ اس لئے کہ وہ بے شمار ہیں تمہاری خوبیوں کے باوجود مجھے کئی دفعہ تم سے اختلاف بھی ہوا، مگر تمہارا حوصلہ بہت بلند تھا اور مجھے عالی حوصلگی بہت محبوب ہے۔ امریکہ سے واپس آنے کے بعد تم نے مجھ سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں یہ دعا سکھائی ہے کہ الٰہی مجھ پر وہ بوجھ نہ ڈال جسے میں سہہ نہ سکوں، تو مجھے اس آزمائش میں کیوں ڈال دیا، میں نے کہا تھا۔ ''دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر۔''

اور تم خاموش ہوگئے تھے۔ اس کے بعد جس وقار اور حوصلے کے ساتھ تم نے موت کا استقبال کیا، اُس سے ثابت ہوگیا کہ تمہارا ظرف بہت بڑا تھا۔ امریکہ سے جو خط تم نے مجھے لکھا تھا اس میں تم نے کہا تھا کہ میں خدائے بزرگ و برتر کے وجود کا قائل ہی نہیں بلکہ اپنی پیدائش سے لے کر آج تک اُس کی قدرت کے لاکھوں مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔ آج تم اُسی خدائے قُدوس کی بارگاہ میں حاضر ہو، تمہارے اور اُس کے درمیان جو دیوار حائل تھی وہ مسمار ہوگئی ہے اور تم بازی

جیت گئے ہو،تمہارے جانے کے دِن سے اکثر وبیشتر یہ شعر پڑھتا رہتا ہوں۔

بہ پیری مے رسد خارِ بیاباں   ولے گل چُوں جواں گردد بمیرد

کانٹا بوڑھا ہوکر بھی نہیں مرتا۔لیکن پھول جوان ہوتے ہوئے بکھر کر مرجاتا ہے۔میں نے تم سے کہا تھا ایک بوڑھے کی بے مصرف زندگی اگر تمہاری کارآمد و فعال زندگی کا فدیہ ہوسکتی ہے تو یہ بوڑھا اسے اپنی سعادت سمجھے گا۔مگر اللہ کو یہ منظور نہ تھا اس کی مشیت میں ہمارا کیا دخل ہے۔بہر حال مجھے معلوم ہے عالم برزخ میں تُم میرے منتظر ہو اور انشاء اللہ ملاقات ضرور ہوگی،سوچ رہا ہوں اور کیا کہوں، خواجہ رومیؒ نے حضرت شاہِ ہمدانؒ کی وفات پر کیا خوب رباعی کہی تھی۔

از بزم طرف بادہ گساراں رفتند
وزقیدِ جنوں سلسلہ داراں رفتند
نے کوہ کنے ماند نہ مجنوں صفتے
ما با کہ نشنیم کہ یاراں رفتند

غم نصیب
میر غلام رسول نازکی

☆☆☆

ممبئی
19-6-09

برادرم ظفر اقبال صاحب۔آداب!

حسب وعدہ جناب شمیم احمد شمیم کے دو خطوط اور اُن کا لکھا ہوا میری پہلی فلم ''دراڑ'' کا تبصرہ ارسالِ خدمت ہے۔یہ نوادر اَور یجنل ہی بھیج رہا ہوں کیونکہ مجھے لگتا ہے اتنے سالوں تک میں نے آپ کے لئے ہی یہ سنبھال کر رکھے تھے۔خدا کا شکر کہ ٹھیک ہاتھوں تک پہنچ رہے ہیں۔

آپ نے مجھے ہفت روزہ ''پکار'' کا ایک شمارہ پڑھنے کے لئے دیا تھا۔اُس میں ایک مدت کے بعد شمیم صاحب کا نمونہ نگارش دیکھ کر محظوظ ہوا۔کیا شگفتگی اور کیا اندازِ فکر۔ویسے ''پکار'' میں جو دوسرے نگارشات ہیں جذبۂ حق کی ترجمان ہیں۔

آپ بخیر وعافیت ہوں گے
نیاز کیش   ویدراہی

☆☆☆

شمیم احمد شمیم کے خطوط

اپنے عزیزوں کے نام

شمیم صاحب کے دو خط...... وید راہی کے نام

1

۸ر مئی ۶۳ء

پیارے راہیؔ!

ابھی کافی ہاؤس میں قبلہ صراف صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اور تمہاری یاد تازہ ہوگئی۔ تم کیا کر رہے ہو؟

تم جب جا رہے تھے تو میں نے تم سے کہا تھا کہ میرے لئے کچھ امکانات کی کھوج لگانا۔ تم مسکرائے تھے، تمہیں میری بات کا یقین نہیں ہوا، ہو بھی کیسے سکتا تھا! حالانکہ میں نے بڑی سنجیدگی سے کہا تھا۔ اب تمہیں بمبئی میں رہتے تقریباً دو سال ہو گئے!۔ تمہیں وہاں کی زندگی کا کچھ کچھ اندازہ ہو گیا ہوگا۔

مجھے لکھو کہ وہاں کے سمندر میں کتنی گہرائیاں ہیں۔ فلم لائن میں میرے لئے کیا امکانات ہیں۔ احمد عباس کو میں جانتا ہوں، دلیپ کمار سے میرے مراسم تھے، لیکن اب نہیں ہیں۔ کیا کچھ کیا جا سکتا ہے۔

میں اپنی سنہری زنجیریں توڑنے کے لئے بے چین ہوں۔ مجھے مفصل طور لکھو کہ وہاں کیا امکانات ہیں، تم کیا کر سکتے ہو؟ میں ان دنوں فیلڈ پبلسٹی آفیسر ہوں، اپنے مستقبل سے مایوس اور اپنے حال سے بیزار!

تمہارے خط کا انتظار رہے گا۔

تمہارا اپنا

شمیم

2

۸؍اگست ۶۵

پیارے راہیؔ!

میں آج ہی علی گڑھ سے لوٹا ہوں۔ خدا خدا کر کے امتحان کی قیامت ٹل گئی۔ اب ایل، ایل، بی ہو گیا ہوں۔ نتائج نکلنے پر وکالت کرنے کا ارادہ ہے۔ میں نے تم سے پہلے بھی وعدہ کیا تھا کہ "آئینہ" باقاعدگی سے بھیجتا رہوں گا۔ پھر تمہارا پتہ کھو گیا، اور میں خود بھی علی گڑھ کے صحراؤں میں کھو گیا۔ اب میں مستقل طور پر واپس آ گیا ہوں۔ اسلئے امید ہے کہ "آئینہ" تمہیں باقاعدگی سے ملتا رہے گا۔ تمہارے بارے میں کچھ معلوم نہیں کہ کیا کر رہے۔ کبھی کبھی اپنی خیریت کی اطلاع دیا کرو۔

"آئینہ" کے متعلق تمہارے رائے کا انتظار رہے گا۔
کبھی "آئینہ" کے لئے کچھ لکھو۔ یہاں بڑی دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔
میرے متعلق کوئی خدمت ہو

تمہارا
شمیم

"آئینہ" کے کچھ شمارے بھیج چکا ہوں۔ موصول ہونے پر اطلاع دے دینا۔

............................☆☆☆....................

شمیم صاحب کا خط......رقیہ جی کے نام

ڈیر رقیہ!

خدا تم سب کو سلامت اور خوش رکھے!

کل حوّا کے نام خط لکھ چکا ہوں۔ توقع ہے کہ یہ خط تمہیں عید سے ایک دو دن قبل یا بعد میں ملے، اسلئے عید مبارک قبول کر لو، اور رشتہ داروں، دوست احباب اور اہل محلہ بلکہ اہل شہر کو میرا عید مبارک کہہ دو۔ کل سے یہاں کے ہسپتال میں میرے ٹسٹ شروع ہو گئے ہیں۔ ان میں سے کئی تو پہلے بھی ہو چکے ہیں لیکن کچھ نئے بھی ہیں۔ دو چار دِن ہی یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا، اور اسکے بعد ڈاکٹر یہ فیصلہ کریں گے، کہ وہ ہندوستان میں ملنے والے علاج کو برقرار رکھیں گے یا کوئی نئی لائن اختیار کریں گے۔ بہر کیف، مرا اپنا ذاتی رویہ تو یہ ہے، کہ میں محض تم لوگوں کے اعتقاد اور اللہ تعالیٰ کے بے پناہ رحم و کرم کے سہارے اتنی مسافت طے کر آیا ہوں۔ ورنہ بیماری کے علاج کے لئے کون دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک آ پہنچتا ہے۔ دوسرے الفاظ ہی میں دواؤں اور ٹسٹوں کے مقابلے میں تمہاری اور بہت سے انجانے دوستوں کی دعاؤں پر زیادہ بھروسہ رکھتا ہوں۔ دیکھئے اسکے ہاں ان دعاؤں کی کہاں تک شنوائی ہوتی ہے۔ لیکن یہ بات بجائے خود قابلِ اطمینان ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے سامان پیدا کرائے، کہ ایک تو مجھے یہاں آنے کا موقع ملا۔ اور دوسرا ماحول بالکل اپنے گھر کا۔ ڈاکٹر سجاد اور ان کی بیگم میرا اسطرح خیال رکھتے ہیں کہ میں بیان بھی کرنا چاہوں، تو نہ کر سکوں گا۔ ہسپتال یہاں سے بیس بائیس میل دور

ہے۔ میں صبح سجاد کے ساتھ کار میں جاتا ہوں۔ پھر زاہدہ دوسری گاڑی لے کر مجھے ہسپتال سے لے آتی ہے۔ کیونکہ اس شہر میں بس کا کوئی انتظام نہیں ٹیکسی بھی مشکل سے نظر آتی ہے۔ دونوں میاں بیوی ایک تو تین چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں اور دوسری میری۔

گرمی یہاں خاص پڑتی ہے۔ سڑک پر چلنا دشوار، بالکل دہلی والی گرمی، لیکن کاریں بھی ایر کنڈیشنڈ بھی اور مکانات بھی۔ خدا کے فضل سے میری صحت میں کچھ ٹھہراؤں آگیا ہے۔ صرف ایک دِن کے لئے بخار آیا تھا لیکن ابھی اپنی صحت کے بارے میں میں حتمی طور مطمئن نہیں ہوں۔

یہاں کچھ کشمیریوں سے بھی ملاقات ہوئی، پرسوں کا چرو صاحب کی صاحبزادی کے ہاں کھانے پر گئے تھے۔ میں ابھی یہ خط مکمل کرنے کے بعد ایک اور اہم ٹسٹ کے لئے جا رہا ہوں۔ انشاء اللہ سب کچھ تسلی بخش طریقے پر ہوگا۔ وسیم نے باقاعدہ کالج جوائن کر لیا ہوگا۔ اب تو بچوں کے سکول بھی کھل گئے ہوں گے۔ سب بچوں اور بڑوں کو فرداً فرداً میرا پیار اور سلام دینا۔

امرت اور رانی کو میرا آداب۔ مونٹی کو خصوصی طور پیار۔

امید ہے کہ سعید صاحب نے اپنا کام باقاعدگی سے شروع کر دیا ہوگا۔ یہاں ہندوستان کے متعلق کوئی خبر نہیں ملتی، اسلئے سعید صاحب سے کہہ دیجے، کہ جب وہ کبھی خط لکھیں، تو ایک مختصر سا خبر نامہ بھی اس میں شامل کیا کریں۔ تم اپنی ان تمام دوستوں کو میرا بہت بھرا سلام پہنچا دینا، کہ جن کی محبت کبھی کبھی تمہاری محبت کی حدوں سے بھی تجاوز کرتی ہے۔ میرے پاس واحد بانہالی کا ایڈریس نہیں ہے۔ اپنے خط میں لکھ بھیجنا، باقی کل،

فقط تمہارا بھائی...... شمیم

شمیم صاحب کا خط...... محمد سعید ملک کے نام

ڈیر سعید!

السلام علیکم۔ اپنے علاج کے بارے میں تفصیلات پارمو صاحب کے نام خط میں لکھ چکا ہوں۔ اور اس میں آپکو آئندہ پروگرام کی بھی ایک جھلک یا اندازہ ملے گا۔ یہ خط آپ کو اسلئے لکھ رہا ہوں، کہ میری طرف سے ٹھاکر دیوی داس کا شکریہ ادا کیجئے، کہ ان کی طرف سے بھیجے گئے دو سو ڈالر اور ان کے دوست بدیو ساہنی کی طرف سے ایک سو ڈالر مل گئے۔ ان سے کہہ دیجئے کہ میں جان بوجھ کر انہیں براہ راست خط نہیں لکھ رہا ہوں، کہ کہیں دشمنوں کو اس معصوم سی حرکت پر ان کی نیت پر شبہ کرنے کا موقع نہ ملے۔ انہیں میری طرف سے پارلیمانی نشست کے لئے نامزدگی کے لئے بھی مبارک باد دیجئے! افسوس کہ میں ان کے حق میں پروپیگنڈہ مہم میں حصہ نہیں لے سکتا۔ لیکن میں چاہوں گا کہ وہ کامیاب ہو کر ریاستی سیاست کے کنوئیں میں سے نکل جائیں اور ملکی سیاست کے سمندر میں اپنی زیرکی اور تیراکی کے جوہر دکھائیں۔ ٹھاکور صاحب کو زبانی میرا یہ پیغام پہنچا دیں کہ اس نازک مرحلے پر انہوں نے جس انسانی ہمدردی اور مروت کا ثبوت دیا ہے۔ اس کے لئے میں بے حد شکرگذار ہوں۔ جن لوگوں نے پیسے بھیجنے کے وعدے کئے تھے، ان میں ابھی تک صرف ٹھاکر صاحب ہی نے اپنا وعدہ پورا کیا ہے اور یہ بڑی بات ہے کہ اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود وہ اس میں اپنا یہ وعدہ بھلا نہیں پائے۔

من موہن فوطیدار کے متعلق سنا ہے کہ اسے سزا ہوگئی ہے۔ اور بڑی سخت سزا، یہ سن کر بھی بے حد افسوس ہوا فوطیدار سے مل کر اسے میرا یہ پیغام دیجئے، کہ

مجھے یہ خبر سن کر بے حد صدمہ ہو گیا۔ اور میں اسے محض انتقام برگی کی کارروائی سمجھتا ہوں۔ تاہم اسے ہمت اور حوصلے سے کام لینا چاہیئے۔ انشاء اللہ یہ مشکل بھی حل ہو جائے گی۔ اور گھر کے کیا حالات ہیں! امید ہے کہ سبھی لوگ بخیر و عافیت ہیں۔ میں اپنے علاج، اپنی جسمانی حالات، اپنی نینداور اپنی بھوک سے مطمئن ہوں۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ لوگ مطمئن رہیں۔ ریزو صاحب سے برابر مراسلت کا سلسلہ جاری ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ قاسم صاحب کچھ پریشان سے لگ رہے ہیں کہ میں ان کے بیٹے پر کچھ زیادہ بوجھ بن گیا ہوں۔ اب انہیں کیوں کر سمجھاؤں کہ خود سجاد میرے یہاں قیام پر اس درجہ بامید ہے، کہ وہ مجھے ایک ہفتے کیلئے نیویارک جانے کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ آپ اپنے طور انہیں یہ بات سمجھانے کی کوشش کیجئے۔ منیر نے پچھلے ہفتے جموں سے فون کیا تھا۔ لیکن لائن اس درجہ خراب تھی کہ سلام علیکم اور ایک دوسرے کے نام کے سوا کچھ سنائی نہ دیا۔ فتحکدل والے محمد امین نے تین روپے خرچ کر کے دعاؤں سے بھرپور ایک خط لکھا تھا۔ اس بے چارے غریب کو کسی نے aerogram کیوں نہیں دیا؟

گھر میں سب کو میرا سلام کہہ دیجئے۔ مامی جی کے جغرافیے کے متعلق کسی نے ابھی تک کچھ نہیں لکھا۔ وہ کہاں ہے کس کے پاس ہے۔ وسیم، منا، مونٹی اور مونٹی کے سارے خاندان کو میرا سلام، سنا ہے کہ ملک بھر میں اندرا گاندھی کا بڑا زور ہے۔ بڑے لوگ اپنی اپنی رسیاں تڑا کر ان کے ساتھ مل رہے ہیں۔ ایک ہلکا پھلکا خبرنامہ ضرور لکھ بھیجئے۔ رقیہ سے رات میں باقاعدہ ٹیلی فون پر تقریباً پانچ سات منٹ بات ہوئی، معلوم ہوا کہ وہ من موہن کے فون سے بات کر رہی تھی۔

فقط، آپ کا اپنا.....شمیم

شمیم صاحب کا خط.....غلام محمد جالب کے نام

۲۳ر اگست

قبلۂ محترم!

عید مبارک۔ امید ہے کہ آپ سب لوگ بخیر و عافیت ہوں گے۔ خدا کے فضل اور دوست احباب کی دعاؤں کے صدقے میں بھی بعافیت ہوں۔ یہ تو آپ کو معلوم ہو چکا ہوگا کہ یہاں ہسپتال میں میرا علاج شروع ہو چکا ہے اور غالباً ستمبر کے دوسرے یا تیسرے ہفتے تک اسکے نتائج ظاہر ہونا شروع ہوں گے۔ اسکے بعد ڈاکٹر یہ رائے قائم کریں گے کہ مجھے یہاں رہ کر مزید علاج کرنا ہوگا یا ادویات ساتھ لے کر ہندوستان میں اس سلسلے کو جاری رکھنا ہوگا۔ فی الحال علاج کے اثرات خاصے حوصلہ افزا نظر آتے ہیں۔ اور میرے معالج مطمئن نظر آتے ہیں۔ میرے حق میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ قاسم صاحب کے صاحبزادہ کی وجہ سے مجھے ہسپتال کے بھاری اخراجات سے نجات مل گئی ورنہ امریکہ میں زکام جیسی معمولی بیماری پر بھی ہزار دو ہزار ڈالر خرچ ہو جاتے ہیں۔ اور پھر دونوں میاں بیوی میرا اسطرح خیال رکھتے ہیں، کہ جیسے ان کے ساتھ میرا سماجی نہیں، بلکہ خون کا رشتہ ہو۔

والدہ صاحبہ کو ہر طرح سے اطمینان دلایئے، کہ میں انشاء اللہ ٹھیک ہوں۔ اور روز بروز بہتر ہوتا جا رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی دعائیں اوران کی نیک

خواہشات میری ہر مشکل حل کردیں گی۔ مجھے اگر کوئی پریشانی ہے، تو وہ ہلال احمد کی ہے، کہ جس نے میری طرح ہمت اور حوصلہ ہار دیا ہے، کہ اسکے تصور سے بھی فکر دامن گیر ہوتی ہے۔ میری طرف سے ہلال سے کہد یجئے، کہ زندگی صرف ہمت، حوصلہ اور صبر کا نام ہے۔ ورنہ مجھ پر پچھلے دو تین سال سے جو جو قیامتیں گذری ہیں۔ کسی اور پر گذرتیں۔ تو وہ کب کا میدان چھوڑ کر بھاگ چکا ہوتا۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہمت ہارنے یا آنسو بہانے سے دنیا کی کوئی مشکل یا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ ان پر جو کچھ گذری ہے۔ اسکی شدت اور سنگینی کا احساس کسے نہیں۔ لیکن کیا انہوں نے اس بات پر غور کیا، کہ جو ان کے ساتھ ہوا ہے، وہ آتے دن ہزاروں اور لاکھوں لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے، ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔ پھر ایک غم کو ساری زندگی کا روگ بنا کر اپنی زندگی کو جہنم اور اپنے عزیز و اقارب کی زندگی کو اجیرن بنانا کہاں کی دانش مندی ہے موت اور زندگی، زندگی اور موت، یہ تو زندگی کا زیر و بم ہے۔ پھر انہوں نے اپنے سینے کو اتنا داغ دار کیوں بنا دیا ہے؟ مجھے افسوس ہے کہ مجھے ان کے ساتھ کھل کر کبھی بات کرنے کا موقع نہیں ملا لیکن ان سے کہد یجئے، کہ اپنی حالت سے زیادہ مجھے ان کی حالت پراگندہ کئے ہوئے ہے۔ میں تو سمجھتا تھا کہ وہ میرا کچھ بوجھ ہلکا کریں گے۔ لیکن انہوں نے تو اپنی زندگی کو ہی بوجھ بنا دیا ہے۔

واشنگٹن سے کچھ دن ہوئے علی محمد خان نے فون کیا تھا۔ یہ غالباً ملک عبدالغنی سوپور کے وہ رشتہ دار ہیں کہ جس کے متعلق انہوں نے اس دن ایئر پورٹ پر بتایا تھا۔ مجھ سے تو بات نہیں ہوئی، کیونکہ میں اسوقت گھر پر نہ تھا۔ لیکن میری طرف سے منصور احمد، منظور احمد، بشیر، جاوید سب کو میرا اسلام پہنچا دیں۔ ثریا جی، سعیدہ، مسز منصور اور نسیمہ بھابھی سب سے کہدیں کہ میرے حق میں مسلسل دعا کرتے

رہیں۔ یہ دعاؤں کا ہی نتیجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے اسباب پیدا کر لئے کہ میں یہاں تک علاج معالجے کے لئے پہنچ گیا۔

برادرم بشیر احمد کو بھی میرا اسلام اور غلام احمد کو بھی، خط ملتے ہی ریذیڈنسی روڈ والوں کو اسکے پہنچنے کی اطلاع دیں۔ میں اپنی جانب سے یہ کوشش کرتا ہوں۔ کہ میرا خط روز ہی انہیں ملے، معلوم نہیں کہ میری یہ کوشش کامیاب ہوتی ہے یا نہیں۔ مجھے ابھی سرینگر سے صرف ایک خط موصول ہوا ہے اور وہ بھی شیام جی کول کا، ہمارے ہاں کل عید منائی جا رہی ہے۔ اب کی بار کاروبار میوہ کا کیا حال ہے؟

فقط! آپ کا اپنا

شمیم

☆☆☆

اِنتخاب......

(شمیم احمد شمیم کے ادب پاروں سے)

شمیم احمد شمیم

اردو زُبان کی بے زبانی

وِودبھارتی کو کشمیری یا اُردو میں نشر کرو!

جواہر لال نہرو اپنے زمانے کے ہندوستان کے سب سے بڑے مدبّر، بالغ نظر اور دور اندیش سیاست داں تھے۔ اگر کسی کو اس کے بارے میں شک رہا تو وہ مرکز کی سرکاری زبان کے سلسلے میں ہونے والے ناخوش گوار واقعات سے دور ہو گیا ۔زبان کے مسئلے پر بات کرنا تلوار کی دھار پر چلنا ہے۔ چراغ بیگ کے پاؤں ہی نہیں گردن بھی بار ہا تلوار کی دھار پر رہ چکی ہے۔ اس لئے آج ذرا اس مسئلے کو بھی چھیڑا جائے تو کیا حرج ہے، چراغ بیگ کو یوں بھی اس مسئلے سے گہری دلچسپی ہے کیونکہ اُردو ریاست کی سرکاری زبان ہے، ملکی پیمانے پر اُردو کے ساتھ انصاف کرنے کے وعدے بہت کئے گئے لیکن ابھی تک اس کے ساتھ صرف ناانصافی ہی ہوئی ہے اور ناانصافی بھی ایسی ویسی نہیں اِتنے بڑے پیمانے کی کہ اس کا جواب نہیں اور اس کے ثبوت ہر جگہ اس طرح بکھرے پڑے ہیں۔ جس طرح رشوت خوروں کی جائیدادیں، جو حکومت وقت کے علاوہ سب کو نظر آتی ہیں۔ اُردو کے ساتھ ناانصافی ہندوستان میں ہو رہی ہے اسے معلوم کرنے کے لئے کسی کمیشن کی

ضرورت نہیں۔ آکاش وانی کے کسی سٹیشن کے پروگرام سنیئے، ہر پروگرام چیخ چیخ کر کہے گا۔

"دیکھو مجھے، جو دیدہ عبرت نگاہ ہو"۔ قوم کی مٹی پلید کر کے اس کو "کوم" کا رتبہ دیا جائے گا۔ آپ کو احساس دلایا جائے گا کہ آپ کی آنکھیں خیرہ نہیں بلکہ "کھیرہ" ہوتی ہیں پہلی بار جب آپ "یہ فریب" سنتے ہیں تو کان کھڑے ہوتے ہیں لیکن کثرت سماع سے یہ حقیقت آپ واضح ہو جاتی ہے۔ کہ "یہ فریب" کی خالص آکاش وانی قسم ہے۔ جو کشمیر کے لئے مخصوص ہے۔ یہ نہیں کہ "ف" کی آواز نکالنے سے پیشہ ور براڈ کاسٹر معذور ہے۔ ایسا نہیں ہے "پھرکی" بجائے "فرا کثر آپ سنیں گے اور تلفظ کی غلطیوں کا تو کوئی حساب ہی نہیں۔ کیرل کو کیرالا "نیم چڑھا" "کر دینا خبر چیوں" "خبریں پڑھنے والوں" کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ ریڈیو کشمیر کی خبروں میں ایک بار خبر چی کا نام آتا تھا، اور باقی ہر جگہ صرف کھالدِ کشمیر بکھشی گلام محمد کا نام آتا تھا اور اس کثرت سے آتا تھا کہ اگر کبھی کسی خبر میں وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو پڑھنا ہوتا تھا تو خبر چی کے منہ سے اکثر حسبِ عادت وہاں بھی بکھشی گلام محمد نکل جاتا تھا اور تو اور شمس الدین صاحِب کے نظام شمی میں بخشی صاحب ہی اپنے ریڈیو کی خبروں کے مرکز ہوتے تھے اور اِن کے جموں سے سرینگر اور سرینگر سے بڈگام کے دوروں کی خبریں ہوتی تھیں۔ جب صادق صاحِب نے حکومت کی ذمہ داری سنبھالی تو کئی بار خبر چی نے حسب عادت "جناب بکھشی گلام محمد" کہا اور معافی مانگ کر نام درست کیا۔ ایک بار تو بخشی غلام محمد صادق کا نام بھی ریڈیو کی خبروں میں نشر ہوا یا لوگوں نے اس کی بڑی سیاسی تاویلیں کیں۔ بخشی غلام محمد صادق کا نام سن کر رشوت خور افسروں کے ایک گروہ نے اِس کو آسمانی

آواز یعنی واقعی آکاش بانی (آکاش وانی) مان لیا اور طے کر لیا کہ اب حکومت میں دونوں کا برابر کا حصہ ہوگا...... دوسروں کو کیا کہوں، چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ وہی حال اس وقت چراغ بیگ کا بھی ہے۔ بات شروع کہاں سے ہوئی اور پہنچی کہاں تک۔

ذِکر جب چھڑ گیا قیامت کا
بات پہنچی تیری جوانی تک

ہر کشمیری کے ذہن میں ایک بات پیوست ہو گئی ہے۔ کہیں بھی کوئی دھاندلی ہو۔ گھپلا ہو بخشی غلام محمد کا ذکر آجاتا ہے۔ اب چراغ بیگ بھی کشمیری ہے۔ اس لئے ...... چھوڑیئے اس قصے کو، اگر خدانخواستہ چراغ بیگ ریاست کا وزیر اعظم یا وزیر مملکت برائے اطلاعات و سیاست ہوتا تو اِس کے ذکر کے بغیر آکاش وانی کا خبر نامہ پورا نہیں ہوتا اور خبر چی نے اب تک اِس کو "چراگ بیغ" ضرور بنا دیا ہوتا۔ جس طرح بخشی غلام محمد کو "بکھشی گلام محمد بنا دیا ہے، نہ یقین ہو تو کشمیری خبروں کا کوئی ایسا بلیٹن سنیئے جس میں موصوف کے خلاف بدعنوانیوں کی تفتیش کے لئے قائم ہونے والے کمیشن کی کارروائی ہو، معاف کیجئے یہ خبر چی کی معافی نہیں ہے، موصوف کا ذکر خیر "فر" آگیا۔ اس وقت شخص مذکور کا ذکر کرنا مقصود نہیں ہے اور نہ زبان کی بات آکاش وانی کے خبر چیوں نشر چیوں کی مشہوری کے لئے کی گئی تھی، اُردو کے لئے صحیح تلفظ وہی ہے جو مستعمل ہو اور یہ غلط العام ہی فصیح ہوتا ہے، چنانچہ اُردو کے تمام الفاظ کو فصاحت کی بلند سطح پر لانے کے لئے ریڈیو، ان کے تلفظ کو مسخ کرنے کا کام بڑی تن دہی سے انجام دے رہا ہے وہ دن دور نہیں جب اُردو کی دو شاخیں ہو جائیں گی۔ ایک صحیح زبان اور دوسری ریڈیائی زبان اور ریڈیائی اردو سیکھنے کے لئے الگ

درس گاہیں کھولی جائیں گی جہاں زبان کو مسخ کرنے کے اصولوں پر تحقیق کا کام ہوگا اور یہیں کے فارغ التحصیل طالب علموں کو اعلانچی مقرر کیا جائے گا۔ غلط تلفظ والوں کو براڈ کاسٹ کے لئے منتخب کرنا اردو دشمنی کے جذبے کی غمازی کرتا ہے، اگر اس کا مقصد اردو دشمنی کے علاوہ کچھ اور ہوسکتا ہے کشمیریوں کا تلفظ ایسا ہی ہوتا ہے اور وہ صرف ایسے ہی تلفظ کو سمجھ سکتے ہیں۔ یہ بات چراغ بیگ نے ریڈیو کے ایک ذمہ دار آفسر کے منہ سے سُنی، چراغ بیگ اس صفحے پر اعلان کرنا چاہتا ہے کہ غلط تلفظ والے شیخ چلی کشمیر کی بہترین روایات کے نمائندے نہیں ہیں۔ بلکہ "ہمارے ماتھے پر کلنک کا داغ ہیں۔"

ریڈیو کی اردو دشمنی کی کوئی اور مثال چاہئے تو موسیقی کے پروگرام سنیئے، میر تقی میر، غالب، مومن، انشا، داغ، امیر مینائی، دیا شنکر نسیم، حسرت موہانی، جگر مراد آبادی، آتش، اکبر الہٰ آبادی، فراق گورکھپوری، آنند نرائن ملا، مجاز، جذبی اور دوسرے سینکڑوں شاعروں کا کلام یا تو بالکل ہی نہیں یا پھر شاذو نادر ہی سننے میں آئے گا۔ ترلوک چند کوثر' امر چند قیس وغیرہ ہم کے کلام (اور اکثر گھٹیا کلام) کی بھرمار ملے گی۔ گویا ریڈیو کے لئے اِن ہی کا کلام اُردو شاعری کا بہترین کلام ہے۔ زبان نہ کسی طبقہ تک محدود رہی ہے اور نہ کسی مذہب تک۔ کسی مذہب تک عملی طور سے حکومتِ ہند اور آل انڈیا ریڈیو اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان سمجھتے ہیں۔ یہ بڑی تکلیف دہ بات ہے کہ یوپی' دہلی اور بہار میں اُردو کی جنم بومی۔ یو، پی، دہلی اور بہار سے اُردو کو نِکالا نہ جاتا تو۔ اس کو کشمیر میں پناہ لینے کی ضرورت ہی نہ پڑتی...... آل اِنڈیا ریڈیو کے اسٹیشنوں سے اُردو کے پروگرام بہت ناکافی ہوتے ہیں عام طور سے ان پروگراموں میں مسلمانوں کو مخاطب کیا جاتا ہے، اور مسلمانوں کے مذہبی

تہواروں پر بھی صرف اسی زبان میں پروگرام ہوتے ہیں۔ ان پروگراموں کا معیار بھی نہایت گھٹیا ہوتا ہے کیونکہ یہ صرف خانہ پوری کے لئے ہوتے ہیں۔

چراغ بیگ ریاست کے وزیر اعظم سے اس معاملہ میں مداخلت کرنے کا مطالبہ کرتا ہے، اگر وہ کل ہند پیمانے پر ریڈیو کی غلط پالیسیوں پر مداخلت نہیں کر سکتے تو کم از کم جہاں تک ان کے گھر (ریاست) کا تعلق ہے وہ غلط روّی کو روک سکتے ہیں چراغ بیگ جناب غلام محمد صادق سے مطالبہ کرتا ہے! ریڈیو کشمیر کے وودھ بھارتی کے پروگراموں کی زبان یا تو کشمیری ہو یا اُردو کسی اور زبان میں اس پروگرام کو نشر کرنا بہت ہی غیر صحت مند سیاسی اثرات کا موجب ہو رہا ہے، اگر اہل کشمیر فطرتاً امن پسند اور صلح جو نہ ہوتے تو وودھ بھارتی کی زبان کشمیر میں ناگوار اثرات پیدا کر سکتی تھی۔

(تیسرا صفحہ آئینہ۔ ۷/ مارچ ۶۵ء)

☆☆☆

شمیم احمد شمیم

فیض احمد فیضؔ کے ساتھ ایک شام

لاہور میں میری رہبری اور رفاقت کا فرض میرے چچازاد بھائی اعجاؔز کے سپرد ہوا تھا۔ وہ انگریزی اور پولیٹکل سائینس میں ،ایم۔اے کرنے کے بعد پی ،سی ،ایس (پاکستان سول سروس) کا امتحان دے چکا تھا اور اب اس نتیجے کے انتظار میں اردو ادب سے شناسائی کر رہا تھا۔ اعجاز کی عمر مشکل سے ۲۵، ۲۶ برس کی ہوگی لیکن اِسکی ذہانت ، گہرے مطالعے اور زبان پر غیر معمولی قدرت نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ پاکستان پہنچنے تک مجھے اِسکے وجود کا بھی علم نہیں ہوا تھا۔ لیکن پہلی ہی ملاقات میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اعجاز سے میری بہت پرانی دوستی ہو۔ اِس احساس کی تہہ میں خون کے رشتہ سے زیادہ فکری اور ذہنی ہم آہنگی تھی جو اجنبیوں کو دوست اور بیگانوں کو یگانہ بنا دیتی ہے۔ ایک دوسرے سے متعارف ہونے کے کچھ ہی دیر بعد جب اعجاز نے مجھ سے پوچھا کہ لاہور میں آپ کِس سے ملنا چاہیں گے؟ تو میں نے جواب دیا، اقبال اور فیض سے!

اقبال سے تو میں آپ کو کل ملا دوں گا لیکن فیض سے ملنا مشکل ہے وہ لاہور نہیں، کراچی میں رہتے ہیں۔ کبھی کبھار لاہور آجاتے ہیں۔ کراچی کا ویزا میرے

پاس نہیں تھا اور ویسے بھی ان دنوں لاہور سے کراچی جانا آسان کام نہ تھا۔ اس لئے میں اپنی بدقسمتی پر ماتم کر کے بیٹھ گیا۔ فیض احمد فیض سے ملنے کی خواہش نے تو اِسی دن جنم لیا تھا۔ جب فیض کا یہ شعر سنا تھا۔ ؎

ادائے حسن کی معصومیت کو کم کر دے
گناہ گار نظر کو حجاب آتا ہے

یہ ۱۹۵۱ء کی بات ہے۔ جب میں پہلی بار فیض کے کلام سے متعارف ہوا تھا۔ اِس کے بعد نقشِ فریادی ''دستِ صبا'' ''زنداں نامہ'' ''میزان'' ''دست تہ سنگ'' کے ذریعے ان سے ملاقاتیں ہوتی رہیں لیکن ان شاہ کاروں سے جھانکتی ہوئی دِل آویز شخصیت کو قریب سے دیکھنے کی خواہش میرے ہی ساتھ ساتھ جوان ہوتی گئی۔ اس دوران وہ کئی بار ہندوستان آئے لیکن میری خواہش پوری نہ ہوسکی۔ اب میں پاکستان میں تھا۔ ان کے بہت قریب...... لیکن ملاقات کے امکانات خاصے تاریک تھے۔
راولپنڈی میں اپنے پندرہ روزہ قیام کے بعد جب میں لاہور لوٹنے کی تیاری کر رہا تھا تو کراچی میں کچھ کشمیری دوستوں کا پیغام موصول ہوا۔ کہ وہ مجھ سے ملنے کیلئے راولپنڈی آنا چاہتے ہیں۔ لیکن اگر میں کراچی جانے کے لئے تیار ہوں تو وہ ہوائی جہاز سے آنے جانے کا خرچہ بھی برداشت کریں گے۔ اندھے کو کیا چاہیئے۔ دو آنکھیں۔ میں نے فوراً ''ہاں'' کر دی اور کچھ دن بعد جب میں کراچی کے ہوائی اڈے پر اُترا تو مجھے فراؔق کے اس شعر کی معنویت اور حسنِ معنی کا احساس ہوا۔

فضا تبسم صبح بہار تھی لیکن
پہنچ کے منزل جاناں پر آنکھ بھر آئی

۱۸ رفروری کی وہ شام کتنی خوب صورت شام تھی! میں اپنے میزبان میر قیوم

میر منان اور امان اللہ کے ساتھ فیض احمد فیض کی قیام گاہ کی طرف جا رہا تھا۔ فیض نے ٹیلیفون پر اپنی کوٹھی کا پتہ بتا دیا تھا اور قیوم صاحب کی گاڑی کچھ اس رفتار سے منزلِ مقصود کی طرف جا رہی تھی کہ جیسے اُسے بھی میری بے قراری کا علم ہو چکا ہوا۔ کچھ دیر بعد ایک عالی شان کوٹھی کے سامنے رُک گئے، معلوم ہوا کہ فیض کوٹھی کے اوپر والے کمرے میں رہتے ہیں۔ ہم یہ دریافت کرنا ہی چاہتے تھے کہ اوپر کون سا راستہ جاتا ہے کہ میری نظر کچھ مجسموں اور دیواروں پر ٹنگی ہوئی تصویروں پر پڑی اور میں نے فیصلہ کیا کہ فیض تک پہنچنے کا یہی راستہ ہوسکتا ہے۔ میرا فیصلہ صحیح تھا۔

زینوں کے دونوں طرف مٹی سے تراشے ہوئے چھوٹے چھوٹے آرٹ کے نمونے سجے ہوئے تھے اور دیواروں پر مشہور مصوروں کے شہہ پارے۔ میں نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ دروازہ کھل گیا اور سامنے فیض تھے۔ لمحہ بھر کیلئے میں مبہوت ہو کر انہیں دیکھتا رہا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہوں! اتنے میں میر منان صاحب نے میرا تعارف کرا دیا۔ اب ہم سب لوگ اندر داخل ہو گئے تھے۔ اور میرے سامنے ایک خوبصورت، باوقار اور بلند قد خاتون مونڈھے پر بیٹھیں مطالعہ میں کچھ اس طرح غرق تھیں کہ جیسے انہیں ہماری آمد کا علم ہی نہ ہوا۔ یہ ایلیس فیض تھیں۔ فیض نے ان سے ہمارا تعارف کرایا۔ اور انہوں نے نہایت شستہ اور شائستہ اردو میں ہمارا خیر مقدم کیا۔ پھر ہم سب لوگ بیٹھ گئے۔ فیض کے سامنے Soviet Literature کا تازہ شمارہ پڑا ہوا تھا۔ معلوم ہو رہا تھا کہ ہمارے آنے سے پہلے وہ اس میں سے کوئی مضمون پڑھ رہے تھے۔ سلسلہ کلام شروع ہونے سے پہلے میں نے کمرے کا ایک سرسری جائزہ لیا۔ یہ غالباً فیض کا سٹیڈی روم تھا۔ پورے کمرے میں کتابوں کی الماریاں سجی ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں لینن کی تصویر تھی اور

دیواروں پر ایبس ٹریکٹ آرٹ کے کچھ شاہکار آویزاں تھے۔ ایک PACK پر منیرہ اور سلیمہ (فیض کی دو صاحبزادیاں) کی اپنے شوہروں کیساتھ تصویریں سجی ہوئی تھیں۔ کمرے میں ریڈیو نہ ٹیلی ویژن تھا۔ کبھی کبھار ٹیلی فون کی گھنٹی اس پر سکون ماحول میں خلل انداز ہوتی تھی!۔

آپ کب سے ہیں پاکستان میں؟

فیض نے پوچھا۔ ان کے چہرے پر ایک عجیب سی شگفتگی چھائی رہتی ہے اس شگفتگی کا احساس ان کی شاعری میں بھی موجود ہے۔

میں اب ایک مہینے سے یہاں ہوں۔ آپ سے ملنے کی بڑی آرزو تھی۔ شیخ صاحب اور صادق صاحب دونوں نے ہی آپ کو یاد کیا ہے۔

فیض کو جیسے بھولی بسری کہانیاں یاد آ گئیں!

"جی ہاں! صادق صاحب سے تو کئی بار ملاقات ہوئی ہے لیکن شیخ صاحب سے ۱۹۴۶ء کے بعد ملاقات نہیں ہوئی۔ خیال تھا کہ ۱۹۶۴ء میں ان کی پاکستان کی آمد پر اُن سے ملاقات ہوگی لیکن پنڈت نہرو کی موت نے سارا سلسلہ درہم برہم کر دیا" اور پھر ان کے ہونٹوں پر ایک حیات آفریں مسکراہٹ بکھر گئی اور وہ کہنے لگے"۔

"آپ کو معلوم ہے کہ شیخ صاحب نے میرے نکاح پڑھے ہیں اور نکاح نامے پر صادق صاحب، بخشی صاحب اور ڈاکٹر نور حسین، کے، ایچ خورشید کے دستخط گواہوں کی حیثیت سے ثبت ہیں۔ اس لحاظ سے میرا نکاح نامہ ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

"آپ آخری بار کشمیر کب گئے تھے؟ میں نے دریافت کیا۔

میں آخری بار ۱۹۴۷ء میں گیا تھا۔ ۱۵؍اگست ۱۹۴۷ء کو جب ملک تقسیم ہوا۔ تو میں وہیں تھا۔ میں ۲۴؍اگست کو سرینگر سے چلا تھا۔ کشمیر کا جھگڑا شروع ہو گیا جو سلجھنے کی بجائے روز الجھتا ہی جارہا تھا۔

"آپ کے خیال میں اِس الجھن کا کیا حل ہوسکتا ہے؟ میرے اندر کے اخبار نویس نے مجھے پوچھنے پر مجبور کردیا۔

بھئی! مسئلہ اتنا الجھا ہوا ہے۔ کہ اس کا کوئی آسان حل تجویز کرنا بڑا مشکل ہے بدقسمتی دونوں طرف سے Extreme Positions لی گئی ہیں اور نتیجہ یہ کہ بات چیت کے ذریعے اس مسئلے کو سلجھانے کے امکانات روز بروز کم ہوتے جارہے ہیں۔

دونوں ملکوں کی حکومتیں انتہاپسندی میں ایک دوسرے سے بازی لے جانا چاہتی ہیں۔ ان حالات میں کوئی حل تجویز کرنا بے معنی بھی ہے۔ اور مشکل بھی! ایک بات ہوسکتی تھی کہ دونوں حکومتیں اپنے اپنے مؤقف پر قائم رہنے کے بعد بھی باہمی گفت و شنید کا سلسلہ جاری رکھ سکتی تھی۔ جس طرح چینی اور امریکی شدید اختلافات اور تضاد کے باوجود وارسا (پولینڈ) میں ایک دوسرے سے ملتے رہتے ہیں۔ اسی طرح ہندوستان اور پاکستان بھی کسی غیر جانبدار ملک میں مفاہمت اور مصالحت کی کوششیں جاری رکھ سکتے تھے!

"لیکن موجودہ پوزیشن یہ ہے کہ پاکستان کہتا ہے کہ کشمیر کا جھگڑا حل کرو۔ ہندوستان کہتا ہے کہ کشمیر کا کوئی جھگڑا ہے ہی نہیں۔ اصل جھگڑے کے وجود سے انکار کرنا غلط ہے اور میں نے ہندوستان میں اکثر دوستوں سے یہ کہا کہ یہ پوزیشن غلط ہے۔ ابھی ہندوستان میں اپنے مختصر سے قیام کے دوران بعض دوستوں نے کہا کہ ہم کشمیریوں کو مطمئن کریں گے۔ وہ کہنے لگے پاکستان پھر بھی مطمئن نہ ہوگا!

میں نے ان سے کہاں کہ یہ ٹھیک ہے کہ پاکستان پھر مطمئن نہ ہوگا۔ لیکن پھر پاکستان کے موقف میں پہلی جیسی قوت باقی نہیں رہے گی۔ فیض بڑے سکون سے باتیں کررہے تھے۔ ان کے لہجے کی معصومیت اور آواز کے لئے ان کی شخصیت کو اور زیادہ دل آویز بنادیا تھا۔ وہ کوئی نئی بات نہیں کہہ رہے تھے۔ لیکن کچھ اس انداز سے کہہ رہے تھے۔ کہ جیسے کسی گہرے راز سے پردہ ہٹا رہے ہوں۔ مجھے محسوس ہوا کہ فیض کے دِل میں کشمیر کا درد ہے۔ ان کی زبان سے میں نے کشمیر کے متعلق ایک ایسی بات سنی جو کسی دوسرے پاکستانی کی زبان سے سُننے کو نہیں ملی۔

کشمیر کا بہترین حل یہ ہے کہ دونوں ممالک کشمیر کو الگ چھوڑ دیں اور کشمیر ایک خودمختار ریاست کی حیثیت سے دونوں ممالک کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرے بالآخر یہی ہوگا۔ لیکن بڑی خرابی کے بعد! آپ لوگوں کو دونوں طرف سے مشترکہ طور یہی مطالبہ کرنا چاہیئے!

"موجودہ انقلاب کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے" میں نے دریافت کیا۔

دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ اس وقت تو اتھل پتھل ہے۔ اس کے بعد شاید کوئی حل نِکل آئے دراصل موجودہ انقلاب اُس زبان بندی کے خلاف ردِعمل ہے جو پچھلے دس یا گیارہ برس روا رکھی گئی ہے۔ صدر ایوب کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ اس نے احتجاج اور اختلاف رائے کے سبھی دروازے بند کردیئے۔ اور اب اُنہیں بہ یک وقت دس سال کی گالیاں کھانا پڑ رہی ہیں!۔

ادھر آپ نے کچھ لکھا ہے؟ میں نے موضوع بدل دیا۔ میں شعر و ادب کے بارے میں باتیں کرنا چاہتا تھا۔ لکھتے رہتے ہیں! پھر جیسے لگا انہیں کوئی بات یاد آ گئی۔ "ٹھہریئے میں دیکھوں کہ کوئی میری کتاب یہاں ہے یا نہیں۔

شیخ صاحب کیلئے لیتے جائیے۔ یہ کہہ کر وہ ساتھ والے کمرے میں گئے اور میں سوچنے لگا کہ۔ ''نقشِ فریادی''''دستِ صبا'' اور''زنداں نامے'' کے خالق کو اس بات کا احساس ہے یا نہیں کہ وہ کتنا بڑا شاعر، کتنا عظیم فن کار اور کتنا محبوب انسان ہے؟ اِس کی نرمی اس کے انکسار اور اس کی سادگی کو دیکھکر مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اُسے اپنی عظمت کا احساس ہی نہ ہو!۔

فیضؔ کتاب کی تلاش میں اندر گئے۔ تو میں نے بیگم فیضؔ سے پوچھا، کہ ''بچیاں کہاں ہیں؟''۔ ''دونوں لڑکیوں کی شادی ہوگئی ہے!۔ ایلیس فیض نے کہا۔ اور اسکے بعد انہوں نے ریک پر سجی ہوئی دونوں تصویریں، مجھے دکھانا شروع کر دیا۔ یہ سلیمہ اور اُن کے شوہر کی تصویر ہے۔ سلیمہ مصور ہے۔ بڑی اچھی تصویریں بناتی ہے۔ یہ جو دیوار پر تصویر آویزاں ہے۔ یہ سلیمہ ہی کی ہے۔ بیگم فیضؔ نے بڑے فخر کے ساتھ دیوار پر لگی ہوئی ایک تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

''مُنیرہ ٹیلی ویژن میں پرڈیوسر ہے۔ یہ دونوں چھوٹی بچیاں تھیں جب شیخ صاحب راول پنڈی میں ہمارے گھر آیا کرتے تھے۔ بیگم فیضؔ نے شیخ صاحب کا ذکر کچھ اس عقیدت اور محبت کے ساتھ کیا کہ مجھے محسوس ہوا کہ ان کے دل میں آج بھی شیخ صاحب کے لئے بے حد عزت اور احترام ہے۔ اتنے میں فیض آئے اور کہا۔ کہ بڑی تلاش کے بعد بھی کوئی کتاب نہیں ملی ہے۔ اب میں شیخ صاحب کے نام اپنی غزل دوں گا۔ اور اسکے بعد وہ قلم لے کر غزل لکھنے لگے۔ وہ غزل لکھ رہے تھے۔ بیگم فیض چائے بنا رہی تھیں۔ اور میں فیضؔ کو دیکھ رہا تھا۔ اُن کے چہرے پر کاروانِ عمر رفتہ کے نشان تو نظر آتے ہیں لیکن ان کے چہرے کی دائمی شگفتگی دیکھنے والے کو ان کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتی! وہ جوانی میں بڑے وجیہہ

صورت اور آن بان والے رہے ہوں گے بیگم صاحبہ نے چائے لا کے رکھ دی اور اسکے بعد پوچھا کہ آپ کتاب کس کے لئے ڈھونڈھ رہے تھے؟ فیض نے کہا۔ شیخ صاحب کو کتاب بھیجنی تھی۔ مِل نہیں رہی ہے!۔

شیخ صاحب کے لئے بھیجنا ہے تو ٹھہریئے میں خود دیکھوں گی۔ بیگم فیض نے کچھ اِس انداز سے کہا کہ جیسے شیخ صاحب کے لئے وہ کچھ بھی کرنے کے لئے تیار ہوں! کچھ دیر بعد وہ ''نقش فریادی'' اور ''انتخاب فیض'' کا ایک پرانا سا نسخہ لے آئیں۔ میں نے کچھ تصویروں کا بھی مطالبہ کیا۔ ایک تصویر پر انہوں نے میرے لئے اپنے دستخط کر دیئے۔ انتخابِ فیض'' پر شیخ صاحب کا نام اور ''نقشِ فریادی'' پر میرا نام لکھ کر دونوں کتابیں مجھے دے دیں۔ فیض نے کہا۔ کہ کشمیر میں شیخ صاحب اور صادق صاحب کے علاوہ بھی میرے بہت سے دوست ہیں۔ ابھی ماسکو میں بھی ایک دوست سے ملاقات ہوئی۔ اُن کا اشارہ درگا پرشاد در کی طرف تھا۔

''اُن سے میری لڑائی ہے! میں نے یوں ہی کہا۔

''وہ تو آپ سیاست دانوں میں ہوتی ہی ہیں۔'' فیضؔ نے اپنی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''علی محمد طارق سے بھی تو آپ کی دوستی ہے؟ میں نے یاد دلایا۔

جی ہاں! وہ آج کل کہاں ہیں۔ انہوں نے میری دو کتابیں چرائی ہیں۔ ان کو بھی میرا اسلام کہہ دینا...... فیض نے کہا......

''آپ کشمیر کیوں نہیں آتے؟ آپ وہاں ایک بار آجائیں تو کیا اچھا ہوتا! کشمیر آنے کی بڑی خواہش ہے۔ اپنی زندگی کے کچھ بہترین دن وہاں گزارے ہیں۔ لیکن موجودہ حالات میں آنا کیسا ممکن ہو سکتا ہے! ہاں بیگم صاحبہ

آسکتی ہیں!۔

"تو آپ کیوں نہیں آجاتے؟ میں نے بیگم فیض سے مخاطب ہوکر پوچھا۔

"میں تو آسکتی ہوں۔ کیونکہ میرا برٹش پاسپورٹ ہے۔ جب فیض صاحب راولپنڈی سازش کیس میں گرفتار ہوئے تھے تو میرا پاکستانی پاسپورٹ منسوخ کردیا گیا تھا۔ اِسکے بعد میرا برٹش پاسپورٹ ہے۔ ایلیس فیض نے کہا۔

"معلوم نہیں کہ شاعروں، ادیبوں اور کھلاڑیوں کی آمدورفت بھی کیوں بند کردی گئی ہے حالانکہ یہ لوگ دونوں ممالکوں کے درمیان خیرسگالی" مفاہمت اور دوستی کا جذبہ بڑھانے میں بہت اہم کام کرسکتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شعروادب اور کھیل کود پر بھی سیاست چھا گئی ہے۔ یہ بڑی افسوس کی بات ہے اور اسکے نتائج بہت خطرناک ہوں گے! فیض نے بڑی حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

ملاقات کا وقت ختم ہوچکا تھا۔ مجھے اس کے بعد دعوت پر جانا تھا۔ گھنٹے کا یہ وقفہ کتنی جلدی بیت گیا۔ میں نے اجازت چاہی۔ فیض مجھے رخصت کرنے کے لئے کھڑے ہوگئے، کہنے لگے۔ شیخ صاحب کو میری طرف سے گلے لگا کر سلام دیجئے گا۔ میں نے کہا۔ میں پہلے آپ سے گلے مِلوں گا۔ اِسکے بعد میں نے اپنے محبوب شاعر نہیں، اپنے محبوب کو گلے لگالیا اور اُس سے رخصت ہوگیا۔

..........☆☆☆..........

شمیم احمد شمیم

کشمیری زبان اور اَدب

شاعری ہمارے یہاں سستی شہرت کا ذریعہ بن گئی ہے آپ اپنے نام کے ساتھ تخلص کا کوئی دم چھلا لگا دیجئے تو آپ شاعروں کی ذیل میں آئیں گے۔ اور اگر آپ غیر موزوں "تک بندی" بھی کرپائینگے تو جانئے کہ سونے پر سہاگہ ہوا۔ کلچرل اکاڈمی کے مشاعروں اور انتھالوجیوں میں، ریڈیو کشمیر کے پروگراموں میں اور پرائیویٹ اجلاس کے جلسوں میں آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ اپنی بڑھتی ہوئی مانگ اور عزت وتوقیر کے پیش نظر آپ خود بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہوجائیں گے۔ کہ آپ حقیقی طور پر شاعر ہیں اور آپ کا کشمیری ادب میں ایک اچھا خاصا مقام ہے اس مقام کو منوانے کے لئے آپ اپنے کسی بھی مخالف نقاد کی ناک کاٹ کھانے پر آمادہ ہونگے۔

ہمارے یہاں کے بعض نامی گرامی شاعروں کا کلام لیجئے، الفاظ کا درست اِنتخاب اور تشبیہہ واستعارات کا برمحل استعمال سیکھ لیجئے یا پھر یہ سمجھنے کی کوشش کیجئے کہ شعر کسے کہتے ہیں۔ جب کہیں جلسوں اور مشاعروں میں اپنی تخلیقات کو پیش

کرنے کی زحمت فرمایئے تو آپ دیکھ لیں گے کہ ان کی آنکھوں میں خون اُتر آیگا اور آپ بمشکل اپنا گلا چھڑانے میں کامیاب ہوں گے ۔ ہمارے نوے فیصدی کشمیری شعراء کا یہی حال ہے۔ نہ اوزان سے واقفیت ، نہ فن کی جانکاری۔ نہ بات کہنے کا ڈھنگ ، اگر کچھ ہے تو صرف تخلص ہی تخلص اور سستی شہرت کے نتیجے میں پیدا ہوئی ایک بے پناہ غلط فہمی...... یہ تو نوخیز شعراء ہیں جو اگر سیکھنے پر آئیں تو اپنے پیشرووں کی خوبیوں اور خامیوں سے بہت کچھ سبق حاصل کر سکتے ہیں لیکن کالجوں کے اُن پروفیسروں کی طرح جو اپنے ایم اے کے طالب علمی کے دوران کورس کی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد آئندہ کیلئے خود کو کسی کتاب کے مطالعہ سے محفوظ سمجھتے ہیں یہ شعرائے کرام بھی ریاضت و محنت سے ہمیشہ جی کتراتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ کئی سال گذرنے کے بعد بھی ان کی تک بندی میں فرق نہیں آیا ہے۔ کشمیری زبان کم مایہ نہ ہوتی تو کسی تک بندی کو اس سے چپک جانے کا کہاں موقع ملتا اور کون اجازت دیتا۔ نوخیز تو ایک حد تک پھر بھی نوخیز ہی ٹھہرے ہمارے کئی شعرا، ایسے بھی ہیں جنہیں کہنہ مشق اساتذہ کرام کہا جاتا ہے لیکن تک بندوں سے ایک آدھ ہی قدم آگے بڑھ سکے ہیں۔ ان میں مرزا عارف نے جب شعر کہنا شروع کیا تھا اُس وقت اُن کے فن اور خیالات کی کل کائنات یہ تھی۔

شاندس پیٹھ چھسے گریہ بولانی   آتی د نیا فانی ز ا ن

اور آج چالیس سال کے قریب زمانہ گذرنے کے باوجود نہ اُن کی زبان بدلی نہ خیالات اور انداز بیان میں کوئی خوشگوار تبدیلی آئی اور نہ فن میں کوئی عظمت پیدا ہو سکی ۔ جیسے اس عرصے میں زندگی ایک ہی کروٹ سوتی رہی ۔ جیسے ان کی آنکھوں کے سامنے مجبور، آزاد ، نادم، راہی، کامل ایسے زبان و بیان میں انقلابی

تبدیلیوں کے نقیب نہیں گذرے۔ اپنے ماحول کے ذہنی، جذباتی اور روحانی آفاق پر ہر آن بدلتے ہوئے رنگوں سے آنکھیں بند کر کے صرف ایک افسوسناک یکرنگی کے شکار رہے۔ یہ نہ صرف اپنے ہمعصر جدید شعراء کی ذہنی کوائف کا ساتھ نہ دے سکے بلکہ احد زرگر اور صمد میر کا ایسا مقام بھی پا نہ سکے جو کہ ذہنی اعتبار سے ان کے زیادہ قریب تھے۔ رباعی کی صنف میں جو کہ اُنھوں نے اپنے لئے خاص کر دی تھی، غلام رسول نازکی کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔ فاضل بھی کوئی تیس سال سے شعر کہہ رہا ہے اور اس تمام مدت میں "کرالہ کوری" کے بغیر اور کوئی قابل ذکر چیز پیدا نہ کر سکا۔ اس نظم کو بھی بے لاگ تنقید کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو اس کا تمام تر حسن وہ لے کر رہیگی جو کہ کسی گوئیے نے اس کیلئے وضع کی ہے۔ گلوکار اپنی لے واپس لے، تو فاضل کے ہاتھ بے جان چیز باقی رہے گی۔ اس کا کوئی بھی مجموعہ کلام اُٹھایئے دو تین ہی چیزیں پڑھنے کے بعد آپ اُس کو ایسا بند کریں گے کہ پھر کبھی ہاتھ لگانے کی ضرورت محسوس نہیں کریں گے۔

پتامبر ناتھ فانی کا ایک مجموعہ کلام حباب کے نام سے چھپ چکا ہے۔ یہ زیادہ تر کسانوں اور مزدوروں کے گیت الاپتا ہے۔ ہمارا یہ محنت کش طبقہ جتنا لاعلم پسماندہ اور مفلوک الحال ہے اتنا ہی فانی کا کلام بے مزہ بے جان، جذبہ و احساس سے عاری۔ محض قافیہ و ردیف کی قلابازی ہے۔ اس نے بھی اپنی تیس سالہ شاعری میں شعر اور شاعری کی حقیقت و ماہیت پر کبھی غور کرنے کی تکلیف نہ اُٹھائی۔ یہ سارے اصحاب زندگی کی ایک ایسی منزل میں قدم رکھ چکے ہیں جہاں ان سے کسی قسم کی توقع رکھنا ہی زیادتی ہے۔ نوخیز شعراء کو اِن سے عبرت حاصل کرنی چاہیئے ورنہ زندگی اُن کے ساتھ بھی ایک دن وہی کچھ کرے گی جو کہ آج اِن شعرائے کرام

کے ساتھ کررہی ہے۔ جو ہم میں ہوتے ہوئے بھی ہم سے نہیں ہیں۔ جن کی آواز میں جان نہیں، خیالات میں تنوع نہیں، اظہار و بیان میں کوئی کشش نہیں۔ جو شعر نہ کہیں تو کشمیری ادب میں کوئی سانحہ نہ ہوگا اور اگر کہیں تو نہ کہنے سے کچھ زیادہ اضافہ نہ ہوگا۔ تشبیہہ و استعارات میں نیاپن نہیں اور موضوع میں کوئی رنگارنگی نہیں۔ پھر بھی یہ غنیمت ہے کہ گوارا حد تک شعر کہہ رہے ہیں۔ چمن لال چمن کی سب سے بڑی کوتاہی کسی دوسری زبان سے ناواقفیت ہے۔ اگرچہ تعلیمی اعتبار سے گریجویٹ ہیں ان کا مجموعہ کلام ''شبنمہ شار'' پچھلے سال شائع ہوا اور ریاستی اکاڈمی نے اُسے دوسرے انعام کے قابل بھی سمجھا۔ اس کتاب میں تو دیکھنے کو بہت سی نظمیں اور غزلیں نظر آئیں گی۔ لیکن شعر ایک بھی نہ ملے گا۔ نوبلوغیت کے غیر فنی جذبات و خیالات کی اُکتا دینے والی تک بندی اور مکررانہ طول کلامی کے سِوا اِس کی اور کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ اِن میں بڑی صلاحیتیں ہیں بشرطیکہ ان سے کام لینا سیکھ لیں۔ مکھن لال بیکس کی شاعری کی کل کائنات دینا ناتھ نادم کا تتبع تھی۔ ان کی جھولی میں اپنے تخلص کے سِوا اور کوئی چیز موجود نہ تھی۔ پچھلے چند ہفتوں سے کافی ہاؤس میں اِن کی اور چمن لال چمن کی نئی کامیاب نظموں اور غزلوں کا چرچا یار لوگوں کی زبان پر تھا۔ اگر یہ درست ہے، تو یہ دونوں کے لئے مبارک فال ہے (کوہکن نے خود وہ نظمیں نہیں سنیں) رشید نازکی پابند شاعری کے بغیر اور کسی صنف کو منہ نہیں لگاتا لیکن اسکے باوجود کوئی نظم یا غزل ایسی کہہ نہیں پایا ہے جسے قابلِ ذکر کہا جائے۔ ان کے یہاں نہ خیال کی بلندی پردازی ہے نہ اظہار و اسلوب کی نُدرت، البتہ اتنا غنیمت ہے کہ تگ بندی نہیں ہے بلکہ شاعری کی حدود میں قدم رکھ چکے ہیں۔

مظفر عازم عمر کے اعتبار سے غلام نبی فراق کے ہم پہلو تو نہیں ہے لیکن

شاعری کے میدان میں اُن سے چند قدم آگے ضرور ہیں۔ نئے شعراء میں یہی ایک شخص ہے جو کہ حقیقی معنوں میں شاعر ہے۔ اسکو پچھلے سال اکاڈمی کی طرف سے ''زولانہٕ'' کتاب پر پہلا انعام مِلا، جس کا یہ بہر طور مستحق تھا۔ اسے غزل اور نظم دونوں پر مشاقانہ مہارت حاصل ہے۔ نظم سے حسین اُنکی غزل اور غزل سے نظم ہوا کرتی ہے۔ اس نے شعر کہنے کے گُر کو پالیا ہے۔ اردو اور فارسی شاعری کے عمیق مطالعہ نے اسے تخیل کی جولانیوں اور فنی رکھ رکھاو سے شناسا کردیا ہے۔ اُن کی ذات میں ہمارے مستقبل کے شاعر کے خدوخال نظر آتے ہیں۔ اس نے شاعری سے اپنی مشق سخن شروع کی اور اب کہیں آزاد نظم کی طرف قلم کی جنبش دی ہے یہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ سنجیدہ اور بالغ ہے۔ یہ زندگی کے ہر نئے تقاضے کا غائر مطالعہ کرنے کا عادی ہے۔ اس لئے اپنے شعر کا قالب بدلنے سے گریز نہیں کرتا۔

اِن سب کے بعد شاعروں کا وہ گروپ آتا ہے جسے ہم صفِ اوّل میں جگہ دیتے ہیں۔ ان میں دینا ناتھ نادم، رحمان راہی اور امین کامل ہیں اس میں شک نہیں کہ کشمیری شاعری ان ہی کے دم سے گونا گوں تجربوں کی مرہون منت ہے۔ یہ چاروں اصحاب قادر الکلام سخنور ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان پر الگ الگ بات کی جائے۔

دینا ناتھ نادم:۔ یہ فطری شاعر ہیں لیکن دنیاوی جاہ و حشمت کے لالچ نے انھیں ادب سے زیادہ سیاست کے میدان میں تخیل کی گل آفرینیاں دکھانے پر مجبور کردیا۔ اُنھوں نے کشمیری شاعری کو آزاد نظم دی۔ امیجری کی دولت کا استعمال سکھایا لیکن جن کو سکھایا وہ عرش کی بُلندیوں کو چھو گئے اور نادم سیاست کا مارا دیکھتا رہ گیا۔ یہ پرانی شہرت کے نام پر زندہ ہے ورنہ کب کا مرحوم ہو چکا ہے آج بھی اگر

کبھی کبھار کچھ لکھتا ہے (ریڈیو یا اکیڈیمی کیلئے) تو اُس میں شاعری کی کرشمہ سازی کے بجائے سیاست کی چشمک ہوتی ہے۔ ان کی نظر محدود، خیالات، غیر متنوع اور زبان اپنے ہمعصروں سے پیچھے رہ گئی ہے۔ کہاں وہ وقت کی ان کی تقلید کے بغیر کسی شاعر کو نوالہ بھی ہضم نہ ہوتا تھا اور کہاں یہ وقت کہ کشمیری شاعری کے تذکروں میں ان کا ذکر کچھ ایسے ہوتا ہے گویا انھیں اس دنیا سے گذرے زیادہ تو نہیں کم وبیش پندرہ سال ضرور ہوئے ہیں۔ اپنی زندگی ہی میں کسی شاعر کے ساتھ وقت کا یہ سلوک سب سے بڑا المیہ ہے۔

رحمان راہی:۔ ان کی شاعری کی ابتداء نادم کی تقلید سے ہوئی لیکن بہت جلد اپنا ایک الگ اسلوب ڈھونڈ نکالا اور اس کو ایسا پرکشش اور جاندار بنالیا کہ کوئی بھی شاعر اُس کی زد سے بچ نہ سکا۔ اُس نے تخیل کی بلندی پردازی اور فن کی گہرائی اور گیرائی سے کشمیری زبان کا دامن بھر دیا۔ ہنگامی اقدار کی بجائے آفاقی اقدار سے شعر کو شناسا کیا اور اس طرح کشمیری شعر کو زمین سے بہت اُوپر اُٹھا کے رکھدیا لیکن فن پر حد سے زیادہ توجہ برتنے کے باعث اب اس کی شاعری تصنع کا شکار ہونے لگی ہے۔ آمد کی بجائے آوارد کا رنگ زیادہ گہرا ہوتا جاتا ہے۔ خیالات میں جدید انگریزی شاعری کے مطالعہ کے نتیجہ میں ژولیدگی اور پیچیدگی آنے لگے ہے۔ شعر کا ماحول اور مزاج کشمیر سے زیادہ یورپ سے ہم آہنگ ہونے لگا ہے یہ ایک ایسے موڑ پر کھڑا ہے جہاں ذرا سی لغزش ان کی شاعری کو خطرناک حد تک متاثر کر یگی۔

امین کامل:۔ یہ ہمارا واحد شاعر ہے جو نہ تو نادم سے متاثر ہوا اور نہ راہی کا ہم آواز بنا۔ یہ ہمیشہ اپنا الگ اسلوب بناتا ہوا آگے بڑھا۔ یہ بڑا سخت جان ہے اور شاید اسی کے فیض سے اپنی شاعری کی کوئی دس سالہ مدت ہی میں صف

اوّل میں جگہ بنالی۔ سچ پوچھئے تو رحمان راہی اور امین کامل کے بغیر آج ہماری شاعری میں کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ (سوائے مظفر عازم کے) جس کو ہم آنکھیں نیچی کئے بغیر ہند و پاک کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں لاکھڑا کریں۔ اپنے اظہار و بیان کیلئے نئے نئے راستے تلاش کرنے کی دُھن میں کامل نے کئی تجربے کئے اور اُن تجربوں سے استفادہ بھی کیا۔ اور آج یہ حالت ہے کہ بہت سارے شعراء ان کی آواز کی زد میں آگئے ہیں۔ ان کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا مشرقی مزاج ہے جو کہ اس کی ہر نظم اور غزل میں برقرار رہتا ہے۔ اسکی آج کی غزل کشمیری شعر کو ایک ایسے آہنگ سے روشناس کر رہی ہے جس سے یہ آج تک ناواقف تھی۔

ہماری طرز تحریر کی خامیوں پر انگلیوں تو اُٹھائی جاسکتی ہیں۔ لیکن ہم نے شعراء کے متعلق جو رائے ظاہر کی ہے اس سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو۔ طرز تحریر کی شوخی کا مقصد صرف یہ ہے، کہ اپنے شاعروں کو جھنجھوڑا جائے اور انھیں بتایا جائے کہ اگر وہ اپنے فن کو سنوارنے کی فکر نہیں کریں گے تو وقت ان کی سہل انگاری کس طور معاف نہیں کرسکتا۔

(آئینہ ۳۰/اپریل ۶۶ء)

☆☆☆

شمیم احمد شمیم

جموں و کشمیر میں
اُردو زبان وادب کا مستقبل

اس وقت جبکہ ملک کے دوسرے حصوں میں اردو کا حال بُرا ہے ریاست میں اُردو کے مستقبل کا سوال ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ زبان جو پچھلے ۲۸/برسوں سے اپنے ہی وطن میں اجنبی قرار دی گئی ہے اور جس کے خلاف کئی بار قتل کے فتوےٰ صادر ہو چکے ہیں، ہماری ریاست کی سرکاری زبان ہے۔ اس طرح ریاستی آئین نے اردو کو بغیر کسی جدوجہد اور کش مکش کے وہ منصب اور مقام عطا کیا ہے کہ جو وہ اپنے آبائی وطن، اتر پردیش اور دلی میں حاصل کرنے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتی۔ اردو کے ساتھ ہماری یہ محبت اور مروّت ایک رعایت یا مصلحت نہیں بلکہ ہماری سیاسی تاریخ، ہماری جغرافیائی حیثیت اور ہماری تعلیمی اور تہذیبی ضروریات کا ایک منطقی نتیجہ ہے۔ یہ زبان سرکاری زبان قرار دئے جانے سے پہلے ہماری جنگ آزادی کی زبان رہ چکی ہے اور ۱۹۳۱ء سے لیکر ۱۹۴۷ء تک ریاست کے اندر اور باہر ہم نے اپنی جدوجہد، احتجاج اور مکالمے کے لئے جس زبان کا سب سے

زیادہ اور موثر استعمال کیا وہ اردو ہی ہے۔ جموں اور کشمیر کے درمیاں سیاسی مکالمے اور تہذیبی اشتراک کے لئے اردو ہی ہمارے کام آتی رہی ہے۔ لداخ اور کرگل جیسے دور اُفتادہ علاقوں کے ساتھ اپنا سیاسی اور ذہنی رابطہ برقرار رکھنے کے لئے ہم اردو کے علاوہ کسی دوسری زبان کا سہارا نہیں لے سکتے۔ یہ تینوں جغرافیائی وحدتیں تین لسانی اکائیاں بھی ہیں اور ان تینوں کے درمیان صرف اردو ہی ایک رابطے کی زبان ہے۔ اور یہی وہ حقیقت ہے کہ جس نے آزادی کے بعد ہمارے سیاسی رہنماؤں کو یہ ہمت اور بصیرت دی کہ وہ لسانی تعصبات اور علاقائی توہمات سے بلند رہ کر اس زبان کو ریاست کی سرکاری زبان قرار دیں تاکہ ریاست کے سیاسی استحکام اور تینوں حصوں کے درمیاں جذباتی ادغام کے نازک مراحل طے ہونے میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ اردو کے ریاست کی سرکاری زبان بننے سے اردو کو کوئی فائدہ ہوا یا نہیں، یہ کہنا مشکل ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو نے تینوں حصوں کے درمیان رابطے کی زبان کے فرائض انجام دے کر ہماری بہت سی مشکلیں حل کر دی ہیں اور اس اعتبار سے ریاست میں اردو کا مستقبل براہ راست ریاست کی سیاسی وحدت کے ساتھ وابستہ ہے۔ دوسرے الفاظ میں جب تک جموں کشمیر اور لداخ ایک ہی ریاست کی تین اکائیوں کے طور پر قائم رہیں گے، اُردو کی موجودہ اہمیت اور ضرورت باقی رہے گی۔

۱۹۴۷ء کے بعد سے ریاست کی علاقائی زبانوں بالخصوص کشمیری، ڈوگری اور لداخی نے اپنی اہمیت کو منوالیا ہے اور مقدار اور معیار دونوں کے اعتبار سے یہ تینوں پسماندہ زبانیں گزشتہ ۲۷، ۲۸ برسوں میں بہت آگے نکل گئی ہیں۔ خاص طور پر کشمیری اور ڈوگری علاقائی زبانوں کی یہ ترویج اور ترقی ہماری تہذیبی صحت کی اچھی

علامت ہے اور امید ہے کہ قومی شخصیت کے اظہار کے ان وسیلوں یعنی زبانوں کو ترقی پذیر کرنے کے لئے سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر موجودہ کوششوں کو تیز تر کیا جائے گا۔ بعض حلقوں کی طرف سے کبھی کبھی اس اندیشے کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ کشمیری یا ڈوگری زبان کی ترقی کا سبب یہ ہوگا کہ کچھ عرصے بعد اُردو زبان باقی نہیں رہے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اندیشہ بے بنیاد ہی نہیں باعثِ فساد بھی ہے۔ اولاً یہ کہ اُردو نے کشمیری یا ڈوگری کی زبان نہیں چھینی ہے بلکہ وہ علاقائی زبانوں کی سطح سے بلند ایک رابطے کی زبان کا کام دے رہی ہے۔ دوئم یہ کہ جب کشمیری، ڈوگری اور لداخی اس قابل ہو جائیں کہ وہ تینوں زبانیں یا اس میں سے ایک ریاست کی سرکاری زبان یا رابطے کی زبان بننے کے اہل ہو جائے تو کوئی ضروری نہیں کہ اردو اس کے بعد بھی ہماری ریاست کی سرکاری زبان برقرار رہے۔ جب یہ وقت آئے گا تو اردو کو اپنا موجودہ منصب چھوڑ کر کسی ریاستی زبان کے لئے جگہ خالی کر دینا ہوگی اور اس معاملے میں کسی جذباتیت یا ذہنی تعصب کی کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیئے، لیکن مجھے مستقبل قریب میں ایسی کوئی صورت نظر نہیں آتی اور ریاست کے سیاسی تقاضوں اور لسانی تنازعوں کے پیش نظر یہ بات ماننا پڑے گی کہ اردو کو ابھی بہت عرصے تک ہماری سیاسی اور تہذیبی زندگی میں ایک اہم مقام حاصل رہے گا۔

اُردو زبان و ادب نے گزشتہ پچاس ساٹھ برسوں میں خاص طور پر ریاست کی علاقائی زبانوں اور ان میں پیدا ہونے والے ادب کو متاثر کیا ہے اور خاص طور پر کشمیری زبان پر اردو کے اثرات کی چھاپ بہت نمایاں ہے۔ ہمارے ہاں جدید ادبی تحریکوں، تجربوں اور رجحانات کا عرفان اور ردّ و قبول، دونوں ہی براہ راست اردو کی ادبی تحریکات اور رجحانات سے متاثر ہوتا ہے۔

مجھے ڈوگری کا علم نہیں لیکن موجودہ کشمیری ادیبوں اور شاعروں میں اکثر اردو اور فارسی پڑھے ہوئے ہیں، کشمیری کے کئی قادر الکلام شعراء کشمیری میں شعر کہنے سے پہلے اردو میں اپنا کلام موزوں کیا کرتے تھے۔ اسی طرح بہت سے افسانہ نگار بھی پہلے اردو میں ہی افسانے لکھتے تھے۔ اس امر کی طرف اشارہ کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس دور میں لکھنے والوں کے لئے اپنے کمروں کی کھڑکیاں بند کر کے لکھنا نا ممکن ہے۔ ان کے ذہن کی بھی کھڑکیاں اگر نہیں کھل سکتیں تو کم از کم ایک کھڑکی ضرور کھلی رہنی چاہیے۔ چاہے یہ اردو کی ہو یا ہندی یا انگریزی کی...... ابھی تک اردو کی کھڑکی سے زیادہ ہوا آتی رہی ہے اور اس اعتبار سے ہم پہلے اپنے آپ کو اردو کے زیادہ قریب محسوس کرتے ہیں۔ جموں میں بھی ردو قبول کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا ہے۔ ملک کی تقسیم سے پہلے پنجاب اردو کا گڑھ تھا اور جموں براہ راست پنجاب کی تہذیبی زد میں تھا۔ پنجاب کے ادبی معرکے اور پنجابی ادیبوں کی بزم آرائیاں جموں کی تہذیبی زندگی کا ایک حصہ تھیں۔ ملک کی تقسیم نے اگرچہ یہ ساری محفلیں درہم برہم کر دیں لیکن اردو زبان کا جادو چوں کہ آسانی سے نہیں ٹوٹتا اس لئے آج ۲۸ / برس بعد بھی آپ کو جموں میں اردو کلچر کے نمایاں اثرات کی نشاندہی کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ غرض جموں اور کشمیر دونوں حصوں کی اُردو سے پرانی شناسائی ہے اور یہی وجہ ہے کہ کشمیری اور ڈوگری کے احیاء کے باوجود جموں اور کشمیر میں اچھی اُردو لکھنے والوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ بلکہ کشمیری اور ڈوگری کے بہت سے ادیب اور شاعر بہت اچھی اُردو نثر بھی لکھتے ہیں۔ اُردو سے ہماری دوستی اور اس کی عزت افزائی کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم ہے کہ ریاستی حکومت اُردو زبان کے سیاسی اور تہذیبی رول کو موثر بنانے کے لئے کچھ نہیں کر رہی

ہے۔ ارباب حکومت اسے سرکاری زبان کا درجہ دیکر یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ وہ اپنے فرائض اور اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو گئے ہیں اور نتیجہ یہ کہ سرکاری زبان ہوتے ہوئے بھی اُردو کو سرکاری زبان قرار دینے کا مقصد صرف یہ تھا کہ یہ ریاست کے تینوں حصوں کے لئے ایک رابطے کی زبان کا کام دے لیکن یہ جبھی ممکن ہو سکتا ہے کہ جب ہمارے بچے اس زبان سے آشنا ہوں۔ وہ پرانی نسل جو اردو کلچر کے زیر سایہ پروان چڑھی تھی اب رفتہ رفتہ عاقبت کی طرف قدم بڑھا رہی ہے۔ نئی نسل اُردو زبان سے نا آشنا اور ادب سے قطعی بے بہرہ ہے اور ظاہر ہے کہ وہ وہی زبانیں پڑھیں گے جو انہیں روزگار دلانے کا ذریعہ بن سکیں۔ ان حالات میں جب تک ریاست بھر میں اُردو کی بنیادی تعلیم لازمی قرار نہ پائے اُردو کے لئے رابطے کی زبان کا فرض انجام دینا ناممکن ہوگا اور یہ ایک بہت بڑا تہذیبی حادثہ ہی نہیں سیاسی سانحہ بھی ہوگا۔ کیونکہ اگر جموں کشمیر اور لداخ کے درمیان مکالمے کے لئے کوئی Link Language نہ رہی تو ریاست کی سیاسی وحدت کو بھی خطرہ لاحق ہوگا اور یہ تینوں حصوں کے اپنے مفاد میں ہے کہ وہ اُردو کو رابطے کی زبان کے طور پر نہ صرف قائم رکھیں بلکہ اسے صحیح معنوں میں جذباتی ادغام اور قومی یک جہتی کا موثر ذریعہ بنائیں۔

ریاستی حکومت کی موجودہ روش کے پیش نظر اگرچہ ریاست میں اُردو زبان کا مستقبل بہت روشن نظر نہیں آتا لیکن سیاسی تقاضوں اور لسانی مجبوریوں کو زیادہ دیر تک نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور مجھے یقین ہے کہ شیخ محمد عبداللہ کی حکومت اُردو کے تاریخی کردار اور ریاست کے سیاسی اور تہذیبی تقاضوں کو سمجھتے ہوئے اُردو کو اپنا صحیح رول ادا کرنے کے مواقع فراہم کرے گی۔ اس مقصد کے لئے یہ ضروری ہے

کہ جموں کشمیر اور لداخ تینوں حصوں میں دوسری زبانوں کے علاوہ اُردو کی بنیادی تعلیم لازمی قرار دی جائے۔ اُردو کو سرکاری زبان قرار دینے کا مطلب یہی تھا کہ تینوں حصوں میں بسنے والے لوگ اس سے کماحقہ' آشنا ہوں لیکن نئی نسل کو اس سے آشنائی پیدا کرنے والی تحریک اور موقع تو ملنا چاہیے۔

ریاست کی موجودہ سیاسی اور تہذیبی فضاء کو نظر میں رکھتے ہوئے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس ریاست میں اُردو زبان کو ایک تاریخی رول ادا کرنا ہے اور جب تک اس رول کی ضرورت باقی رہے گی اُردو زبان و ادب کا مستقبل بھی روشن رہے گا۔ اس کے بعد کیا ہوگا؟ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

شاید اس وقت کوئی دوسرا شمیم آکر اس موضوع پر آپ کی سمع خراشی کرے گا۔

(شیرازہ: جنوری تا جولائی ۱۹۷۵ء)

☆☆☆

شمیم احمد شمیم

وادی کے پھول۔ایک تنقیدی جائزہ

سنسکرت اور فارسی کے علاوہ کشمیری نے اردو زبان کی نشوونما میں بھی ابتداء سے ہی ایک شاندار رول ادا کیا ہے ۔ اردو ادب کے افق کو کشمیر نے جو روشن ستارے عطا کئے ہیں ان کا ذکر کئے بغیر اردو تاریخ کی کوئی ترتیب مکمل نہیں کہلائی جاسکتی ۔ ماضی قدیم سے لے کر ابتک اردو ادب کی ترویج واشاعت کے ساتھ ساتھ اس کی تخلیق کا عمل بھی یہاں جاری رہا ہے، اور آج ہندوستان بھر میں یہی ایک واحد ریاست ہے جہاں کی سرکاری زبان اردو ہے، کشمیر نے اُردو کو جوان کرنے میں ہی حصہ نہیں لیا ہے اسکی جوانی کو بے داغ رکھنے کا فیصلہ بھی کیا ہے، اور یہ فیصلہ جتنا عظیم ہے اسی قدر اہم بھی ہے۔ ہمیں اپنی روایتوں کا سہارا ضرور لینا چاہیئے، مگر اپنے فرائض اور اپنی ذمہ داریوں کو بھی محسوس کرنا ہوگا، اور مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ کشمیر کے ادیب اور شاعر اس عظیم رول کو بڑی تندہی سے ادا کر رہے ہیں، جو تاریخ نے انہیں سُپرد کر دیا ہے۔

کشمیر زبان کی ترقی اور ترویج کے لئے جہاں بہت سے اردو ادیبوں نے کشمیری میں لکھنا شروع کر دیا ہے، وہاں اردو کو نئے لکھنے والوں کا ایک سرگرم اور

پُر جوش گروہ مل گیا ہے، جو بڑی سرعت کے ساتھ یہاں کی ادبی فضا پر چھا رہا ہے، اس وقت اردو شاعری کی صف میں شہ زور، تنہا انصاری، رسا جاودانی، شوریدہ کاشمیری اور حامدی کاشمیری کے علاوہ کوئی ایسا نام نظر نہیں آتا، جو یہاں کے ادبی حلقوں سے متعارف ہو لیکن وادی کے ہر گوشے میں ننھے ننھے ذرّات کی چمک دمک سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ ذرّے بھی بہت جلد ستارے بننے والے ہیں

اردو افسانے کے میدان میں یہاں کے نوجوان ادیبوں نے اپنی جگہ بنالی ہے اور میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے ہاں کے افسانہ نگار بیرون ریاست کے نامور افسانہ نگاروں سے کسی حال میں کمتر نہیں ہیں۔ نوجوان افسانہ نگاروں کا یہ گروہ اپنی غیر معمولی صلاحیتوں سے بہت کم عرصے میں کشمیر کے علاوہ بیرون کشمیر کی ادبی دنیا سے بھی متعارف ہو گیا ہے۔ بہت سے وُہ دوست جو اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں، اردو اور ہندی کے امتزاج سے ایک ایسی زبان استعمال کرتے ہیں جسے ہندوستانی کہا جا سکتا ہے۔ اس طرح اردو افسانے کی ترقی کیساتھ ساتھ ہمارے ہاں زبان وبیان کا وُہ تعصب بھی ختم ہو رہا ہے جو زبان اور کلچر کو گھن کی طرح کھا جاتا ہے۔ اس امید افزا ماحول میں جب پروفیسر حامدی کے افسانوی مجموعے ''وادی کے پھول'' کو میں نے پڑھا تو مجھے اپنے ماحول سے نہیں، لیکن حامدی صاحب سے ضرور نا اُمیدی ہوئی۔ میں نے اُوپر بیان کیا ہے کہ اردو کو اپنانے سے ہم پر بھاری ذمہ داریاں عاید ہو گئی ہیں، ہمیں یہ ذمہ داریاں نبھانے کے اہل ہونا ہوگا اور ان کے لئے ہمیں زبان وبیان کے مقررہ معیاروں تک رسائی حاصل کرنا ہوگی۔ یہ کام بڑی ریاضت اور محنت کا ہے اور مجھے افسوس ہے کہ حامدی صاحب نے اس محنت اور ریاضت سے کافی حد تک گریز کیا ہے۔ پریم ناتھ پردیسی

اور پریم ناتھ در کے افسانوی مجموعوں کی اشاعت کے بعد حامدی کا مجموعہ ''وادی کے پھول'' ایک ایسی کوشش ہے جو اپنی ناکامی کی وجہ سے ہمیشہ یاد رہیگا۔ پردیسی اور در کے افسانوں نے اردو افسانے کی دنیا میں ایک ہلچل مچادی تھی کیونکہ انہوں نے پہلی بار کشمیر کی صحیح سماجی زندگی کی تصویر پیش کی تھی۔ یہ تصویر حقیقی بھی تھی اور فنکارانہ بھی۔ حامدی نے بھی کشمیر کا پس منظر پیش کرکے یہاں کی سماجی زندگی کا خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی، لیکن حامدی اپنے رومانی تصوّرات اور نیم پختہ شعور کی دلدل میں پھنس کر آگے بڑھنے سے رہ گئے ہیں۔ کشمیر کے متعلق دہلی اور بمبئی میں بیٹھ کر بڑے بڑے فنکاروں نے کشمیر پر کہانیاں لکھی ہیں اور اس وادی کے حُسن و جمال سے مسحور ہوکر ایک تمثیلی دنیا آباد کی ہے۔ یہاں کی ہانجن، بھکارن اور کسان زادی کو اپنے افسانوں کی ہیروئن بنا کر ان لوگوں نے کافی مال کھرا کرلیا، لیکن کشمیر کی روح اور اسکی صحیح تصویر یہ لوگ کبھی پیش نہ کرسکے اور اُبھرتی ہوئی زندگی کا مطالعہ حامدی نے بھی خود اپنی آنکھوں سے نہیں کیا ہے۔ اس کا مشاہدہ ان افسانوں کا مرہونِ منّت ہے جو دہلی، بمبئی یا لاہور کے شاندار ریستورانوں میں بیٹھ کر لکھے گئے اور جو حقیقت سے اس قدر دُور ہیں جس طرح خود حامدی ہے۔

''وادی کے پھول'' میں جو دنیا آباد ہے۔ کشمیر میں رہتے ہوئے مجھے یہ دنیا کہیں نظر نہیں آتی۔ اس میں جو کردار ہیں وُہ کبھی مجھے گوشت اور پوست کے انسانوں کی شکل میں نظر نہیں آتے۔ یہ کردار اپنی فطرت، اپنے مزاج اور اپنے کردار سے مجھے کشمیری نظر نہیں آتے۔ مجھے تو ہر لمحہ یہی احساس ہوتا ہے کہ یہ افسانے کسی ایسے ادیب کی تخلیق ہیں جو خود کبھی کشمیر نہیں آیا ہے لیکن جس نے کسی رومانی سیاح کی زبان سے یہاں کی داستانیں سُن سُن کر اپنے تخیل کی دنیا آباد کی ہے، جس نے

سیاح سے یہاں کے حُسن کی تفصیل سُن کر اپنی کہانیوں میں کہانی پن پیدا کرنے کے لئے حُسن اور افلاس کو ملکرادیا۔ ان افسانہ نگاروں کو جنہیں کبھی یہاں آنے کا موقع نہیں ملا یا جو یہاں آکر بھی ہماری زندگی سے قریب نہ ہوسکے اور کشمیر کے ماحول کو بیچ کر چند سکے کما گئے۔ ان کو بخشا جاسکتا ہے، لیکن بحیثیت ایک کشمیری کے حامدی اس رعایت کے مستحق نہیں ہیں۔ یہ کتاب جب کشمیر کی سرحدوں کو پھاند کر دنیا کے سامنے پیش ہوگی، تو اپنی تمام فنی خامیوں کے باوجود اسے کشمیر کی تصویر سمجھا جائیگا، کیونکہ ایک کشمیری نژاد ادیب کی تخلیق ہے اور میں حامدی صاحب سے نہیں، ان کے ضمیر سے یہ سوال کرنا چاہتا ہوں کیا انہوں نے دیانت داری اور ادبی خلوص سے کشمیر کی تصویر پیش کی ہے؟ افسانوی مبالغے اور فنی لوزمات کی پابندی کا احترام کرنے کے لئے میں تیار ہوں۔ لیکن اس پردے میں حقیقت کو مسخ کرنا نہ ادبی دیانت داری ہے اور نہ اچھی فنکاری!

حامدی صاحب سے ذاتی طور ایک استفسار کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ تمام کہانیاں ۱۹۵۰ء کے بعد لکھی گئی ہیں، میں نے ان کہانیوں کو ایک ایک کرکے پڑھا، بار بار پڑھا۔ شروع سے آخر تک مجھے ان میں کسی گہرے شعور یا کسی خلاّقانہ عمل کا احساس نہیں ہوا۔ کسی کہانی نے میرا دامن کھینچکر مجھے اپنی طرف متوجہ نہیں کیا۔ کسی کہانی کا کوئی بھی نقش یا تاثر میرے ذہن پر موجود نہیں رہا۔ کوئی کردار کوئی ایسا تاثر پیدا نہ کرسکا جس سے اسکے بارے میں سوچنے کی ترغیب ہوسکے۔ پروفیسر شکیل الرحمٰن نے تعارف کرتے ہوئے حامدی کے بارے میں لکھا ہے۔

''حامدی نے کشمیری کہانیاں لکھی ہیں، یہاں کا ماحول ان کے افسانوں میں ہر جگہ موجود ہے۔ مقامی رنگ نے ان کے افسانوں میں جان ڈالدی ہے، جنہوں

نے کشمیر کو دیکھا ہے وہ حامدی کے افسانوں کے کرداروں کو یہاں کے ماحول میں ضرور پہچان لیں گے۔ان کے کردار جیتے جاگتے اور یہاں کی فضا میں سانس لیتے ہوئے کردار ہیں"

میں تعارف نگار کی مشکلات اور مجبوریوں کا اندازہ کر سکتا ہوں لیکن اگر ان مجبوریوں اور معذوریوں کی وجہ سے کوئی بہت بڑی غلط فہمی پیدا ہونے کا اندیشہ ہو، تو تکلف برطرف، تعارف نگار کو اس موقع پر بڑے حوصلے سے کام لینا ہوگا۔ میں شکیل صاحب کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ جس طرح کوئی فلم اپنی ہیروئن یا ہیرو کے اسلامی نام کی وجہ سے ہی اسلامی تحفہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اسی طرح ایک افسانہ امیرا کدل، نشاط باغ، بادام واری یا اہرہ بل کے ذکر سے کشمیری ماحول کا نمائندہ نہیں بنتا۔ صرف اپنے کرداروں کے نام شعبان، کرم دین، زونی اور نورہ رکھنے سے ان کے صحیح کشمیری کردار ہونے کی شرط پوری نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے اس روح کی گہرائیوں کو پیش کرنا پڑتا ہے، جو اس ماحول اور ان کرداروں میں کارفرما ہو۔ شکیل صاحب نے ٹھیک کہا ہے کشمیر دیکھنے کے لئے بصارت ہی نہیں بصیرت کی بھی ضرورت ہے...... حامدی کے ہاں یہی بصیرت نہیں ملتی۔

مجھے اس بات سے انکار نہیں کہ کشمیر میں افلاس اور غربت ہے۔ اس بات سے بھی انکار نہیں کہ یہاں امیر اور غریب سبھی قسم کے لوگ ملتے ہیں لیکن حامدی نے جس کشمیر کی تصویر پیش کی ہے، اس میں صرف بھوکے، ننگے اور دق کے مریض رہتے ہیں، ان کے کردار یا تو بھوک سے مر جاتے ہیں یا تپ دق کا شکار ہو کر خون اُگلنا شروع کر دیتے ہیں۔ غربت اور افلاس کے خلاف یہاں کے عوام جو جنگ لڑ رہے ہیں اور اس جنگ میں انہیں جو فتوحات حاصل ہوئیں، حامدی کی تمام کہانیوں

میں اس کی ایک بھی واضح جھلک موجود نہیں ہے۔ اس کا ہر کردار بھوکا ہے، ہر کردار تپ دق کا مریض ہے اس کے سبھی کردار یا تو فرشتے ہیں یا شیطان، جو یا تو لٹتے ہیں یا لوٹتے ہیں۔ ان کے افسانے کی ہیروئن حُسن و جمال کا پیکر ہوتی ہے، حتیٰ کہ اُنہیں جہاں کہیں بھی بھکارن نظر آتی ہے وہ ماہ پارہ ہوتی ہے۔ ان کے افسانوں کا ہیرو ہانجی ہو، کلرک ہو یا افسانہ نگار، وہ باتیں شاعروں کی سی ہی کرتا ہے۔

"زلزلے" کا مرکزی کردار ایک ان پڑھ اور جاہل آدمی ہے، جسے لوگ اکثر پاگل خیال کرتے ہیں۔ وہ اپنی کہانی ان الفاظ میں سُناتا ہے۔:

"یہ لوگ زلزلوں سے ڈرتے ہیں، عجیب ہیں یہ لوگ، یہ زلزلوں کو نیا سمجھتے ہیں۔ حالانکہ زلزلے نئے نہیں ہوتے ہیں۔"

سچ تو یہ ہے کہ میں نے ان ہی زلزلوں میں پرورش پائی ہے۔ بچپن سے لے کر جوانی تک اور جوانی سے لے کر آج تک میں نے ایسے ہی زلزلے محسوس کئے ہیں جیسے میری زندگی ایک مسلسل زلزلہ ہے۔"

اور پھر شعبان چاچا اس لئے پاگل ہو کر پاگل خانے بھیج دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی لڑکی کی شادی کے لئے جلدی تیار نہیں ہو پاتا، اور لوگ طعنے دینا شروع کرتے ہیں پر شعبان چاچا ان طعنوں کی تاب نہ لا کر پاگل ہو جاتے ہیں۔ شعبان چاچا کا پاگل ہونا نفسیاتی طور ضروری نہیں تھا اور اس قسم کے مصنوعی اور غیر فطری کلائمکس پیدا کرنے کے لئے حامدی نے اپنے تمام افسانوں کو تختۂ مشق بنایا ہے۔

اس مختصر سی صحبت میں تمام افسانوں کا ایک ایک کر کے جائزہ لینا ممکن نہیں۔ مجموعی طور پر افسانے کا آغاز بھوک یا تپ دق سے ہوتا ہے اور تمام تر مسائل جو ان کی کہانیوں میں پیش کئے گئے ہیں، صرف بھوک اور تپ دق کی وجہ سے پیدا

ہو جاتے ہیں۔ کہیں کہیں حامدی خود اِن مسائل بھوک اور تپ دق سے گھبرا کر یا اکتا کر محبت کا موضوع پیش کرتے ہیں، لیکن اس موضوع کی پیش کش میں حامدی کا ذہن Adolesant age سے آگے نہیں بڑھنے پاتا۔ اس موضوع کی نفسیاتی کیفیت اور سماجی تضادات پر کہیں انکی نگاہ نہیں پڑی ہے۔ افسانہ نگار کے لئے حقائق کا احساس ہی ضروری نہیں ان کا ادراک اور شعور بھی ضروری ہے۔ حامدی کے افسانے پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ کوئی رومان پرست جو زندگی کو حقیقتوں کی بجائے تخیل کی عینک سے دیکھتا ہے، اپنے سطحی مشاہدات بیان کر رہا ہے۔

'بہار اور خون' میں حسین بھکارن اِتنی لیتے ہوئے کلرک کا ہاتھ دبا دیتی ہے۔ اور بہار آنے تک یہی بھکارن تین نوجوانوں کو دعوتِ شوق دیتی ہے۔ 'اور دیکھتا ہی رہ گیا' میں یہی بھکارن طوائف کا روپ دھار لیتی ہے۔ بھکارن کا سماجی پس منظر اس کے کردار کی نشو ونما اور اس کی ذہنی سطح کا احساس کئے بغیر حامدی اِسے اپنی کہانیوں کا کردار بنالیتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ہر عورت جسے دو وقت کا کھانا نہیں ملتا، وہ بھکارن ہو جاتی ہے اور بھکارن بن کر وہ عورت سے طوائف بن جاتی ہے۔ اولاً میں نے کشمیر میں اس قسم کی بھکارنیں نہیں دیکھی ہیں، اگر بدقسمتی سے حامدی صاحب نے اپنی افسانوی بھکارنوں کو کہیں دیکھا ہے، تو ان کے افسانے میں ان تضادات اور اس سماجی عمل کی کوئی ہلکی سی جھلک بھی کیوں نہیں ملتی، جو ان کے وجود میں آنے کیلئے ذمہ دار ہوتا ہے۔ اور میں یہ جاننا چاہوں گا کہ ان کے افسانوں کی بھکارن ہمیشہ حسن و جمال کا پیکر ہی کیوں ہوتی ہے۔ میں نے پرتاپ پارک، امیرا کدل اور ریگل سنیما کے قرب و جوار میں جو بھکارنیں دیکھی ہیں، وہ تو بڑی

بدصورت اور جسمانی لحاظ سے عموماً ناکارہ ہوا کرتی ہیں۔ ان پر حامدی صاحب کی نگاہ کیوں نہیں پڑی ہے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ حامدی کی کہانیوں کا کوئی ایک کردار بھی اس آب و گِل کی پیداوار نہیں ہے۔

اب دیکھئے، 'آنسو اور شعلے' میں ایک دیہاتن پھول چُننے والی ایک شہری بابو کے عشق میں مبتلا ہوتی ہے۔ اس کے عشق کرنے پر مجھے اعتراض نہیں ہے لیکن وہ جس انداز سے عشق کرتی ہے، اس سے مجھے وہ کشمیری لڑکی کی بجائے بمبئی کی کوئی ایکسٹرا گرل نظر آتی ہے۔ وہ شہری بابو سے کہتی ہے۔

''نہ جانے مجھے ہر وقت آپ ہی کا خیال کیوں رہتا ہے۔ مجھے آپ کے لئے پھول چُننے میں کتنی خوشی ہوتی ہے۔ نہ جانے کیوں؟ میں چاہتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ میرا کل بھی ایک مہکتا ہوا پھول بن جائے اور وہ آپ کی نذر کروں۔

اور یہی نہیں پھر حسب معمول جُدائی کا وقت آجاتا ہے اور حسب معمول یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہیرو دق کا مریض ہے اور کھانستا ہے۔ کیونکہ بھوک، افلاس اور دق کے بغیر حامدی کوئی کہانی مکمل ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لئے ایک طرف جہاں شمی اور اس کی ماں بھوک سے بدحال ہیں تو دوسری طرف شہری بابو کھانستا ہوا شہر کی طرف چل دیتا ہے۔

حامدی کے شعور کی سطحیت کا اندازہ کرنا ہو، تو اس کے کردار جو زیادہ تر شاعر، مصّور اور افسانہ نگار ہی ہوتے ہیں، کی زبانی فن، زندگی، سماج اور محبت کی تفسیریں سُنیئے۔

''وہ ایک فن کار تھا، فن کار! ایک فن کار سماج کے بندھنوں کو توڑ سکتا ہے۔ فن کار آزاد ہے۔ آزاد، غریبی اور امیری سے آزاد، فن کار محبت اور حسن چاہتا ہے۔''

(آنسو اور شعلے)

سوال یہ ہے کہ یہ تصور پرست Idealist کردار کہاں رہتے ہیں اور ان کا سماجی جواز Social justification کیا ہے۔ غربت اور امیری کے متعلق اُن کا اپنا تصور کیا ہے۔ یہ جاننے کے لئے اس کی وہ کہانیاں پڑھ لیجئے، جن میں انہوں نے اس کشمکش اور تضاد کو پیش کیا ہے، انہیں پڑھکر یہ احساس ہوتا ہے کہ غربت اور افلاس کا احساس دراصل حامدی کے اپنے احساس کمتری کی پیداوار ہے، اس لئے وہ اس تضاد کی بنیادی وجہ اور اس کی سماجی اسباب وعلل پر غور نہ کرسکے!

میں نے اوپر کہا ہے کہ حامدی کے افسانوں کا ماحول اور ان کے کردار کسی حالت میں بھی کشمیری یا کشمیر سے متعلق نہیں کہے جاسکتے۔ انہوں نے جس کشمیر کا ذکر کیا ہے، وہ مریضوں، بھوکوں، کمینوں اور رذیلوں کا کشمیر ہے۔ اسمیں دق، بھوک اور بدحالی کے سوا کچھ نہیں۔ اس میں رہنے والے سبھی شاعروں کی طرح تخیل کی دنیا میں رہتے ہیں۔ میں جس کشمیر میں رہتا ہوں وہاں نہ بھوک ہے اور نہ افلاس۔ وہاں عورتیں بھوک سے مجبور ہوکر عصمت فروشی اور بھیک مانگنے پر مجبور نہیں ہوتیں، وہاں ہر تیسرا آدمی دق کی وجہ سے خون نہیں تھوکتا، وہاں کوئی آدمی بھوک اور افلاس کی وجہ سے پاگل بھی نہیں ہوتا۔ وہاں کوئی لڑکی بڑی شستہ اور صاف زبان میں ادب پارے بھی تخلیق نہیں کرتی۔ وہاں صرف شاعر اور افسانہ نگار ہی نہیں رہتے، عام آدمی بھی رہتے ہیں جو بڑے کھردرے انداز سے سوچتے ہیں۔ وہاں کی ہانجن جب کسی مسافر کو دریا کے پار لے جاتی ہے تو اُس سے زبردستی پیسے وصول کرلیتی ہے۔ اس کی محبت میں فوراً گرفتار نہیں ہوتی۔ غرضیکہ 'وادی کے پھولوں' کی دنیا میرے کشمیر سے اس قدر مختلف ہے کہ مجھے اپنے کشمیر سے بے حد محبت اور وادی کے پھولوں سے نفرت ہوجاتی ہے۔ میں یہ اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں کہ دنیا کو بتادوں کہ ''وادی کے

پھول'' وادی کے پھول نہیں ہیں بلکہ قنوطی ادیبوں کے تصور پرست ذہنوں کی پیداوار ہیں، جن کا حقیقت سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔

حامدی کے افسانے پڑھکر میں مایوس نہیں ہوا ہوں۔ میری نگاہیں تیج بہادر، پشکر، ہری کرشن، مخمور بدخشی، امیش کول، دیپک کول اور بھارتی کی طرف اٹھ جاتی ہیں، جو حقیقی کشمیر کی ترجمانی کرکے وادی کے پھولوں کی مہک سارے ہندوستان میں پھیلا رہے ہیں۔ ان تمام فن کاروں کو حامدی کے خام تجربوں Romantic Idealism سے بچنا چاہیئے۔ اور میرا خیال ہے کہ مجموعی اعتبار سے حامدی کے افسانوں کا یہ مجموعہ اردو ادب میں مقداری لحاظ سے کوئی اضافہ ہو تو ہو مگر معیاری لحاظ سے اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔

میں اپنے دل کی جانب دیکھ کر خاموش ہوتا ہوں
بہاریں پوچھتی ہیں یہ ویرانہ وطن کس کا

☆☆☆

شمیم احمد شمیم

جشنِ کشمیر کی تمدّنی اہمیت

ہر مُلک اور قوم کے اپنے اپنے تہوار ہوتے ہیں اور انسانی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ انسان نے تمدّن کے ابتدائی دور سے ہی اپنی مسرت یا عقیدت کے اظہار کے لئے تہواروں کی روایت کا آغاز کیا تھا۔ پرانے پتھر کے زمانے کی معاشرت میں بھی اگر ہمیں کہیں اس دَور کے سماج کی اجتماعی رُوح نظر آتی ہے تو وہ ان ہی تہواروں میں، جن کو منانے کے لئے سب لوگ ایک جگہ جمع ہوجاتے تھے، ان تہواروں کی نوعیت مذہبی، سماجی اور فصلی ہوا کرتی تھی۔

تمدّن کی ترّقی کے ساتھ ساتھ انسان نے اپنے آباء واجداد سے یہ تمدّنی میراث حاصل کر کے اسے نہ صرف قائم رکھا بلکہ اس میں کچھ اہم اضافے بھی کر دیئے۔ حتیٰ کہ ہر موسم کا اپنا ایک تہوار ہوگیا۔ ہر اہم مذہبی تقریب کے لئے ایک تہوار مخصوص کرلیا گیا...... زراعت پیشہ لوگوں نے فصلی تہواروں کا آغاز کیا۔ غرضیکہ اپنی مسّرت یا عقیدت کے اظہار کے علاوہ تہواروں کو انسان نے اپنے ذوقِ تفریح کی آسُودگی کا ذریعہ بھی بنایا۔ ہولی، دیوالی اور عید کے تہوار اب صرف عقیدت کا

اظہار ہی نہیں بلکہ متنوع تفریحات کا سامان بھی ہیں۔

مذہبی تہواروں کے علاوہ ہماری ریاست کے کچھ مخصوص مقامی تہوار بھی ہیں جو ہماری تمدّنی زندگی کی مختلف منزلوں پر وجود میں آئے ہیں۔ مثلاً بہار کے آغاز میں بادام واری کا تہوار جسے ہم آج بھی بڑی سرگرمی اور دلچسپی سے مناتے ہیں یہ ہمارے لئے کوئی مذہبی یا سماجی اہمیت نہیں رکھتا بلکہ یہ خالصتاً انسان کے اس ذوقِ تفریح کی پیداوار ہے جو کہیں نہ کہیں سے اپنے لئے راہ پیدا کر لیتا ہے۔ غلامی جہاں ہمیں زندگی کی مُستعار قدریں مہیا کرتی ہے وہاں وہ ہمارے مزاج کو بدلنے کے سامان بھی کرتی ہے۔ صدیوں کے دَورِ غلامی میں ہمیں رفتہ رفتہ یہ بھلا دیا گیا تھا کہ ہماری حیثیت ایک قوم کی ہے جس کی اپنی روایات، اپنا تمدّن اور ایک اپنا مزاج ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم اپنی قومی روایات سے بیگانہ ہو کر چند مستعار تصوّرات کو اپنانے لگے۔ اس سے ہماری تہذیبی زندگی میں جو انحطاط پیدا ہوگیا، وہ ابھی مکمل طور ختم نہیں ہو پایا ہے۔ ہمارے ذہنوں سے مقامی تہوار اور تقریبات کی اہمیت حرفِ غلط کی طرح مٹ گئی۔

مطلق العنان حکمرانوں کے چُنگل سے آزاد ہونے کے بعد جب ہماری تہذیبی زندگی نے ایک کروٹ بدلی تو ہمیں احساس ہوا کہ غلامی نے نہ صرف ہمارے جسم کو قید کیا تھا بلکہ ہمارے شعور کو بھی اپنی گرفت میں لیا تھا اور ہم ایک عظیم تہذیبی ورثے سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ یہ احساس اتنا شدید تھا کہ کھوئی ہوئی میراث کو حاصل کرنے کے لئے ہم نے غیر معمولی جوش وخروش اور عزم کے ساتھ اپنی تہذیبی زندگی کے ایک نئے دَور کا آغاز کیا۔ ہمارے ادب میں ایک نئی توانائی پیدا ہوگئی جس نے ہمیں نئے حوصلے اور نئے افق دیئے...... یہ تہذیبی نشاۃ ثانیہ

نامکمل رہتا، اگر اس مُلک کے گم نام اور اُفتادہ فن کاروں کو بھی اپنے فن کی عظمت اور اہمیت کا احساس دِلا کر اس نئے کارواں میں شامل نہ کیا جاتا۔

جشن کشمیر اسی نشاۃ ثانیہ کی تکمیل تھا جس کا آغاز آج سے نو سال پہلے ہماری زندگی اور ہمارے کلچر میں ہوا ہے۔ ہم یہ بھول گئے تھے کہ یہاں کے بھانڈ، رقاص، گوییے اور اسی نوع کے دیگر اُفتادہ فن کار ہماری کلچرل زندگی کے اتنے ہی اہم رُکن ہیں جتنے شاعر اور ادیب۔ یہ صحیح ہے کہ غیر ملکی حکمرانوں نے ان کی اہمیت کو نظر انداز کر کے ان کے فن اور ان کی صلاحیتوں کو کچل ڈالا۔ یہ ابتذال اور گراوٹ کی اس گہرائی تک پہنچ گئے کہ ہم بھی انہیں ذلت اور حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے۔ لیکن اگر ہم اپنی تہذیبی قدروں کا احیا چاہتے ہیں، ایک نئے اور صحت مند سماج کی تشکیل چاہتے ہیں تو ہمیں ان فن کاروں کے کچلے ہوئے فن کو بھی اُبھارنا ہوگا کہ اس میں ہمارے فن کی ابدی قدریں پوشیدہ ہیں۔ ہمارے فن کی روایات انسان دوستی، عالم گیر اخوت اور ظلم و استبداد کے خلاف نفرت کی روایات ہیں۔ اس کا مزاج ایک غیرت، خوددار اور مستقل مزاج قوم کے حوصلوں کا آئینہ دار ہے۔ ان قدروں کو ماضی کے ورثے سے کھنگال کر ہمیں نئی نسلوں کے سُپرد کرنا ہوگا کہ وہ اپنی نئی زندگی کی تشکیل میں ان سے مدد لیں...... کسی ملک یا قوم کا کلچر ''خالص'' نہیں ہوتا۔ ہر مُلک کے تمدّن پر دوسرے تمدّنوں کا اثر پڑتا رہا ہے۔ ہمارے تمدّن پر حکمرانوں کے تمدّن کے گہرے اثرات موجود ہیں۔ ہمارے رقص، ہماری موسیقی اور ہمارے پاتھر (ڈرامے) براہِ راست غیر ملکی اثرات سے متاثر ہوئے ہیں۔ ہم چاہیں بھی تو ان اثرات سے انکار نہیں کر سکتے۔ مثلاً ہمارا لوک ناچ خالص یہاں کا ناچ نہیں ہے۔ اس کی روایتوں میں پٹھانوں کی روایات گڈ مڈ ہو کر رہ گئی ہیں۔ ہماری

موسیقی، جس پر حزنیہ رنگ غالب ہے، خالص ہمارے مزاج کی آئینہ دار نہیں۔ اسی طرح ہمارے موجودہ پاتھر مکمل طور ہماری روایات سے ہم آہنگ نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فنونِ لطیفہ کے یہ شعبے نئے نئے حکمرانوں کی آمد سے متاثر ہوتے رہے۔

جشنِ کشمیر اسی اُفتادہ فن کا احیائے نو تھا اور یہ امر باعث خوشی ہے کہ عوام نے اس تمدّنی تہوار کو اپنا کر اِسے غیر معمولی کامیابی بخشی اور جشن کی بے پناہ مقبولیت کے پیش نظر یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ آئندہ یہ ہمارے ہاں ایک مستقل تہوار کے طور پر منایا جائے گا۔

جشن کے دوران میں کچھ ایسے باصلاحیت فن کار دریافت ہوئے ہیں کہ اگر ان کی باقاعدہ تربیت کا انتظام کیا جائے تو ان کا وجود ہمارے کلچرل سرمائیے میں ایک بیش بہا اضافہ ہوگا۔ مثلاً چاڈورہ کی لوک ناچ پارٹی، کپواڑہ، اسلام آباد اور سری نگر کے رقاص، واہتھورہ کے اداکار۔ یہ سب ہمارے لوک تمدّن کے وہ عناصر ہیں جن سے ہماری معاشرت اور تہذیب مرکب ہے۔ واہتھورہ اور چاڈورہ کے لوک ناچ کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے جب ہم اس ناچ کے ارتقاء کی تاریخ کا تجزیہ کرتے ہیں۔ حکمرانوں کی استبدادیت کے خلاف ناچ کی ایک ایک ادا اور موسیقی کی ایک ایک تان میں کس طرح فنکاروں نے محکوموں کی فریاد کو سمو دیا ہے۔ پائل کی ایک ایک جھنکار میں اس دَور کی معاشرت اور اس معاشرہ کے تصادمات کس طرح سمٹ کر آئے ہیں۔ جذبۂ انتقام نے کس طرح اپنے لئے پناہیں ڈھونڈی ہیں، محکوم معاشرت کی یہ رُوح فرسا داستان آپ کو چاڈورہ کے لوک ناچ میں ملے گی۔

واہتھورہ کے فن کاروں کا پاتھر بھی تاریخی حیثیت سے کم اہمیت کا حامل نہیں۔ اس میں حکمرانوں پر جو بھرپور طنز ہے وہ اس دَور کے محکوموں کی ذہنیت کو

واضح کرتا ہے جو صید ہونے کے باوجود صیاد پر چوٹ کرنے سے نہ چوکتے تھے۔ جو حکمرانوں کی بوالعجبیوں کا مذاق اُڑا کر اپنی بے بسی اور محرومیوں کا انتقام لیتے تھے۔ ان میں اپنی کمزوریوں اور محرومیوں پر ہنسنے کا بھی حوصلہ تھا۔ غلامی نے ان کے جوہرِ انسانیت کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ مگر غلاموں نے شکست نہ کھائی۔ وہ نیم جان ہو کر بھی لڑتے رہے۔ گو ان کے ہاتھ میں تلوار نہ تھی۔ ''درزہ پاتھر'' ''راجہ پاتھر'' اور اس نوع کے دوسرے پاتھر محکوموں کے ظالموں کے خلاف خاموش جہاد کے آئینہ دار ہیں۔ ''شکارگاہ'' عوام کے مزاح کی ایک قابلِ قدر مثال ہے۔

اسی طرح اننت ناگ کے عبدالغنی، کپواڑہ کے محی الدین اور سرینگر کے موتی لال کیمو کے رقص میں بھی کلاسیکی رنگ کا امتزاج ہے۔ کتھک کی علامات ہمارے لوک ناچ میں کثرت سے پائی جاتی ہیں اور اگر موجودہ ناچ کو صحیح بنیادوں پر اُستوار کیا جائے اور ان رقاصوں کی باقاعدہ تربیت کا انتظام کیا جائے تو ہمارا لوک ناچ ہندوستان کے دیگر کلاسیکی ناچوں کے مقابلے میں جگہ پاسکتا ہے۔ ہمارے ہاں ناچ اور موسیقی کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ جہاں کہیں بھی محفلِ رقص و موسیقی منعقد ہوئی۔ ہزاروں لوگ، جن میں مرد، عورتیں، بوڑھے، بچے سبھی شامل ہیں رات رات بھر محظوظ ہوتے رہے۔

ریاست میں اچھے موسیقاروں کی کمی نہیں اور خوش قسمتی سے یہاں موسیقی کے کچھ سکول بھی قائم ہیں جہاں کلاسیکل موسیقی کی تربیت کا انتظام ہے۔ مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ سرکاری طور ایک ایسے کالج کا انتظام کیا جائے جہاں مقامی موسیقاروں کو تربیت کے بہتر مواقع میسر ہوں۔ جشن کے دوران میں باہر سے بھی کچھ بڑے بڑے موسیقاروں کو بُلایا گیا تھا جس سے ہمارے ہاں کے

موسیقاروں کو بیرونِ کشمیر کے موسیقاروں سے میل جول کا موقع مِلا۔

وادی بھر میں ایسے شعراء کی کمی نہیں جو مناسب مواقع نہ ملنے کی وجہ سے قعرِ گمنامی میں پڑے رہے۔ جشن میں مشاعروں کا انتظام کافی وسیع پیمانے پر کیا گیا تھا اور وادی کے اہم مراکز پر مشاعروں کی محفلیں منعقد ہوئیں جن میں مقامی شعراء کے علاوہ ہندوستان کے بڑے بڑے شعراء نے بھی حصہ لیا۔ اس طرح بہت سے نئے شاعر عوام سے مانوس ہوئے اور عوام کو مقامی شعراء کے علاوہ ہندوستان کے شعراء کو دیکھنے اور اُن کا کلام سُننے کا موقعہ ملا۔

جشن کشمیر کے مقاصد میں یہاں کے کلچرل احیاء کے علاوہ مقامی لوگوں کو ایک وسیع پیمانے پر تفریح کا سامان مہیا کرنا بھی شامل تھا۔ اس غرض کے لئے باہر سے پہلوانوں، فلمی اداکاروں اور کلکتہ کی کلاسیکی ناچ کی پارٹی کو بھی دعوت دی گئی تھی۔ تفریح کے یہ پروگرام بے حد کامیاب رہے۔ ریاست کی تاریخ میں پہلی بار اتنی کثرت سے لوگوں نے کسی تفریحی پروگرام میں اتنی دلچسپی لی ہے جتنی جشن کشمیر کی طرف سے پیش کئے گئے پروگراموں میں لی گئی۔ جشن کے دوران میں مختلف سکولوں اور سماجی اداروں کی طرف سے مختلف موضوعات کے ڈرامے دکھائے گئے۔ جنہیں بے شمار اداروں نے دیکھا اور سراہا۔ ''ہی مال ناگرائے'' کی بے پناہ مقبولیت سے اس بات کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہاں کے لوگوں کو اپنے لوک ادب سے کتنی گہری دلچسپی اور لگاؤ ہے۔ کشمیر کے سٹیج پر پہلی بار ایک لوک کہانی کو غنائی رُوپ میں پیش کیا گیا تھا اور اس کی پیش کش میں کئی نئے تجربے بھی کئے گئے تھے۔ جنہیں غیر متوقع مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہماری ریاست میں تھیٹر کا مستقبل کتنا تابناک ہے اور اگر تھیٹر کی ترقی کی طرف معقول توجہ دی

جائے تو مُلک کی ایک اہم ضرورت پوری ہو گی۔

اس سے قبل ہمیشہ سری نگر ہی ہر قسم کی تفریحات کا مرکز ہوا کرتا تھا مگر جشن کشمیر کی خصوصیت یہ تھی کہ وادی کے کونے کونے میں مقامی باشندوں نے اس میں حصہ لیا اور سرینگر اور بیرونِ کشمیر کی پارٹیوں نے بھی مقامی پروگراموں میں شمولیت کی جس کی وجہ سے ہر جگہ بڑی دِل چسپی اور رنگا رنگی رہی۔ جموں کا ''بانگڑہ'' کُد اور لداخ کے لوک ناچ ہر جگہ بہت پسند کئے گئے۔

ستمبر کا مہینہ واقعی ہماری کلچرل تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے ہماری قومی زندگی کے احیا میں ایک نئے باب کا آغاز کیا ہے۔ گمنامی اور ذلت کی گہرائیوں میں پڑے ہوئے فن کاروں کو پہلی بار اپنے فن اور اس کی اہمیت کا احساس ہوا ہے۔ صدیوں کی غلامی کے بعد اس حقیقت کا احساس ہماری نئی زندگی کے لئے ایک نیک شگون ہے۔ جشنِ کشمیر نے ایک بہت بڑی تاریخی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ سیاسی اُلجھنوں سے تنگ آ کر کشمیری عوام کا ذہن خالص تفریح چاہتا ہے جس سے انہیں ذہنی سکون میسر ہو۔ سال ہا سال سیاسی جھمیلوں میں گرفتار کشمیری کو پہلی بار ایک متوازن انسان کی طرح زندگی کی دِلچسپیوں، رنگا رنگیوں اور بزم آرائیوں میں حصہ لینے کا موقع مِلا اور وہ ایک بار پھر ذہنی کوفتوں سے چھٹکارا پا کر نئے مسائل سے اُلجھنے کے لئے تیار ہے۔

جشن کا بنیادی مقصد فوت ہو کر رہ جائے گا اگر اس کے اختتامیہ کے طور پر ایک مستقل کلچرا کیڈیمی کا قیام عمل میں نہ لایا جائے جو یہاں فنونِ لطیفہ کو منظم کر کے یہاں کے فن کاروں کی تعلیم و تربیت کا خاطر خواہ انتظام کر سکے۔

.........☆☆☆.........

شمیم احمد شمیم

کشمیری میں اَفسانہ نویسی

''بال مرائیو'' اور '' آدم چھُ یتھے بدنام'' بنسی نردوش کی کشمیری کہانیوں کے مجموعے ہیں۔ میں کشمیری افسانے کی موجودہ رفتار سے مطمئن نہیں ہوں۔ یکے بعد دیگرے کئی افسانوی مجموعوں کی اشاعت اگر چہ اس بات کی دلیل ہے کہ کشمیری زبان میں بہ کثرت افسانے لکھے جا رہے ہیں لیکن فنی اعتبار سے کشمیری افسانہ ابھی تک گھٹنوں کے بل چل رہا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض افسانہ نگاروں نے کچھ اہم افسانے لکھے ہیں، لیکن مری نگاہیں ''عظیم'' افسانوں کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ میں ابدی زندگی کا قائل نہیں ہوں، لیکن ادب کی دائمی و دوامی قدروں پر یقین رکھتا ہوں، کشمیری افسانے کی محدود سی کائنات میں مجھے زندگی تو نظر آتی ہے لیکن وہ دائمی اور دوامی قدریں ابھی تک ناپید ہیں جو زندگی کو اعلیٰ فن کے شیشے میں اُتارتی ہیں۔ میں مستقبل سے مایوس نہیں لیکن حال کی افراتفری سے کچھ پریشان ضرور ہوں۔ ہمارے ہاں کے بہت سے افسانہ نگار افسانے کی ہیئت، تکنیک اور تقاضوں کو سمجھے بغیر افسانہ نگاری کا شغل اختیار کرتے ہیں اور جس طرح شاعروں کی کثرت کو تہذیب و تمدن کے زوال

کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔اسی طرح میں افسانہ نگاروں کی اس کثرت کو کشمیری زبان کے لئے ایک خطرہ سمجھتا ہوں، میرے کہنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ افسانہ نگاری کے لئے کسی خاص قسم کے لائیسنس یا اجازت نامے کی ضرورت ہے لیکن افسانہ نگاروں سے یہ توقع رکھنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ افسانے کے بنیادی لوازمات اور اس کے تقاضوں کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

بنسی نردوشؔ کے دو افسانوی مجموعے ''بال مرأیو'' اور ''آدم چھ تتھے بدنام'' دیکھ کر مجھے اس بات کی خوشی ہوئی ہے کہ نردوشؔ جدید افسانے کے تقاضوں کو سمجھتے ہیں اور اپنے افسانوں میں ان سے حتی المقدور عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں ''بال مرأیو'' اور ''آدم چھُ تتھے بدنام'' کو کشمیری زبان کے افسانوی ادب میں ایک خوشگوار اضافہ سمجھتا ہوں۔سب سے زیادہ اطمینان بخش بات یہ ہے کہ نردوشؔ کا فن ارتقا پذیر ہے۔اس کا تازہ ترین مجموعہ ''آدم چھُ تتھے بدنام'' اس کے فنی نکھار اور اسکی فکری پختگی کی ایک عمدہ مثال ہے۔اس مجموعے کی کہانیاں ''بال مرأیو'' کی کہانیوں کے مقابلے میں فن اور موضوع کے اعتبار سے زیادہ موثر اور متنوع ہیں۔

''بال مرأیو'' میں چھ کہانیاں ہیں اور نردوشؔ کا پہلا مجموعہ ہے ان کہانیوں میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ان کے موضوعات کافی فرسودہ ہیں اور ان کے Treatment میں بھی کوئی جدت نہیں ہے لیکن اس کے باوجود ان کہانیوں میں ایک دلکشی ہے۔ایک حسن ہے۔یہ کہانیاں پڑھتے ہوئے ان کے باسی پن کا ہلکا سا احساس تو ہو جاتا ہے لیکن قاری ''بور'' نہیں ہوتا۔یہ نردوشؔ کے اندازِ بیان کا اعجاز ہے۔اس کی زبان میں داستان گوؤں کی سی لذت اور لہجے میں وہ بے ساختگی ہے کہ کہانی پڑھتے ہوئے ایک طلسم سا بندھ جاتا ہے۔نردوشؔ کی کہانیوں کی سب سے

اہم خصوصیت ان کا ماحول ہے اور یہ ماحول پیدا کرنے کے لئے نردوشؔ کرداروں کی شخصیت سے زیادہ اُن کی گفتگو کا سہارا لیتے ہیں۔گفتگو کرداروں کی شخصیت کا ایک اہم پہلو ہے لیکن یہ پوری شخصیت نہیں ہے۔اسی لئے ''بال مرأیو'' میں کرداروں کی پوری شخصیت نہیں اُبھرتی اور غالباً یہی وجہ ہے کہ کہانی کا ماحول تو ہمارے ذہن میں رہتا ہے لیکن کہانی کے خاتمے کے ساتھ ہی اس کے کرداروں کا تصور ذہن سے محو ہو جاتا ہے۔''جافر خان'' بھی جو دراصل ایک کردار کی کہانی ہے ہمارے ذہنوں کو ایک کردار کی حیثیت سے نہیں بلکہ اپنے ماحول کی وحشت اور بے چارگی کی وجہ سے متاثر کرتا ہے۔ ماحول کا یہ طلسم فنی لحاظ سے مستحسن تو ہے لیکن بجائے خود فن نہیں ہے۔یہ شدتِ تاثر پیدا کرنے کا ایک ذریعہ ہے بجائے خود مقصد نہیں۔

''تُلر'' ایک نفسیاتی مطالعہ ہے لیکن یہ موضوع اتنا گھسا پٹا ہے کہ نردوشؔ باوجود کوشش کے بھی اس میں کوئی نئی بات پیدا نہیں کر سکے ہیں۔بعض مقامات پر یہ نفسیاتی مطالعہ بے حد غیر فطری بن جاتا ہے ''موہنا'' کا کردار بڑی حد تک قابلِ قبول ہے لیکن اس کے نفسیاتی تغیر کا عمل اتنا کمزور ہے کہ اس کا سارا کردار مصنوعی بن جاتا ہے۔

''یوتامت نال ووتم دامنس تل'' ایک اچھی کہانی ہے۔اس کہانی کا کوئی مقصد نہیں اور یہ ''زندگی کرنے'' کا کوئی گُر بھی نہیں سکھاتی، یہ زندگی کے کسی اہم اور سربستہ راز کو بھی بے نقاب نہیں کرتی لیکن اس کے باوجود یہ ایک اچھی کہانی ہے۔ بیسویں صدی کے اس ایٹمی دَور میں ہماری زندگی توہمات اور اعتقادات کا سہارا لئے بغیر بعض الجھنوں یا معمول کی توجیہہ نہیں کر سکتی۔گنگادھر کو پیروں، فقیروں اور درویشوں کی کرامات پر یقین نہیں۔خود مجھے بھی ان پر کوئی وشواس نہیں۔لیکن اس

نے اپنی آنکھوں کے سامنے کوئلے کے ایک ٹکڑے کی کرامت دیکھ لی، اعتقاد اور یقین کا ایک غیر معمولی معجزہ دیکھا۔ اس کی عقلیت، اس کا شعور اور اس کی پوری شخصیت اس ''کرامت'' کی توجیہہ نہیں کر سکتے۔ وہ خود اس ''توہم'' کا شکار ہو گیا جس کا اس نے کبھی مذاق اُڑایا تھا...... یہ ایک معمہ ہے، ایک ناقابلِ توجیہہ حقیقت ......زردوشؔ نے اس معمے کا کوئی حل پیش نہیں کیا ہے لیکن اس کو کچھ اس انداز سے پیش کیا ہے۔ کہ یہ ہم سب کی زندگی کا معمہ بن کر رہ گیا ہے۔

''جافر خان''، ''شروک'' اور ''گس لوگ داوس'' اوسط درجے کی کہانیاں ہیں۔ ان میں زبان کا چٹخارہ اور بیان کی دِل کشی ضرور ہے۔ لیکن کوئی ایسی کیفیت نہیں جو روح کو تازگی بخشے یا ذہن کو دعوتِ فکر دے۔ یہ دلچسپ ہیں دِل نشین نہیں۔ ان کہانیوں میں تخلیق کی روح سے زیادہ ترتیب کا سلیقہ نظر آتا ہے ''بال مرآیو'' نچلے درجے کے طبقے کی ایک کہانی ہے۔ اس میں اس طبقے کی زندگی کی ساری بدصورتی اور گھناؤنے پن کے ساتھ اس کا حسن بھی نمایاں ہے۔ زندگی کی تلخیاں، محرومیاں اور نامرادیاں انسانیت کو مسخ کر دیتی ہیں، اس کو ختم نہیں کر سکیں۔ قادر کی محبت کچھ دیر کے لئے نفرت اور حیوانیت کے سیلاب میں بہہ جاتی ہے لیکن اشمؔ کی رفاقت کا احساس آخر غالب آجاتا ہے۔ وہ جس نے اپنی نفرت کے اظہار کے لئے ساری دُنیا کو سر پر اُٹھایا تھا دُنیا کی نظریں بچا کر اپنی محبت کا اقرار کرنے لگا۔ یہ محبت کی نفرت پر فتح ہے اور زردوشؔ نے بڑی چابک دستی سے اس موضوع کو پیش کیا ہے۔ یہ کہانی پڑھ کر اخترؔ محی الدینؔ کی مشہور کہانی ''دندوَزُن'' یاد آجاتی ہے۔ ماحول، کرداروں اور کلائمکس کے اعتبار سے ان دو کہانیوں میں بڑی مماثلت ہے لیکن ''دندوَزُن'' میں گہرائی ہے اور ''بال مرآیو'' میں وُسعت۔ زردوشؔ کی کہانیوں کی ایک

بڑی خامی یہ ہے کہ وہ بات کو پھیلا کر بیان کرتے ہیں۔ اِس پھیلاؤ سے کہانی کے نقطۂ عروج میں تاثر کی وہ شدت باقی نہیں رہتی جو ایک فن پارکا منتہائے مقصد ہوتا ہے۔

''آدم چھُ تھے بدنام'' زردوشؔ کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ بہ حیثیت مجموعی اس مجموعے کے افسانے موضوع اور ہیّت کے اعتبار سے پہلے مجموعے کے افسانوں سے یقیناً بہتر ہیں۔ ان میں زردوشؔ کی فنی پختگی کے ساتھ اس کی خود اعتمادی بھی نمایاں ہے اِس مجموعے میں بھی کل چھ کہانیاں ہیں زردوشؔ نے دعویٰ کیا ہے کہ اس میں پانچ کہانیاں اور ایک ناولٹ ہے۔ ناوِلٹ مجھے تلاش بسیار کے باوجود کہیں نظر نہ آیا۔

مجموعے کی پہلی کہانی ''اُتی رب اُتی سب'' ہے۔ یہ اس مجموعے کی ہی نہیں، زردوشؔ کی سب سے کمزور کہانی ہے۔ اس کہانی کا کوئی مرکزی خیال ہی نہیں ہے اور زردوشؔ نے کہانی کو غیر ضروری طول دے کر اس کا رہا سہا اثر بھی کھو دیا ہے (ہو سکتا ہے کہ اسی طوالت کے پیشِ نظر زردوشؔ اسی کو ناوِلٹ کہتے ہوں، لیکن اس غیر ضروری طوالت کے باوجود میں اسے طویل افسانہ ماننے میں بھی تامّل کروں گا) کہانی پڑھتے پڑھتے یہ احساس ہو جاتا ہے کہ کہانی کار یا تو کسی ''اہم حقیقت'' کا انکشاف کرنے والا ہے یا ہماری کسی ایسی کمزور رگ کو چھیڑنے والا ہے۔ ہم تلملا جائیں گے لیکن آخر میں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ صرف تضیع اوقات کا احساس ہو جاتا ہے ''تقصیر کس'' اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے بڑی جان دار کہانی ہے۔ لیکن غیر معمولی ڈرامائیت پیدا کرنے کے لئے زردوشؔ نے ایسے واقعات کا سہارا لیا ہے جن سے کہانی کی ساری فضاء مصنوعی اور غیر حقیقی بن گئی ہے۔ زردوشؔ کی کہانیاں

پڑھ کر یہ احساس ہو جاتا ہے کہ اُسے پڑھنے والے کی ذہانت، فہم وفراست اور سوجھ بوجھ پر کوئی اعتماد نہیں۔ اس غلط فہمی کے نتیجے کے طور پر اس نے کئی اچھی کہانیوں کے ساتھ بے انصافی کی ہے!

''کائنہ موراُون شورے پان'' ایک نفسیاتی کہانی ہے۔ تنہائی، جنسی محرومی اور فرقت اِنسان کی پوری نفسیات کو متاثر کر دیتی ہیں۔ نفرت، محبت، بغاوت اور احتجاج کے لئے انسان عجیب عجیب حرکتیں کرتا ہے۔ وہ خارجی طور پر ایک نارمل اِنسان ہوتے ہوئے بھی عام آدمیوں کی دُنیا سے الگ اور مختلف دنیا میں رہتا ہے۔ دامودھر کا کردار بڑی خوبی سے نبھایا گیا ہے اور اس کی پوری نفسیات کو کانتا کے پسِ منظر میں بڑی خوبی سے پیش کیا گیا ہے۔ اس کہانی میں صرف ایک خامی ہے اور وہ ہے کہ اس کا انجام! نردوش نے کہانی کو اپنے منطقی انجام پر لے جا کر ختم کر دیا ہے۔ حالاں کہ کہانی کو وہیں ختم ہو جانا چاہیئے تھا جہاں کانتا اور اس کا شوہر، آپس میں گھل مل جاتے ہیں اور دامودھر کو اپنی تنہائی کا شدید احساس ہو جاتا ہے۔

اس مجموعے کی دو کہانیوں ''کھوژن'' اور ''براتھ'' کا میں خاص طور پر ذکر کرنا چاہتا ہوں کیوں کہ میں ان دونوں کو صرف نردوش کی نہیں بلکہ کشمیری زبان کی بہترین کہانیوں میں شمار کرتا ہوں۔ یہ دونوں کہانیاں فنی لحاظ سے مکمل ہونے کے علاوہ کشمیری زبان میں افسانے کے رُجحانات اور اس کے ارتقاء کے امکانات کی طرف بھی اشارہ کرتی ہیں! ''کھوژن'' بظاہر ایک allucination ہے لیکن نردوش کا زورِ بیان اور اس کی روانی یہاں اپنی بلندیوں پر ہے۔ پوری کہانی میں ایک ایسا سماں بندھ گیا ہے کہ یہ سوچنے کے لئے فرصت ہی نہیں ملتی کہ جو کچھ بیان کیا جا رہا ہے وہ ممکن بھی ہے یا نہیں۔

''براتھ'' بڑی حسین اور جاندار کہانی ہے۔ میں خود تقدیرِ مطلق کا قائل نہیں لیکن میری زندگی میں کئی بار ایسے مقام آئے ہیں۔ جہاں مجھے تقدیر اور مقدر پر ایمان لانا پڑا ہے۔ ''براتھ'' تقدیر کے مطلق یا ناگزیر ہونے کے موضوع پر کوئی تھیسس نہیں ہے لیکن ایک سوالیہ علامت ضرور ہے۔ یہ ہماری زندگی کے کسی سربستہ راز کو افشاں نہیں کرتی بلکہ زندگی کی ایک عام سی حقیقت کو ''پراسرار'' بنا دیتی ہے۔ یہ نئے اور پرانے دور کی نہیں بلکہ نئے اور پرانے انسان کی کش مکش ہے۔ یہ نیا اور پرانا انسان ایک ہی وجود رکھتے ہیں لیکن ان کے ذہن، شعور اور لاشعور میں ایک زبردست کشمکش ہے!

نردوش کی کہانیوں کے تقریباً سبھی کردار کشمیری پنڈت سماج کے اوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ چوں کہ خود اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے وہ اس طبقے کی نفسیات، ان کے مسائل اور ان کی زندگی پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ کرداروں کے ایک مخصوص طبقے سے وابستگی کے باوجود نردوش کے کردار ''طبقاتی کردار'' ہو کر نہیں رہ گئے ہیں بلکہ پوری زندگی پر حاوی ہیں۔ ایک لحاظ سے کرداروں کے اس انتخاب نے بہت حد تک نردوش کو ''رسوا'' کر دیا ہے اور اس کے سماجی شعور، نظریات اور فکر کو سمجھنے میں آسانی پیدا کر دی ہے۔ نردوش کسی خاص مکتبہ فکر ادبی نظریئے کا قائل نہیں۔ جو لوگ ادب کو افادیت اور مقصدیت کے آئینے میں دیکھنے کے خواہش مند ہیں اُنہیں نردوش کے افسانے پڑھ کر مایوسی ہوگی۔ نردوش کسی نظریئے یا اصول کی تبلیغ نہیں کرتا۔ وہ زندگی کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کی بھی کوئی کوشش نہیں کرتا۔ وہ صرف اِنسانی ذہن کے تہہ خانوں میں جھانکتا ہے اور شخصیت کی بھول بھلیوں میں بھٹکتا ہے۔ زندگی کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ اس کے اسرار میں کھو جاتا ہے۔

اس کیلئے زندگی بڑی پُر کیف اور پُر اسرار شے ہے۔ وہ خود حیران ہو جاتا ہے اور اپنے پڑھنے والوں کو اس حیرت میں شریک کرنا چاہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہی اس کے فن کا مقصد ہے اور وہ بہت حد تک اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

کشمیری افسانے کی محفل میں بنسی نردوشؔ کی آمد میرے لئے یقیناً باعثِ مسرت ہے۔ وہ بڑا ذہین اور محنتی ہے۔ اس کے ہاں زورِ بیان بھی ہے اور ذوقِ سلیم بھی! لیکن ابھی اس کے تجربات میں گہرائی پیدا نہیں ہوئی ہے جو اعلیٰ درجے کی فنی تخلیق کے لئے غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں نردوشؔ کی زود نویسی اُسے اُس محنت اور ریاض سے محروم نہ کردے جس کے بغیر اچھے ادب کی تخلیق ممکن نہیں!

نردوشؔ کو مقدار کے ساتھ معیار کو ذہن میں رکھنا چاہئیے۔

(............شیرازہ جنوری ۱۹۶۳ء............)

............☆☆☆............

شمیم احمد شمیمؔ

''سَت سنگر'' کی ثقافتی اہمیت

''ست سنگر'' کا یہ جائزہ دراصل بہت پہلے شائع ہو جانا چاہیئے تھا، لیکن میری مصروفیات اور تساہُل پسندی نے مِل کر اس کی اشاعت کو ٹالے رکھا۔ آج سے تقریباً آٹھ ماہ پہلے کی بات ہے کہ اخترؔ نے ''ست سنگر'' کی ایک کاپی نذر کرتے ہوئے مجھ سے درخواست کی کہ میں اس پر کچھ لکھوں۔ میں نے ''ست سنگر'' کی بیشتر کہانیاں اخترؔ کی زبانی سُنی تھیں۔ مجھے یہ کہانیاں بے حد پسند تھیں اور پھر اخترؔ پہلے کشمیری افسانہ نگار ہیں جنہوں نے کشمیری کہانیوں کا ایک مجموعہ چھاپنے کی جرأت رِندانہ کی۔ اس لئے اس مجموعے کی ادبی اہمیت اور اس کے فنی محاسن پر کچھ نہ کچھ لکھنا میں ایک اہم فریضہ سمجھتا تھا۔ میں نے اخترؔ سے وعدہ کیا کہ میں لکھوں گا اور ضرور لکھوں گا۔ اس کے بعد آج تک یہ وعدہ ایفا نہ ہوسکا!

اس دَوران میں ''ست سنگر'' کو ساہتیہ اکاڈمی کی طرف سے سال ۱۹۵۸ء میں کشمیری زبان کی بہترین کتاب قرار دے کر اخترؔ محی الدین کو پانچ ہزار روپے کا انعام بھی دیا گیا۔ جن دِنوں انعام کا اعلان ہوا، میں بمبئی میں تھا۔ انعام کے اعلان کی خبر سنتے ہی میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ پہلی بار ساہتیہ اکاڈمی نے کشمیری زبان اور کشمیری

ادیبوں کے ساتھ انصاف کیا ہے۔اس سے قبل ماسٹر جی کے مجموعہ کلام ''سُمرن'' کوسالانہ ایوارڈ مل چکا ہے، لیکن ''سُمرن'' اور ''ست سنگر'' پر دیئے گئے ایوارڈوں میں ایک بنیادی فرق ہے۔ ''سمرن'' کا ایوارڈ ماسٹر جی کی بزرگی اور ان کی ادبی خدمات کا اعتراف تھا، اس کے انتخاب میں ''سُمرن'' سے زیادہ ماسٹر جی کی شخصیت کا احترام ملحوظِ خاطر رکھا گیا تھا۔ لیکن ''ست سنگر'' کشمیری زبان اور ادب کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس کو نظر انداز کر کے ساہتیہ اکاڈمی اپنے وقار کو مشکوک کر دیتی اور جس کو منتخب کرے ساہتیہ اکاڈمی نے کشمیری ادیبوں کا اعتماد حاصل کر لیا۔

بمبئی سے واپس آتے ہوئے جموں میں اختر محی الدین سے مُلاقات ہوئی۔ میں نے اُسے مبارک باد دی تو اُس نے مُسکراتے ہوئے کہا کہ ''اب مجھے تمہاری تنقید کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے فن کو جانچنے والے ایک تم ہی نہیں ہو' اسے ہندوستان کے بہترین ناقدوں نے جانچ کر منتخب قرار دیا ہے۔'' اختر کے لہجے میں آج التجا نہیں تھی، اعتماد تھا...... اور مجھے محسوس ہوا کہ ''ست سنگر'' کے تنقیدی مطالعے کی ضرورت اب پہلے سے کہیں زیادہ ہے!

کشمیری ادب کا بیشتر ہی نہیں بلکہ تمام تر سرمایہ شعر و شاعری پر مشتمل ہے۔ للہ دید کے دَور سے ۱۹۴۷ء تک کشمیری نثر کا تصور مشرقی شاعری کے محبوب کی کمر کی طرح ناپید تھا۔ کشمیری زبان میں دیگر زبانوں کے جو قصے کہانیاں ترجمہ ہوئے وہ بھی منظوم ہیں اور کشمیری ادب میں فن کار کا تصور صرف شاعری تک محدود تھا، شاعری کے علاوہ ادب کی اور بھی کئی اصناف ہیں۔اس سے لوگ نا آشنا نہیں تھے۔ لیکن نامانوس ضرور تھے۔ کشمیری زبان کو بول چال کی ایک ایسی زبان سمجھا جاتا تھا جس میں یا تو روزمرہ کی گفتگو ہو سکتی ہے یا شاعری ہو سکتی ہے۔ مستند رسم الخط کی عدم

موجودگی نے اس خیال کو تقویت پہنچائی، کیوں کہ نثر کے لئے رسم الخط کی جو اہمیت اور ضرورت ہے، شاعری کے لئے وہ نہیں ہے اور پھر جس صنفِ سخن کی کوئی تاریخ ہی نہ ہو، کوئی روایت یا کوئی اسلوب ہی موجود نہ ہو، اس میدان میں طبع آزمائی کرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کشمیری زبان کو نثر کے ''خطرناک تجربے'' کے لائق نہیں سمجھا گیا اور اس طرح زبان و ادب کا یہ صحرا، صحرا ہی رہا۔ ۱۹۴۷ء میں جب ہماری ادبی تحریک ایک ہنگامہ خیز دَور میں داخل ہوئی، تو کچھ اہم تاریخی تقاضے ہمارے سامنے آئے۔ روایت سے بغاوت کا سلسلہ دراصل تحریک آزادی کے ساتھ ہی شروع ہوا تھا لیکن ۱۹۴۷ء کے ہنگامے نے ضبط و توازن، ہمواری اور میانہ روی کی اصلاحی قدروں کو انقلابی تصورات سے بدل دیا۔ ہمارے سامنے سب سے اہم تاریخی تقاضا یہ تھا کہ ہم اپنی زبان کے دامن کو وسیع سے وسیع تر کر کے اپنی آواز زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچائیں۔ دُشمن سری نگر سے چند میل کے فاصلے پر تھا اور بحث مباحثے کے لئے وقت نہیں تھا۔ ایک کلچرل فرنٹ قائم ہوا اور ڈرامے، رقص و موسیقی اور شعر و شاعری کا ایک طوفان اُمڈ آیا۔ کشمیری شاعروں نے مہجور اور آزاد کی آواز سے آواز مِلا کر انقلابی نغمے اور جنگی ترانے گائے۔ ان کے ہاں سکون کی جگہ اضطرار تھا اور ضبط و توازن کی جگہ ایک ہنگامی کیفیت تھی۔ کشمیری ادب کی تاریخ میں پیداوار کے لحاظ سے یہ دَور انتہائی زرخیز ہے۔ لیکن اس زرخیز ترین دَور میں بھی کشمیری نثر کے لئے کوئی لگن پیدا نہ ہو سکی۔ حالاں کہ کشمیری نثر کی اہمیت اور ضرورت کا احساس سبھی کو تھا۔ ہنگامہ ختم ہوا، ہنگامی کیفیت بھی جاتی رہی۔ سیلاب کے گذر جانے کے بعد اب ان تقاضوں کا تجزیہ ہونے لگا، جو اس سیلاب سے پیدا ہو گئے ہیں۔ فن کاروں کی ایک متحدہ انجمن کی ضرورت محسوس کی گئی اور کلچرل

کانفرنس کا وجود عمل میں آیا۔ اختر ان دِنوں اُردو میں لِکھ رہا تھا اور اُردو کے نہایت معمولی رسالوں میں لِکھ کر اپنا مقام بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اختر کو پہلی مرتبہ کلچرل کانفرنس کے ایک اجلاس میں اپنی ایک کہانی سُناتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کے ناگوار تلفظ اور اوسط درجے کی زبان کے باوجود میں کہانی سے متاثر ہوا تھا۔ میں نے کہانی پر تنقید کی اور مجھے یاد نہیں کہ میں نے کیا کچھ کہا تھا۔ لیکن مجھے یاد ہے کہ میں نے اس کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا تھا۔ یہ غالباً ۱۹۵۳ء کے اوائل کا زمانہ ہے۔ اس کے بعد ''ملاپ'' دہلی کے تحت اُردو کی کہانیوں کا ایک مقابلہ ہوا اور اختر کو اس کی کہانی ''پونڈرچ'' پر تین سو روپے کا پہلا انعام مِلا۔ ان ہی دِنوں ایک رَو چلی۔ اُردو کے بیشتر لِکھنے والوں نے کشمیری میں لکھنا شروع کیا اور اختر نے ایک بار مجھ سے بڑی سنجیدگی سے کہا کہ میں نے بھی کشمیری زبان میں لِکھنا شروع کر دیا ہے۔

مجھے حیرت ہوئی اور میں نے پوچھا کہ تم شاعر کب سے ہو گئے!

اختر نے کہا۔ ''نہیں میں کشمیری میں کہانیاں لِکھوں گا۔'' میں نے اختر کے اس بیان کو ایک مذاق سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔

اور پھر کلچرل کانفرنس کے ایک اجلاس میں اختر نے اپنی کشمیری کہانی ''دندوزُن'' سُنائی۔ یہ اس کی پہلی کشمیری کہانی تھی یا دوسری، تیسری، یہ میں نہیں جانتا۔ لیکن جدید افسانے کی ٹیکنیک کے اعتبار سے یہ ایک مکمل افسانہ تھا۔ ان ہی دِنوں کشمیری زبان کے کچھ اور قلم کاروں نے بھی کشمیری افسانہ کی طرف توجہ دی۔ ماہنامہ ''کونگ پوش'' میں سوم ناتھ زتشی، نور محمد روشن اور دینا ناتھ نادم نے کہانیاں لکھیں۔ اس وقت میرے ذہن میں صرف نادم کی کہانی ''شِینہ پتو پتو'' ہے جو ان

کی پہلی اور آخری کہانی ہے۔ اس کے بعد وہ خود کہانی بن گئے!

اختر وہ پہلا کشمیری ادیب ہے جس نے کشمیری افسانہ کو ایک سنجیدہ صنف کے طور پر استعمال کیا اور مسلسل افسانے لکھے۔ ''ست سنگر'' اس کی اس مسلسل کاوش، لگن اور اس اُپج کی پیداوار ہے۔ جو اِس کے فن کی اساس بھی ہے اور اس کے مستقبل کی ضمانت بھی۔ اختر کی شخصیت اور اس کے فن کو صحیح طور جانچنے کے لئے اس پس منظر سے واقف ہونا بہت ضروری ہے۔ اختر نے عین اُس وقت اُردو میں لِکھنا ترک کر دیا جب کہ وہ آل انڈیا مقابلے میں اپنی کہانی پر انعام پا چکا تھا۔ اس کی کہانیاں اُردو کے بیشتر رسائل میں چھپ چکی تھیں اور وہ خراماں خراماں آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

اس منزل پر پہنچ کر اُردو میں لِکھنا ترک کر کے کشمیری زبان میں لِکھنے کا فیصلہ بہ ظاہر کوئی دانش مندانہ فیصلہ معلوم نہیں ہوتا تھا اور کم از کم میں نے یُوں ہی محسوس کیا تھا۔ خاص طور پر جب کہ کشمیری نثر کی کوئی روایت نہیں تھی اور اس کا مستقبل نہایت مبہم اور غیر واضح تھا۔ مستند رسم الخط کی عدم موجودگی میں کشمیری نثر کا سنجیدہ تجربہ ہر لحاظ سے ایک Adventure تھا اور پھر کشمیری پڑھنے والوں کی تعداد ہی کیا تھی؟ تعلیم یافتہ طبقہ تو کشمیری زبان کو قابلِ اعتنا ہی نہیں سمجھتا تھا اور پھر کشمیری نثر کا تصور تو ان کے لئے انتہائی ناگوار تھا۔ کم از کم کچھ ''تعلیم یافتہ'' دوست ایسے بھی تھے جو کشمیری رسم الخط سے آشنا ہونے کو گنوار پن کی نشانی سمجھتے تھے۔ ان حالات میں اُردو دُنیا کی وُسعتوں سے باہر آ کر کشمیری زبان کی ''تنگنائے'' میں قدم رکھنا کوئی نفع بخش سودا نہیں تھا۔ لیکن اختر نے ان تمام خطرات اور اندیشوں کے باوجود کشمیری میں افسانہ لکھنے کا فیصلہ کیا اور اس کا یہ فیصلہ اضطراری نہیں تھا۔ اس نے ان تاریخی

تقاضوں کو محسوس کیا تھا جو نئے شعور اور نئے سماجی حالات نے پیدا کر دئے تھے۔ نیا دور کچھ نئے مسائل لے کر آیا تھا۔ ان سے نپٹنے اور انہیں سلجھانے کے لئے ایک نئے قومی شعور کی ضرورت تھی۔ یہ نیا شعور پیدا ہو رہا تھا، لیکن اس کی تربیت اور تہذیب کے لئے ایک نئے زاوئیہ نگاہ کی ضرورت تھی اور یہ زاوئیہ نگاہ صرف ادیب پیدا کر سکتا تھا۔ فکر کو فن کے پیمانے میں ڈھالنے کے لئے اختؔر کو ایک ایسے قالب کی ضرورت تھی جو شدتِ تاثیر کو کم کرنے کی بجائے اسے اور تیز کر دے اور اس کے لئے مادری زبان سے بہتر کوئی اور ذریعہ اظہار نہیں ہو سکتا تھا...... اختؔر کو اپنی زبان کی کم مائیگی اور تنگ دامنی کا احساس تھا، لیکن اس کے دامن کو وسیع کرنے کی لگن بھی تھی۔ اختؔر کا فیصلہ ایک تاریخی فیصلہ تھا اور اس تاریخی فیصلے نے کشمیری زبان و ادب کو ایک نئی صِنف ہی نہیں دی بلکہ یہاں سے ہماری زبان میں نثر کی تاریخ اور روایات کا آغاز بھی ہوتا ہے۔ اختؔر کی کہانیوں میں جس دِل چسپی کا اظہار کیا گیا، اس سے نہ صرف خود اختؔر کی حوصلہ افزائی ہوئی بلکہ اس نے ایک پوری پود کو کشمیری افسانہ کی طرف راغب کر دیا۔ ہمارے ہاں آج کل کشمیری افسانہ نِگاروں کی کثرت اس بات کا ثبوت ہے کہ کشمیری افسانے سے متعلق جو اندیشے لاحق تھے وہ دُور ہو گئے ہیں اور کشمیری افسانہ اب تجرباتی منزل سے گذر کر ایک مستقل صنف کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ امین کامؔل، صوفی غلام محمد، اُمیش کول، علی محمد لون اور سوم ناتھ زتشی نے کشمیری افسانے کے سرمائے میں بیش بہا اضافہ کئے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ جب کبھی ان فن کاروں کی تخلیقات کتابی شکل میں شائع ہو کر منظرِ عام پر آئیں گی تو کشمیری ادب کی کم مائیگی اور تنگ دامنی کا احساس ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مِٹ جائے گا۔ اختؔر نے کشمیری زبان اور ادب کو جو وُسعتیں عطا کی ہیں وہ کشمیر کی

علمی، ادبی اور ثقافتی تاریخ کا ایک نا قابل فراموش باب ہوگا، لیکن خود کشمیری زبان نے بھی اختؔر کو بہت کچھ دیا ہے۔

''ستِ سنگر'' سات مختصر کہانیوں کا مجموعہ ہے جو ۱۹۵۶ء کے اوائل میں شائع ہوا ہے۔ اس میں چھ کہانیاں تو طبع زاد ہیں اور ایک کہانی ''ستلہِ داوٗ'' موپساں کی کہانی (A piece of String) سے متاثر ہو کر لِکھی گئی ہے۔ آغاز میں اختؔر نے ان الفاظ میں اپنا نظریہ فن پیش کیا ہے:۔

'' عظیم فن وہ ہے جس میں زندگی کے دِل کی دھڑکنیں ہوں اور جس کے ہونٹوں پر معصوم شِیر خوار بچے کی مسکراہٹ ہو اور جس فن میں یہ دو چیزیں نہ ہوں وہ مُردہ بے جان اور بے اثر ہوتا ہے۔''

اور اس کے بعد اپنے پڑھنے والوں سے پورے اعتماد کے ساتھ کہا ہے ''میرا فن اس کسوٹی پر پرکھ کر دیکھ لیجئے۔ اگر اس پر پورا نہیں اُترتا تو اِسے جلا ڈالئے۔ میری پوری پوری اجازت ہے۔''

اختؔر نے اپنے فن کو پرکھنے کے لئے جو معیار مقرر کئے ہیں وہ اتنے تشنہ، نامکمل، غیر واضح اور مبہم ہیں کہ اختؔر تو کیا، کسی بھی فن کار کو اس کسوٹی پر پرکھ کر اس کے بارے میں کوئی صحیح رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ عظیم فن کے لئے اختؔر کے ہاں سب سے مقدم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں زندگی کے دِل کی دھڑکنیں ہوں۔ یہ بیان اس قدر تشنہ اور نامکمل ہے کہ اس کو بنیاد بنا کر کوئی نتیجہ اخذ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ ہر فن پارہ چونکہ ''زندگی'' کی پیداوار ہوتا ہے اس لئے اس میں زندگی کے دِل کی دھڑکنوں کا شامل ہونا فطری بات ہے۔ زندگی سے الگ ہو کر نہ فن کار خود زندہ رہ سکتا ہے اور نہ فن کی تخلیق کر سکتا ہے۔ ان لوگوں کے فن میں بھی جو فن

برائے فن کے نظریے کے قائل ہیں، زندگی کے دِل کی دھڑکنیں شامل ہوتی ہیں۔ اسی لئے ادب کی عظمت کا اندازہ صرف اس امر سے نہیں ہوسکتا کہ اس میں زندگی کی دھڑکنیں ہیں یا نہیں، بلکہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ ایک فن پارے میں فن کار کا زندگی سے متعلق نظریہ کیا ہے؟ اوران نظریات کو پرکھنے کے لئے ہمیں خود تنگ نظر نہیں ہونا چاہیئے۔ ادب میں سارا فساد اسی تنگ نظری کی پیداوار ہے۔ اخترؔ نے عظیم فن کے لئے ایک اور خصوصیت یہ قرار دی ہے کہ "اس کے ہونٹوں پر معصوم شیر خوار بچے کی مسکراہٹ ہو......" یہ تعریف بڑی مبہم، غیر واضح اور نامکمل ہے۔ غالباً اخترؔ کا مقصد ادب میں دیانت، خلوص اور سادگی کے عناصر پر زور دینا ہے۔ خود اخترؔ کے فن میں مجھے ان خصوصیات نے بے حد متاثر کیا ہے۔

اخترؔ کی کہانیوں کا کینواس بہت مختصر ہے۔ وہ اپنی کہانیوں میں اپنی معاشرت کی بڑی عمدہ تصویریں پیش کرتا ہے۔ ان کے موضوعات میں زیادہ تنوع نہیں۔ لیکن اس زندگی میں بھی تو کوئی تنوع نہیں، جس کو وہ پیش کرتے ہیں۔ یہ زندگی صدیوں سے ایک ہی ڈھرے پر چلی آئی ہے۔ اس میں کوئی غیر معمولی یا قابلِ ذکر تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ یہاں کوئی چونکا دینے والی بات نہیں ہوتی۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ باہر کی دنیا کا کوئی ہنگامہ اس پر اثر انداز نہیں ہوا۔ یہاں زندگی کے مسائل آج بھی وہی ہیں جو صدیوں سے پہلے تھے۔ اخلاق، شرافت اور انسانیت کی وہی قدریں ہیں جو آباواجداد سے چلی آرہی ہیں۔ ان لوگوں میں نہ کوئی بڑی تبدیلی پیدا کرنے کا حوصلہ ہے اور نہ کسی بہت بڑی تبدیلی کو تسلیم کرنے کی جرأت۔ انہیں اس بات کا یقین سا ہو گیا ہے کہ موجودہ نظامِ زندگی مستقل اور پائیدار ہے اور اس میں کوئی بڑی تبدیلی پیدا کرنا سعی لاحاصل ہے۔ اسی لئے جب

کبھی یہ کسی بہت بڑی تبدیلی سے دوچار ہوتے ہیں تو اس پر اعتماد کرنے کی بجائے اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگتے ہیں۔ صدیوں کی غلامی، مجبوری اور لاچاری نے ان کی شکلیں مسخ کردی ہیں۔ ان سے ان کا اعتماد اور عزم چھین لیا ہے۔ یہ اپنی اس ذلت پر قانع دکھائی دیتے ہیں جو اِن کے آباواجداد سے ان کو ورثے میں مِلی ہے۔ اخترؔ نے بڑے خلوص اور سچائی سے اس معاشرے کی تصویر پیش کردی ہے۔ اس نے یہ دُنیا کسی فلسفی یا ماہرِ نفسیات کی آنکھ سے نہیں دیکھی۔ وہ خود اس ماحول میں رہا ہے اور آج بھی اسی ماحول میں سانس لے رہا ہے۔ اس کے شعور نے کوڑے کرکٹ کے ان ہی ڈھیروں میں پرورش پائی ہے جو آج بھی اس کے اِرد گرد تاحدِ نظر پھیلے ہوئے ہیں۔ افلاس، مجبوری اور ذلت کے اسی اندھیارے میں اخترؔ نے آنکھیں کھولیں اور اسی فضا میں اخترؔ نے جوانی کی سرحدوں میں قدم رکھا۔ جہاں اخترؔ جیسے سینکڑوں بچے جنم لیتے ہیں اور جوان ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اپنی انسانیت اور اپنی صلاحیتوں کو کھو دیتے ہیں۔ اخترؔ کا فن اس ذلیل معاشرے سے نفرت کرنا نہیں سِکھاتا بلکہ ہمدردی اور انسانیت کا وہ چراغ روشن کرتا ہے جو تعفن اور گندگی کے ان ڈھیروں میں ہمیں کھوئی ہوئی انسانیت، مسخ شدہ چہروں اور بھولی بھٹکی پاکیزہ رُوحوں کو تلاش کرنے کا حوصلہ دیتا ہے۔ اس کے لہجے میں کہیں تلخی نہیں آتی ہے۔ وہ زندگی کے اس جابرانہ نظام اور استحصال کے وحشیانہ چکر پر خود بھی ہنستا ہے اور ہمیں بھی ہنساتا ہے۔ لیکن اس کی ہنسی میں خود اذیتی یا نہیں بلکہ اُمید کا ننھا سا چراغ روشن نظر آتا ہے۔ وہ ہنستا اس لئے ہے کہ اس میں ابھی تک اپنی مصیبتوں پر ہنسنے کا حوصلہ باقی ہے اور یہی ایک چیز اسے اپنے ماحول سے ممتاز کرتی ہے۔

"دندوزن" اخترؔ کی بہترین کہانیوں میں سے ہے۔ یہ نچلے طبقے کی

معاشرت کی ایک صحیح تصویر ہے اور پھر اس تصویر میں اختر نے مختلف رنگوں کے امتزاج سے جو گہرائی اور شدت پیدا کی ہے وہ اسی کا حصہ ہے۔ اقتصادی بدحالی اور معاشی غلامی نے اس طبقے کے لوگوں کو ان قدروں سے محروم کردیا ہے جو متوسط طبقے کے لوگوں کو عزیز ہوتی ہیں۔ شرافت، ننگ و ناموس، غیرت اور اس نوع کی تمام اصطلاحیں ان کے ہاں ذہنی تعیش سے منسوب کی جاتی ہیں اور وہ اپنے آپ کو نہ ان سے وابستہ سمجھتے ہیں اور نہ ان کا محافظ۔ گالی گلوچ، ماردھاڑ، چوری کے ہنگامے ان کے ہاں روزمرہ کا معمول ہے۔ میاں بیوی کو مارتا ہے تو بیوی غیرت اور شرافت کے نام پر خاموش رہ کر سب کچھ نہیں سہہ لیتی۔ وہ میاں کو گالیاں دے دے کر محلے کو جمع کرتی ہے۔ وہ جسمانی لحاظ سے کمزور سہی لیکن اس کی زبان پر کسی کا زور نہیں چلتا۔ وہ محلے کے سبھی لوگوں کے سامنے اپنے میاں کو گالیاں اور بددُعائیں دیتی ہے۔ میاں بیوی کے سُسرال والوں کو کوسنے لگتا ہے تو بیوی اپنا حملہ تیز تر کردیتی ہے۔ وہ مار کھائے جاتی ہے لیکن اپنی زبان بند نہیں کرتی۔ محلے کے کچھ لوگ بیچ بچاؤ کرتے ہیں اور یہ ہنگامہ کچھ مدھم پڑ جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آج بریست چمار کو تنخواہ ملی تھی اور اس نے اپنی لڑکی کے لئے کپڑے نہیں لائے تھے۔ اس پر چمارن نے ہنگامہ بپا کیا اور بریست چمار نے غصے میں آکر اس کو پیٹنا شروع کردیا۔ آخر ۲۵ روپوں میں وہ کیا کیا خرید لاتا۔ اسی میں سے تو پچھلے مہینے کا قرضہ بھی چکانا تھا۔ اس نے محلے والوں کو تو مطمئن کردیا لیکن چمارن کو وہ مطمئن نہ کرسکا۔ اس کے بعد ایک اور ہنگامہ بپا ہوتا ہے۔ بریست چمار کی نِگاہ چولہے پر پڑی تو چولہا خالی نظر آیا۔ اس نے آج بڑی مدّت کے بعد دو روپے کے پائے لائے تھے اور اس کی بیوی نے یہ بڑے ارمانوں سے پکائے تھے، مار پیٹ کے اس ہنگامے میں غلہ چمار چولہے پر

سے ہانڈی ہی لے اُڑا...... چمار اور چمارن اپنی لڑائی بھول گئے اور غلہ چمار کے پیچھے دوڑے۔ مگر بے سود! غلہ چمار تو چھپا رہا، لیکن اس کی ماں جھوٹی قسمیں کھاتی رہی۔ رات کو بریست چمار، چمارن کے زخموں پر ہلدی لگاتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ گھر میں لڑائی جھگڑا اچھا نہیں ہوتا اور چمارن غلہ بدمعاش کو بددُعائیں دے کر بریست کے صدقے ہوئے جارہی تھی۔ یہ کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں، یہ قریب قریب روز کا معمول ہے۔ معاشی بدحالی نے انہیں وحشی بنادیا ہے۔ اِنسانی عظمت (Human dignity) کا تصور یہاں ناپید ہے۔ میاں بیوی کے تعلقات میں بھی وہ تقدس نظر نہیں آتا جو اوسط درجے کے گھرانوں میں اس سے وابستہ کیا جاتا ہے۔ معاشی پستی سے پیدا شدہ تضادات نے انسانی صورتوں کو مسخ کردیا ہے۔ "دند وزُن" میں اختر نے بڑی چابک دستی سے ان تضادات اور پیچیدگیوں کو پیش کیا ہے۔ جس نے اس سماجی ڈھانچے کو انسان کے لئے ایک ایسا ناقابل برداشت بوجھ بنادیا ہے کہ اس میں رہتے رہتے ان کی کمر دہری ہوگئی ہے۔ اس کی نگاہیں مستقبل کے اُفق سے ہٹ کر زمانہ حال کے دھندلکے میں کھوگئی ہیں اور یہاں سے وہ اپنے لئے کوئی راہ فرار نہیں پاتا۔ اختر کو روزمرہ کی زبان پر جو قدرت حاصل ہے وہ اس کے کسی ہم عصر کو نصیب نہیں۔ وہ اپنی کہانیوں میں واقعات سے زیادہ مکالموں سے فضا پیدا کرتا ہے۔ یہی اس کا حسن بھی ہے اور یہی اس کی کمزوری بھی۔ اس کی کہانیوں میں مکالمے اتنے برجستہ، برمحل اور فطری ہوتے ہیں کہ پڑھنے والے کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ کوئی کہانی پڑھنے کی بجائے خود اِس گفتگو میں شریک ہے۔ "دندوزُن" میں زبان پر اختر کی یہ قدرت اپنے پورے عروج پر ہے۔ اس کے ہاں تصنع یا آورد کا شائبہ بھی نہیں۔ بریست چمار جب اپنے پچیس روپوں کا

حساب دیتا ہے تو وہ اپنے طبقے کی ساری معاشرت کی تصویر پیش کرتا ہے۔ وہ اُن شیطانوں کا ذکر بھی کرتا ہے جو اپنا قرضہ وصول کرنے میں بڑے سخت گیر ہوتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی اس کی توجیہہ بھی کرتا ہے۔ وہ اُن فرشتوں کا بھی ذِکر کرتا ہے جو دو چار گالیاں دیکر تسکین حاصل کرتے ہیں اور قرضے کی وصولی ملتوی کر دیتے ہیں۔ اس کہانی میں کوئی سنسنی خیز واقعہ نہیں ہے۔ کوئی ایسا Twist بھی نہیں جو ہم کو چونکا دے۔ غلہ بد معاش کا ہانڈی چُرانا بھی ہمیں نہیں چونکاتا۔ لیکن اس کے باوجود ہمارے ذہن میں اس معاشرے کو تبدیل کرنے کا ایک احساس پیدا ہوتا ہے۔ ہمیں اُن لوگوں سے نفرت کی بجائے ان کے دُکھوں سے ہمدردی ہو جاتی ہے۔ انسانیت ان کے ہاں مسخ ہوگئی ہے، ختم نہیں ہوگئی ہے۔ بریست چمار اور اس کی چمارن گالی گلوچ اور مار پیٹ کے بعد بھی ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔ یہ اِنسانیت کا وہ ٹمٹماتا چراغ ہے جس کی طرف اختر نے اشارہ کیا ہے۔

''ست سنگر'' کی دوسری اہم اور قابلِ ذکر کہانی ''دریا یہ ہُند ایزار'' ہے یہ ایک نفسیاتی مطالعہ ہے۔ نبر شالہ اور خوتن دید اس مطالعے کے دو کردار ہیں۔ نبر شالہ کی عمر ستر (۷۰) سال سے زیادہ ہے اور خوتن دید کے منہ میں صرف ایک دانت ہے۔ ایک سُرخ شلوار، جوان کے شادی کے ایام کی یادگار ہے، دیکھ کر خوتن دید کے دِل میں ایک عجیب سا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ سے شرمانے لگتی ہے اور اس کے ذہن میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اُسے اپنی جوانی کے دِن یاد آتے ہیں اور اُسے نبر شالہ ایک دولہے کی طرح جوان دِکھائی دیتا ہے اور اپنا وجود ایک نئی نویلی دُلہن محسوس ہونے لگتا ہے۔ اس دَوران میں نبر شالہ کی نظر بھی سُرخ شلوار پر پڑتی ہے اور وہ خوتن دید سے اصرار کرتا ہے کہ وہ سرخ شلوار پہن

لے۔ کافی حیل وحجت کے بعد خوتن دید شلوار پہن لیتی ہے۔ اختر نے اس کیفیت کو بڑی کامیابی سے پیش کیا ہے۔ جوانی کی منزلوں سے بہت دُور جا کر بھی کبھی کبھی انسان اپنی عمرِ رفتہ کو آواز دینا چاہتا ہے۔ وہ اپنے بڑھاپے کے کھنڈروں میں کبھی کبھی ان چنگاریوں کی تلاش کرنے لگتا ہے جو جوانی کے خاکستر میں دَب کر بجھ چکی ہوں۔ بڑھاپے میں انسان کو مشکل سے یقین آتا ہوگا کہ وہ کبھی اُن راہوں سے بھی گذرا ہے جو اس کے پیچھے ایک لامنتہائی سلسلے کی طرح پھیلی ہوتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس کے دِل میں ان راہوں پر سے گذرنے کی ہوس بیدار ہوتی رہتی ہے۔ اسی لئے کبھی کبھی انسان اپنے نقشِ پا دیکھ کر مچل جاتا ہے اور عمر رفتہ کو آواز دینے لگتا ہے۔ ایک سُرخ شِلوار نے نبر شالہ اور خوتن دید کے دِل میں جو تلاطم اور ہنگامہ پیدا کیا وہ کوئی غیر فطری اور نا قابل توجیہہ کیفیت نہیں بلکہ بڑھاپے کے روشن دان سے جوانی کے گلستان کا نظارہ ہے۔ یہ ذہنی تعیش نہیں بلکہ دو ہم سفروں کی نگاہِ واپسیں'' ہے۔ لیکن اختر نے اس کیفیت کو پھیلا کر تاثر کی شدت کو کم کر دیا ہے اور فنی نقطہ نگاہ سے یہ اس کہانی کی بہت بڑی ناکامی ہے! یہ پھیلاؤ اس وقت شروع ہوتا ہے جب نبر شالہ اور خوتن دید بہ یک وقت اور مشترک طور اس کیفیت میں شریک ہوتے ہیں۔ خوتن دید کے دِل میں اُس وقت یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے جب کہ وہ اپنے مرحوم بیٹوں کے پرانے کپڑے دیکھ کر کہتی ہے...... ''گندر ہیو یے زیو ان اُسم'' پتھ کُس آدم قہراو سُکھ گوہان۔'' (اتنے تنومند، ہٹے کٹے پیدا ہو کر اُنہیں کون سا قہر کھا جاتا تھا!) خوتن دید کی چھاتیوں میں ایک سرسراہٹ پید ہو جاتی ہے۔ اس کی سوئی ہوئی ماتا کروٹ لینے لگتی ہے جو زخم وقت کے مرہم سے مندمل ہو چکے تھے۔ ان میں ایک ٹیس سی اُٹھنے لگتی ہے اور عین اس وقت اس کی نظر سُرخ شلوار

پر پڑتی ہے۔اس پس منظر میں خوتن دید کے دِل میں وہ عجیب وغریب کیفیت پیدا ہونا، جواس کہانی کی اساس ہے) ممکن ہے لیکن Convincing نہیں۔خوتن دید کے دِل میں یہ کیفیت پیدا ہونے کے بعد نبر شالہ بھی اس میں شریک ہے۔وہ خوتن دید سے اصرار کرتا ہے کہ وہ سرخ شلوار پہن لے۔یہاں سے یہ کہانی ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت آگے بڑھتی ہے۔اس میں وہ فطری ارتقاء نہیں جو اسے ایک شاہکار بنادیتا۔نبر شالہ بازار جاتا ہے، وہاں سے گوشت لاتا ہے۔اس سارے وقفے کے دَوران میں بھی خوتن دید شلوار نہیں پہنتی۔واپس آکر نبر شالہ پھر اصرار کرتا ہے اور خوتن دید کو شلوار پہننی پڑتی ہے۔یہ سارا وقفہ اس نفسیاتی کیفیت یا تاثر کی شدت کو کم کرتا ہے جو اس کہانی کی بُنیاد ہے۔اگر خوتن دید اس نامعلوم کیفیت کے تحت شلوار پہن لیتی اور پھر اتفاقاً نبر شالہ کی اِس پر نظر پڑتی تو یہ خوش گوار حادثہ ایک بہترین نفسیاتی مطالعہ بن سکتا تھا۔لیکن اختر نے دونوں کو بیک وقت اس کیفیت میں شریک کرکے اسے ان کیلئے ایک Adventure بنادیا ہے۔شلوار پہننے کے بعد خوتن دید کے جذبات کا جو مرقع اختر نے پیش کیا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔کہانی کی تمام کمزوریوں کے باوجود خوتن دید نے آخر پر کہانی کو بچالیا ہے اور یہ اختر سے زیادہ خود خوتن دید کا کارنامہ ہے۔

میں نے کچھ تفصیل کے ساتھ ''دندوژن'' دریایہِ ہُند ایزار'' کا ذکر کیا ہے کیونکہ میں ''ست سنگر'' میں ان ہی دو کہانیوں کو قابل ذکر سمجھتا ہوں ...... باقی کہانیاں موضوع اور فن کے اعتبار سے اوسط درجے کی کہانیاں ہیں۔''چھونا سپدان'' اور ''میٕہ تہِ توگ نہ کہینہ !'' سماجی طنز کی مثالیں ہیں، لیکن فنی لحاظ سے بہت کمزور ہیں۔''چھونا سپدان'' منٹو کے ''نیا قانون'' کی صدائے بازگشت ہے لیکن

اس میں طنز کے تیکھے پن کی بجائے ایک عجیب بوکھلاہٹ پیدا ہوگئی ہے۔یہاں اختر کے فن نے نہیں بلکہ اس کے شعور نے ٹھوکر کھائی، وہ زندگی کی گردش کو اِمروز و فردا سے ماپتا ہے، وہ انقلاب کا تجزیہ تاریخ کی روشنی میں نہیں بلکہ انفرادی واقعات کے آئینے میں کرتا ہے۔اس کے ہاں انقلاب کی قدر و قیمت کا تعین تاریخی قوتوں سے زیادہ اخلاقی معیاروں پر ہوتا ہے۔ظاہر ہے کہ ایک فن کار اخلاقی قدروں سے آنکھیں بند نہیں کرسکتا۔لیکن ایک عظیم انقلاب کے Impact کو سمجھنے کیلئے اخلاقی قدروں سے زیادہ تاریخی شعور کی ضرورت ہوتی ہے اور ''چھونا سپدان'' میں تاریخی شعور سے زیادہ ایک سطحی داخلیت کی کارفرمائی ہے۔اس کہانی میں گہرے طنز کے امکانات موجود تھے، لیکن طنز کا جو وار اوچھا پڑ جاتا ہے وہ خود فن کار کو زخمی کرتا ہے۔ ''چھونا سپدان'' کے طنز میں وہ گہرائی، شدت اور تیکھا پن پیدا نہیں ہوسکا ہے جو پڑھنے والے کو سوچنے کی ترغیب دے۔

اسی طرح ''میٕہ تہِ توگ نہ کینہہ !'' بھی طنز سے زیادہ ایک چٹکلہ ہو کر رہ گئی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اختر نے اچھی خاصی کہانیوں کو چٹکلہ بنادیا ہے۔وہ مزاح اور طنز میں فرق نہیں کرسکتا اور مزاح پیدا کرنے کے لئے وہ واقعات سے زیادہ زبان کا سہارا لیتا ہے۔اسی لئے اس کی کسی کہانی میں طنز پیدا نہیں ہوسکا ہے۔وہ ساری محنت روزمرہ کے استعمال پر کرتا ہے۔اس کی کہانیوں کا طِلسم زیادہ تر اس کی زبان سے قائم رہتا ہے۔اس کی کہانیوں میں کرداروں کو ثانوی حیثیت حاصل ہے اور وہ ہر کہانی میں پہلے اپنے وجود کو منواتا ہے۔اُسے اپنے پڑھنے والوں کی ذہانت اور ان کے قوتِ فیصلہ پر اعتماد نہیں۔وہ انہیں ہر بات سمجھانا چاہتا ہے اور ایسا کرتے ہوئے پڑھنے والے پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔

"زٹھ" اور "کھوہ" تیسرے درجے کی معمولی کہانیاں ہیں۔ "زٹھ" میں ایک نہایت ہی فرسودہ سماجی مسئلے کو ایک فرسودہ ڈھنگ سے پیش کیا گیا ہے۔ فنی لحاظ سے بھی اس میں کوئی قابل ذکر بات نہیں۔ "کھوہ" ایک نعرہ ہے۔ جس میں امنِ عالم کیلئے اپیل کی گئی ہے یہ کہانی سے زیادہ ترقی پسند ادیبوں کا ادبی مینی فیسٹو ہے۔ اگر "کھوہ"، "ست سنگر" میں شامل نہ ہوتی تو "ست سنگر" کی ادبی عظمت کم ہونے کی بجائے اور بلند ہوتی!

"ستلہ داوٗ" موپساں کی کہانی سے ماخوذ ہے۔ اس کو کشمیری ماحول پر منطبق کرنے کی کوشش بجائے خود قابل تعریف ہے، لیکن یہ کوشش زیادہ کامیاب نہیں رہی ہے۔ کیونکہ موپساں کے دَور اور آج کے کشمیر میں جو فاصلہ ہے اُسے نظرانداز کرنے کوشش کی گئی ہے اور نتیجہ کے طور پر کہانی ٹیکنیک کے اعتبار سے جاندار ہونے کے باوجود کمزور ہوگئی ہے۔ کہانی کی فضا اور اس کا ماحول اس کے کرداروں سے ہم آہنگ نہیں ہو پاتا۔

مجموعی حیثیت سے اپنی تمام خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود "ست سنگر" ایک ایسا عظیم تہذیبی کارنامہ ہے جسے ہماری ثقافتی تحریک میں ہمیشہ ایک نُمایاں مقام حاصل رہے گا۔ میں نے اس کی ادبی اہمیت سے زیادہ اس کے تہذیبی پہلو پر زور دیا ہے کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ ادبی حیثیت سے اس کے مقام کا تعین کرنا اس مرحلے پر دُشوار ہے جب کہ ابھی تک ہمارے پیش نظر صرف یہی ایک مجموعہ ہے۔

☆☆☆

شمیم احمد شمیم

تنقید کی اہمیت

ادب کی ضرورت، اہمیت اور تفوق اب ایک ناقابل انکار حقیقت ہے ادب اپنی طاقت کا لوہا دنیا سے منوا چکا ہے، ادب زندگی کی عکاسی کرتا ہے، حیاتِ انسانی کا آئینہ دار ہے۔ یہ زندگی ہی تو ہے جو ہمیں ادب کے مختلف حصوں میں بکھری ہوئی نظر آتی ہے۔ ادیب اپنی تخلیقات کے ذریعے ہمیں زندگی سے آگاہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور نقاد ہمیں ادب اور ادیب کے ساتھ روشناس کرنے کے اہم فریضہ کو انجام لاتا ہے زندگی کے لئے ادب جس اہمیت کا حامل ہے، جس اعزاز کا مستحق ہے ادب کی راہِ راست پر رکھنے کے لئے اسے شاہراہ ترقی دکھانے کے لئے تنقید اسی عظمت کی مستحق ہے وہی منصب رکھتی ہے۔

تنقید نگار کے لئے ضروری ہے کہ وافر معلومات کے ساتھ ساتھ وسیع مطالعہ رکھتا ہو، کثرت مطالعہ، فطری ذہانت اور اعلیٰ درجہ کی قابلیت کی بدولت اسے کھوٹے اور کھرے میں تمیز کرنے کا سلیقہ حاصل ہو، اس کی عقابی نگاہ میں ان جوہروں کو پانے کی صلاحیت ہو جو ادیب کی تخلیق میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے فنی باریکیوں اور موشگافیوں، حسن و قبح، اسرار و رموز کو جاننے اور پہچاننے پر عبور حاصل ہو، تنقید نگار جب اپنی ان صلاحیتوں کے ساتھ کسی ادبی تخلیق کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس کی دوررس اور تیز بین نگاہ ان دبیز پردوں کو چیر کر جن کے اندر

جھانکنے کی عوام میں استعداد نہیں ہوتی، اُن ادبی اسرار رموز اور گراں مایہ نکتوں کو برسر عام لاتی ہے جو ادیب نے اپنے خون جگر سے اپنی تخلیق میں سموئے ہوتے ہیں۔ نقاد ایک صحیح اور مسلمہ معیار کی کسوٹی پر جانچ کر ایک ادبی تخلیق کی ادبی فنی خوبیوں اور خامیوں کو اُجاگر کرتا ہے، مطلب یہ ہے کہ نقاد اپنے تنقید کے پیمانوں سے ماپ کر ادب کی تخلیق کی صحیح قدر و قیمت کا احساس دلاتا ہے۔ غالباً غالب کو اپنے زمانہ میں اپنے کلام کا کوئی جوہر شناس نہ ملا اور اسے کہنا پڑا کہ ''شہرت شعرم بگیتی من خواہد شدن''۔ یہ کہنا کہ نقادوں کی حقیقت بین نگاہوں کی بدولت غالب کی یہ پیشن گوئی آج ایک مسلمہ حقیقت ہے۔

زندگی کے معمولی واقعات سے ادیب اپنی تخلیق کا مواد حاصل کرتا ہے، اس کی متلاشی نظر روزمرہ کے واقعات میں سے ان اسرار و رموز کو ڈھونڈ کر لاتی ہے جہاں عوام کے تخیل تک کورسائی نہیں، بالکل اسی طرح نقاد ادیب کے دنیائے افکار کی سیر کر کے ان کے بحرِ خیال کے عمیق ترین گوشوں میں جھانک کر وہاں سے ان آبدار موتیوں کو نکال کر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے جو عوام کی سطحی نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں۔ نقاد ابہام کے پردوں کو چیر کر اصلیت تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے اور اس طرح قاری اور ادیب کی دوری کو دور کر کے انہیں ایک دوسرے کے نزدیک لانے میں ممد ہوتا ہے۔

نقاد کی حقیقتِ شناسی کی صلاحیت جہاں ایک ادبی تخلیق کی خوبیوں کا اظہار کرتی ہے، وہاں اس کی خامیوں اور نقائص کو بھی آشکار کرتی ہے، اُپنے قوی اور تیز احساس کی بدولت تنقید نگار فوراً ادیب کی کوتاہیوں اور غلطیوں کو محسوس کرتا ہے اس کی بینا آنکھ فوراً ادیب کی خامیوں اور کوتاہیوں پر پڑتی ہے وہ بے باکانہ ان خامیوں اور

کوتاہیوں کا اظہار کرتا ہے، ایسے ادب سے جس کا کوئی مقصد نہیں کھوکھلے پن کا اظہار کر کے مطالعہ کرنے والوں کے وقت کو ضائع ہونے سے بچاتا ہے غرض تنقید ادیب کی اصلاح کرتی ہے، اس کے ذہن کو پختہ ہونے میں مدد دیتی ہے۔ ادیب کے فکری بہاؤ کو صحیح راستے پر لگاتی ہے اور مطالعہ کرنے والوں کو گمراہی سے بچانے کا مبارک اور اہم فریضہ انجام دیتی ہے۔

ادیب جب اپنے قلم کو حرکت میں لاتا ہے تو وہ ہر چیز سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ سماج کا اسے ڈر نہیں، عوام کی اسے پروا نہیں، جس طرف اس کا تخیل اس کی رہنمائی کرتا ہے اس کا اشہب قلم بے تحاشا اسی رخ پر دوڑتا ہے ہاں اپنے افکار کو صفحہ قرطاس کی زینت بنانے کے دوران جو چیز اُسے جادۂ احتیاط سے باہر قدم رکھنے سے روکتی ہے، وہ نقاد کی گرفت کا خوف ہے۔ نقاد کا قلم ادیب کے لئے تازیانہ ہدایت ہے وہ اسے معیار سے گرنے نہیں دیتا، مقصد کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ مہمل اور بے مقصد اور لغو ادب کو پیش کرنے سے روکتا ہے۔ نقاد کی گرفت کے خوف ہی کی وجہ سے ادیب کج روی سے بچتا ہے۔ منزل پیش نظر رہتی ہے اور اسے آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا۔ جب ہمارے نئے لکھنے والوں کی تخلیقات منظر عام پر آتی ہیں تو یہ تنقید نگار کی نگاہ گوہر شناس ہی کا عطیہ ہے کہ ہم اس جم غفیر میں سچے ادب کو پانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ نقاد دربارِ ادب کی ڈیوڑھی کا دربان ہے۔ وہ اپنے وسیع مطالعہ، حقیقت بین نگاہ اور تجربہ کی بناء پر اس انبوہِ کثیر میں سے اصل اور نقل کو پہچاننے میں کامیاب ہو جاتا ہے وہ ادیب کے پیش کردہ حروف سے کلام کرنے اور ان سے راز دریافت کرنے کا عادی ہوتا ہے۔ ان حروف سے وہ پیش کنندہ کی اصلیت معلوم کرتا ہے۔ پیش کرنے والے کی تخلیق کے

سہارے وہ ادیب کے دل کی عمیق گہرائیوں کی تھاہ لیتا ہے۔ اس کی سچائی اور خلوص کو جانچتا ہے اور پھر اپنی اس کاوش کا نتیجہ ہمارے سامنے رکھتا ہے۔ نقال کو ٹوکتا ہے کہ تم نے غلط راستہ اختیار کیا ہے یہ تمہارے بس کا روگ نہیں، دربار ادب میں داخل ہونے کے لئے جو سند درکار ہے، وہ تمہیں نہیں مل سکتی۔ یہاں چور دروازے سے داخل ہونے کا امکان نہیں۔ یہاں کے نگہبان اور نگران مستعد اور فرض شناس ہیں۔ جھوٹی شہرت حاصل کرنے کے لئے کسی اور دروازے کا رخ کرو۔

دوسری طرف وہ جہاں ادب کی تخلیق میں صداقت کا پرتو دیکھتا ہے، جس نوآموز کے ہاں آرزو کی تڑپ اور منزل کی لگن دیکھتا ہے، جس کے ہاں فریب اور ریا نہیں، جس کے قلم میں حقائق پر پڑے ہوئے پردوں کو اٹھانے کی قوت کا مطالبہ بھی پاتا ہے، نقاد فوراً اس کا ہاتھ پکڑنے کے لئے آگے بڑھتا ہے۔ ہمدردانہ انداز میں اس کی خامیوں کی اصلاح اور خوبیوں کو نکھارنے کا کام انجام لاتا ہے۔ اس کے ذہن کو پختہ ہونے میں مدد دیتا ہے۔ منزل کی طرف اشارہ کرتا ہے ہے، اس کے ہر مرحلے کو بڑھاتا ہے، امنگوں کو بیدار کرتا ہے۔ نئے ادیب کو اپنے فطری جوہر کام میں لانے کی ترغیب دیتا ہے اور اس طرح جوان حوصلوں اور تازہ امنگوں کے ساتھ آگے بڑھنے کی تلقین کرتا ہے۔

نوآموز ادیب جب منزل کی تلاش میں ادھر اُدھر بھٹکتا پھرتا ہے، ادب کی پیچدار گھاٹیوں میں سے جب اسے منزل کا ملنا دشوار ہوتا ہے، اسے جب ادب کی شاہراہ سے گذرنے والے ہر رہرو پر رہنما کا گمان ہوتا ہے اور وہ ان کے پیچھے لپکتا ہے۔ تھوڑی دور چل کر اس پر بھید کھل جاتا ہے کہ سراب کو چشمہ سمجھ بیٹھا تھا، اس غیر یقینی اور تذبذب کی حالت میں نقاد خضر راہ بن کر نمودار ہوتا ہے اور اسے منزل کی

طرف اشارہ کرتا ہے۔ تنقید ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ادیب اپنا عکس دیکھتا ہے۔ منزل کا نشان پاتا ہے۔ تذبذب اور تامل کی حالت سے نجات پا کر نئے ارادوں اور محکم یقین کے ساتھ منزل کا رخ کرتا ہے۔

ایک صحیح اور جامع تنقید بیک وقت ادب کے کئی اہم اور عظیم الشان تقاضوں کو پورا کرتی ہے ایک جامع، مخلصانہ اور مبنی بر صداقت تنقید جہاں خود ادب کا ایک قابل فخر سرمایہ بنتی ہے، ادیب کی حوصلہ افزائی اور اس کی اصلاح کی اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے، وہاں ادیب کا مطالعہ کرنے والوں کے فکری بہاؤ کو صحیح راہ پر لگانے کا مبارک فریضہ انجام دیتی ہے۔ عام مطالعہ کرنے والے جن کا ذہن کچا ہوتا ہے، جن کے مذاق میں بلوغیت نہیں ہوتی، جن میں مضر اور مفید میں تمیز کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی، جو خود پرکھنے اور جانچنے کا ملکہ نہیں رکھتے، پیتل کو بھی سونا سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔ لیکن جب کوئی ادبی تخلیق ادب کی کسوٹی جو صرف اور صرف ایک مخلصانہ تنقید ہے پر جانچنے کے بعد ان کے سامنے آتی ہے، عام قاری کی نگاہ بھی اصلیت کو پہچان لیتی ہے اور اس طرح قاری بھی تنقید کی بدولت گمراہی سے بچ جاتا ہے۔

نقاد کو صحیح معنوں میں ادبی جراح کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ وہ ایک ادبی تخلیق کی چیر پھاڑ کر کے خوبصورت الفاظ کے لبادہ کو اٹھا کر اس کے اندر جھانکتا ہے اور اس کے اندرونی حسن و قبح کو آشکار کرتا ہے۔ اس کی ادبی خوبیوں اور جوہروں کو نمایاں کرتا ہے۔ حالی نے جو آسمان ادب کا ایک درخشاں ستارہ تھے، اپنی مشہور کتاب یادگار غالب کے ذریعے غالب کے حضور میں نذرانہ عقیدت پیش کیا، جب حالی کے نوک قلم کے سہارے دنیا نے غالب کی عظمت کی جھلک دیکھی تو اردو ادب کے تمام بڑے نقاد غالب کی طرف متوجہ ہوئے۔ ہر صاحب کمال نے

اپنے اپنے رنگ میں غالب کے فن کا اعتراف کیا۔ اس کی بے شمار شرحیں شائع ہو گئیں اور متفقہ طور غالب کو سپہر ادب کا آفتاب قرار دیا۔ عبدالرحمٰن بجنوری نے دیوان غالب کو ہندوستان کی الہامی کتاب کے نام سے موسوم کیا۔ محمد حسین آزاد کے زور قلم نے ذوق کے سر پر ملک الشعراء کا تاج رکھا اور اسے ایک پائیدار اور قابلِ رشک شہرت سے ہمکنار کیا۔

تنقید ہمیں کسی ادبی تخلیق پر نظر ڈالنے کے لئے نئے نئے نظریے عطا کرتی ہے، نئے زاویوں سے متعارف کرتی ہے۔ علامہ اقبالؒ پر جو غالباً اردو کے واحد شاعر ہیں جن کی شہرت کے آفتاب کا پرتو ہندوستان کے علاوہ ایشیا کے دیگر مما لک کو ضیا بار کرتا ہوا مغرب تک جا پہنچا، مختلف ناقدوں نے مختلف زاویوں سے نظر ڈالی۔ کسی نے یہ دکھایا کہ فلسفہ کس حد تک ان کے کلام پر اثر انداز ہے، کسی نے اقبال کی مذہب پرستی کے جذبہ کو نمایاں کیا کسی نے اُن کے کلام سے وطن دوستی کا درس دیا، اور کئی اصحاب نے اسے ملت کی محبت کے نشہ میں سرشار پایا۔ بعض نے اس کی چشم بینا کے سہارے حال کی سرحدوں سے نکل کر مستقبل کی سیر کی لیکن موجودہ دور کے عظیم المرتبت ناقد آل احمد سرور نے ان سب سے الگ ایک نئے زاویہ سے اُن کے کلام پر نگاہ ڈالی اُنہوں نے اقبال کے کلام میں غزلیت کے عنصر کو تلاش کیا اور اسے اس دولت سے بھی مالا مال پایا۔ فاضل نقاد نے محسوس کیا کہ شاعر مشرق کے اس کمال سے بے اعتنائی کر کے حق تلفی کی گئی ہے اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ اقبال نے غزل کو جس حد تک پہنچایا شعر کو جو رفعت دی اس سے آگے اس کے پر جلتے ہیں۔ حقیقت شناس نقاد کی رہنمائی میں جب ہم اس زاویہ سے اقبال کے کلام پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم بھی محسوس کئے بنا نہیں رہ سکتے کہ غزل کو اقبال نے

جس رفعت پر پہنچایا، اُن کے کلام میں جو شعریت ہے اس کا اعتراف نہ کرنا کور ذوقی ہے، شعریت کی انتہا اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے ۔

عین وصال میں مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا
گرچہ بہانہ جُو رہی میری نگاہِ بے ادب

پریشان ہو ، میری خاک آخر دل نہ بن جائے
جو مشکل اب ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے
گفتی بجو وصالم بالاتر از خیالم
عُذر نو آفریدی اشک بہانہ جُو را

ان آبدار موتیوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ یہ مختصر مضمون ان کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔ غرض یہ تنقید ہی تو ہے جو ادیب کی تخلیق کی صحیح قدر و قیمت کا تعین کرتی ہے۔

اگر آپ تنقید کی عظمت جاننا چاہتے ہیں تو تاریخ کے ورق الٹ کر دیکھئے کہ غالب سا خودبین شخص نواب مصطفٰے خان شیفتہ کی کتنی قدر کرتا تھا کیونکہ وہ ادب کے اچھے نقاد تھے۔ حالی کو اردو کا پہلا معیاری نقاد ہونے کی وجہ سے کتنا اونچا منصب ملا۔ علامہ شبلی کی تنقیدی صلاحیت نے اُنہیں کمال تک پہنچایا۔ موجودہ دور میں دریا ادب میں جا کر مجنوں گورکھپوری، عبادت بریلوی، وقار عظیم، سید احتشام حسین، ممتاز حسین، آل احمد سرور اور دیگر سر برآوردہ تنقید نگاروں سے پوچھ لیجئے کہ آپ کو دربار ادب کی صفِ اولین میں کس چیز نے جگہ دی۔ ان کا متفقہ جواب ہوگا کہ یہ تنقید کی عظمت ہے۔

..........☆☆☆..........

شمیم احمد شمیم

ہم سخن فہم ہیں

یہ مضمون ایس پی کالج کے "میگزین" "پرتاپ" میں شائع ہوا تھا کہ جب شمیم صاحب بی ،ایس ،سی کے طالب علم تھے اور "پرتاپ" کے مدیر بھی۔ "پرتاپ" کے اس شمارے پر دسمبر ۱۹۵۲ء کی تاریخ درج ہے۔ اور میگزین کے نگران پروفیسر محمد طیب صدیقی نے اس کے آغاز میں یوں لکھا ہے......ہم سخن فہم ہیں......کلام غالب اور جناب غالب پر ایک تنقیدی حملہ ہے جو جارحانہ ہونے کے ساتھ ساتھ وحشیانہ بھی ہے۔ تاہم شمیم صاحب کے بعض ہم جماعتوں کے کہنا ہے کہ یہ تحریر بھی ان کی ہے جسے انہوں نے پروفیسر صدیقی کے نام سے چھاپا تھا..........

بُت پرستی انسانی سرشت ہے ہم میں سے ہر انسان شعوری یا غیر شعوری طور کسی نہ کسی بُت کو پوجتا ہے اور جب تک یہ بُت پرستی ایک معین حد کے اندر رہتی ہے یہ انسان کے شعور، ذہن اور ادراک کی نشو و نما کے لئے بہت مفید ہوتی ہے۔ مگر جب یہ حدودِ تعینہ سے تجاوز کرے تو یہ شعور انسانی کے ارتقاء کی راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے۔

غالب پرستوں نے جذبۂ عقیدت سے اثر پذیر ہو کر غالب کو ایک آئیڈل

شخصیت بنادیا ہے۔ اس کی شکل وصورت عادات وفضائل اور کردار پر کچھ اس انداز سے حاشیہ آرائی کی ہے کہ غالب کی سوانح حیات سے واقفیت نہ رکھنے والے کو وہ ایک فرشتہ سیرت، وجیہہ صورت مکمل اور جامع شخصیت نظر آتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے مرزا کی جو عام تصاویر ملتی ہیں۔ ان کو دیکھکر انہیں خوبصورت کہنا، جمالیاتی ذوق کی توہین اور پرلے درجے کی بدمذاقی ہے۔ جہاں تک ان کی سیرت کا تعلق ہے میری رائے میں ان کی سیرت میں کوئی ایسی غیر معمولی خصوصیت نہیں ہے جو انہیں عام انسانوں سے ممتاز کرسکتی ہے۔ غالب کی سوانح حیات ان کے کردار کی تصویر ہے اور یہ تصویر دیکھنے کے لئے ہمیں ان کی سوانح حیات کے اوراق الٹنے ہونگے۔ لیکن ایسا کرنے میں اس بات کا خدشہ ہے کہ کہیں جذبۂ عقیدت سے مسحور ہو کر ہم ان کی غلطیوں، کوتاہیوں اور خامیوں کو بھی صفاتِ عالیہ تصور نہ کریں۔ جیسا کہ غالب کے کئی سوانح نگاروں اور نقادوں نے کیا ہے۔ حتیٰ کہ گارِ غالب کا مصنف، جسے غالب کے سوانح نگاروں میں سب سے زیادہ مستند، متوازن اور صائب رائے قرار دیا جاسکتا ہے خود معترف ہے کہ اس نے یکطرفہ تصویر پیش کی ہے۔ مرزا کے کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں اور ان کے پھوڑوں کو کہیں ٹھیس نہیں لگنے دی۔ مرزا کی زندگی میں سوانحی تسلسل پیدا کرنے سے ان کی سیرت کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔ مرزا بحیثیت انسان بہت بلند نہ تھے انہوں نے بھی دیگر ہمعصر شعراء کی طرح قصیدے اور سہرے لکھے۔ انہوں نے بھی اپنی مطلب پروری کے لئے ایک عام انسان کی طرح انگریز افسروں کی خوشامد کی۔ ذوق سے ان کا اظہار معذرت ان کی پست ذہنیت کا بین ثبوت ہے۔ وہ بعض وقت اپنے مخالفین کی نسبت ایسے سخت فقرے لکھ جاتے کہ انہیں دہرانے کی تہذیب اجازت نہیں دیتی۔ فارسی لغت

نویسوں کی نسبت جو دُرشت اور فحش الفاظ انہوں نے استعمال کئے ہیں۔ واقعی قابل مواخذہ ہیں غرضیکہ ان کے کردار میں کوئی قابلِ ذکر خوبی نہ تھی بجز اس کے کہ وہ شاعر تھے اور انہیں مولانا حالیؔ اور مہرؔ جیسے قدرداں مل گئے۔ جنہوں نے خوش اعتقادی اور جذبۂ احترام سے اثر پذیر ہو کر اُن کے وجودِ حقیقی پر ایک ایسا لبادہ اوڑھ دیا۔ جو خوشنما اور دل کش تو ضرور ہے لیکن اصل نہیں۔

غالب کے معتقد اگر ان کی سیرت وصورت کے بیان میں ہی مبالغہ آمیزی سے کام لیتے تو ہمیں کوئی اعتراض نہ تھا کیونکہ ان کی سیرت وصورت کا بظاہر ان کے کلام سے کوئی تعلق نہ تھا اور ادب کے طالب علم کی حیثیت سے میرے لئے ان کا کلام اہم تھا نہ اُن کی شکل وصورت اور کردار سے مگر غالب کے مُداحوں نے ان کے کلام پر بھی دست اندازی شروع کردی ہے اور یہاں بھی وہ مبالغہ آرائی سے کام لیکر طالبانِ ادب کے لئے مشکلات پیدا کر رہے ہیں۔ جس طرح حافظ شیرازی کے مداح بادۂ شیرازی کو بادۂ معرفت اور ان کی عشق بازی "کو عشق حقیقی" سے تعبیر کر کے ان کی شاعرانہ عظمت اور برتری کے دعویدار ہیں۔ ٹھیک اسی طرح غالب پرست بھی کلام غالب کی دوراز قیاس تاویلات اور توضیحات کر کے ان کے مہمل اور معمولی اشعار کو بھی غیر معمولی اہمیت دے رہے ہیں۔ غالب کو ترقی پسند، ترجمانِ حیات، محبِ وطن معلمِ اخلاق اور نہ معلوم کیا کیا کچھ ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

مجھے اس امر سے انکار نہیں کہ غالبؔ فنِ شعر کے استاد تھے۔ ان کے ہاں معنی آفریں، نازک خیالی، لفظی صناعی، شوخی، طراوت اور روانی ہے۔ ان کے ہاں ہمیں عشق ومحبت کی روئداد ملتی ہے اور ان کے کلام کا بیشتر حصّہ وارداتِ عشق کے

بیان ہی تک محدود ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے ہاں ہمیں عشق، تصوف، خودداری، اخلاقیات، اور ہر قسم کے دیگر مضامین بھی ملتے ہیں لیکن ان کا ذکر ضمنی طور آیا ہے اور بحیثیت مجموعی ان کا کلام عشق کے موضوع سے ہی متعلق ہے لیکن کلام غالب کے ان شارحوں سے مجھے اتفاق نہیں۔ جو تکلف اور کھینچا تانی سے کام لیکر حقیقت اور اصلیت پر پردہ ڈالتے ہیں جو ان کی ہر بات کو آیت وحدیث کہہ کر اسے تنقید سے بالاتر سمجھتے ہیں جو محاسن شعری کے صرف چند پہلوؤں کو زیرِ نظر رکھ کر ان کے کلام کی تشریح کرتے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے کبھی کبھی حقیقت سے اس قدر دُور ہو جاتے ہیں کہ شاعر اور ان کے درمیاں تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔

غالب کے بعض مُداحوں نے غالب کے فلسفۂ عشق کو فلسفہ زندگی سے تعبیر کیا ہے ان کا دعویٰ ہے غالب کا بیشتر کلام زندگی کا ترجمان ہے اور یہ کہ ان کا فلسفۂ عشق، ہی فلسفۂ زندگی ہے؟ مداحانِ غالب کا یہی دعویٰ ہے۔ میرا نظریہ یہ ہے کہ غالب کا موضوعِ سخن، عشق اور صرف عشق ہے ان کے ہاں زندگی کا کوئی واضح تصور نہیں ملتا۔ وہ زندگی کا شعور نہ رکھتے تھے۔ اور اس لئے ان کے ہاں ہمیں زندگی نہیں ملتی بلکہ زندگی سے فرار کے لئے انہوں نے عشق ومحبت کی پناہ گاہ میں پناہ لی تھی اپنے نظریئے کی تائید میں غالب کے نظریہ شعر اور ان کے تصور عشق پر مفصل بحث کروں گا۔

غالب کا یہ نظریہ کیا تھا یا دوسرے الفاظ میں' غالبؔ کیوں شعر کہتے تھے؟ یہ ایک بنیادی سوال ہے، اور اسے واضح کرنے سے ہمیں غالب کو سمجھنے میں کافی مدد ملے گی۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ غالب نے گیارہ برس کی عمر میں ہی شعر کہنے شروع کر دیئے تھے یعنی شعر گوئی کا ذوق ان میں فطری موجود تھا۔ طبیعت میں آمد تھی، اس

لئے ان کے ہاں آورد کا شعور نہ تھا۔ وہ ہر اس احساس کو جو انہیں متاثر کرتا، نظم کرتے تھے یا یوں کہیئے کہ ان کے ہاں مقصدیت کا سرے سے ہی وجود ہی نہ تھا۔ کلام غالب کے ناقدانہ مطالعہ سے پتہ چلتا ہے۔ کہ مرزا کے لئے ان کی شاعری ذہنی تعیش کا ذریعہ تھی۔ اس لئے ان کے ہاں ہمیں کئی متبذل قسم کے مضامین بھی ملتے ہیں اس وقت شاعری چونکہ "پہلوانوں کا اکھاڑہ" تھی اور شعر گوئی سے کمال فن کا مظاہرہ کیا جاتا تھا اس لئے مرزا نے بھی اس دنگل میں بحیثیت "پہلوان" کے حصہ لیا۔ ان کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ وہ ان فنی نزاکتوں سے اپنے ہمعصروں سے ممتاز ہیں۔ اور چونکہ فطرت نے انہیں اعلیٰ قسم کی شاعرانہ صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ ان کی کوششیں بہت حد تک کامیاب رہیں۔ اسی لئے ان کے ہاں لفظی صناعی، تکلیف اور الجھاوے پائے جاتے ہیں۔ مرزا سیدھی سادھی بات کو سلیس انداز میں بیان کرنا جانتے ہی نہ تھے۔ ابتدا میں ان کا خیال تھا کہ ان کی شاعری کی ایک فنی خوبی یہ بھی ہے کہ عوام اُسے سمجھ نہ سکیں۔ اور اس لئے انہوں نے ابتداء میں نہایت مشکل، ثقیل اور مغلق زبان استعمال کی ہے جو عوام تو عوام خواص کیلئے بھی سمجھنا مشکل ہو گئی۔ اس مشکل پسندی پر معاصرین نے ان کا مذاق اڑایا اور بڑی دلچسپ چوٹیں کیں۔ حکیم آغا جان عیش نے ایک مشاعرے میں ذیل کا قطعہ پڑھا۔ ؎

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلام میر سمجھے اور کلام مرزا سمجھے
مگر ان کا کہا، یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

اسکے بعد مرزا نے اپنی شعر گوئی کی یوں وضاحت کی: ؎

ہمارے شعر میں اب صرف دل لگی کے اسد
کھُلا کہ فائدہ عرض ہنر میں خاک نہیں

اور حق گو یہ ہے کہ مرزا تمام عمر دل لگی کرتے رہے اور خوش اعتقاد اِس دل لگی کو حیات کی ترجمانی سمجھتے ہیں۔

غالب کا تصورِ عشق کیا ہے؟ کیا ان کے فلسفۂ عشق میں بہت گہرائی، گیرائی اور بلندی ہے۔ جو اقبالؔ کے تصورِ عشق میں ہے؟ کیا اِن کے جنون میں بھی وہی وسعت، ہمہ گیری اور جلال ہے جو اقبالؔ کے بیان کی امتیازی خصوصیات ہیں؟ اگر ان تمام سوالات کا جواب، اثبات میں ہے تو مرزا کی عظمت ورفعت سے اِنکار کرنا کفر ہے، لیکن مجھے یقین ہے کہ غالب کا بڑے سے بڑا مداح بھی یہ تسلیم نہیں کریگا کہ اقبال اور غالب کے تصوراتِ عشق میں کسی قسم کی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ غالب کا عشق زمین ہے اور اقبال کا عشق آسمان! اس میں پستی ہے اور اُس میں بلندی ہے یہ سراب ہے اور وہ چشمہ، یہ دھوکا ہے وہ حقیقت، یہ موت ہے وہ حیات، یہ زہر آب ہے اور وہ آب حیات!

حقیقت یہ ہے کہ غالب کا عشق ایک بازاری انسان کی عشق بازی ہے اور بس! ان کا عشق، ان کی جنسی اُلجھن کا آئینہ دار ہے ان کی تشنگی صرف محبوب کے ایک بوسے سے ہی تسکین پائی ہے ان کا تخیل محبوب کے مژگان میں ہی اُلجھ کر رہتا ہے۔ ان کا شعور ایک ہی تیرِ نگاہ سے زخمی ہو کر نیم جان اور کبھی کبھی بے جان ہو جاتا ہے۔ ان کے ہاں عشق دماغی خلل ہے۔ ؎

بلبل کے کاروبار پر ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جسے عشق خلل ہے دماغ کا

اوراس خلل دماغی میں کبھی کبھی وہ اِسقدر بہک جاتے تھے کہ ان کا پاکیزگی عشق ذوق سلیم اورطبع خاطر پر بار گذرتی ہے۔ان کے شہباز تخلیل کی پرواز محبوب کے ہونٹوں سے آگے نہیں ان کے رہوار تخلیل کی پہنچ معشوق کی زلفوں تک ہی ہے، ان کے ذوق طلب پیکر ناز کے بوسہ لینے پر ہی قانع ہے۔ان کی زندگی کی معراج معشوق کی آغوش ہے۔اوراس شعر میں انہوں نے اپنی تمام نفسیاتی کیفیات سمودی ہیں۔

نینداُسکی ہے دماغ اسکا ہے راتیں اُس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

"تکمیلِ عشق" میں ان کے ہاں "دھول دھپا" اور چھیڑ چھاڑ بھی رَوا ہے۔

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایکدن
ہم سے کھل جاؤ بوقت مئے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھکر عذر مستی ایک دن

اس قسم کے اشعار ان کے ذہنی تعیش اور سطحی جذباتیت کے آئینہ دار ہیں۔
غالب کے تصورات بیمار، غیر مفید، مایوس کن اور حوصلہ شکن ہیں۔وہ اپنے دور کے سب سے بڑے قنوطی گذرے ہیں۔اوران کی قنوطیت ان کے تمام کلام پر چھائی ہوتی ہے۔

جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

؎ رہے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

؎ کوئی اُمید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

؎ منحصر مرنے پہ ہو جسکی اُمید
نااُمیدی اس کی دیکھا چاہیئے

یہ اور اس قسم کے تاثرات ان کے کلام کا خاصہ ہیں۔ان کی قنوطیت زندگی سے مزار تک پہونچ جاتی ہے اور ہر سلیم الطبع جانتا ہے کہ انسانیت اور اخلاق کے لئے یہ مزاریت کس حد تک مہلک اور خطرناک ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ غالب بُری طرح احساس کمتری کے شکار تھے اور ایک مشہور نقاد کے اس قول سے مجھے مکمل اِتفاق ہے کہ غالب کو اس کے احساس کمتری نے شاعر بنادیا۔غالب کے اس احساس کمتری نے انہیں ایک خیالی معشوق کی تخلیق پر مجبور کردیا اور وہ تمام عمر اس کی پرستش کرتے رہے۔یہی احساس ان کی ادبی اور پرائیویٹ زندگی پر حاوی رہا۔اوران کے قویٰ ذہنی کو مفلوج کردیا۔ذیل کے چند اشعار سے ان کے اس احساس کی شدت واضح ہوجاتی ہے۔

؎ دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آستاں نکلا ان کا پاسبان اپنا

؎ مہربان ہو کے بلالو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

چاہتے ہیں خوبروؤں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے

مجھے اس امر سے انکار نہیں کہ عشق ومحبت بھی ہماری زندگی کا ایک جزو ہے۔ لیکن آپ جزو کو کل نہیں کہہ سکتے۔زندگی ایک بحرِ بے پایاں ہے آپ اس میں سے ایک تنکے کا سہارا لیکر ساحل تک نہیں پہونچ سکتے۔غالب نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو ایک جز کی نذر کیا ہے آپ اُس کو کل پر حاوی نہیں کر سکتے۔اور ہمیں یہ بھی تو دیکھنا ہے کہ ان کے کلام کی افادیت کیا ہے؟ انہوں نے زندگی کو کیا دیا؟ ان کے ہاں ہمارے لئے کونسا پیغام ہے؟ان کا کلام جدید تنقید کے معیار پر اُتر سکتا ہے؟

مجھے یہ کہنے میں عار نہیں کہ کئی پہلوؤں میں غالب کے کلام کی بہت بلندی اور وسعت عطا کی ، اردو زبان کا دامن وسیع سے وسیع تر کردیا۔انہوں نے اپنے ہمعصروں کے مقابلے میں مبالغہ آرائی اور غیر فطری احساسات کو بہت کم جگہ دی۔ ان کے ہاں اچھوتی تشبیہیں ، نادر استعارے اور نئی ترکیبیں عام ملتی ہیں۔مختصراً یہ ہے۔کہ انہوں نے حقیقت کو جھٹلایا نہیں کہ وہ زندگی کو کچھ نہ دے سکے۔ان کی شاعری تاج محل کی حیثیت رکھتی ہے جو فنِ تعمیری اور سنگ تراشی کا بہترین نمونہ ہے۔ جس کی چمک دمک سے آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔جس میں جڑے ہو جواہر ریزے مغلوں کی شان وشوکت اور وجاہت کی غماز ہیں۔لیکن تاج محل ہماری زندگی کی تصویر نہیں۔اس پر صرف کی ہوئی دولت سے ہماری اقتصادی اور معاشی حالت سدھر نہیں گئی۔اس کی شان وشوکت اور خوبصورتی ہماری بھوک کو نہیں مٹا سکتی۔ بالکل اسی طرح غالب کی شاعری خوبصورت ہوتو ہو،لیکن یہ خوبصورتی ہمارے لئے کوئی افادیت نہیں رکھتی۔

غالب کی شاعری قطب صاحب کی لاٹ ہے جس کی تاریخی اہمیت سے انکار تو نہیں کیا جاسکتا لیکن جس کی افادیت قطب الدین ایبک کے سوا شاید کوئی نہیں جانتا ہو۔ہمیں اچھے اور برے ادب میں فرق کرنے کے لئے ہیئت اور اسلوب کی پرکھ کو مقدم نہ رکھنا چاہیئے بلکہ مواد کو مقدم رکھنا چاہیئے۔ہوسکتا ہے کہ غیر صحت مند مواد کی ہیئت اور اسلوب خوشنما ہو لیکن صرف ہیت کی خوشنمائی سے ہی مواد کی غیر صحت مندی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔اپنے نظریہ کو زیادہ واضع کرنے کے لئے میں نیچے اس طویل خط کا اقتباس درج کر رہا ہوں جو سردار جعفری نے اداۂ شاہراہ کے نام لِکھا تھا۔

”بُرے مواد کی ہیئت بظاہر جتنی خوبصورت ہو اس کے اظہار و بیان میں جتنی شدت ہو۔اس ادب کو میں اتنا ہی برا اور خطرناک سمجھتا ہوں۔کیونکہ اس کا زہر زیادہ اثر انگیز اور کارگر ہوتا ہے۔جو حضرات اظہار و بیان کے حسن کو اچھا ادب سمجھتے ہیں ان کی خدمت میں مجھے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ اچھا کھانا وہ جو لذیز ہو لیکن لذیز ہونے سے پہلے وہ غذائیت کا ہونا ضروری ہے۔اب اگر کوئی زہر کو لذیز بنا دے تو کیا آپ اسے اچھے کھانوں میں شمار کرنے لگیں گے۔لیکن بدقسمتی اور ناسمجھی سے ادب میں ان باورچیوں کے فن کی داد دینے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔جو زہر کی کھیر پکاتے رہتے ہیں۔اچھا ادب وہ ہے جو اظہار و بیان میں حسین و موثر ہو۔لیکن اس سے پہلے اس کے مواد کا صحت مند ہونا ضروری ہے۔“

ڈاکٹر بجنوری نے جذباتِ عقیدت سے مغلوب ہوکر دیوانِ غالب کو الہامی کتاب قرار دیا ہے۔بظاہر ان کا دعویٰ نقلی اور مبالغہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا لیکن

میں سمجھتا ہوں کہ ان کے اس دعویٰ میں ایک تلخ حقیقت پوشیدہ ہے۔ دیوانِ غالب واقعی الہامی کتاب ہے، کیونکہ اس میں خاکی دنیا کا کوئی ذکر نہیں اس میں تصور اور تخیل کی بوقلمونی تو ہے لیکن حقیقت کی رنگ آمیزی کہیں نہیں۔ اس میں کسی آسمانی عشق کی روئداد تو ہے لیکن اس دنیائے آب وگل کا کوئی ذکر نہیں۔ یہ سراپا الہام ہے اور ڈاکٹر بجنوری اس انکشاف حقیقت کے لئے مبارک باد کے مستحق ہیں غالب خود ان کے دعویٰ کی تائید کرتے ہیں۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

غالب پرست غالب کے چند اشعار پیش کر کے ان کی خودداری، اخلاقی بلندی اور ان کے صوفی ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔ مجھے تسلیم ہے کہ عمر بھر کی قافیہ پیمائی میں ان کے ہاں اخلاقیات، خودداری اور تصوف کے مضامین بھی آگئے ہیں۔

بندگی میں بھی وہ آزادو خودبین ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وانہ ہوا!!!

روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
ہاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

یہ اور اس قسم کے دیگر اشعار غالب کی خودداری اخلاقیات اور صوفی ہونے کے ثبوت میں پیش کئے جاتے ہیں۔

لیکن میں غالب کے وکیلوں سے کہوں گا کہ دیوانِ غالب میں اس قسم کے

اشعار کی تعداد اُنگلیوں پر گنی جاسکتی ہے دیکھنا یہ ہے کہ انکے کلام کا مجموعی تاثر کیا ہے؟ قافیہ پیمائی میں ممکن ہے اس قسم کے اشعار اتفاقی طور آئے ہوں۔ اردو کے ممتاز نقاد ممتاز حسین کہتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ ظاہری طور غزل کا ہر شعر منفرد مقام رکھتا ہو لیکن بحیثیت مجموعی غزل میں ایک ہی موڑ Mode کارفرما ہوتا ہے۔ ہمیں بھی غالب کی غزلیات کا یہی موڑ دیکھنا ہے نہ کہ ان کے منفرد اشعار کی محدود کیفیات! اور اگر دیانتداری کے ساتھ اس موڑ کا مطالعہ کیا جائے۔ تو ہمیں وہاں واردات عشق اور روئیداد کے سوا کچھ بھی نہیں ملتا۔ اسی ایک مضمون کو مختلف انداز میں نظم کیا گیا ہے۔ شرابی بھی تو کسی وقت مدہوشی کے عالم میں بڑے پتے کی بات کہہ جاتا ہے۔ کسی پاگل کے منہ سے بھی تو کسی وقت کوئی شعور کی بات نکل ہی جاتی ہے لیکن صرف اس لئے ہم ان کو ذی ہوش اور باشعور قرار نہیں دے سکتے۔

اردو ادب کی تاریخ میں غالب کا کیا درجہ ہونا چاہئے؟ انہیں کون سا مقام حاصل ہونا چاہیئے۔ موجودہ نسل کے لئے ان کی شاعری قابلِ تقلید ہے یا نہیں؟ ان امور پر میں اگلے شمارہ میں روشنی ڈال سکوں گا۔

(پرتاپ، دسمبر ۱۹۵۳ء)

☆☆☆

شمیم احمد شمیم

کشمیری ناول۔ ایک جائزہ

کشمیری ادب میں ہمارے افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں کی شعوری کوشش یہ رہی ہے کہ کشمیری زبان میں مختلف اصنافِ سخن اور اسالیب بیان کو رواج دیا جائے ۔کشمیری افسانے کا وجود اسی شعوری کوشش کا نتیجہ ہے۔ اختر محی الدین، امین کامل، علی محمد لون، صوفی غلام محمد، امیش کول، بھارتی اور دیگر نوجوان فن کاروں کی کاوِشوں نے کشمیری افسانے کے شان دار مستقبل کے لئے راہیں ہموار کردی ہیں اور یہ امر حوصلہ افزا ہے کہ کشمیری افسانے کے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں اور کئی ایک اشاعت کے مرحلے طے کر رہے ہیں۔ اپنی زبان کی کم مائیگی کا شدید احساس اور پھر اپنی زبان سے محبت کا بے پناہ جذبہ کشمیری زبان کے مستقبل کے لئے ایک نیک فال ہے اور اگر کشمیری ادیبوں کی کوششیں اسی سرگرمی کے ساتھ جاری رہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ مستقبل قریب میں یہ زبان اپنے ادبی اثاثے پر فخر نہ کر سکے۔ کشمیری زبان میں چونکہ نثر کی تاریخ کا آغاز افسانے کی ترویج کے ساتھ ہی ہوا ہے، اس لئے ابھی تک کشمیری نثر کا کوئی واضح اسلوب یا اسٹائل نہیں اُبھرا ہے۔ ہر رنگ ایک انفرادیت لئے ہوئے ہے اور ہر نقش ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ رنگوں کی یہ

قوسِ قزح دل کش اور دِل فریب ضرور ہے لیکن اس میں توازن کی کمی ہے۔ نثر کے لئے جس پُر وقار سنجیدگی کا ہونا ضروری ہے وہ ابھی تک پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ یہ سب چیزیں رفتہ رفتہ آ ہی جائیں گی اور اس کے لئے بے صبر ہونے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن خود ادیبوں میں ایک بے چینی اور بے صبری کی کیفیت پائی جاتی ۔ وہ ایک جست میں اس منزل کو پالینا چاہتے ہیں جس کے لئے دیگر زبانوں کو صدیوں ریاض کرنا پڑا۔ افسانے کی ترویج کے فوراً بعد کشمیری زبان کے کچھ مہم پسند ادیبوں نے اس زبان میں ناول کا تجربہ کرنا چاہا ہے۔ ابھی تک دو ناول طبع ہو کر ہمارے سامنے آ چکے ہیں اور میری اطلاع کے مطابق کچھ اور حضرات نے بھی افسانے اور شاعری کی بجائے ناول نگاری پر اپنی توجہ مبذول کی ہے۔ تجربے کی خواہش اور مہم پسندی بجائے خود کوئی خطرناک رُجحان نہیں ہے لیکن اپنے پڑھنے والوں کے مزاج اور وقت کے تقاضوں کو نظر انداز کر کے صرف جدت پسندی کے لئے کوئی تجربہ کرنا ادب میں کوئی صحت مند رُجحان قرار نہیں دیا جا سکتا۔ تجربے کی اہمیت اُسی وقت بڑھ جاتی ہے جب یہ ایک تقاضے کی پیداوار ہو اور اس میں مزاج اور ماحول کے باہمی تعلق کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہو۔ میں کشمیری زبان میں ناول لکھنے کا مخالف نہیں ہوں بلکہ میرا عقیدہ ہے کہ جب تک کسی ادب میں اچھے ناول نہ ہوں، وہ عظیم ادب نہیں کہلا سکتا۔ لیکن یہ سمجھتا ہوں کہ ہمارا مزاج ابھی کشمیری ناول کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ہمارے مزاج کی بات رہنے دیجئے، خود ابھی کشمیری نثر نگاروں کے ذہن بھی ناول لکھنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ناول میں خیالات کے اظہار اور واقعات کے بیان کرنے کے لئے زبان میں جو وسعت، گہرائی اور گیرائی ہونی چاہیئے وہ کشمیری زبان میں ابھی تک پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ رسم الخط کی

دِقت کی وجہ سے بہت کم لوگ ایسے ہیں جو آسانی سے کشمیری پڑھ سکتے ہوں گے۔ ان حالات میں ہمیں سب سے پہلے پڑھنے والوں کو ذہنی طور کشمیری پڑھنے کے لئے آمادہ کرنا چاہیئے۔ مختصر افسانے نے اس سلسلے میں کافی اہم کام کیا ہے، لیکن یہ کام ابھی ادھورا ہے۔ ابھی تک کشمیری افسانہ سے محظوظ ہونے والوں کی تعداد صرف انگلیوں پر ہی گنی جاسکتی ہے۔ ہمارے پڑھنے والوں کی دُنیا اتنی محدود ہے کہ کوئی مصنف اپنی کتاب کی چار سو (۴۰۰) کاپیاں بھی بیچ پائے تو اسے حیرت انگیز کامیابی تصور کیا جاتا ہے۔ ناول صرف ناول نگار سے ریاض نہیں چاہتا، وہ پڑھنے والے سے بھی صبر آزما مطالعے کا تقاضہ کرتا ہے۔ صرف اوّلیت کا اعزاز حاصل کرنے کے لئے ناول کا تجربہ ادب کے لئے برا نہیں، لیکن ادیب کے لئے نقصان دہ ضرور ہے۔ اس طرح فن کار فن کو ثانوی درجہ دے کر تاریخی اہمیت حاصل کرنا چاہتا ہے۔

اختر محی الدین اور امین کامل اسی کمزوری کا شکار ہو گئے ہیں۔ انہوں نے ''ادبی عظمت'' کا سودا کر کے ''تاریخی اہمیت'' حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اختر محی الدین کا ''دوودگ'' اور امین کامل کا ''گٹہِ منز گاش'' تاریخی اعتبار سے ایک اہم کارنامہ ہیں، لیکن ان کی فنی اور ادبی قدر و قیمت بہت زیادہ نہیں ہے۔

اختر محی الدین کے ناول (اسے ناولٹ کہنا زیادہ موزوں ہوگا) میں ایک ادبی کارنامہ بننے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں، لیکن اختر کی جلد بازی اور اس کی سہل پسندی نے اسے ایک تیسرے درجے کی ادبی تخلیق بنا دیا ہے۔ ''دود دگ'' کا موضوع اور اس کے کردار ہماری جیتی جاگتی زندگی کا ایک مُرقع ہے۔ اس میں ہماری زندگی کا تعفن اور اسکی پاکیزگی، ہمارے سماج کی صحیح روح اور اس کا غازہ، ہمارے کردار کی بلندی اور پستی، ہمارے شعور کی پیچیدگیاں اور ہمارے لاشعور کی بھول

بھلیاں بھی کچھ ہے، لیکن اس کے باوجود یہ ہماری معاشرت اور ہماری زندگی کی تصویر نہیں ہے۔ اختر زندگی سے اتنے قریب ہونے کے باوجود زندگی کو نہیں پا سکے۔ یہ اس کے خلوص کا نہیں، اس کے فن کا عجز ہے۔ امین کامل کا ناول ''گٹہِ منز گاش'' جو میرے اس مقالے کا موضوع ہے، بقول امین کامل ''ایک نیم تاریخی حقیقت ہے۔'' امین کامل کے الفاظ میں اس ناول کا موضوع ہندو مسلم اتحاد ہے اور انہوں نے ابتدا میں ''گوڈ کتھ'' (پہلی بات) کے عنوان سے تفصیل سے اُن مشکلات کا تذکرہ کیا ہے جو ایک نیم تاریخی حقیقت کو افسانے کے طور پر پیش کرنے میں درپیش آتی ہیں۔ کامل نے اپنے پڑھنے والوں کو خبردار کیا ہے کہ کسی تاریخی حقیقت یا واقعے کو ناول کا موضوع بنانے کے لئے اس میں کافی ترمیم' تدوین اور اضافے کی ضرورت پڑتی ہے، اس لئے میرے ناول میں تاریخی حقائق کی تلاش کرنا بے سُود ہے۔ بلکہ صرف اس تاریخی پس منظر کو ذہن میں رکھ کر اس کے پلاٹ، کردار اور اس کی زبان پر بحث کی جانی چاہیئے...... ''مجھے ذاتی طور پر کامل صاحب کے اس بیان سے اتفاق ہے اور میں اپنی بحث کو ان ہی حدود کے اندر رکھنے کی کوشش کروں گا۔

''گٹہِ منز گاش'' کا پسِ منظر ۱۹۴۷ کا قبائلی حملہ ہے اور اس کا مرکزی خیال ہندو مسلم اتحاد ہے۔ بانڈی پورہ کے ایک شریف گھرانے کی لڑکی فاطمہ قبائلی حملہ سے چند ماہ پہلے ملازمت کے سلسلے میں بارہ مولہ چلی جاتی ہے اس کے ساتھ بانڈی پورہ کا ایک بزرگ ولی بڈہ بھی روانہ کر دیا جاتا ہے۔ ولی بڈہ اور فاطمہ دونوں بارہ مولہ میں چند کمرے کرائے پر لے کر رہنے لگتے ہیں۔ فاطمہ دِن بھر سکول جاتی ہے اور ولی بڈہ ٹوپیاں سیتا رہتا ہے۔ فاطمہ کے مکان کے نیچے رام کرشن نام کا ایک دُکان دار دُکان داری کرتا ہے جو ایک ہی مرتبہ فاطمہ کو دیکھ کر اس پر فریفتہ ہو جاتا

ہے۔لیکن فاطمہ کو رام کرشن سے شدید نفرت ہوتی ہے اور ادھر رام کرشن اپنی ساری زندہ دِلی اور شوخیاں بھول کر اُداس ہو جاتا ہے۔رام کرشن ایک مرتبہ بارہ مولہ کے ایک رئیس زادے حسہ لالہ سے اپنی محبت کا ذکر کرتا ہے۔اتفاق سے جس مکان میں فاطمہ رہتی ہے وہ حسہ لالہ کے باپ عزیز اللہ کا ہوتا ہے۔حسہ لالہ، رام کرشن سے فاطمہ کے بے پناہ حسن کی تعریف سُن کر ہی فریفتہ ہو جاتا ہے۔وہ مکان کی مرمت کے بہانے فاطمہ کے ہاں جاتا ہے اور فاطمہ کو دیکھ لیتا ہے۔وہ اس کے بعد فاطمہ سے خط و کتابت شروع کر کے اپنے عشق کا اظہار کرنا چاہتا ہے۔فاطمہ کی شرافت اور بلندی کردار کا یہ عالم ہے کہ وہ حسہ لالہ کے خط کا جواب تو دیتی ہے لیکن اُس پر یہ بات واضح کر دیتی ہے کہ وہ کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں ہے جو کسی غیر مرد کے ساتھ خط و کتابت کا سلسلہ شروع کر دے۔اگر حسہ لالہ کو فاطمہ سے شادی کرنا مقصود ہے تو اسے چاہیئے کہ اپنے باپ سے کہہ کر فاطمہ کے باپ سے سلسلۂ جنبانی کرے، اگر اُس کے باپ کو یہ قبول ہو تو فاطمہ کو کوئی اعتراض نہیں۔اس کے بعد سارا سلسلہ طے ہوتا ہے۔فاطمہ کا باپ بانڈی پورہ سے آ کر حسہ لالہ کے باپ سے وعدہ کر لیتا ہے......اسی دوران میں قبائلی حملہ آور ریاست پر دھاوا بول دیتے ہیں اور وہ بارہ مولہ تک آ پہنچتے ہیں۔فاطمہ اور ولی بڈہ اس اجنبی ماحول میں اور زیادہ پریشان ہو جاتے ہیں۔ہفتے بھر تک سارے بارہ مولہ میں قیامت کا سماں برپا رہتا ہے اور اسی دوران میں رام کرشن اپنی جان کے خوف سے ایک رات کو فاطمہ کے ہاں پہنچ جاتا ہے۔فاطمہ اپنی تمام نفرت اور حقارت کو بھول کر رام کرشن کو اپنے ہاں پناہ دیتی ہے۔اس کے بعد ایک دن چند قبائلی فاطمہ کے مکان پر بھی حملہ کر دیتے ہیں۔ولی بڈہ زخمی ہو جاتا ہے۔رام کرشن، فاطمہ کو بچاتے ہوئے گولی کا شکار ہو جاتا

ہے اور فاطمہ قبائلیوں کی موجودگی میں رام کرشن کو اپنا خاوند جتاتی ہے۔فاطمہ قبائلیوں کے چنگل سے بچ کر واپس آ جاتی ہے اور رام کرشن اس کی گود میں جان دے دیتا ہے۔فاطمہ، حسہ لالہ سے اس لئے شادی کرنے سے انکار کر دیتی ہے کہ اس کا باپ عزیز اللہ قبائلی حملہ آوروں کی امداد و اعانت کرتا رہا تھا......وہ ہمیشہ کے لئے شادی کا ارادہ ترک کر کے بانڈی پورہ کے سکول میں اُستانی کے طور پر کام کرنے لگتی ہے......یہ ہے ”گٹہِ منز گاش“ کی کہانی، جسے مصنف نے بانڈی پورہ، کے ایک ریٹائیرڈ ٹیچر ماسٹر عبدالسلام کی زبانی کہلوایا ہے۔

امین کاملؔ نے اس ناول کے لئے جو فارم استعمال کیا ہے اِس کے متعلق انہوں نے شروع میں کہا ہے ”چونکہ ناول کشمیری ادب میں ایک نئی چیز ہے اس لئے مجھے ایک ایسے طرز یا فارم کی تلاش کرنا پڑی جو ہمارے لوگوں کو نامانوس معلوم نہ ہو، اس لئے میں نے ایک داستان گو کا سا طرز اختیار کیا جس سے ہمارے ہاں کے لوگ سال ہا سال سے لطف اندوز ہوتے رہے ہیں۔“ کاملؔ صاحب کے ناول میں یہ معلوم نہیں ہو پاتا کہ داستان گو کون ہیں؟ وہ خود ہیں یا ماسٹر عبدالسلام، جن کی زبانی وہ کہانی سُن رہے ہیں۔اگر مصنف خود داستان گو ہے تو پھر وہ مقصد پورا نہیں ہو پاتا جس کے لئے اس نے یہ طرز اختیار کیا۔پرانی داستانوں میں داستان گو کہانی کا حصہ نہیں ہوتا تھا اور ”گٹہِ منز گاش“ میں امین کاملؔ اس کہانی کے ایک اہم کردار ہیں۔وہ اس کہانی کے کرداروں سے خود مل کر مواد فراہم کرتے ہیں اور پھر عجیب اتفاق یہ ہے کہ وہ اس کہانی کے تقریباً سبھی اہم کرداروں سے ذاتی طور مل کر کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ماسٹر عبدالسلام سے ان کی ملاقات ایک اتفاق سہی، لیکن اس کے بعد تو ناول صرف اتفاقات کے ہی سہارے آگے بڑھتا ہے۔مجید، ولی

بڈہ، جلہ صاب، ڈاکٹر، نازکی، ان سب کے بغیر ناول مکمل نہیں ہوسکتا اور مصنف صرف چند گھنٹوں کے سفر میں ہی ان سے مِل کر ناول کو اختتام تک پہنچا دیتا ہے۔ اس لئے مصنف اُس داستان گو سے مختلف ہے جو داستان سُناتے سُناتے ایک ایسی فضا پیدا کردیتے تھے کہ سُننے والے یہ جانتے ہوئے بھی کہ داستان گو ایک سُنی سُنائی بات کہہ رہا ہے، اس کی ہر بات کا یقین کرلیتے تھے۔ ''گٹھِ منز گاش'' میں مصنف کی ہر بات کو صحیح ماننے میں قدرے تامّل ہوتا ہے۔ اگر ماسٹر عبدالسلام کو، جس کی زبانی خود مصنف ابتدائی قصہ سُن رہے ہیں، داستان گو مان لیا جائے تو بہت سی مشکلیں حل ہو جائیں گی۔ ماسٹر عبدالسلام کے بات کہنے کا انداز واقعی ایک داستان گو کا انداز ہے اور پھر کہانی کے اختتام تک یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ اس سارے قصے سے خود بھی متعلق ہیں۔ لیکن ماسٹر عبدالسلام بھی کبھی کبھی ''داستان گو'' کی حدود سے باہر ہوکر خود کہانی کے کردار بن جاتے ہیں اور اس طرح پڑھنے والوں کے اعتماد اور اعتبار کو دھچکا لگتا ہے۔ مثلاً وہ کہانی بیان کرتے کرتے فاطمہ کے اندرونی جذبات اور اس کی داخلی کش مکش کی تصویر یوں کھینچ دیتے ہیں کہ اس کا یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ کہانی کی جُزئیات بیان کرتے ہوئے بھی اس درجہ مبالغہ سے کام لیتے ہیں کہ پڑھنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ ساری کہانی ماسٹر جی کی اختراع ہے۔ مثلاً وہ اُس خط کا مضمون حرف بہ حرف سنا دیتے ہیں جو فاطمہ نے حسہ لالہ کے خط کے جواب میں لکھا تھا۔ ایک جگہ وہ قرآن شریف کی وہ آیت بھی سُنا دیتے ہیں جو فاطمہ نے انتہائی پریشانی کے عالم میں اپنے دِل میں پڑھی تھی۔ اور پھر انتہا یہ کہ وہ بڑی تفصیل سے فاطمہ کے بچپن کے اُن واقعات کو بیان کرتے ہیں جو فاطمہ اپنے تصوّر میں دیکھ لیتی ہے۔ اور اس قسم کی باتیں وہ ماحول پیدا کرنے میں مانع ہوتی ہیں

جس میں بیان کرنے والے کو پڑھنے والے یا سننے والے کا مکمل اعتماد حاصل ہوتا ہے۔ دوسری بات جو اس اعتماد، اعتبار اور ایقان کی فضا قائم نہیں ہونے دیتی، اس ناول کا Time period ہے۔ یہ ساری کہانی صرف چند گھنٹوں میں مکمل ہوتی ہے اور اس کے مکمل کرنے میں واقعات کی رفتار سے زیادہ مصنف نے اپنے گفتار سے کام لیا ہے۔ مصنف کی گاڑی بانڈی پورہ جاتے ہوئے ایک جگہ پر خراب ہو جاتی ہے۔ ڈرائیور گاڑی کی مرمت کرنے لگتا ہے اور مصنف ساتھ کے گاؤں میں اپنا جسم گرم کرنے کے لئے چلا جاتا ہے۔ جتنی دیر میں ڈرائیور گاڑی ٹھیک کر لیتا ہے، مصنف ماسٹر عبدالسلام سے ساری داستان سُن کر واپس آجاتا ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ یہ ساری داستان عین اُس وقت ختم ہوجاتی ہے جب گاڑی کا ہارن بجنے لگتا ہے...... اور یہی نہیں، کہانی کے باقی کردار اس کے بعد گاڑی میں مصنف کو مِل جاتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اڑھائی تین گھنٹے میں یہ سب ممکن ہوسکتا ہو، لیکن پڑھنے والا یہ سب کچھ قبول نہیں کرسکتا، کیونکہ وہ اتفاقات سے زیادہ واقعات اور حادثات پر یقین کرلیتا ہے اور پھر جب سارا ناول اتفاقات سے بھرپور ہو تو ناول کا ارتقاء واقعات سے زیادہ مصنف کے زورِ قلم کا مرہونِ منت ہو جاتا ہے اور ''گٹھِ منز گاش'' میں یہ سقم کافی نُمایاں ہے۔

اس ناول کا مرکزی خیال، جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، ہندو مسلم اتحاد ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب سارا ہندوستان فرقہ پرستی، تعصب اور مذہبی جنون کی آگ میں جل رہا تھا، کشمیر میں ہندو اور مسلمان بھائیوں کی طرح رہ رہے تھے۔ جب برِصغیر ہندو پاکستان میں انسانیت دَم توڑ رہی تھی تو باپو نے کہا تھا کہ...... ''اس اندھیرے میں اگر مجھے کہیں سے روشنی کی کرن دکھائی دیتی ہے تو وہ

کشمیر ہے......" روشنی کی یہ کرن ایک اتفاق یا حادثہ نہیں تھی۔ یہ وہ شمع تھی جو رشیوں منیوں اور صوفیوں نے صد ہا سال پہلے روشن کی تھی۔ مذہبی رواداری، بھائی چارے، اور سماجی انصاف کی روایات چند سال میں قائم نہیں ہوتیں۔ ان کی بنیادیں اس تہذیب اور کلچر میں نظر آئیں گی جسے للہ دید، نُند ریشی، پرمانند، رسول میر اور مہجور نے اپنے خونِ جگر سے سینچا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں اگر کشمیریوں کو اُس حیوانیت نے مغلوب نہیں کیا جس نے سارے ہندو پاکستان کو دبوچ لیا تھا تو اسے محض ایک اتفاق کہہ کر ٹالنا ایک تاریخی غلط بیانی ہوگی۔ قبائلی حملے نے ثابت کر دیا کہ یہ قوم آگ سے دور رہ کر ہی اپنے آپ کو بچانے کی اہل نہیں، بلکہ آگ میں گھر کر بھی اپنے ماضی اور اپنی روایات کا تحفظ کرنا جانتی ہے۔ قبائلیوں نے اوڑی، بارہ مولہ، سوپور، پٹن اور بانڈی پورہ کے مسلمانوں کو ہندوؤں اور سکھوں کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ وہ مسلمانوں کو کافروں سے نجات دِلانے کے لئے آئے ہیں۔ یہ ایک سخت ترین امتحان تھا۔ لیکن کشمیری اس امتحان میں بھی پورے اُترے، کشمیری مسلمانوں نے اپنے ہندو اور سکھ بھائیوں کو اپنی زندگی کی قیمت پر بھی محفوظ رکھنے کی سعی کی۔ قبائلی درندوں نے مسلمانوں کا یہ عدمِ تعاون دیکھ کر انہیں آڑے ہاتھوں لیا۔ مسلمانوں کے گھروں کو لوٹا گیا۔ ان کی عورتوں کی بے عزتی ہوئی اور شیروانی کا سینہ گولیوں کی بوچھاڑ سے چھلنی کر دیا گیا۔ شیروانی کی موت ہندو مسلم اتحاد کی اُن عظیم روایات کی زندگی تھی جنہیں ہم صدیوں سے اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ شیروانی کی موت کشمیر کی تاریخ میں سب سے زیادہ قابلِ رشک موت ہے۔ امین کاملؔ نے اسی پس منظر میں کشمیریوں کے جذبۂ رواداری اور بھائی چارے کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے مجھے اُن کے خلوص

اور ان کے نیک ارادوں پر شک نہیں، انہوں نے بڑی محنت اور لگاؤ سے اس جذبے کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس نے ساری دُنیا میں ہمارا سر اونچا کر دیا ہے۔ لیکن کاملؔ صاحب اپنے خلوص اور اپنی دیانت کے باوجود اس جذبے کو کامیابی کے ساتھ پیش کرنے میں کامیاب نہیں رہے ہیں۔ پس منظر اتنا عظیم الشان ہے کہ کامل صاحب کی کاوِشیں بڑی حقیر اور ناچیز نظر آ رہی ہیں۔ یوں سمجھ لیجئے کہ تاج محل کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے کوئی شخص تاج محل کا ماڈل بنا کر اس کی نمائش کرے۔ کاملؔ صاحب نے فاطمہ اور رام کرشن کو ہندو مسلم اتحاد کا مظہر بنا کر پیش کیا ہے۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ نہ فاطمہ اس رُوح کی نمائندہ ہے اور نہ رام کرشن اُس جذبے کا مظہر، فاطمہ تو دیوی ہے۔ وہ تو زمین و زماں سے پرے کسی اور ہی دُنیا کی رہنے والی ہے۔ وہ اگر بانڈی پورہ یا بارہ مولہ کی بجائے نواکھلی یا مغربی پنجاب میں بھی ہوتی تو وہ اتنی ہی بلند اور پاکیزہ ہوتی۔ اس کی انسانیت اور شرافت، اس کی روح کی عظمت اور اس کے کردار کی بلندی کسی مخصوص زمین یا آب و ہوا کی پیداوار نہیں۔ وہ انسانوں کے دیش میں رہنے والی فرشتہ تھی۔ وہ انسانوں کی نمائندہ کیسے ہو سکتی ہے؟ رام کرشن کے ہاں اس جذبے کی عظمت کا کہیں گمان تک نہیں ہوتا ہے جس کا وہ نمائندہ قرار دیا گیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ہندو کہہ کر قبائلیوں کے ہاتھ سے نہیں بچ سکتا تھا۔ وہ فاطمہ کا دفاع اس لئے کرتا ہے کہ فاطمہ نے اُسے اپنے ہاں پناہ دی تھی، وہ فاطمہ کو اس لئے بھی بچانے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ ایک مرد تھا۔ وہ اس لئے بھی قبائلی پر جھپٹتا ہے کہ فاطمہ اسے اپنا شوہر کہتی ہے۔ رام کرشن کا ذہن ایک نفسیاتی کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ رام کرشن فاطمہ سے محبت کرتا تھا اور یہ محبت خالص جنسی محبت تھی، جس پر تصوف یا افلاطونی عشق کا گمان

نہیں کیا جاسکتا تھا! اس طرح رام کرشن کا کردار کسی ایسے جذبے کا مظہر قرار نہیں دیا جاسکتا جو ہمارے مزاج، کلچر اور ہماری روایات کا نمائندہ ہو۔ تمام ناول میں اس جدوجہد کا کوئی ذکر نہیں جو اس نازک دَور میں کشمیری من حیث القوم ہر محاذ پر کررہے تھے۔ قبائلی حملہ نے جہاں ہمارے سیاسی، معاشی اور اقتصادی نظام کو درہم برہم کردیا، وہاں ہمارے خوابیدہ احساس کو بھی جگا دیا۔ کشمیر کی تاریخ میں پہلی مرتبہ یہاں کے نہتے بچے، جوان اور بوڑھے حملہ آور کا مقابلہ کرنے کے لئے کفن بردوش نکلے ہیں۔ ہندو مسلم اتحاد اب ایک سیاسی نعرہ ہی نہیں رہا تھا۔ وہ ایک سوالیہ علامت بن کر ہمارے سامنے آیا تھا اور ہمیں فخر ہے کہ اس نازک امتحان کی گھڑی میں بھی ہمارے آدرش کا پرچم بڑی آن بان سے لہراتا رہا۔ ''گٹہِ منز گاش'' میں اس ساری قومی جدوجہد کو ایک انفرادی واقعے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس ناول کی ساری کہانی بارہ مولہ میں شروع ہوکر یہیں اختتام کو پہنچ جاتی ہے لیکن اس ناول میں کسی شیروانی کا ذکر نہیں۔ شیروانی سے مراد مقبول شیروانی سے نہیں۔ اور میں اس بات پر اصرار نہیں کرتا ہوں کہ اس کا ذکر کیا جانا ضروری ہے۔ لیکن شیروانی واقعی اس پاک اور ارفع جذبے کا نمائندہ ہے جسے امین کامل نے فاطمہ یا رام کرشن کی صورت دینے کی کوشش کی ہے اور اگر کسی کو اس بلند آدرش کی نمائندگی کا حق ہے تو وہ شیروانی ہے جو کشمیریوں کے مزاج، اُن کے کلچر اور اُن کی روایات کی پیداوار تھا۔ رام کرشنوں اور فاطموں کے علاوہ کچھ ایسے بھی لوگ تھے جو صرف اپنے آپ کو بچانے کے لئے ہی نہیں بلکہ اپنے بھائی بندوں اور اپنے وطن کی آزادی کی حفاظت کے لئے بھی آگ میں کود گئے۔ ''گٹہِ منز گاش'' میں ان لوگوں کا وجود ہی عنقا ہے، یہ ایک بہت بڑی فروگذاشت ہے، یہ صحیح ہے کہ ناول میں تاریخی حقیقتوں کی تفصیل تلاش کرنا ممکن

نہیں۔ لیکن ناول میں تاریخی حقیقتوں کو جھٹلایا بھی نہیں جاسکتا۔ اگر عزیز اللہ جیسے غداروں نے ملک اور قوم کی آبرو بیچنے کے لئے سب کچھ کیا، تو ایسے نوجوانوں کی بھی کمی نہیں ہے جنہوں نے ملک کی آزادی کو بچانے کے لئے اپنا سب کچھ نچھاور کردیا۔ ''گٹہ منز گاش'' کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے سبھی کردار فرشتے ہیں یا شیطان، انسانوں کی اس پر پرچھائیں بھی نہیں پڑی ہیں۔ اسلئے اس کا ماحول بھی مابعد الطبعیاتی معلوم ہوتا ہے ''گٹہ منز گاش'' کے یہی مافوق الفطرت کردار اس ناول کی سب سے بڑی کمزوری ہیں۔ فاطمہ کے کردار پر کامل صاحب نے غیر معمولی محنت کی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہی کردار پیش کرنے کے لئے یہ سارا ناول لکھا گیا ہے۔ ناول کی ساری کہانی فاطمہ ہی کے گرد گھومتی ہے۔ اس کی روح کی عظمت کو اُجاگر کرنے کے لئے کامل صاحب نے اپنا سارا زورِ بیان اور زور قلم صرف کردیا ہے۔ انہوں نے فاطمہ کے ساتھ ہر وہ خصوصیت وابستہ کی ہے جس کے سزاوار صرف آسمان کے فرشتے ہی ہوسکتے ہیں۔ ابتداء میں وہ اپنے تخیل کی مدد سے فاطمہ کا جو سراپا پیش کرتے ہیں۔ وہ کامل صاحب کے حسن تخیل کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ فاطمہ کی ''عظیم روح'' کی جھلک فاطمہ کے نمودار ہونے سے پہلے ہی دکھائی دیتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مصنف فاطمہ کی عظیم انسانی روح کو پیش کرنے سے پہلے اپنے سامعین کو ذہنی طور تیار کرنا چاہتا ہے اُسے خود اس بات کا احساس ہے کہ ''فاطمہ اتنی بلند، پاکیزہ اور فرشتہ سیرت ہے'' کہ انسانی ذہن اسکے وجود کو آسانی سے تسلیم نہیں کرسکتا، اسی لئے وہ بار بار اس ''عظیم انسانی روح'' کی طرف اشارہ کرتے ہیں، جو فاطمہ کے وجود میں پیش کی جاتی ہے۔

فاطمہ بانڈی پور کے ایک غریب گھرانے کی نوجوان لڑکی ہے جو قبائلی حملہ

سے چند ماہ پہلے ملازمت کے سلسلے میں بارہمولہ چلی جاتی ہے۔ فاطمہ کا تعارف ماسٹر سلام یوں کراتے ہیں:۔

"فاطمہ کم عمر تھی اور غیر شادی شدہ، اور پہلی مرتبہ اپنے گھر سے باہر جا رہی تھی...... فاطمہ بڑی شریف اور باسلیقہ لڑکی تھی، مذہب کی اتنی سخت پابند تھی کہ عمر کے تقاضے کے لحاظ سے حیرت ہوتی تھی۔ جوانی میں پابندی سے پانچ وقت نماز پڑھنا اور صبح شام قرآن شریف کی تلاوت کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔"

فاطمہ سے یوں مختصر تعارف کے بعد بارہمولہ میں ہمیں فاطمہ کے کردار کا مطالعہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔ فاطمہ میں عام لڑکیوں سی کوئی بات نہیں پائی جاتی، وہ ایک سنجیدہ، متین اور بڑی خاموش سی لڑکی ہے۔ نوجوانی میں جو شوخی، ترنگ اور شرارت آمیز حیا لڑکیوں میں ہوتی ہے، وہ اس سے بالکل عاری ہے، وہ سکول جاتی ہے اور سکول سے واپس آکر کھانا پکاتی ہے۔ یہی اس کی کُل کائنات ہے، اس کی سہیلیاں نہیں ہیں اور وہ اپنے ماحول سے مطمئن نظر آتی ہے۔ کبھی کبھی اُسے "رام کرشن" کے گانے اور گنگنانے سے بھی اُلجھن ہو جاتی ہے اور وہ صرف اسی لئے ترکِ مکان کا بھی ارادہ کر دیتی ہے۔ وہ ولی بڈہ کے ذریعہ رام کرشن کو پیغام بھی بھجوا دیتی ہے کہ یوں گاتے رہنا اچھا نہیں لگتا، آخر اس کے پڑوس میں عورتیں بھی رہتی ہیں۔ وہ ایک مرتبہ سنجیدگی سے ولی بڈہ کو دوسرا مکان تلاش کرنے کے لئے کہتی ہے۔ فاطمہ کی زندگی میں کوئی تلاطم، کوئی ہیجان کوئی کشمکش یا اونچ نیچ نہیں، وہ مشین کی طرح کھانا پکاتی ہے اور سکول جاتی ہے۔ پانچ وقت نماز پڑھتی ہے اور صبح شام قرآن شریف کی تلاوت کرتی ہے۔ ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ یہ کیسی لڑکی ہے کہ جسے کوئی اُمنگ، کوئی جذبہ، کوئی خواہش اور کوئی لغزش چھو تک نہیں گئی ہے۔ اس عمر میں

جنسی جذبے کی اُٹھان نوجوان لڑکیوں میں ایک نامعلوم اور عجیب تبدیلی پیدا کر دیتی ہے لیکن فاطمہ کے وجود میں اس تبدیلی کا کوئی اثر نمایاں نہیں ہوتا ہے۔ بارہمولہ کا رئیس زادہ حسہ لال، جو پہلی ہی ملاقات میں الف لیلیٰ کے شہزادوں کی طرح اس پری چہرہ پر دل و جان سے فریفتہ ہو جاتا ہے، جب فاطمہ سے پہلی مرتبہ اظہار محبت کرتا ہے، تو فاطمہ گھبرا جاتی ہے، پریشان ہو جاتی ہے اور رونے لگتی ہے، ایک لمحے کے لئے وہ اپنے کو بھول جاتی ہے۔ اس کے خوابیدہ احساس میں ایک ہلچل سی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسے پہلی بار احساس ہوتا ہے کہ اس کی جوانی اور اس کا حسن کسی مرد کو متاثر بھی کر سکتا ہے، اپنی جوانی کا غرور اسے ایک لمحے کے لئے ......صرف ایک لمحے کے لئے اپنے وجود کا احساس دلاتا ہے۔ لیکن فوراً ہی فاطمہ کے دِل پر گناہ کا احساس غلبہ کرتا ہے اور وہ حسہ لال کو ایک ایسی چھٹی لکھتی ہے، جو صرف فاطمہ لکھ سکتی ہے، دنیا کی کوئی نوجوان لڑکی نہیں لکھ سکتی ہے یہی فاطمہ کی بلندی ہے اور یہی اس کی پستی بھی۔ فاطمہ حسہ لال کو لکھتی ہے کہ میں اور لڑکیوں کی طرح خط و کتابت کرنا پسند نہیں کرتی، میں کنواری ہوں، مجھے اپنے ماں باپ کی عزت کا بہت خیال ہے، اگر آپ واقعی مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں تو میرے ماں باپ کو لکھئے، اگر انہیں کوئی اعتراض نہ ہو، تو مجھے بھی کوئی عذر نہیں ہوگا، مجھے بھی بڑی خوشی ہوگی......" فاطمہ کی عمر کی نوجوان لڑکی ایسا خط نہیں لکھ سکتی، یہ میرا ایمان ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اس خط کو پڑھ کر جلا دے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے، اور اس کا جواب تک دینا بھی گوارا نہ کرے، لیکن وہ اتنا "کتابی" جواب دینا کہاں سیکھے گی، جتنا فاطمہ نے حسہ لال کے خط کے جواب میں لکھا ہے، یہ ناممکن ہے...... لیکن میں نے کہا ہے کہ فاطمہ تو فرشتہ تھی، اُس سے ہر بات ممکن تھی! مجھے فاطمہ کی شرافت،

اس کی مذہبیت اور اس کے بلند کردار پر شک نہیں، لیکن اس کے انسانی کردار ہونے پر شک ضرور ہے۔ جوانی کا اپنا ایک مذہب ہوتا ہے، اور اس کی شرافت کی اپنی قدریں ہوتی ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ فاطمہ کسی سے عشق کیوں نہیں کرتی، یا وہ حسہ لال سے خط و کتابت کیوں نہیں کرتی، لیکن اس کے دل میں وہ جذبات کیوں مفقود ہیں۔ جو ایک اوسط درجے کی نارمل لڑکی میں ہوتے ہیں، جب بچہ اپنی کم عمری میں ہی بزرگی اور پختگی کے آثار ظاہر کرتا ہے۔ تو نفسیات کی اصطلاح میں اس بچے کو Abnormal قرار دیا جاتا ہے۔ فاطمہ ذہنی لحاظ سے Abnormal اور جنسی لحاظ سے Sub Normal ہے۔ وہ ہمارے ماحول کی صحیح نمائندہ قرار نہیں دی جاسکتی ...... فاطمہ کی جنسی نفسیات کا آپ نے مطالعہ کیا، اب اس کی ذہنی پختگی اور اس کا سیاسی شعور ملاحظہ کیجئے۔

جب قبائلی حملہ آور بارہمولہ تک آپہنچتے ہیں اور فاطمہ کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے منگیتر حسہ لال کا باپ عزیز اللہ ان کی رہنمائی کرتا ہے تو وہ فلمی ہیروئنوں کی طرح حسہ لال کو دھتکار دیتی ہے، گولیوں کی بوچھاڑ میں جب حسہ لال فاطمہ کو اپنے گھر لیجانے کے لئے اس کے ہاں آتا ہے تو فاطمہ اسے کہتی ہے کہ میں قبائلیوں کے ہاتھوں مرنا پسند کروں گی، لیکن اس کے گھر میں قدم نہیں رکھوں گی۔

حسہ لالہ اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں خود بھی اپنے باپ کی حرکتوں سے نالاں ہوں مگر کیا کرسکتا ہوں میں اس کا مقابلہ کروں تو وہ جائیداد سے بے دخل کردیں گے...... حسہ لالہ ایک بے عمل اور بزدل نوجوان ہے اور فاطمہ اس کی غیرت اور عزت کو للکارتی ہے لیکن بے سود!

فاطمہ کے کردار میں یہ غیر معمولی تبدیلی کیوں اور کیسے پیدا ہوئی۔ اس کا

سراغ لگانا آسان نہیں۔ اس شریف الطبع اور مذہب کی پابند لڑکی سے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اپنی عزت اور آبرو کو خطرے میں ڈالنے کے لئے تیار ہو جائے اور اپنے منگیتر کے ساتھ جانے کے لئے تیار نہ ہو۔ فاطمہ کے کردار کی یہ رفعت قابل تعریف ہے لیکن ذہن یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا کہ اتنی بڑی تبدیلی آنِ واحد میں آسکتی ہے۔ فاطمہ قبائلی حملہ آوروں کے دوبدو ہو جاتی ہے تو وہ ایک بار پھر اپنی جرأت، ہمت اور بلند نظری کا مظاہرہ کرتی ہے۔ قبائلی جب رام کرشن پر حملہ کرتے ہیں تو وہ فوراً کہہ اٹھتی ہے کہ...... یہ میرا خاوند ہے۔ میں اس کی بیوی ہوں، سمجھے...... یہی ایک سانحہ اس ناول کا کلائمکس قرار دیا جاسکتا ہے اور اسی کی بنیاد پر مصنف نے فاطمہ کے کردار کی بلندی اس کی روح کی عظمت اور ہندو مسلم اتحاد کی روایات کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔

اسکے بعد فاطمہ رام کرشن کی تعریف یوں کرتی ہے "خان! یہ تمہاری طرح حسین نہیں ہے لیکن اس کے چہرے پر انسانیت کا نور ہے۔ اس کے پیچھے انسانی تہذیب کی ہزاروں سالہ تاریخ ہے۔"

یہ سارا واقعہ اپنے اندر بڑی ڈرامائی کیفیت رکھتا ہے فاطمہ جو رام کرشن سے بے پناہ نفرت کرتی ہے، اس مرحلے پر اسے اپنا خاوند بتاتی ہے اس کی زبان سے ایسے مکالمے ادا ہوتے ہیں جو صرف سٹیج پر ادا کئے جاسکتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ اس سارے واقعے کی منطقی توجیہہ کیونکر کی جاسکتی ہے۔ فاطمہ رام کرشن کو اپنا بھائی بھی ظاہر کرسکتی تھی، اس کے رام کرشن کو اپنا خاوند ظاہر کرنے سے کہانی کا کلائمکس تو بن گیا لیکن خود فاطمہ کے کردار میں کئی گرہیں پڑ گئیں۔ فاطمہ کو کشمیری عورتوں کی نمائندہ کردار بنانے کے لئے اس سے یہ مکالمہ بھی ادا کروایا جاتا ہے "ہم جس کو

ایک بار اپنا خاوند کہتی ہیں اس کی رہتی ہیں، ہم کشمیری عورت ہیں"۔

سٹیج پر یہ مکالمے سامعین کو متاثر کر سکتے ہیں، لیکن ایک مسلسل ناول جس کا ایک ارتقاء ہو اور جس کے کردار اپنی ایک انفرادیت رکھتے ہوں، میں اس قسم کے جملے نعرے بازی سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ مان لیجئے کہ فاطمہ نے ایک شدید جذباتی کیفیت میں رام کرشن کو قبائلیوں سے بچانے کے لئے اپنا خاوند کہا۔ اس کو تو کسی حد تک قبول بھی کیا جا سکتا ہے اور اس کی کوئی توجیہہ بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن فاطمہ تو قبائلیوں کے اخراج کے بعد ہندوستانی فوجی افسر سے بھی یہی کہتی ہے کہ "میرے خاوند کو جلانے کا انتظام کیا جائے" وہ اس کے بعد حسہ لال سے شادی کرنے سے انکار کرتی ہے۔ یہی نہیں وہ ہمیشہ کے لئے شادی کا ارادہ ترک کر کے بانڈی پور کے گرلز سکول میں پھر سے پڑھانے لگتی ہے۔ اسے فاطمہ کے کردار کی بلندی کہئے یا اس کے روح کی عظمت، لیکن اسے کشمیری عورت کے کردار کی عکاسی کہنا ایک ناقابل قبول مبالغہ ہوگا۔ میں نے بار بار کہا ہے کہ فاطمہ کے کردار میں کوئی بھی انسانی خصوصیت شامل نہیں ہے، وہ ہر قسم کی انسانی کمزوریوں سے مبرّا ہے۔ وہ بانڈی پور کی پیداوار نہیں، مصنف کے ذہن کی پیداوار ہے، اس کا اپنا کوئی کردار یا نشو ونما نہیں، وہ ناول نگار کے ہاتھوں کا ایک کھلونا ہے۔ وہ جہاں اور جس مرحلے پر چاہے شطرنج کے مُہرے کی طرح اسے رکھ دیتا ہے۔ وہ کٹھ پتلی کی طرح اس کی ہر حرکت اور جنبش کا خالق ہے اور اس لحاظ سے فاطمہ "گٹہ منز گاش" کا کمزور ترین کردار ہے، فاطمہ کے متعلق ایک اور کردار ولی بڈہ کا یہ فقرہ بڑا ہی معنی خیز اور بلیغ ہے۔ "فاطمہ حض چھ سرِ خدا۔ یؤت تام سبٹھاہ کم لوکھ چھ واتان"...... مصنف اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہتا ہے۔ "میانز کنز وؤن نہ غلط کینہہ تہِ" فرشتوں کی اس

کائنات میں دوسرا فرشتہ خود ماسٹر عبدالسلام ہے، جو فاطمہ کی داستان بیان کرتا ہے۔ وہ پہلی ہی ملاقات میں مصنف سے اس قدر گھل مل جاتا ہے کہ چند ہی گھنٹوں کے اندر اندر اُسے اپنی زندگی کی ساری حکایت بیان کرتا ہے۔ وہ خود ہی نہیں بلکہ اس کے بچے بھی کلامِ نادم، پنج گنج اور اسرارِ خودی کا مطالعہ کرتے رہے ہیں۔ وہ اپنے پاگل لڑکے مجید سے بھی بڑے ادب اور تعظیم سے بات کرتا ہے۔ وہ قبائلیوں سے بھی آزردہ یا ناراض نہیں۔ حالانکہ وہ اپنی آنکھوں سے انکی بربریت دیکھ چکا ہے۔ وہ اُن کی درندگی کی بھی توجیہہ کرتا ہے۔ اس کا لڑکا مجید مفقود الحواس ہونے کے باوجود بڑا شائستہ ہے، وہ کوئی بدتمیزی یا بے ادبی نہیں کرتا، صرف اپنی محبوبہ کے بارے میں پوچھتا رہتا ہے۔ ماسٹر عبدالسلام کا گھرانہ ایک دیہاتی گھرانے سے زیادہ شہر کا ایک مہذب اور متمدن گھرانا معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ مصنف کے تخیل کا اعجاز ہے۔ حسہ لال اور ولی بڈہ صرف فاطمہ کے کردار کو نمایاں کرنے کے لئے ہمارے سامنے آتے ہیں، ان کو اپنی کوئی انفرادیت نہیں۔ رام کرشن ہماری زندگی سے قریب تر ہے، لیکن اس کا فاطمہ پر پہلی ہی نظر میں فریفتہ ہو کر ہنسنا، کھیلنا بھول جانا اور اپنی شخصیت میں اتنی بڑی تبدیلی پیدا کرنا الف لیلیٰ کا قصہ معلوم ہوتا ہے۔ رام کرشن اس سنسان اور سنجیدہ ماحول میں ایک Relief کا کام دیتا ہے، اس کے ہاں انسانی کمزوریاں بھی ہیں، حسرتیں بھی اور لغزشیں بھی!

مجموعی حیثیت سے یہ ناول ایک طویل افسانہ ہے۔ اگر ماسٹر عبدالسلام کی داستان سرائی اور مصنف کی حاشیہ آرائی کو نکال دیا جائے، تو اس کہانی کا تاثر زیادہ شدید اور دیرپا ہوگا۔ مصنف نے کہانی کو اختتام تک پہنچانے کے لئے حیرت انگیز، مبالغے سے کام لیا ہے، ولی بڈہ کا ملانا، نازکی صاحب سے فاطمہ کے متعلق مزید

معلومات فراہم کرنے اور پھر فاطمہ کو ماسٹر عبدالسلام کی اپنی بیٹی ثابت کرنا انتہائی غیر ضروری تھا۔ اور پھر ایسا کرنے سے کہانی میں وہ چیز باقی نہیں رہی ہے، جو پڑھنے والے کو بہت دیر تک متاثر رکھتی ہے۔ کہانی کو وہیں ختم ہو جانا چاہیئے تھا۔ جہاں ماسٹر جی نے اسے ختم کر دیا تھا۔ مصنف کی ''تحقیق'' نے کہانی کو صرف ایک تھیسس بنا کر رکھ دیا۔ جس میں شروع سے آخر تک فاطمہ کی ''عظیم انسانی روح'' کے مختلف پہلو پیش کئے گئے ہیں۔ فنی نکتہ نگاہ سے مصنف کا کہانی کی ابتداء میں فاطمہ کے کردار اور اس کے سراپا کا خاکہ پیش کرنا بھی مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس سے پڑھنے والے کو شروع میں ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ فاطمہ کا کردار کیسا اور کیا ہوگا۔

''گٹہِ منز گاش'' کشمیری زبان کا دوسرا ناول ہے۔ کشمیری ادب میں اسکا کیا مقام ہوگا، اس کا فیصلہ آنے والا مؤرخ ہی کر سکے گا، لیکن میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ یہ ادبی اہمیت سے زیادہ اپنی تاریخی اہمیت کے اعتبار سے ہی یاد کیا جائے'' اخلاقیات حب الوطنی، شرافت اور ہندو مسلم اتحاد کے پرچار کے نقطہ نظر سے یہ ناول ایک اچھی کوشش ہے سکولوں اور دیگر تعلیمی اداروں میں اس کی اشاعت ضرور ہونی چاہیئے۔ اپنے موضوع کے اعتبار سے یہ بچوں کے لئے ایک عمدہ اور سبق آموز کہانی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ''گٹہِ منز گاش'' اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود ایک صحت مند اور دلچسپ ناول ہے اور اس کا اثر بچوں پر کافی مفید اور دیرپا ہوگا۔ ادبی اور فنی محاسن کے اعتبار سے یہ ناول کمزور سہی لیکن اپنی افادیت کے لحاظ سے اس کی اہمیت مسلم ہے۔

..........☆☆☆..........

شمیم احمد شمیم

کشمیری ادب اور ادیب

آج تک موجودہ کشمیری ادب کے متعلق ہم نے مبالغہ آرائی بھی کی اور بہت سے ادیبوں کی شان میں قصیدے بھی پڑھے لیکن اب بہت کچھ ہو چکا۔ اب مصلحت کوشیوں کے بجائے صاف گوئی کی ضرورت ہے۔ اس صاف گوئی سے کئی ماتھوں پر بل بھی پڑیں گے، بہت سی تلخیاں پیدا ہوں گی، لیکن وسعتِ قلب کا مظاہرہ کیا جائے تو اختلافات کی بہت کم گنجائش باقی رہے گی۔

کشمیری زبان ابھی تنقید سے نا آشنا ہے۔ ادیبوں کو اپنے فرض منصبی کا احساس دلانے والا اور ادبی کارناموں کو پرکھنے والا کوئی بھی ناقد موجود نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اپنی ابتدائی منزل ہی میں اِس زبان کا ادب مائل بہ پستی ہے۔ ہر وہ شخص جو گلہ اور حسنہ کی بات کرتا ہے، افسانہ نگار ہے اور ہر وہ نوجوان جو چار قافیے جوڑتا ہے، شاعر کہلاتا ہے۔ حالات کی یہی رفتار رہی تو زبان بھی گئی اور ادب کا جنازہ بھی نکل چکا۔

کسی ادبی صنف پر مہارت حاصل کرنے کے بجائے ہمارے ادیب اندھے کی طرح تاریکی میں لاٹھی گھماتے رہتے ہیں۔ ہزار ضربوں میں ایک آدھ

نشانے پر لگی تو اندھے نے نشانہ باز نام پایا۔ نقاد آنکھوں والے ہوتے ہیں۔ جب وہی نہ ہوں تو ادیبوں کو صحیح رُخ کون بتائے اور انہیں گہری کھائیوں میں گرنے سے کون بچائے۔ ہمارے اکثر شعراء ناموزُوں تک بندی میں گرفتار ہیں۔ اِس پر بھی جب انہیں، سنجیدہ ادبی مضامین میں نمایاں جگہ دی جاتی ہے تو انہیں اپنے متعلق غلط فہمیاں پیدا ہونی لازمی ہیں۔ اِس خطرناک رجحان کے نتیجے میں جب ادیب کو سستی شہرت نصیب ہوئی تو اُسے ریاضت کی صعوبتیں برداشت کرنے کی کیا آ پڑی۔

عرب کے مشہور کاذب اشعب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایک روز وہ گھر آیا تو باہر گلی میں کچھ لڑکے دھما چوکڑی مچا رہے تھے۔ سوچا کہ یہ لوگ آرام حرام کریں گے، ان کو کسی طرح سے چلتا کر دینا چاہیئے۔ قریب آکر کہنے لگا "ارے تم یہاں کھیل رہے ہو اور ساتھ کے محلے میں مٹھائی بٹ رہی ہے۔" بچوں نے نعرہ لگایا اور چل پڑے۔ ان کے جانے کے بعد اشعب نے سوچا "شاید بٹ ہی رہی ہو اور خود بھی ادھر کو چل پڑا۔ یہی حال ہمارے ادیبوں کا بھی ہے۔ دوسروں کی خاطر اپنی فرضی بڑائی کے قصے بیان کرتے ہوئے اَب اپنے ہی فرضی قصوں کی صداقت پر یقین کر بیٹھے ہیں اور اس طرح مٹھائی والے محلے کی طرف چل پڑے ہیں۔

تو آیئے آج کی اس صحبت میں ہم کشمیری نثر نگاروں پر ایک نظر ڈالیں، ان میں سے بعض صاحب تصنیف ہیں اور بعض اس "عظمت" سے ابھی تک محروم ہیں۔

علی محمد لون......انہیں غیر ملکی ناولوں اور ڈراموں کا وسیع مطالعہ ہے۔ لیکن یہ سارا مطالعہ ان میں پچھلے پندرہ سال میں صرف تین عدد افسانے اور اِسی قدر ڈرامے لکھنے کی تحریک پیدا کر سکا۔ اوسط کے حساب سے انہوں نے ہر پانچ سال بعد ایک

افسانہ اور ایک ڈرامہ لکھا ہے۔ یہ بات ان کے قلم اور قوت تخلیق کی انتہائی کم مائیگی پر دال ہے۔ ہم تو شاید اس قدر بھی غنیمت جانتے اگر ان کی یہ تخلیقات کسی اعلیٰ معیار کا پتہ دے دیتیں، لیکن اِس کے برعکس ان کے افسانے محض افسانے بن سکے ہیں اور ان کے ڈرامے اور یجنل ہونے کے بجائے غیر ملکی ڈراموں کے چربے، Adaptation ہیں۔ انہوں نے ایک ناول بھی لکھا ہے۔ لیکن ان کا حشر ان دو ناولوں سے کچھ مختلف نہیں ہوا، جو اس سے پہلے اختر محی الدین اور امین کامل نے لکھے تھے۔ اپنی اتنی سی ادبی کائنات کو ذہن میں رکھتے ہوئے لون صاحب ہی خدا لگتی کہیں کہ کشمیری ادب میں ان کے لئے کیا جگہ مخصوص کی جا سکتی ہے؟ پندرہ سال کے عرصے میں جس کا اثاثہ محض تین افسانے ہوں اُسے کشمیری زبان کا کوئی بھلا کرنے کے لئے اور کتنی عمر درکار ہوگی۔

اختر محی الدین......افسانہ اختر سے پہلے بھی تھا اور اس کے بعد بھی ہے لیکن یہ پہلا شخص ہے جس نے اس صنف کو اپنے اظہار خیال کے لئے خاص کر لیا۔ انہوں نے چار پانچ درجن افسانے ضرور لکھے ہیں، جن میں کوئی تین سنجیدہ افسانوں کے زمرے میں اور باقی مزاحیہ ادب کی ذیل میں آتے ہیں۔ ذرا ژرف نگاہی سے کام لیا جائے تو ان کے سنجیدہ افسانوں پر علی محمد لون کے افسانے بھاری ہیں۔

اختر کو ہم مزاح نگار اور ان کی تخلیقات کو مزاحیہ ادب میں شامل سمجھتے ہیں۔ مزاحیہ ادب ایک طاقت ور صنف ادب ہے اور کشمیری زبان میں اس کی شدید کمی ہے۔ ہمارے نقاد مزاحیہ اور سنجیدہ ادب میں امتیاز نہیں کر پاتے ہیں۔ اِس لئے جب وہ اختر کے افسانوں پر نظر ڈالتے ہیں تو انہیں لازماً مایوسی ہوتی ہے اور انہیں

لطیفہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں۔ لیکن یہ اختر اور کشمیری ادب دونوں سے انتہائی زیادتی ہے۔ اختؔر کی تخلیقات کو مزاحیہ ادب کی نظروں سے جانچا جائے تو مایوسی کا سارا پس منظر بدل جائے گا۔ مشہور امریکی وڈہاؤس افسانے لکھنے کے باوجود مزاح نگار کہلائے تو اختر کو کس طرح افسانہ نگار کہا جاسکتا ہے؟ وڈہاؤس کے افسانوں اور اختر کے افسانوں میں سوائے اس کے کہ وڈہاؤس کے مزاح میں طنز وظرافت کا عنصر بھی شامل ہے اور اختؔر میں اس کی کمی ہے؟ اور کیا فرق ہے۔ ان سوالوں کا جواب ہمارے نقادوں کو آج نہیں تو کل ضرور دینا ہوگا اور اسی کے مطابق اختؔر کی صحیح پوزیشن متعین کرنی ہوگی۔

اُمیش کول...... انہیں افسانہ نگاری کے فن پر پوری قدرت حاصل ہے اور اس میں اپنا ایک انفرادی رنگ رکھتے ہیں۔ لیکن انہوں نے بھی کوئی پندرہ سال میں مشکل سے پانچ افسانے لکھے ہیں۔ ان ہی چند افسانوں کو لے کر کشمیری ادب میں اپنے مقام کی فکر میں لگے ہیں۔ علی جواد زیدؔی نے کیا خوب کہا تھا کہ ہر کشمیری ادیب دو افسانے لکھ کر مزید لکھنے کے بجائے کشمیری ادب میں اپنے مقام کی تلاش میں ابدی نیند سو جاتا ہے، جس طرح سوم ناتھ زتشؔی اور نور محمد روشن کب کے سو چکے ہیں۔ یہ کشمیری زبان کی کم مائیگی ہی ہے جو چار افسانے بغل میں دبائے ہوئے ہر ادیب کے لئے اپنی تاریخ کے صفحات پیش کش رکھتی ہے۔ دوسری زبانوں میں سینکڑوں افسانے والے صاحب تصنیف تک اسی حسرت میں دنیا سے رخصت ہوجاتے ہے کہ ان کی تاریخ کے کسی گوشے میں ان کا دوحرفی نام آجائے۔

امین کامل...... یہ ایک ہمہ گیر قلم کار ہے، ایسے ادیب کا جائزہ بڑی ژرف نگاری چاہتا ہے۔ کیوں کہ اس کی شخصیت مختلف خانوں میں بٹی ہوئی ہوتی ہے جن

کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا ہے، لینن کے بقول ہمہ گیر ادیب صاحب فسطائیت ہوتا ہے اور اس کی قوت تخیلہ حد درجہ زندہ و متحرک رہتی ہے جو اپنے اظہار کے لئے مختلف قالب تلاش کرتی رہتی ہے۔ اس لحاظ سے امین کامل وہ سب کچھ ہے جو کشمیری زبان کے سارے ادیب مل ملا کر ہیں۔ اپنے تجزیئے کی سہولیت کی خاطر ہم اس وقت صرف ان کے نثری ادب کو لیں گے۔ انہوں نے ایک ناول لکھا جو بری طرح سے ناکام ہوا۔ شاید اپنی ناکامی کی خفت مٹانے کے لئے انہوں نے اِس کو دن کی روشنی نہ دکھائی۔ ڈرامے میں اگر چہ ان کی خصوصیت ٹیکنیلیٹی اور پلاٹ کی ہے لیکن کوئی ڈرامہ معیاری تو کیا گوارا حد تک بھی ڈرامہ نہ بن سکا۔ البتہ افسانہ نگاری میں انکی اپنی انفرادیت ہے ان کا ہر افسانہ، افسانہ ہے۔ اُن کے افسانے موجودہ دور کی تمام تلخیاں اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ہر افسانہ آخر میں ہمیں ایک کرب انگیز گہری سوچ میں ڈال دیتا ہے۔

بنسی نردوش...... اُن کے متعلق یہ بات عام ہے کہ اُنکے ہر افسانے میں داستان کا رنگ ہے۔ ممکن ہے کہ نردوشؔ اِس سے چڑتے بھی ہوں، کیوں کہ ہمارے ادیبوں کے ذہن میں نہ جانے یہ بات کس طرح سما گئی ہے کہ اگر انہیں افسانہ نگار نہیں کہا گیا تو وہ کچھ بھی رہنے نہیں پاتے، ہم اِسے نردوش کی خوش قسمتی سمجھتے ہیں کہ اگر وہ حقیقی معنوں میں داستان گو ہوتے اور ان کی تخلیقات داستان کا شرف پاتیں...... لیکن افسوس تو یہ ہے کہ وہ داستان گو بھی نہیں ہیں...... وہ تاریکی میں تیر مارتے ہیں۔ جن میں کوئی نشانے پر بیٹھ گیا تو بیٹھ گیا، اور جب کسی کو ان میں افسانہ پن نظر آیا تو وہ کہنے کو کہہ گیا کہ ان میں داستان کا رنگ ہے۔ کسی شاعر کی کہی ہوئی سانیٹ میں اگر چہ سانیٹ کی لوازمات یہاں تک کہ قافیوں کی خاص ترتیب بھی

نہیں تو اُسے سانیٹ کیسے قرار دیا جا سکتا ہے۔ جب افسانے میں افسانہ پن نہیں، افسانے کی لوازمات نہیں تو صاف گوئی سے کام لے کر یہ کیوں نہیں کہا جاتا کہ یہ سرے سے افسانے ہی نہیں ہیں۔ ناحق صفحات کے صفحات سیاہ کردیئے گئے ہیں۔

صوفی غلام محمد...... یہ بھی اپنی طرف سے افسانے لکھتا ہے۔ لیکن جب دوسروں سے سنتا ہے کہ یہ افسانے نہیں بن پائے ہیں تو انہیں خاکہ کا نام دینے لگتا ہے۔ گویا یہ دبی زبان میں خود اعتراف کرتا ہے کہ میں نے تاریکی میں تیر پھینکے تھے۔ خیال تھا کہ نشانے پر لگے ہوں گے۔ اگر نہیں لگے ہیں تو بھی اتنی داد دو کہ ہم نے تیر نشانے پر لگانے کی سعی کی تھی۔ اس ناکام سعی کا نام یار لوگوں نے خاکہ رکھ دیا ہے کیوں کہ یہ ایک وسیع اصطلاح ہے اور اس میں گلہ رحتی کی کوئی بھی بات کوئی بھی پہلو سما سکتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہ دونوں قلم کار اور ان کے ساتھ عباس تابش، غلام نبی بابا (یہ زیادہ تر مزاح لکھتا ہے) تاج بیگم اور دوسرے "افسانہ نگار" کب تک افسانے کے فن پر قدرت حاصل کرنے کے بجائے سستی شہرت کے طلب گار رہیں گے۔ ادیب کی حقیقی زندگی اس کی موت کے بعد شروع ہوتی ہے۔ کاش ہمارے ادیبوں کو اِس بات کا احساس ہوتا کہ وہ صحیح معنوں میں اپنے آپ کی اور کشمیری زبان کی خدمت کرسکیں"۔

(ہفت روزہ "آئینہ" مورخہ ۲۳؍جنوری ۱۹۶۶ء)

...........☆☆☆...........

شمیم احمد شمیم

"آدم چھُ عجب ذات"

(کشمیری اَدب میں رومانوی رجحانات)

"تعمیر" (نومبر، دسمبر ۱۹۵۹ء) میں اختر محی الدین کے ایک کشمیری افسانے "آدم چھ عجب ذات" کی اشاعت نے یہاں کے ادبی حلقوں میں ایک ہل چل پیدا کردی ہے۔ اختر کے کسی افسانے پر آج تک اتنی لے دے نہیں ہوئی ہے بلکہ کشمیری زبان کے کسی افسانے پر آج تک اتنی متضاد، مختلف اور متفرق رائیں قائم نہیں ہوئی ہیں۔ ادبی مجلسوں، نجی گفتگو اور ادیبوں کی غیر رسمی محفلوں میں یہ افسانہ گذشتہ چار مہینوں سے بحث و تمحیص کا موضوع بنا ہوا ہے ابھی تک کچھ لوگ یہ فیصلہ نہیں کر پائے ہیں کہ "آدم چھ عجب ذات" کو موضوع اور تکنیک کے اعتبار سے کشمیری افسانے کی صف میں جگہ دی جائے یا نہیں...... بعض ادبی محتسبوں نے افسانے کو طنز اور تمسخر کا نشانہ بنا کر اس پر سنجیدگی سے بحث کرنے سے گریز کیا۔ کچھ "ترقی پسند" اختر پر رجعت، گریز اور فرار کے الزامات عائد کرکے اپنے فرائض سے سبکدوش ہو گئے اور چند "خدا دوست" بزرگوں نے اختر کے اس افسانے کو فلسفۂ

تصوف کی تفسیر سمجھ کر مصنف کے حق میں دُعائے خیر کی۔ مدیر تعمیر نے ”آدم چھ عجب ذات“ کے متعلق اپنے خیالات کا یوں اظہار کیا...... ”اختر کے اس افسانے کے متعلق صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ ابھی، جب کہ کشمیری افسانے کی عُمر جمعہ جمعہ آٹھ دِن بھی نہیں ہوئی، وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ جب کشمیری افسانہ پختگی کی بہت بہت منزلیں طے کر چکا ہوگا، اُس وقت بھی ”آدم چھ عجب ذات“ کشمیری زبان کے بہترین افسانوں میں شمار ہوگا۔ موضوع اور اسلوب دونوں کے بے باک حسن نے اسے اختر کے فن کا سنگِ میل بنا دیا ہے۔“ (”تعمیر“ نومبر، دسمبر ١٩٥٩ء) علی محمد لون نے اسے اختر کے بہترین افسانوں میں شمار کیا ہے (”انڈین لٹریچر“) نور محمد بٹ نے کہانی کے کرداروں کو غیر فطری قرار دے کر اُن تضادات کی طرف اشارہ کیا ہے جو دو مرکزی کرداروں کے نظریات اور ان کے کرداروں میں پیدا ہو گئے ہیں۔ انہوں نے موضوع کی خوبصورتی کو سراہنے کے باوجود تکنیک اور پیشکش کی کمزوریوں پر زور دیا ہے (”خدمت“ ١٨/اپریل ١٩٦٠ء) شری دینا ناتھ نادم نے ایک نجی گفتگو میں ”آدم چھ عجب ذات“ پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ”اختر حقیقت سے گریز کر کے طلسمات میں کھو گیا ہے۔ امین کامل افسانے میں افسانہ نگار کی شخصیت تلاش کرتے کرتے مایوس ہو گئے اور انہوں نے یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ ”اختر کا نظریہ حسن غیر صحت مند اور ماورائی ہے...... ”غرض کشمیری ادب سے دلچسپی رکھنے والے ہر اہل رائے نے افسانے میں دلچسپی کا اظہار کر کے اپنی پسند یا ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ میں اسے کشمیری زبان اور ادب کے لئے ایک نیک شگون سمجھتا ہوں۔ اختر کے افسانے پر جس ضبط و توازن اور سنجیدگی سے تنقید ہوئی ہے یا ہو رہی ہے اُس سے کشمیری زبان میں تنقید کی اہمیت واضح ہو گئی ہے۔

مجموعی اعتبار سے اختر کے اس افسانے پر اعتراضات کی بوچھاڑ ہوئی ہے۔ علی محمد لون اور محمد یوسف ٹینگ کے تعریفی جملوں کے سِوا کسی اور صاحب نے ”آدم چھ عجب ذات“ کو نہ کشمیری زبان کا بہترین افسانہ مانا ہے اور نہ اختر کا۔ افسانے کے موضوع، تکنیک، زبان اور پیش کش سبھی عناصر پر اعتراضات ہوئے ہیں۔ اور ان اعتراضات کو جناب رحمان راہی نے ایڈیٹر ”تعمیر“ کے نام ایک خط نما مقالے میں بڑی خوبصورتی سے سمیٹا ہے (”تعمیر“ جنوری، فروری ١٩٦٠ء) راہی صاحب نے بڑی وضاحت اور تفصیل سے افسانے کے موضوع، کرداروں، تکنیک اور اس کی زبان پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ انہوں نے تقریباً ہر اُس خامی کی طرف اشارہ کیا ہے جو بقول ان کے افسانے کی ناکامی کا باعث بنی ہے اور جس پر گذشتہ چار مہینوں سے کافی لے دے ہوئی ہے، اس اعتبار سے راہی صاحب کے مقالے کو ان اعتراضات کا خلاصہ بھی سمجھنا چاہیئے اور حاصل بھی، جو کشمیری ادب کے اہل ذوق قارئین نے افسانے پر کئے ہیں۔ میں ان اعتراضات کا مفصل جواب دینے سے قبل جناب راہی صاحب کو ان کے سنجیدہ تنقیدی مطالعے کے لئے مبارک باد دیتا ہوں۔ کشمیری زبان میں یہ پہلا تنقیدی مطالعہ ہے جو زبان اور اسلوب کے لحاظ سے کشمیری تنقید کا اوّلین نمونہ کہا جاسکتا ہے۔ راہی صاحب کے تنقیدی نظریات سے شدید اختلافات کے باوجود میں ان کے استدلال اور طرز بیان کی کیفیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ ان کی اس کاوش نے کشمیری زبان میں تنقید لکھنے کی طرح ڈال دی ہے۔

راہی صاحب کے اعتراضات اور ان کے سیاق و سباق کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اختر کی کہانی ”آدم چھ عجب ذات“ کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کیا

جائے تاکہ وہ لوگ، جو کشمیری زبان سے ناواقفیت کی بناپر یہ کہانی نہ پڑھ سکتے ہوں، بحث کی اصلیت اور اعتراضات کی نوعیت کو سمجھ سکیں۔

رمضانا ایک ہانجی کا لڑکا ہے۔ اس کی تعلیم واجبی ہے۔ وہ کشمیر سے باہر جاکر دُنیا دیکھنا چاہتا ہے۔ اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک پنجرے میں قید ہے اسے حیرت ہوتی ہے کہ ہزاروں میل سے لوگ کشمیر کیوں آتے ہیں، یہاں کیا رکھا ہے؟ دوسری عالم گیر جنگ میں اسے رنگروٹ بننے کا موقع ملتا ہے اور وہ فوج میں بھرتی ہوکر بھاگ جاتا ہے۔ وہ چار سال تک کئی ممالک میں جنگی محاذوں پر کام کرتا ہے۔ اِس دوران میں وہ جب کبھی باپ کو خط لِکھتا ہے تو یہی لِکھتا ہے کہ کشمیر جیسی خوبصورت جگہ میں نے کہیں نہیں دیکھی، باقی ساری دُنیا ایک ویرانے سے کم نہیں۔ چار سال کے بعد جنگ کے خاتمے پر رمضانا واپس کشمیر لوٹا تو اس کی ساری شخصیت بدلی ہوئی تھی۔ اس کے باپ ملہ سبحان کو یوں محسوس ہوا کہ رمضانا کے "دماغ" کو "کچھ" ہوگیا ہے۔ وہ اس "کچھ" کی تشریح یا تفسیر نہ کرسکتا تھا، لیکن اُسے یہ احساس ضرور ہوگیا کہ "کچھ" ہوگیا ہے...... رمضانا کا یہ حال تھا کہ وہ صبح وشام ایک عجیب کیفیت میں رہتا تھا، اُسے کشمیر کے پہاڑوں، یہاں کے سبزے اور جھیلوں سے ایک والہانہ عشق ہوگیا۔ وہ کہتا کہ "عرب، عراق اور مصر کے ریگستان بے جان ہیں۔ کشمیر کی مٹی میں زندگی ہے"، وہ وہاں کے لوگوں کی سنگ دِلی وہاں کی فیکٹریوں اور پختہ سڑکوں کی بے رحمی کا ذکر کرتا، جنگ کی ہولناکیوں اور زندگی کی ارزانی کا ذکر کرتا ......اور اسی کے ساتھ کشمیر کی بے پناہ خوبصورتی اور یہاں کی حیات آفریں فضاؤں کا بھی ذِکر کرتا وہ دِن بھر شکارے میں بیٹھ کر جھیل ڈل میں پانی پر پہاڑوں اور درختوں کے عکس کو دیکھتا رہتا۔ پتوں پر شبنم اور پانی کے تیرتے ہوئے قطروں کو

دیکھتا رہتا......ڈل میں تیرتی ہوئی چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کے پیچھے بھاگتا رہتا ......رمضانا کی ان حرکتوں سے سب لوگوں نے یہی سمجھا کہ رمضانا پاگل ہوگیا ہے۔ ملہ سبحان کو بھی رمضانا کے پاگل پن کا یقین ہوگیا۔ رمضانا اپنے باپ کو ڈل، پہاڑوں اور سبزے کی خوبصورتی کا احساس دِلانا چاہتا تھا۔ اس کے پاس الفاظ نہیں تھے۔ اُسے حیرت ہوتی تھی کہ اس کا باپ اس حسن اور اس خوبصورتی سے متاثر کیوں نہیں ہوتا۔ اس نے کئی بار اُس سمجھانے کی کوشش کی، لیکن الفاظ اس کا ساتھ نہیں دے سکے، اس کے سینے کے اندر جو تلاطم تھا اُسے بیان کرنے کے لئے زبان کی ضرورت تھی۔ رمضانا کے پاس یہ زبان نہ تھی اور وہ اشاروں سے سب کچھ سمجھانا چاہتا تھا، لیکن ملہ سبحان یہ اشارے کیونکر سمجھتا...... ملہ سبحان رمضانا کو پاگل سمجھ کر اُس سے مایوس ہوگیا، تعویز گنڈے سے بھی کام نہ چل سکا۔ تو اس نے اُسے اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ پھر ایک دِن ڈل یخ بستہ ہوگیا، درختوں کے پتے زرد ہوکر گرے، سبزہ سُوکھ کر پژمردہ ہوگیا اور رمضانا نے باحسرت و یاس ملہ سبحان سے پوچھا۔ "وہ سب کیا ہوا؟ وہ سبزہ؟ وہ پانی؟ ملہ سبحان نے رمضانا کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ "سرما کو ختم ہونے دو، سب کچھ لوٹ آئے گا۔" لیکن رمضانا کی بے چین رُوح کیونکر انتظار کرسکتی تھی۔ سرما کی منحوس سرداری وہ کیونکر قبول کرسکتا تھا۔ اور پھر ایک صبح کو رمضانا کی لاش ڈل کے یخ بستہ پانی میں پائی گئی!

اس کے کئی سال بعد کا واقعہ ہے کہ ایک انگریز دوشیزہ ملہ سبحان کے ہاؤس بوٹ، "بٹر فلائی" میں آکر رہنے لگی۔ یہ میم صاحب دِن بھر مصوری میں مشغول رہتیں۔ یا انگریزی شاعری کی کوئی کتاب اُونچے سُروں میں پڑھتی رہتی۔ وہ کیمبرج یونیورسٹی کی طالب علم تھیں اور انگریزی شاعروں میں ورڈز ورتھ اس کا محبوب شاعر

تھا......ورڈز ورتھ، چونکہ پہاڑوں، مرغزاروں اور فطرت کی کرشمہ سازیوں کا شاعر ہے، اسی لئے میم صاحب کو بہت مرغوب تھا۔ میم صاحب بھی پہاڑوں اور مرغزاروں کی تصویریں بنایا کرتی۔ وہ ڈل میں تیرتے ہوئے پتوں پر پانی کے قطروں کی تصویریں بناتی اور جب کبھی ملہ سبحان اُس سے پوچھتا کہ وہ یہ سب کچھ کیوں بناتی ہے تو میم صاحب کہتی کہ "میری ان تصویروں سے اُن لوگوں میں حسن کا احساس پیدا ہوگا جو یہ سب کچھ یہاں آکر نہیں دیکھ سکتے۔" ملہ سُبحان جاننا چاہتا تھا کہ حُسن کا احساس پیدا ہونے سے کیا ہوگا؟ آخر اس کا مقصد کیا ہے؟ میم صاحب بہت کچھ سمجھانے کے باوجود بھی ملہ سُبحان کو کچھ نہ سمجھا سکی۔ ملہ سُبحان کو بار بار یہی احساس ہوتا تھا کہ اے کاش! آج رمضانا زندہ ہوتا تو وہ یہ سب باتیں سمجھ سکتا!

ایک دِن میم صاحب ملہ سُبحان کو ساتھ لے کر شالیمار باغ گئی۔ دِن بھر شالیمار میں تصویریں بنا کر جب وہ باہر آئی تو اِس نے شالیمار باغ کے پیچھے والے پہاڑ کی اُونچی چوٹی پر جانے کی خواہش ظاہر کی۔ چاروناچار ملہ سُبحان اس کے ساتھ ہولیا۔ میم صاحب ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتی ہوئی بلندیوں کی طرف پھلانگ رہی تھی۔ آخرکار چوٹی کے قریب پہنچ کر اس نے ملہ سُبحان کو کہا کہ وہ ایزل لگادے ملہ سُبحان نے ایزل لگادیا، لیکن میم صاحب کی نگاہیں خلاؤں میں کھوگئیں۔ وہ جیسے بڑے انہماک سے کسی کھوئی ہوئی چیز کی تلاش کررہی تھیں، سُورج غروب ہورہا تھا اور شفق کا لالہ زار دُور پہاڑوں پر پھوٹ رہا تھا۔ برف پوش چوٹیوں پر ڈوبتے ہوئے سُورج کی کرنیں پڑرہی تھیں۔ نیرنگئی فطرت کا وہ شاہکار تخلیق ہورہا تھا جس نے میم صاحب کو مبہوت کردیا، میم صاحب کی مسّرت کو حیرت میں بدل دیا۔

وہ ایزل کے پاس آکر اس تصویر کو رنگوں کے امتزاج سے کاغذ پر منتقل کرنے لگی۔ وہ رُک گئی! وہ سوچنے لگی کہ کیا وہ اس وسیع اور اتھاہ حُسن کو ان رنگوں میں سمیٹ سکتی ہے۔ فن کار اپنے فن سے حُسن کی تکمیل کرتا ہے، مگر یہ وُسعت، یہ سلیقہ اور یہ حُسن؟ کیا وہ اس میں کسی قسم کا اضافہ کرسکتی ہے؟ نہیں، وُہ ایسا نہیں کرسکتی۔ ایسا کرنے کی کوشش بھی اس حُسن کی توہین ہوگی۔ وہ سوچتے سوچتے بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ اِسے یُوں محسوس ہورہا تھا کہ وہ اس سارے پھیلے ہوئے حُسن کا ایک حصہ ہے، اس کا ایک جز ہے اور اگر وہ ذرا بھی حرکت کرے تو اس حُسن کا سارا میزان سلیقہ اور ترتیب درھم برھم ہوکر رہ جائے گا۔ میم صاحب کو اس حالت میں دیکھ کر ملہ سُبحان نے اُسے "میم صاحب" کہہ کر پکارا۔ میم صاحب کو اپنے وجود کا احساس ہوا اور وہ اپنے آپ سے یُوں ہم کلام ہوئی۔۔۔ "افسوس کہ اس منزل پر میرا کوئی رہبر نہیں، یہاں ورڈز ورتھ اور وان گاگ بھی نہیں پہنچ سکتے"

ملہ سُبحان کو رمضانا یاد آیا۔۔۔۔ اُدھر میم صاحب خود کلامی میں مصروف تھی۔ "دو ہی راستے ہیں، یا تو یہ سارا حُسن سمیٹ کر اپنی رُوح کے ساتھ ہم آغوش کیا جائے یا اپنی رُوح کو آزاد کر کے اس سارے حُسن میں تحلیل کردیا جائے۔۔۔۔"
میم صاحب نے دُور پہاڑوں کی ایک چوٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ملہ سُبحان سے پُوچھا کہ اس چوٹی پر کوئی رُوح ہوگی؟ ملہ سُبحان نے کہا کہ وہاں پر تو نہیں، ہاں کوہِ سلیمان کی چوٹی پر ایک رُوح ضرور ہے، میرے بیٹے رمضانا کی رُوح۔۔۔ اور اس کے بعد اس نے میم صاحب کو رمضانا کی ساری رُوئداد سُنائی، اور میم صاحب کو یُوں محسوس ہوا کہ کوئی بہت بڑی مُشکل حل ہوگئی ہے۔ جسم کے پنجرے سے رُوح کو آزاد کر کے اس سارے حُسن میں تحلیل کرنا ہی زندگی ہے۔ میم صاحب نے چوٹی

کی بلندی سے چھلانگ مار کر اپنی رُوح کو قفسِ عنصری سے آزاد کر دیا۔

میم صاحب کی موت نے ملہ سُبحان کے لئے کسی بڑے عقدے کا حل پیش کر دیا۔ وہ بار بار یہی کہتا تھا کہ آج ساری حقیقت کھل گئی (آج بات کا شل نِکل گیا) اس نے یہ کہہ کر جج کو سب کچھ سمجھانا چاہا کہ آج بات کا شل ''نِکل گیا، مگر جج کچھ نہ سمجھ سکا۔ اس لئے ملہ سُبحان کو ساری رُوئداد سُنانا پڑی۔ ملہ سُبحان کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ رمضانا، میم صاحب اور وُہ خود ایک سلسلے کی کڑی ہیں، وہ یہ فیصلہ نہ کر پاتا تھا کہ میم صاحب اس کی بیوی ہے، بہُو ہے یا اس کی اپنی بیٹی!

میں نے ذرا تفصیل سے افسانے کا خاکہ پیش کیا ہے۔ اس تفصیل کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ ''آدم چھُ عجب ذات'' میں پلاٹ کو اتنی اہمیّت حاصل نہیں ہے جتنی ماحول اور فضا کو، بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ افسانہ پلاٹ سے نہیں بلکہ ماحول اور فضا (Atmospher) سے تشکیل پاتا ہے، اِسی لئے افسانے کا لُب لباب پیش کرنے کے باوجود میں مطمئن نہیں ہوں کہ میں پڑھنے والوں کو افسانے کے موضوع اور اس کے کرداروں کی نفسیات کی باریکیوں سے آشنا کرنے میں کامیاب ہوا ہوں، کیونکہ اس قسم کے افسانے میں جُزئیات اپنے اختصار کے باوجود غیر معمولی اہمیت رکھتی ہیں اور کہانی کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے مجھے ان جُزئیات کو نظر انداز کرنا پڑا ہے اور بہر کیف اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے میں کوشش کروں گا کہ میں فضا اور ان جُزئیات کو بھی پیش کر سکوں۔ جن سے افسانے میں ایک لطیف کیفیت اور غیر معمولی تاثر پیدا ہوا ہے۔

''آدم چھُ عجب ذات'' کے ناقدین اور معترضین نے اپنے تجزیے کی ساری عمارت ایک غلط بُنیاد پر قائم کی ہے اور جب ''خشتِ اوّل'' ہی کج ہو تو دیوار

کی ''کجی'' ایک منطقی نتیجہ بن جاتی ہے۔ شاعری، ناول، تنقید اور ڈرامے کی طرح افسانوں کو بھی موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے کئی حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ شاعری کو غزل، مثنوی اور قصیدہ کے علاوہ کلاسیکی، رومانوی اور تصوّف کی شاعری کے مختلف عنوانوں کے تحت بھی تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اِسی طرح ناول کو بھی سیاسی، تاریخی اور رومانی ناول کہا جاتا ہے، تنقید کے لئے بھی تاثراتی تنقید اور سائنسی تنقید کی دو مختلف اصطلاحیں وجود میں آئی ہیں۔ ڈرامے کی تقسیم بھی موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے کی جاتی ہے، بالکل اسی طرح افسانے کو بھی اپنے موضوع اور اسلوب کی بنا پر نفسیاتی، رومانی یا اصلاحی کہا جا سکتا ہے جس طرح ایک تاریخی ناول کو اِصلاحی ناول کے معیاروں پر جانچنے سے غلط نتائج برآمد ہوں گے۔ اسی طرح ایک رومانوی افسانے کو حقیقت نگاری کے مقررہ معیاروں پر پرکھنے سے گمراہ کُن نتائج اخذ کئے جانے کا اندیشہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سائنسی تنقید کی اساس عقلیت، توازن اور پُختہ سماجی شعور پر ہے، لیکن ہر صنف ادب کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے۔ اور اس مزاج کی اصلیت اور اس کے عناصر ترکیبی اور اس کی کیفیت سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ نقاد اپنے شعور کو فن کار کے شعور سے ہم آہنگ کر دے۔ اور اپنے نظریے کو فن کار کی نظر سے ہم آغوش کر دے...... جناب رحمان راہی نے ''آدم چھُ عجب ذات'' کے تجزیے میں یہی بُنیادی غلطی کی ہے۔ انہوں نے ایک رومانوی افسانے کو مروّجہ حقیقت نگاری کے اصولِ نقد پر پرکھ کر اپنے نظریات کو اختر کی ''نظر'' پر مسلّط کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے ''آدم چھُ عجب ذات'' کے مطالعے میں اہل نقد نے یہی ٹھوکر کھائی ہے۔---- ''آدم چھُ عجب ذات'' کے رومانوی کردار کو کشمیری زبان کے اہل نظر اور صائب الرائے نقادوں نے

کیونکر نظر انداز کیا۔ یہ سمجھنے کے لئے کشمیری ادب کے تاریخی پس منظر پر ایک نظر کرنا ضروری ہے، لیکن ایسا کرنے سے پہلے یہ واضح کردینا ضروری ہے کہ رومانیت سے میری مُراد کیا ہے؟

لُغوی اعتبار سے رومان، عشق و محبت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، لیکن میں رومانیت کی اصطلاح ایک تحریک، اندازِ فکر اور ایک مخصوص دَور کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ انگریزی اور اُردو ادب میں رومانوی تحریک کلاسیکیت کے مروّجہ ضابطوں اور اصولوں کے خلاف احتجاج کے طور پر پیدا ہوئی۔ رومانوی ادیبوں نے عقلیت، توازن، تقلید اور میانہ روی کی بُنیادی قدروں کو اپنے پاؤں کی زنجیریں سمجھ کر انہیں توڑنے کی کوشش کی۔ وہ بنے بنائے سانچوں کو توڑ کر فضا میں پرواز کرنے لگے، ان کے نزدیک انسانی جذبات کو عقل کے تابع بنا کر مطلق اصولوں پر کاربند رہنا انساں کی خودی اور اس کی عظمت کے منافی تھا۔ ڈاکٹر محمد حسن نے رومانوی ادیبوں کے اندازِ فکر کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

"رومانوی ادیب کے نزدیک نقل محض چیزوں کی ظاہری شکل وصورت اور ترتیب سمجھنے میں مدد دیتی ہے لیکن ان کی ماہیت تک نہیں پہنچنے دیتی۔ ہمیں ان میں ماورائی حقیقت کا پرتو نہیں دکھاتی، جو ان کے اندر ایک نئی تابنا کی پیدا کرتی ہے۔ اس کے نزدیک عقل چراغ راہ گذر سے زیادہ نہیں اور جذبات اور وجدان ہی وہ آگ پیدا کرتے ہیں جو کائنات کو نئے اُجالوں سے روشناس کرتی ہے۔ عقل کی رسائی محض حقیقت کے ایک جزو تک ہوتی ہے اور اس لحاظ سے وہ اس کے اصول وضوابط بناتی ہے۔ حسن کو قاعدوں اور زاویوں میں اسیر کرتی ہے اور اصل روح کو فراموش کردیتی ہے"۔

(اُردو ادب میں رومانوی تحریک) اسی اندازِ فکر نے ادب میں ایک پوری تحریک کو جنم دیا اور بعض دیو قامت ادبی شخصیتیں بڑی مدّت تک رومانویت کی زُلف گرہ گیر کی اسیر رہیں۔ "رومانیت" کا عنصر یوں تو ہر ادیب کی ادبی تخلیقات میں موجود ہوتا ہے اور وہ ادیب بھی، جو رومانوی تحریک سے قبل یا بعد گذرے ہیں، اپنی پروازِ فکر میں کبھی نہ کبھی رومانویت کی فضاؤں میں آنکلے ہیں، لیکن ایک ادبی تحریک کی حیثیت سے یورپ میں یہ تحریک انقلاب فرانس کے دَور میں ہی منظّم ہوگئی۔ اور اُردو میں اس کا آغاز بیسویں صدی کے اوائل سے ہوتا ہے۔

اردو ادب میں رومانوی تحریک کے علم برداروں میں اقبالؔ کے ساتھ ساتھ ابوالکلام آزاد، سجاد حیدر یلدرم، مہدی افادی، اختر شیرانی، نیاز فتح پوری، حفیظ جالندھری اور جوش ملیح آبادی بھی شامل ہیں۔ ان سب کے ہاں فضا میں پرواز کرنے کی شدید خواہش، مروجہ دستوروں کی گرفت سے آزاد ہونے کی کشمکش، بنے بنائے سانچوں کی توڑ پھوڑ کر رکھ دینے کا جذبہ، فطرت سے بے پناہ اور والہانہ عشق کی کیفیت اور جنس کا ایک ماورائی تصور ملے گا! ڈاکٹر محمد حسن نے رومانوی ادیبوں کے رُجحانات کی تشریح کرتے ہوئے لکھا۔ "جذباتی آسودگی کی خواہش انہیں تصورات کی دُنیا میں محو کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ وہ ایک ماورائی دُھند میں کھو جاتے ہیں اور ستاروں پر اِتنی دیر نظریں جماتے ہیں کہ کرۂ ارضی فراموش ہوجاتا ہے۔ تہذیب کے شکنجوں سے تنگ آ کر نیچر کی پرستش کرتے ہیں اور سادگی اور معصومیت کے گیت گاتے ہیں، جہاں انسان کی پرداخت تمام تر عقل اور علم کے نہیں، فطرت اور جذبات کے ہاتھ میں ہو......" کم وبیش اور کسی نہ کسی رنگ میں یہی رُجحان آپ کو ہر رومانوی ادیب اور شاعر کے ہاں نظر آئے گا۔

ادب میں رومانوی تحریک کی تاریخ اور تجزیہ اس وقت میرا موضوع نہیں۔ لیکن اس کا سرسری ساذکر کرنا اس مرحلے پر میرے لئے ناگزیر ہوگیا ہے، اس لئے کہ ''آدم چھ عجب ذات'' کے رومانوی کردار کو واضح کرنے کے لئے یہ بیان بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ میں اس سے پہلے کہہ چکا ہوں کہ کشمیری ادب کے نقادوں نے اس افسانے کو حقیقت نگاری کے مروجہ اصولِ نقاد اور معیار پر پرکھ کر کچھ گمراہ کُن فتویٰ صادر کر دئے ہیں۔ اختر کا زیر بحث افسانہ چونکہ کشمیری زبان کا پہلا عظیم رومانوی افسانہ ہے، اس لئے اس کے تجزیے میں سب نقادوں نے یہ بنیادی غلطی کی ہے۔ یہ اجتماعی فروگذاشت ادبی رومانیت کی تحریک اور تاریخ سے ناواقفیت کی وجہ سے سرزد ہوئی ہے۔ کیونکہ کشمیری ادب کی تاریخ میں رومانویت بہ حیثیت تحریک یا مکتبہ فکر کے کبھی نہیں اُبھری ہے۔ انگریزی ادب کی طرح اُردو میں بھی کلاسکیت رومانویت اور حقیقت نگاری کی تحریکیں ایک دوسرے کے ردِّعمل کے طور پر پیدا ہوتی رہیں۔ کشمیری ادب کے کلاسیکی دَور پر اُردو سے زیادہ فارسی زبان کا اثر نمایاں ہے۔ اس دَور کے متقدمین رسول میر، محمود گامی، وہاب کھار، مقبول کرالہ واری اور ان کے ہم عصر شعراء پر اردو کے مقابلے میں فارسی کا رنگ زیادہ گہرا ہے۔ مہجور کی ابتدائی شاعری میں بھی فارسیت کا یہ غلبہ واضح طور نظر آئے گا، لیکن ان کے ہاں رفتہ رفتہ زبان فارسی کے اثر سے آزاد ہوکر نِکھر نے لگی اور کشمیری زبان نے براہِ راست اُردو ادب کی تحریکات سے متاثر ہونا شروع کر دیا۔ دَورِ قدما کے شعراء چوں کہ اُردو زبان سے ناواقف تھے۔ اس لئے ان کے لئے اردو ادب کے رُجحانات سے متاثر ہونا ممکن ہی نہیں تھا۔ فارسی ادب کے رُجحانات اور تحریکات سے تاثر قبول کرنے کا اس لئے سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کہ ایران اور کشمیر کے درمیان براہِ راست کوئی ثقافتی

تعلق قائم نہیں تھا۔ اسی لئے کشمیری شاعری کا کلاسیکی دَور، جو رسول میر سے مہجور تک پھیلا ہوا ہے، کسی بڑی تبدیلی، غیر معمولی رُجحان یا کسی منظم ادبی تحریک کے نشوونُما کے لئے موزوں اور سازگار نہیں تھا۔ مہجور کے ہاں سب سے پہلے تبدیلی کا یہ احساس واضح طور پر اُبھرتا ہے۔ مہجور چونکہ اُردو سے خاصی واقفیت رکھتے تھے، اس لئے ان کے ہاں اُردو کے ادبی رُجحانات کا اثر بھی نظر آئے گا۔ یہ اثر ان کے ہم عصر آزاد کے ہاں زیادہ واضح صورت میں نظر آتا ہے۔ تحریک حریت کے آغاز سے کشمیر اور ہندوستان کے درمیان ایک گہرا ربط اور تعلق پیدا ہوگیا تھا اور اس طرح ہندوستان کی سیاسی تحریکوں، ادبی میلانات اور اس نوع کی دوسری تبدیلیوں نے کشمیری عوام اور یہاں کے فن کاروں کو براہِ راست متاثر کر دیا۔ ۱۹۳۸ء میں ترقی پسند مصنفین کے قیام سے اُردو ادب میں رومانوی تحریک کا اثر کم ہوکر حقیقت نگاری کا ادبی نظریہ مقبول ہو رہا تھا۔ مہجور اور آزاد کے ہاں رومانویت کا عنصر ضرور نظر آتا ہے، لیکن اس رومانویت کی جڑیں آپ کو اسی زمین میں نظر آئیں گی، وہ ستاروں پر نظریں ضرور جماتے ہیں، لیکن اتنی دیر نہیں کہ کرہ ارض کو فراموش کر دیں۔ ان کے ہاں رومان اور حقیقت کا بڑا ہی حسین سنگم نظر آئے گا۔ مہجور کے مقابلے میں آزاد کے ہاں انقلابی رومانیت کے عناصر زیادہ واضح اور ٹھوس شکل میں ملتے ہیں، کیونکہ وہ اقبال سے بے حد متاثر تھے، لیکن تحریک حریت کشمیر سے وابستگی اور قربت کی بنا پر وہ خالص رومانوی شاعر ہونے سے بچ گئے۔ اس طرح کشمیری ادب میں رومانویت بہ حیثیت تحریک کے پروان نہیں چڑھ سکی۔ جب اُردو ادب میں رومانویت کا زور تھا، ہمارے ہاں کے شاعر کلاسیکی روایات سے گہری وابستگی اور اُردو کی ادبی تحریکات اور رُجحانات سے ناواقفیت کی بنا پر رومانویت سے متاثر نہیں ہو سکے۔ اور جب

کشمیری شاعروں نے براہِ راست اُردو کی ادبی تحریکات سے متاثر ہونا شروع کیا تو اُردو ادب میں چھا گیا تھا، اس لئے کشمیری ادب میں رومانیت ایک طرزِ فکر یا تحریک کی صورت میں کبھی ظاہر نہیں ہوئی۔ مہجور اور آزاد کی حقیقت پسند رومانیت کا اثر شاید کچھ دیر قائم رہتا۔ لیکن اکتوبر ۱۹۴۷ء میں قبائلی حملے نے انقلابی حقیقت پسندی کے رُجحانات کو فروغ دیا۔ اور مارکسی حقیقت نگاری ہمارے ادب کا ''دستورِ اساسی'' بن کر رہ گئی۔ دینا ناتھ نادم، رحمان راہی، امین کامل، نور محمد روشن، غلام نبی فراق سے لے کر پریم ناتھ پردیسی اور مولانا محمد سعید مسعودی تک رجز گانے میں مشغول ہوگئے۔ انگریزی اور اردو ادب کی روایات اور تاریخ کے برعکس کشمیری ادب میں صرف کلاسکیت اور حقیقت نگاری کے نظریات کو ہی فروغ ملا۔ اور یہی وجہ ہے کہ ۱۹۵۹ء میں اختر کے رومانوی افسانے نے کشمیر کے صائب الرائے نقادوں اور اہل نظر فن کاروں کو ''پریشان'' کردیا ہے کہ اس افسانے کو کیونکر افسانہ کہیں اور اس کے موضوع، اسلوب اور کرداروں کے ساتھ کیا ''سلوک'' کیا جائے۔
رومانوی ادب کی روایات اور تاریخ سے ناواقفیت کی بناء پر انہوں نے اس افسانے کو حقیقت نگاری اور (غیر شعوری طور ان کے ذہن اب بھی مارکسی حقیقت نگاری کے طلسم میں اسیر ہیں) کے زاویوں سے پرکھ کر اسے ایک مُبہم اور نابالغ تصور قرار دیا۔ اس کے کرداروں کو غیر فطری اور مخبوط الحواس قرار دیا۔ اختر کے نظریۂ فن اور حسن کو غیر صحت مند قرار دیا۔ میں ان ناقدوں کے خلوص پر شبہ کرنے کی جرأت نہیں کروں گا، لیکن ان کے تاریخی شعور پر اعتماد کرنے میں تامل ضرور کروں گا!

میرے اس بیان سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جانا چاہیئے کہ میں ادبی رومانیت کا دِل دادہ ہوں یا یہ کہ میں رومانوی تحریک اور ادیبوں کا پرستار ہوں یا میں کشمیری ادب میں

رومانوی مکتبۂ فکر کو فروغ دینے کا خواہش مند ہوں۔ میں نے صرف کشمیری ادب میں رومانوی تحریک کے عدم وجود کا تاریخی تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ جس طرح قصیدے کو غزل اور داستانِ امیر حمزہ کو منشی پریم چند کے ناولوں کے معیار سے پرکھنے کی کوشش غلط اور گمراہ کُن نتائج کی حامل ہوسکتی ہے۔ اسی طرح ایک رومانوی افسانے کو منطق، عقلیت اور وکیلانہ استدلال کی کسوٹی پر نہیں پرکھا جاسکتا۔ رومانوی ادب کی کچھ اپنی روایات ہیں اور اسے جانچنے کے لئے ان روایات سے آنکھیں بند نہیں کی جاسکتیں۔ میں ذاتی طور پر ادب میں رومانویت کے رُجحان کو مستحسن نہیں سمجھتا۔ میرے نزدیک اعلیٰ ادب رومان اور حقیقت کا سنگم ہوتا ہے۔ نری رومانیت یا نری حقیقت نگاری بجائے خود ادب نہیں بن سکتی۔ ''آدم چھُ عجب ذات'' کے پس منظر، اس کے موضوع اور اس کے اسلوب میں ایک ایسی دِل کشی ہے کہ اپنے رومانوی کردار کے باوجود میں اسے اختر کے رومانیت میں تخیل کی پرواز ضرور ہے لیکن یہ پرواز ہمیں خلاؤں میں نہیں لے جاتی بلکہ گہرائیوں میں دیکھنے کی ترغیب دیتی ہے۔ وہ ستاروں کے جانب تو دیکھتے ہیں، لیکن اتنی دیر تک نہیں کہ کرہ ارض کو فراموش کردیں۔ اگر ''آدم چھ عجب ذات'' ناقدین ادب میں رومانوی رُجحانات کی ترویج کے خلاف آواز بلند کرتے تو شاید میں بہت دُور تک ان کے ہمراہ جاتا، لیکن انہوں نے افسانے کے کرداروں کو منطق، عقلیت اور نفسیات کے اُن میکانکی اصولوں سے جانچنے کی کوشش کی ہے جن پر دُنیا کا کوئی ادب پارہ اپنی ''ادبیت'' کو محفوظ نہیں پائے گا۔

بعض دوست یہ اعتراض کریں گے (اور ستم ظریفی یہ کہ نقادوں میں سے کسی نے یہ اعتراض نہیں کیا ہے) کہ کلاسکیت سے رومانویت کی طرف پرواز

کرنے کی تو توجیہہ کی جا سکتی ہے لیکن حقیقت نگاری سے لوٹ کر رومانویت کو اپنانے میں کیا تک ہے، کیا یہ فن کار کی ترقی معکوس نہیں؟ اس اعتراض میں کچھ وزن ضروری ہے اسی لئے میں اس ''ترقی معکوس'' کے تاریخی اسباب پر کچھ روشنی ڈالوں گا۔

ڈاکٹر محمد حسن نے رومانویت کو اُس اصول پرستی' عقلیت اور میانہ روی کے خلاف صاعقہ بردوش بغاوت قرار دیا ہے، جس نے زندگی اور حسن کو چند گنے چنے محدود دائروں میں اسیر کر لیا تھا۔ کلاسیکیت عقلیت کا نشان تھی، جذبات کو یہاں ثانوی اور بعض حالات میں کوئی حیثیت ہی حاصل نہ تھی۔ رومانوی ادیبوں نے عقل کے اس آمریت کے خلاف بغاوت کی آواز بلند کی۔

......''رومانیت اسی طاقت ورانا اور زبردست خودی کی مظہر ہے جو پرانے مسلمات کو رد کرتی ہے اور دُنیا کو اپنے جذب وشوق کے سانچے میں ڈھالتی ہے۔......''

(اُردو ادب میں رومانوی تحریک) جس طرح کلاسیکیت کا بُت توڑنے کے لئے رومانوی ''سرفروشوں'' نے اپنا خون دیا تھا، اسی طرح رومانوی ''ہوابازوں'' کو زمین پر اُتارنے کے لئے حقیقت پسندوں نے بھی ایک زبردست جنگ لڑی ہے۔ رومانوی بغاوت جو عقلیت اور اصول پرستی کا ردعمل تھی، بہت جلد بے راہ روی اور بے اصولی کا مظہر بن گئی اور اسی لئے حقیقت نگاروں کو منظم ہو کر پھر زندگی اور ادب کے کچھ ضابطے، اصول اور راہیں متعین کرنا پڑیں۔ اتفاق سے زندگی اور ادب کے یہ ضابطے متعین کرنے کا کام مارکسی حقیقت نگاروں کے ہاتھوں میں پڑ گیا......اور ان آئین سازوں نے' جو مارکسی زیادہ تھے اور حقیقت نگار کم، ادب اور زندگی کے وہ آداب مقرر کئے کہ زندگی سمٹ کر ''ضابطۂ فوج داری'' ہو کر رہ گئی۔ اس ضابطے کا

کشمیری ادب اور کشمیری ادیبوں کی زندگی پر ۱۹۴۷ء کے بعد جس شدت سے اطلاق ہوا، شاید ہی ملک کے کسی اور حصے میں ہوا ہو۔ ادب میں افادیت سماجی پس منظر، عقلیت اور توازن کا مطالبہ اس طور سے ہونے لگا کہ ادب، ادب نہیں، بلکہ چند مخصوص آداب کے التزام کا نام ہو کر رہ گیا۔ عوامی ادب کے نام پر ادیبوں سے وہ تقاضے ہونے لگے کہ ادیب کی آزادی، انفرادیت اور شخصیت دب کر رہ گئی۔ ۱۹۵۳ء کے بعد کلچرل کانگریس کے نام سے ایک نیم سرکاری انجمن وجود میں آئی اور ادبی احتساب کا کام زیادہ منظم طور ہونے لگا۔ کلچرل کانگریس سے گہری وابستگی کی بنا پر مجھے معلوم ہے کہ کس طرح ادیبوں کی ایک پوری نسل کو مارکسی نظریات کا تابع بنا کر ان کی انفرادیت کو مجروح کر دیا گیا۔ جب کبھی کوئی شاعر یا افسانہ نگار اپنی تخلیق پیش کرتا تو اس پر اس انداز سے تنقید ہوتی...... ''کیا اس میں افادیت ہے یا نہیں؟ کیا یہ ادب پارہ سماج کو آگے بڑھانے میں مدد دے سکتا ہے یا نہیں؟ اس میں سرمایہ داری کے موجودہ استحصالی نظام کے خلاف ناپسندیدگی کا جذبہ ہے یا نہیں ؟ کیا یہ ادب برائے زندگی کے تمام تقاضے پورا کرتا ہے یا نہیں؟''......اس نوعیت کی تنقیدی جراحی کے بعد محتسبوں کی طرف سے یہ فیصلہ صادر ہوتا تھا کہ یہ ادبی تخلیق صحت مند ہے یا غیر صحت مند۔ ظاہر ہے کہ ان پابندیوں کا التزام کرتے ہوئے فن کار کو کتنی مرتبہ اپنی رُوح کو مجروح کرنا پڑتا تھا......یہ ادبی محتسب کون تھے؟ اس منصب پر ہم سب فائز تھے۔ دینا ناتھ نادم، رحمان راہی، عزیز ہارون، اختر محی الدین اور پران ناتھ جلالی سے لے کر اکبر لداخی تک سب لوگ ادب برائے زندگی کی روایات کو سینے سے لگائے زندگی کا ''تحفظ'' کر رہے تھے۔ میں نے بارہا ادیبوں پر اس قسم کے تنقیدی حملے کئے ہیں۔ (میں نے اُن دِنوں غالب کی شاعری

کوفضولیات کا پلندہ ثابت کرنے کے لئے ایک طویل مقالہ بھی لکھا تھا) اور جن سرکشوں نے ادب اور زندگی کے ان محافظوں کے تئیں اپنے ماتھے پر شکن لائی کہ ان کے خلاف ''ایوان بالا'' میں شکایت کی جاتی اور وہ عنایتوں سے محروم کردئے جاتے! زندگی پھر چند خانوں میں بٹ کر محدود ہوگئی تھی۔ ادب ریلوے ٹائم ٹیبل کی طرح خالص افادی ہوکررہ گیا تھا۔ ادب ''حقیقت نگاری'' کے جھانسے میں آکر مارکسی مبلغ ہوکررہ گئے......اور یہ صورت حال بہت دیر تک قائم رہی!

رفتہ رفتہ ''حقیقت نگاری'' کا طلسم ٹوٹنے لگا۔ اس مخصوص عقلیت اور پابندی آداب کے خلاف بغاوت کے آثار نمودار ہوگئے جس نے زندگی کو ''بحرِ بیکراں'' سے ''جوئے کم آب'' بنادیا تھا۔ کلچرل کانگریس ٹوٹ گئی۔ رحمان راہیؔ، امین کاملؔ اور اخترؔ محی الدین بھی Disillusion ہوگئے۔ بظاہر ادیبوں کا شیرازہ بکھر گیا، لیکن درحقیقت ان کی زنجیریں کٹ گئیں...... حقیقت پسندی کے خلاف ایک ردِ عمل پیدا ہوگیا اور شاعروں کے ہاں یہ ردِعمل ایک لطیف رومانویت کی شکل اختیار کر گیا۔ راہیؔ، کاملؔ، فراقؔ اور خودنادم کے ہاں یہ رومانیت ایک مخصوص لب ولہجے کے ساتھ نظر آئے گی۔ ان کے ہاں کی رومانیت بغاوت کی شکل میں نہیں بلکہ ایک فطری ردِعمل کے نتیجے کے طور پر پیدا ہوئی ہے اور یہ ردِعمل اُس نظامِ فکر کے خلاف ہے جس نے ادیبوں کو سیاسی مبلغوں کے طور پر استعمال کرکے اُن کی شخصیت اور آزادی کو غصب کرنا چاہا۔ کشمیری نثر کی تاریخ بہت مختصر ہے اور ابھی تک نثر کی ایک ہی صنف یعنی صرف افسانہ ہی معرضِ وجود میں آیا ہے اور اس کا سہرا اخترؔ محی الدین کے ہی سر رہے گا کہ اس نے افسانے کی صنف کو سنجیدگی سے اپنا کر کشمیری ادب میں کچھ قابل قدر اضافے کئے۔ ''آدم چھُ عجب ذات'' اس بغاوت کا بے باک

ترجمان ہے جو بنے بنائے مفروضوں اور نظریاتی کلیوں کے خلاف ایک عرصے سے شعوری اور غیر شعوری طور کشمیری فن کاروں میں پرورش پارہی ہے۔ انسانی ذہن اور نفسیات کی گتھیوں کو حل کرنے کے لئے جو میکانکی فارمولے مرتب کئے گئے ہیں اُن کے کثرتِ استعمال نے ان فارمولوں کو غلط ثابت کردیا ہے۔ ''آدم چھُ عجب ذات'' دراصل ان غلطیوں کا اعتراف ہی نہیں، ان نظریوں کے خلاف احتجاج بھی ہے۔ سماجیات، عمرانیات اور اقتصادیات کے اصول مسلم، لیکن یہ ''زندگی کرنے کے گر ہیں، بجائے خود زندگی نہیں ہیں۔ انسانی زندگی کا معمہ اس سے کہیں زیادہ پُر اسرار پیچیدہ اور حیرت انگیز ہے، جتنا اقتصادیات کے ماہرین اور فلسفی سمجھتے ہیں۔ اور اس ''محشر خیال آدمی'' کو سمجھنے کے لئے کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آدمی اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے، یہ صحیح ہے کہ خارجی حالات اس کے ذہن، اس کی نفسیات، اس کے خیالات اور اس کے ذہن پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ایک ادھوری حقیقت ہے......اس کی زندگی کو مکمل طور سمجھنے کے لئے اس داخلی دُنیا کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جو اپنے اندر بڑی حقیقتیں پوشیدہ رکھتی ہے...... خارجی دُنیا پر ہم نے اتنی توجہ صرف کی ہے کہ ہم اس داخلی دُنیا کے وجود سے منکر ہوکررہ گئے ہیں، فرد کی شخصیت اور اس کی انفرادیت ہر حال میں سماج کے اجتماعی کردار سے متاثر ہوتی ہے۔ لیکن اپنا وجود نہیں کھوتی۔ لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ سال ہا سال کی Regimentation کے اثرات مختصر سے وقفے میں زائل نہیں ہوسکتے یہی وجہ ہے کہ اب بھی بیشتر نقادوں اور ادیبوں کے ذہن پر غیر شعوری طور پر وہی اصولِ نقد اور ادبی معیار سوار ہیں جن سے وہ بظاہر اختلاف کرتے ہیں۔ ''آدم چھُ عجب ذات'' پر رحمان راہیؔ کا تنقیدی مقالہ اُسی ذہنیت اور اُسی ''ضابطۂ فوج داری''

کی پیداوار ہے، جس کے خلاف اختر کا افسانہ ایک فن کارانہ صدائے احتجاج ہے۔
رحمان راہی کے اعتراضات کا جواب دینے سے قبل میں افسانے کی تعریف میں اُن چند بیانات کو پیش کرنا چاہتا ہوں تا کہ یہ واضح ہو سکے کہ افسانے میں انہیں کس چیز کی تلاش تھی اور انہیں کیوں مایوسی ہوئی ہے۔

افسانے کی تکنیک کے متعلق ارشاد ہے:۔

"افسانے کی سب سے بڑی دِل کشی اس کی ہیئت ہے۔ یہ ہیئت اتنی پختہ ہے کہ لامحالہ اختر کی اُستادی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ ہیئت میں اس قدر توازن ہے کہ افسانے میں جو دُنیا اُبھرتی ہے، پڑھنے والا بیک وقت اس کے چاروں طرف دیکھ سکتا ہے۔ افسانے کا Suspenes قریب قریب آخر تک برقرار رہتا ہے۔"

زبان کے متعلق راہی صاحب کا بیان ملاحظہ کیجئے:۔

"زبان کا رنگ موضوع کے ساتھ ہم آہنگ ہے، بعض نازک مقامات پر افسانہ نگار نے زبان کے ساتھ ساتھ ہیئت کا توازن برقرار رکھنے کی کوشش بھی کی ہے........."

کردار نگاری کے متعلق فرماتے ہیں:۔

"رمضانا کے مقابلے میں میم صاحب کا کردار بہت ہی معقول ہے.....رمضانا کا نفسیاتی تجزیہ بجائے خود قابل تعریف ہے.......... یہاں اختر کی نگاہ بڑی گہرائیوں میں جھانکتی ہے.....اختر کا مشاہدہ بھی مجموعی اعتبار سے بہت صحیح اور باریک ہے۔"

.........اور آخر میں افسانے کے متعلق رائے دیتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ یہ سب چیزیں مل جُل کر افسانے کو ایک طلسم بنا دیتی ہیں۔"

ہیئت، زبان، کردار نگاری اور مشاہدے کے متعلق راہی صاحب کی یہ آراً ذہن میں رکھتے ہوئے آیئے یہ دیکھیں کہ ان کے اعتراضات کی حقیقت کیا ہے!

سب سے پہلے موضوع کا سوال ہے، پیشتر اس کے کہ موضوع کی صحت مندی یا اس کے نظریاتی پہلو پر غور کیا جائے۔ اس بات کا تعین کرنا ضروری ہے کہ "آدم چھ عجب ذات" کا موضوع کیا ہے۔ راہی صاحب کا خیال ہے کہ افسانے کا موضوع "حُسنِ فطرت......انسان (یا فن کار) اور اظہار کے تین اشاروں سے واضح ہو سکتا ہے، ان کے نزدیک افسانے کا مرکزی نقطہ حسنِ فطرت اور اس کے تئیں انسان کا ردِ عمل ہے، کیونکہ اپنی ساری بحث کی عمارت انہوں نے اسی خیال اور موضوع کی بُنیاد پر قائم کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ حسنِ فطرت کے تئیں انسان یا فن کار کے ردِ عمل کا یہ تاثر نہ صرف مبہم بلکہ ایک نابالغ تصور ہے......راہی صاحب نے "آدم چھ عجب ذات" کے طِلسم میں کھو کر موضوع کا صحیح تعین کرنے میں غلطی کی ہے۔ میرے نزدیک افسانے کا موضوع "آدم چھ عجب ذات" یعنی "انسان" ہے۔ حسن فطرت صرف اسی موضوع یا کو پیش کرنے کے لئے ایک ذریعے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے اور افسانہ نگار نے اس بنیادی موضوع کو واضح کرنے کے لئے انسان کے احساسِ جمال اور اس کے جذبہ محبت کا سہارا لیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر افسانہ نگار نے اپنے نقطہ نظر یا موضوع کو واضح کرنے کے لئے انسان کے جذبہ نفرت اس کے اندر پوشیدہ بہمیت کو بھی اُجاگر کیا ہوتا، جب بھی افسانے کا موضوع نفرت یا بہمیت نہیں بلکہ "انسان" ہوتا......سوال یہ ہے کہ اختر

کہنا کیا چاہتا ہے؟ میرے خیال میں اختر نے افسانے کے عنوان میں اس سوال کا واضح جواب دیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس افسانے میں عنوان کو بڑی Significance حاصل ہے اور اگر اختر کی ذہانت اور اس کے شعور پر اعتماد کیا جائے تو فوراً اس بات کا احساس ہوگا کہ افسانے کا عنوان، اس کا موضوع بھی ہے اور راہی صاحب کے بہت سے سوالات کا جواب بھی۔ اختر زندگی میں عقلیت، توازن، میانہ روی اور اخلاق کی اعلیٰ قدروں پر یقین رکھتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ہر آدمی اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔ وہ زندگی کو کئی زاویوں سے دیکھتا ہے۔ وہ کچھ بنیادی اصولوں کو سامنے رکھ کر انسانی زندگی کا معمہ سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اقتصادیات، سماجیات، نفسیات اور اخلاقیات کے مسلمہ اصولوں کی روشنی میں انسانی ذہن اور زندگی ایک مربوط نظام کے تحت رواں دواں ہے، لیکن وہ نظریات پر اعتقاد رکھنے کے ساتھ ساتھ بڑی گہری نظر بھی رکھتا ہے وہ فطرتِ انسانی کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھتا ہے تو اسے کچھ ایسے بھی راز ہائے سربستہ نظر آتے ہیں کہ وہ بے اختیار کہہ اُٹھتا ہے "آدم چھُ عجب ذات"! (انسان بھی کیا عجیب شے ہے!) اختر کا یہ تحیر اس کے ذہن میں ایک صحت مند تشکیک پیدا کر دیتا ہے اور یہ تشکیک اُسے رومانیت کی طرف لے جاتی ہے اور زندگی کے متعلق اس کے "سائنٹفک" نظریے میں ایک غیر معمولی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے، اُسے اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ انسانی زندگی قاعدوں، کلیوں اور فارمولوں میں نہیں سما سکتی، اس کی وسعتوں، اس کے تنوع اور رنگارنگی کا احاطہ صرف فلسفہ اور منطق ہی نہیں کر سکتے۔ جدلیات زندگی کے مسائل کو حل کرنے کی ایک کوشش ہے، اس کے اسرار سے پردہ اُٹھانا اس کے بس کا روگ نہیں...... اور اس حد تک "آدم چھُ عجب ذات" میں

اختر کے نظریۂ فن، حسن اور زندگی کو رمضانا اور میم صاحب کی شخصیتوں میں تلاش کر کے اختر کے ساتھ بہت بڑی ناانصافی کی ہے سوال یہ ہے کہ کس حد تک ایک فن کار کی تخلیق میں اس کی شخصیت اور اس کے نظریات کو تلاش کیا جا سکتا ہے؟ راہی صاحب نے جس انداز سے اختر کے نظریات کی تلاش میں میم صاحب اور رمضانا کے کردار کو کھنگالا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک افسانے کا ہر کردار اپنے خالق کا "پبلسٹی آفیسر" ہوتا ہے۔ مولوی نذیر احمد کے اصلاحی ناول فن کی ابتدا ہیں، انتہا نہیں۔ اپنی شخصیت اور اپنے پیغام کو اوروں تک پہنچانے کے لئے "اصغری" کا روپ دھارتا ہو کافی نہیں۔ "اکبری" کا جامہ بھی زیبِ تن کرنا پڑتا ہے۔ زندگی اب اتنی "سادہ و معصوم نہیں" کہ اسے آسانی کے ساتھ اصغری اور اکبری کے دو خانوں میں بانٹ دیا جائے۔ یہ اتنی "پرکار" ہو گئی ہے کہ فن کار کو اپنی شخصیت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اسے اپنے فن پاروں میں بکھیر دینا پڑتا ہے۔ راہی صاحب نے رمضانا اور میم صاحب کے کرداروں کو اختر کا نمائندہ سمجھ کر اختر کے نظریات کو غیر صحت مند قرار دیا ہے۔ راہی صاحب کا یہ تنقیدی نظریہ بجائے خود بہت ہی غیر صحت مند اور غیر ادبی ہے۔ افسانے اور ناول میں کردار فن کار کی تخلیق کے باوجود اپنی ایک انفرادیت، شخصیت اور کردار رکھتے ہیں۔ آپ فن کار سے یہ سوال نہیں کر سکتے ہیں کہ فلاں کردار نے ایسی بات کیوں کہی؟ فلاں کردار نے اس طرح کا طرزِ عمل کیوں روا رکھا؟ فلاں کردار کا نظریہ کیوں غیر صحت مند ہے؟ فلاں کردار نے اُس چیز سے کیوں محبت نہیں کی اور اُس چیز سے کیونکر کی؟ نقاد تھانے دار نہیں ہوتا ہے۔ وہ فن کار کے تجربات، اس کی مسرتوں اور اس کی حسرتوں میں شریک ہو کر اُس ذہنی انبساط کو عام کر دیتا ہے جو اس کی تخلیق میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ راہی صاحب نے

تنقید نہیں کی، تھانے داری کی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ رمضانا اور میم صاحب کے کردار ہمارے ذہن پر کوئی نقش چھوڑ دیتے ہیں یا نہیں؟ وہ اس سارے ماحول سے ہم آہنگ ہیں جو افسانے میں پیش کیا گیا ہے؟ ان کا اپنا کوئی وجود ہے یہ وہ صرف فن کار کے اشاروں پر ناچتے ہیں؟ راہی صاحب نے رمضانا کے کردار پر تفصیلی بحث کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس کے ہاں توازن اور تناسب نہیں، اور وہ نارمل نہیں بلکہ جنونی ہے! ان کے اعتراضات پر بحث کرنے سے پہلے میں ان سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ کیا زندگی میں توازن اور تناسب ہے؟ کیا ہم سب نارمل انسان ہیں؟ اور کیا ہماری زندگی میں وہ اعتدال، توازن اور تسکین ہے جس کا وہ رمضانا سے تقاضا کرتے ہیں؟

راہی صاحب سب سے پہلے یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کیا رمضانا حُسنِ فطرت کا دِل دادہ ہے؟ اور اگر جواب اثبات میں ہے تو وہ جاننا چاہتے ہیں کہ اُسے کس چیز یا تجربے نے حسن شناسی اور اس پر مر مٹنے کی یہ غیر معمولی حِس عطا کی؟

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ رمضانا میں فطرت کے حسن سے متاثر ہونے کی اتنی ہی صلاحیت ہے جتنی ایک عام آدمی میں ہوتی ہے وہ چونکہ کشمیر کی خوبصورت وادی میں پیدا ہوا ہے اور پیدائش سے ہی بلند پہاڑوں اور گہری نیلی جھیلوں سے مانوس ہے، اس لئے ان کے حسن کا احساس اُسے اُس طور پر نہیں ہوتا جس طرح یورپ یا میدانوں سے آئے ہوئے کسی سیاح کو ہو سکتا ہے۔ جھیل ڈل، نشاط باغ اور کوہِ سلیمان کی چوٹی چونکہ سب کچھ اس کے ماحول اور اس کی دنیا کا ایک حصہ ہیں، اس لئے اسے ان کے وجود کا احساس بھی نہیں ہو سکتا، لیکن رمضانا کے کردار میں ہمیں جو بات سب سے پہلے متاثر کرتی ہے وہ ہے اس کی

رومانیت...... ایک عام آدمی ہونے کے باوجود اس میں ایک ایسی خصوصیت ہے جو اسے ''غیر معمولی'' بنا دیتی ہے اور یہ خصوصیت ہے اس کا Romanticism۔ اختر اس کا تعارف یُوں کرتے ہیں:۔

''رمضانا پانچ چھ جماعتیں پڑھ چکا تھا۔ اُسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہ چار پہاڑوں کے درمیان جھیل ڈل کے پانی میں قید کر دیا گیا ہو۔ اُسے یہ سوچ کر ہنسی آتی تھی کہ یہ انگریز لوگ یہاں کیا کچھ دیکھنے کے لئے آتے ہیں۔ یہاں دھرا کیا ہے؟ چاروں طرف پہاڑ اور بیچ میں ڈل، اُسے کشمیر ایک پنجرہ نظر آتا تھا جس میں وہ گرفتار ہو گیا ہو۔''

رمضانا کی نفسیات کا یہ پہلو اس کے کردار کی تشکیل میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ ابتدا سے ہی ایک Romantic کردار کی حیثیت سے متعارف ہوتا ہے۔ اس کے جذبات اس کی انتہا پسندی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس کی روح میں کوئی خلش اور بے چینی نُمایاں ہے، وہ اپنے ماحول سے مطمئن ہونے کے باوجود اضطرار اور اضطراب کا شکار ہے۔ وہ ایک پرندے کی طرح اپنے آپ کو پہاڑوں کی چار دیواری میں مقید محسوس کرتا ہے۔ اس کا اندازِ فکر ایک عام اور نارمل آدمی کا سا نہیں ہے۔ اختر یہیں سے ہمیں ذہنی طور اس کی Abnormal فطرت کو ایک بنیادی حقیقت تسلیم کرنے کے لئے تیار کرتا ہے۔ رمضانا حسنِ فطرت کا اتنا ہی دِل دادہ ہے جتنا ملہ سبحان یا اس قبیل کا کوئی فرد ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے کردار کو سمجھنے کے لئے اس کے Romanticism کو ذہن میں رکھنا چاہئیے۔ رہا سوال کہ اُسے کسی چیز یا تجربے نے حسن شناسی اور اس پر مر مٹنے کی یہ غیر معمولی حِس عطا کی۔ سو اس کا جواب افسانے میں موجود ہے اور اس کی طرف خود راہی صاحب نے بھی اشارہ کیا

ہے۔" تو گویا رنگروٹی اور جنگی ماحول نے رمضان کے ذہن میں تلاطم پیدا کیا۔"
جنگی ماحول نے رمضانا کے ذہن میں تلاطم پیدا کرنے میں اپنا حصہ ضرور ادا کیا۔ لیکن اس طوفان کی ماہیت اور حقیقت سمجھنے کے لئے کچھ اور چھوٹی چھوٹی حقیقتوں کا دراک بھی ضروری ہے۔ Great tales of fantacy and imagination کے تعارف میں Philip Van Doren Stern نے لکھا ہے:۔

" The most memorable moments are not necessarily those which were most crucial, little happenings also leave their mark.But one thing all these dearly recalled moments share together-they were close to what poets write about; they had to do with love's ecstacy nature's heauty,death's pain."

رمضانا کے ذہنی تلاطم میں جنگی ماحول نے جو حصہ ادا کیا ہے خود رمضانا نے اس کا اظہار یوں کیا ہے:۔

"وہاں کی پختہ سڑکیں، فیکٹریاں اور ریلیں بڑی بے رحم ہیں، جیسے بے جان لوہے نے انگڑائی لی ہو اور ساری دُنیا پر اپنے سرد وجود کو پھیلا دیا ہو.....وہاں کے لوگوں کے دِل لوہے نے ٹھنڈے کر دئے ہیں، جنگ کرنا، بے وطن ہو جانا، کھو جانا اور مرنا ایک ہی بات ہے۔"

رمضانا Romantic تھا۔ جنگ کے رومانی تصور نے اُسے کھینچ لیا تھا۔ جنگ

کی حقیقت نے اس کی رومانیت کو ٹھیس پہنچائی۔ وہ برنارڈ شا کے Arms and the man کی ہیروئن کی طرح جنگ کو جوانمردی، بہادری اور Adventure کے مترادف سمجھتا تھا۔ لیکن محاذِ جنگ پر اس کے حسین تصورات کا آبگینہ چور چور ہو گیا۔ وہ پہلی مرتبہ کشمیر سے باہر نکلا تھا۔ بیرونی دُنیا کا جو رومانی تصور اس کے ذہن میں تھا اُسے جنگ کی کیفیت نے مسخ کر دیا تھا۔ اُسے اپنے گھر اور اپنے وطن کی یاد ستانے لگی۔ اپنے Nostalagia کا اظہار رمضانا نے باپ کے نام اپنے خطوط میں اس طرح کیا ہے:۔

"میں خیرت سے ہوں۔ کشمیر جیسی اور کوئی جگہ دیکھنے میں نہیں آئی۔ باقی دُنیا ویرانہ اور بنجر ہے۔"

چار سال بعد اپنے وطن لوٹ کر رمضانا ان احساسات کو یوں پیش کرتا ہے:۔

"جنگ میں، میں بھی مارا جاتا۔ مگر کشمیر کی نرم نرم اور ڈھیلی ڈھیلی زمین میرے پاؤں چومتی تھی۔ کشمیر کے سبزہ زار میری آنکھوں میں تراوت اور ٹھنڈک پیدا کرتے۔ میرا دھیان اسی طرف لگا رہتا۔ میں کشمیر کی یاد میں بے کل رہا کرتا۔ اسی لئے میں مرا نہیں، اسی لئے میں کھو نہیں گیا۔"

Nostalagia سے پیدا شدہ یہ جذبات انتہائی فطری ہیں۔ پورے چار سال رمضانا ان جذبات کو اپنے سینے میں جوان کرتا رہا اور رفتہ رفتہ ان کی شدت جنوں کا رنگ اختیار کر گئی۔ وہی رمضانا، جو اونچے اونچے پہاڑوں اور ڈل کو قید خانے اور پنجرے سے تعبیر کرتا تھا، اب اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ محبت اس کے اندر موجود تھی، لیکن اس کے وجود کا احساس اُسے جب ہی ہوا جب وہ اس "زنداں" سے دُور چلا گیا۔ یہ فطرت کا مسلمہ اصول ہے کہ جب تک کوئی چیز ہمیں حاصل رہتی

ہے، ہم اس کی قدر قیمت تو کیا، اس کے وجود کا احساس بھی نہیں کر پاتے، لیکن جُوں ہی یہ چیز ہم سے چھن جائے ہمیں فوراً اس کے وجود کا احساس ہو جاتا ہے۔ ماں کے دِل میں اپنے بیٹے کی محبت پوری شدت اور گہرائی کے ساتھ موجود ہوتی ہے، لیکن روزمرہ زندگی میں نہ ہی ماں کو، اور نہ ہی بیٹے کو اس محبت کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن بیٹے کی عارضی جُدائی کا صدمہ بھی اس محبت کا ''تلاطم'' بنا کر ہمیں اس کا احساس دِلاتا ہے۔ بالکل اسی طرح ''عراق، مصر اور عرب کے ریگستانوں'' نے رمضانا کو کشمیر کی نرم نرم اور ڈھیلی ڈھیلی زمین کا احساس دِلایا...... راہی صاحب نے اس ''نئے'' احساس کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ اس حِس کی ہیئت اور اس کے عناصِر ترکیبی کیا ہیں۔ یہ احساسِ جمال کی شدّت ہے یا حب وطن؟ جنگ سے نفرت اور پُرامن زندگی گذارنے کی خواہش ہے یا گھر سے محبت کا احساس؟ یا صنعتی دُنیا دیکھ کر ڈل کے خاموش ماحول سے پیار، میں سمجھتا ہوں کہ رمضانا کے ذہنی تغیر اور تلاطم میں ان سب عناصر نے ضرور حصہ لیا ہے، لیکن ان عناصر کو الگ الگ کر کے اس کیفیت کا صحیح تجزیہ نہیں ہو سکتا جو رمضانا کے ذہن میں پیدا تو دورانِ جنگ میں ہو گئی تھی، لیکن نُمایاں اپنے گھر آ کر ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ رمضانا کے دِل میں ان جذبات کا پیدا ہونا اتنا ہی فطری ہے جتنا ماں کے دِل میں اپنے بچھڑے ہوئے بیٹے کی محبت کا طوفان اُمڈنا! جس طرح ماں کے جذبات کی نفسیاتی، مادی، سماجی اور اخلاقی توجیہات ضرور ہو سکتی ہیں اسی طرح رمضانا کی کیفیت کی بھی بہت سی تاویلیں ہو سکتی ہیں۔ لیکن بنیادی حقیقت یہی ہوگی کہ گھر کی دُوری نے اس کے اندر Nostalagia کی ایک ایسی کیفیت پیدا کر دی جسے نہ حب وطن کہنا کافی ہوگا اور نہ احساسِ جمال کی شدت اور اس فطری کیفیت کو رمضانا

کی رومانیت نے جنون کی سرحدوں سے مِلا دیا۔ اس کیفیت پر حب وطن یا احساسِ جمال کی تیزی کا لیبل چسپاں نہیں کیا جا سکتا۔ خود راہی صاحب نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے:۔

''اکثر موقعوں پر رمضانا محض حُسنِ فطرت پہ فریفتہ نظر آتا ہے اور وہ بھی اس حسن کے ایک پہلو پر!''

راہی صاحب کا اعتراض یہ ہے کہ رمضانا کے ہاں کوئی تسلسل، قطعیت یا توازن کیوں نہیں ہے۔ وہ گھر لوٹ کر یہاں کے سبزہ زاروں، پہاڑوں اور جھیل ڈل پر اس والہانہ انداز سے کیوں فریفتہ ہوتا ہے...... رمضانا کے کردار کا گہرا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ رمضانا کے ہاں اسی تسلسل یا توازن کا ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ اس کی بے چین روح، اس کی سیمابی فطرت، اس کی رومانیت اُسے کیونکر عقلیت، استدلال اور میانہ روی کا پابند ہونے دے گی۔ Romantists تو بہر حال Abnormal ہوا کرتے ہیں، ان سے نارمل زندگی گذارنے کی توقع بجائے خود ایک بہت بڑی Abnormality ہے۔ Arnold Hanser نے تو اپنی تازہ ترین کتاب The Philosopy of Art History میں Romantist اور Neurotic کو ایک ہی سطح پر رکھا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ Romantist حقیقت کی دُنیا سے پرواز کر کے نعم البدل کے طور پر ایک اور دُنیا آباد کرتا ہے۔ رمضانا نے زندگی کی تلخ حقیقتوں سے گھبرا کر ایک نئی دُنیا آباد کر لی ہے، جہاں وہ حسنِ فطرت کے چند مظاہر کی پرستش کرتا ہے۔ ہم اپنی دُنیا کی حقیقتوں سے اس کی قدروں کو نہیں جانچ سکتے۔ اس کے کردار کا تجزیہ کرنے اور اس کی شخصیت کو سمجھنے کے لئے ہمیں اس کی دُنیا کی حقیقتوں سے انکار کرنے کی بجائے ان حقیقتوں کا سمجھوتہ کرنا پڑے گا۔ راہی صاحب اس

سمجھوتے کے لئے تیار نہیں ہیں اور یہی وجہ کہ کہ وہ رمضانا سے مایوس ہو کر اسے مخبوط الحواس اور جنونی قرار دیتے ہیں۔

رمضانا کے کردار پر راہی صاحب کو ایک اعتراض یہ ہے کہ رمضانا پر وجد و حال کی یہ کیفیت اتنی دیر کیونکر طاری رہی۔ ان کا کہنا ہے کہ دُنیا میں بے شمار شاعروں اور ادیبوں کے لئے فیضان (Inspiration) کے مواقع آتے رہے ہیں۔ مگر رمضانا کے اس فیضانِ مسلسل کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی ہے......راہی صاحب اندیشہ ظاہر کرتے ہیں کہ لوگوں کا رمضانا کو پاگل قرار دینا صحیح تو نہیں تھا۔

جہاں تک رمضانا کی مجذوبی کیفیت کا تعلق ہے، میں نہیں جانتا کہ راہی صاحب حکمت اور نفسیات کے کن اصولوں کی روشنی میں اس کے لئے کسی مخصوص وقت کا تعین کرنا چاہتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس کے وجود میں جو ذہنی اور جذباتی تغیر واقع ہوا ہے، اس کے محرکات کیا ہیں اور اس میں کتنی شدت ہے؟ میں نے ایک جگہ کہا ہے کہ رمضانا کا یہ تغیر اس کی بے پناہ رومانویت کا مظہر ہے اور اس کے محرکات اگرچہ وہ خارجی اسباب ہیں جو چار سال تک اُسے متاثر کرتے رہے، لیکن اس ''تغیر'' کی حقیقت سمجھنے کے لئے اس کے کردار کو مختلف حصوں یا Periods میں تقسیم کرنے کی بجائے ایک مسلسل عمل کی شکل میں دیکھنا ضروری ہے۔ رمضانا پر بقول راہی صاحب ''وجد و حال'' کی یہ کیفیت آغازِ بہار سے موسم سرما کے وسط تک طاری رہتی ہے۔ راہی صاحب اس ''عرصے'' کو نفسیات اور معقولیت کے اعتبار سے غلط سمجھتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ''نفسیات'' اور ''عقلیت'' کی رُو سے تو اس کیفیت کا پیدا ہو جانا ہی راہی صاحب کے نزدیک غلط ہے، اس لئے اس کے وقفے (Time period) کا تعین بھی نفسیات اور عقلیت کی روشنی میں نہیں کیا

جاسکتا ہے۔ اگر مجھے اس بات کا یقین ہو جائے کہ راہی صاحب لیلیٰ مجنون کے قصے کو منطق اور فلسفے کے ترازو پر نہیں تولیں گے تو میں اُن سے یہ پوچھنے کی جرأت کروں گا کہ قیس پر لیلیٰ کے عشق میں جنون کی کیفیت کتنی دیر قائم رہی اور کیا قیس پر اتنی دیر کے لئے جذب وجنوں کی یہ کیفیت طاری رہنا عقلِ انسانی قبول کرتی ہے؟ راہی صاحب کہیں گے کہ میں دُور کی کوڑی لایا، فطرت سے عشق اور لیلیٰ سے عشق تو دو مختلف جذبے ہیں، ان میں تو کوئی مماثلت ہی نہیں...... میں کہوں گا کہ یہ دونوں جذبے ایک ہیں اور ان میں گہری مماثلت ہی نہیں بلکہ یکسانیت پائی جاتی ہے۔ بہرکیف میں ایک اور مثال سے اپنا مقصد واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔

میں نے ایک پٹھان نوجوان کے متعلق سنا ہے کہ وہ جب دو تین سو سال قبل کشمیر آیا تو اس کی نگاہ ایک مرتبہ جھیل ڈل پر تیرتے ہوئے پتوں کے اُوپر پانی کے قطروں پر پڑی۔ ان کی چمک دمک اور خوبصورتی نے اُسے اتنا متاثر کیا کہ وہ انہیں موتی کے دانے سمجھا۔ اس کے بعد اس نے سارا موسم بہار اور موسم گرما ان ہی موتیوں کو جمع کرنے میں صرف کرلیا۔ وہ باپ سے ہزاروں روپے منگوا کر اسی ''شغل'' میں صرف کرتا رہا۔ بتایا جاتا ہے کہ وہ پٹھان جوان اس کے بعد کشمیر سے نہیں گیا۔ وہ یہیں مرا، اور اس کی قبر بھی یہیں موجود ہے۔ عام لوگ اسے میاں ڈل کے نام سے یاد کرتے ہیں...... میں اس واقعے کی صحت کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اس واقعے کو میں نے ایک لوک کہانی کے روپ میں بار ہا سُنا ہے۔ سنانے والے اور سننے والے، جن میں میری طرح آپ بھی شامل ہیں، سبھی میاں ڈل کے وجود پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ ہم میں سے آج تک کسی نے یہ سوال نہیں کیا کہ میاں ڈل اتنی دیر اس حسین ''مغالطے'' میں کیونکر مبتلا رہے؟ انہوں نے اتنا روپیہ

اس بے سود مشغلے میں کیوں صرف کیا؟ لیکن اسی قسم کے سوالات راہی صاحب نے رمضانا کے بارے میں کئے ہیں۔ انہوں نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے اور اگر وہ اعتراف نہ بھی کرتے، جب بھی یہ حقیقت قائم رہتی کہ شیکسپیئر کے شہرہ آفاق کردار ہیملٹ پر ایک مخصوص کیفیت اتنی دیر قائم رہی کہ بعض لوگ اسے پاگل سمجھتے ہیں۔ راہی صاحب نے اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ رمضانا کو لوگوں کا پاگل کہنا صحیح تو نہیں تھا؛ بھلا اس میں جھجک کی کیا بات ہے۔ راہی صاحب رمضانا کو پاگل کیوں نہیں کہتے، مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے کہ اُسے پاگل قرار نہ دینے میں جیسے وہ اختر، ملہ سجان اور خود رمضانا پر احسان کر رہے ہوں۔ رمضانا کا جذب وشوق اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ کوئی اُسے نارمل کردار سمجھ ہی نہیں سکتا اور پھر اختر نے کہیں اپنے پڑھنے والوں سے یہ وعدہ تو نہیں لیا ہے کہ وہ رمضانا کو Abnormal کردار سمجھنے کی بجائے ایک ذی ہوش اور متوازن شخصیت تصور کر لیں گے؛ میرا خیال ہے کہ خود اختر کے ذہن میں بھی رمضانا کا تصور ایک مجذوب اور Abnormal کردار کا ہے۔ میں خود اُسے ایک بے حد Abnormal کردار سمجھتا ہوں۔ کیونکہ اس کے بغیر اس کے کردار اور ذہن کی کئی گتھیاں سلجھائی نہیں جاسکتیں...... میں سمجھتا ہوں کہ رمضانا بالکل اسی طرح پاگل ہے جس طرح قیس، ہیملٹ اور ''میاں ڈل'' پاگل تھے۔ رمضانا کو پاگل کہنے کی بجائے میں Abnormal اس لئے کہتا ہوں کہ پڑھنے والے کو اس کے ساتھ ایک ذہنی قربت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ رمضانا کی ذہنی کیفیت پر رحم کھانے کی بجائے اس میں شریک ہو جاتا ہے۔ وہ بہت دُور تک رمضانا کا ہم سفر ہو جاتا ہے۔ کردار سے قاری کی یہ گہری وابستگی اختر کا کمالِ فن بھی ہے اور رمضانا کو پاگل قرار دینے میں ایک بہت بڑی رُکاوٹ بھی...... میرا خیال ہے کہ خود راہی

صاحب بھی رمضانا کو پاگل قرار دینے میں اس لئے ہچکچاتے ہیں کہ رمضانا کو پاگل تصور کر کے وہ کیونکر اپنے آپ کو ذی ہوش سمجھیں گے؟

رمضانا کے کردار پر راہی صاحب اپنے پورے مقالے میں یوں بحث کرتے ہیں کہ جیسے یہ ثابت کرنا چاہتے ہوں کہ اس قسم کے کردار کا وجود عقلی اور عملی لحاظ سے ممکن ہی نہیں اور یہ کہ اس کردار میں بڑے تضادات موجود ہیں۔ ان کی اس منطق کا جواب یوں بھی دیا جاسکتا تھا کہ کیا ادب العالیہ کے سبھی کردار عقلی اور عملی معیاروں پر پورے اُترتے ہیں اور کیا ان کرداروں میں کوئی تضاد، کوئی کش مکش کوئی Abnormality نہیں ہے، لیکن اس طرح بحث کا دائرہ بہت محدود ہو جاتا اور مجھے وہ چند گرہیں کھولنے کی کوشش سے محروم ہونا پڑتا جو راہی صاحب اور اُن سے اتفاق کرنے والے نقادوں کے ذہن میں ادبی تنقید کے سلسلے میں موجود ہیں۔ اپنی منطق اور عقلیت کی بنیاد پر رمضانا پر ایک وار یوں کرتے ہیں:۔

> ''کیا جمالیاتی اور نفسیاتی اعتبار سے یہ ممکن ہے کہ رمضانا، جو یہ غیر معمولی اور ''مسلسل حسن شناسی'' کا دم بھرتا ہے، مہینوں اپنے احساس اور جذبات کا اظہار نہ کرسکتا۔''

اس کے بعد انہوں نے تاریخ اور تجربے کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسان کی جمالیاتی حِس، کِس طرح اظہار کے پیراہن میں نمودار ہوتی ہے...... رمضان کی اس ''بے زبانی'' کا نفسیاتی تجزیہ تو کوئی ماہرِ نفسیات ہی کر سکتا ہے۔ جو ہمیں یہ بتائے کہ باوجود کوشش اور کاوش کے رمضانا وہ جذبات کیوں بیان نہیں کرسکتا تھا جو اس کے دِل میں حُسنِ فطرت کے مشاہدے سے پیدا ہوتے تھے۔ لیکن میں جس حد تک اس گتھی کو اپنے طور سلجھا سکا ہوں وہ یوں ہے:۔

رمضانا کے دِل میں پہاڑوں، جھیلوں اور سبزہ زاروں سے والہانہ عشق کی کیفیت اس کی جمالیاتی حِس میں ''اضافے'' کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی شدت کی وجہ سے پیدا ہوگئی۔ اور یہ والہانہ پن حسن شناسی سے زیادہ اس کی رومانیت کی پیداوار ہے۔ رمضانا کی والہانہ کیفیت کو اس لحاظ سے اس کے سلجھے ہوئے ذوقِ جمال سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا ہے۔ جس لحاظ سے راہی نے اُسے غیر معمولی حُسن شناسی کہا ہے بلکہ میں تو اس جذب و جنون کو حسن شناسی کی بجائے Nostalagia کی پیداوار سمجھتا ہوں...... اور اس کی حُسن شناسی کو اس جذب و شوق کا ایک پیکر سمجھتا ہوں جو رمضانا کی رومانویت نے اپنی آسودگی اور اپنے اظہار کے لئے تراشا ہے۔

عام طور پر ہمارے سبھی قوائے ذہنی، جسمانی اعضا کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ نشو و نُما پاتے ہیں۔ ایک مخصوص عمر میں ہمارا ذہن ایک خاص سطح پر رہتا ہے۔ عالم شباب میں ہمارے جذبات میں ایک غیر معمولی تموج پیدا ہو جاتا ہے۔ بڑھاپے میں ہمارے قوائے جسمانی ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور ہمارے خیالات میں ایک پژمردگی یا تھکن کے آثار نُمایاں ہو جاتے ہیں۔ یہ سارا عمل ایک اوسط آدمی کی زندگی پر حاوی رہتا ہے، لیکن کبھی کبھی قاعدہ کلیہ سے استثنیٰ بھی پایا جاتا ہے۔ بچپن میں ہی کسی کے ذہن میں پختگی کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی کم سِنی میں ہی وہ جنسی جذبات پیدا ہو جاتے ہیں جنہیں عالم شباب میں پیدا ہو جانا چاہیئے تھا، یہ کہ جسمانی لحاظ سے تو آدمی بڑھتا رہتا ہے، لیکن ذہنی طور سے وہ نابالغ ہی رہتا ہے۔ اس قسم کی مثالیں اِردگرد کی دُنیا میں کئی مِل سکتی ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ اس سائینٹفک دَور میں ذہنی بلوغت کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ اب فرض کیجئے کہ ایک بچے میں جنسی

جذبہ ''مقررہ وقت'' سے پہلے بیدار ہو جاتا ہے، چونکہ جسمانی اور ذہنی اعتبار سے وہ ابھی بچہ ہے، اس لئے اپنے جذبات کے اظہار کے لئے اُسے الفاظ نہیں ملتے، ایسی حالت میں یہ بچہ کیا کرے گا؟ میرا خیال ہے کہ اپنی محدود قوتِ اظہار سے ہم پر جذبات واضح کرنے کی کوشش کرے گا اور اگر اس کی زبان یا اس کے اظہار کو نہ سمجھ سکے تو اس کی ساری نفسیات اور اس کا سارا وجود ''مقررہ'' اور ''معینہ'' راستوں پر سفر نہیں کر سکے گا...... اور اس کے ذہن کے اندر عجیب تضادات پیدا ہوں گے جو اس کے سارے کردار کو متاثر کریں گے۔ رمضانا کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا ہے۔ اس کی تعلیم بس واجبی ہے۔ وہ بچپن سے ہی ایک نامعلوم رومانیت کا شکار رہا ہے۔ اگر اس رومانیت کی تہذیب ہو پاتی تو شاید وہ شاعر ہو جاتا، یا مصوّر بنتا یا کسی لیلیٰ کے عشق میں گرفتار ہو کر مجنون بنتا۔ لیکن بدقسمتی سے اس کے جذبات اور اس کی رومانیت کی نشو و نما اور اظہار کا کوئی ذریعہ میسر نہ ہو سکا؛ گھر سے دُوری اور جنگی ماحول نے اس رومانیت کو اسی طرح بیدار کیا۔ جس طرح چقماق میں کسی چیز کے ساتھ ٹکرانے سے آگ پیدا ہو جاتی ہے۔ چقماق کی طرح رمضانا کے اندر رومانیت کی آگ موجود تھی۔ لیکن گھر کی یاد اور جنگی ماحول کی رگڑ نے اسے شعلے میں بدل دیا۔ یہ جذبہ بتدریج ارتقاء کے طور پر جوان نہیں ہوا بلکہ ایک اتفاقی رگڑ سے یک لخت شدید ہو گیا۔ سائینس کی اصطلاح میں اسے Precocit کہا جاتا ہے۔

اب رومانوی جذبہ تو شدید ہو گیا، لیکن قوّتِ اظہار کو وہ نشو و نُما نہیں مِل سکی جو جذبات کے اس تلاطم اور سیلِ بے پایاں کو اپنے اندر سمیٹ سکتی نتیجہ یہ کہ جب شدّتِ جذبات سے مغلوب ہو کر رمضانا ہمیں کچھ سمجھانے کی کوشش کرتا ہے تو اس کی گویائی اس کے ساتھ نہیں دے سکتی۔ اور وہ اُن اشاروں میں اپنے جذبات کو

ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کا باپ تک اس کو پاگل سمجھنے لگتا ہے۔ اگر رمضانا کی رومانیت کو اظہار کا سہارا ملتا تو وہ شعر کہتا یا میم صاحب کی طرح مصور بن جاتا، لیکن اس کا المیہ تو یہی ہے کہ وہ اس طوفان کو الفاظ یا اظہار کے کسی پیرائے میں گرفتار نہیں کر پاتا......

وہ اشاروں ہی اشاروں میں باپ کو کچھ سمجھانے کی کوشش کرتا۔

"دیکھو ابا...... وہ دیکھو! وہ ابر کا ٹکڑا! جیسے میری رُوح پرواز کر رہی ہو۔ ابا! ابا! ہرموکھ کی چوٹی پر سونے کا دستار بندھا ہے! "نا" مت کہو ابا!"

جب جذبات کی لہریں ٹکرا ٹکرا کر اس کے سینے میں قیامت بپا کرتی تھیں، تو وہ باپ سے کہتا:۔

"ابا! میرا کلیجہ پھٹ رہا ہے۔ میں تمہیں بتا دیتا، لیکن میرے پاس زبان نہیں ہے۔"

دُور پہاڑوں کی طرف اشارہ کر کے وہ کہتا...... "دیکھو، وہ۔" اور اس کے بعد عجزِ بیان کے احساس سے خاموش ہو جاتا!

راہی صاحب کہتے ہیں کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے، میں کہتا ہوں کہ یہ سانحہ مہجور کے ساتھ بھی پیش آتا تھا، آپ کے ساتھ بھی پیش آیا ہوگا۔ ہر فن کار اور حساس آدمی کے ساتھ پیش آتا ہے۔ مہجور نے کہا ہے۔

ژلہِ لارِہؤ چھمکھ، حال ونہِ ہے، وارِ ہؤچھِ ہے روگ
گلہِ زیؤ میہٗ گیم اؤش وؤتھم دورایہِ ونٔے کیٛاہ

آنسوؤں کی زبان سمجھنے والے تو بہت سے لوگ موجود ہیں لیکن جب یہ حالت ہوتی ہوگی تو کیا ہوتا ہوگا۔

وٗنتھ لولہِ گفتار ژیہٗ تَے عارانہِ ہے
ژیہٗ ڈیشتھ میہٗ زیؤ چھم کلان ٹاٹھہِ یارو

راہی صاحب کہتے ہیں کہ "ابا! میرا کلیجہ پھٹ رہا ہے، میں تم سے کہتا لیکن کہہ نہیں سکتا ہوں!" کے فقرے بے معنی ہیں اور وہ جھلا کر اسے اختر کے "ہاتھ کی صفائی" قرار دیتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ رمضانا کا یہ احساس کہانی ہے اور کہانی کی رُوح بھی...... یہ اختر کے ہاتھ کی صفائی نہیں ہے، رمضانا کے رُوح کی گہرائی ہے جس میں جھانکنے کے لئے عصمتِ قلب ونظر کا ہونا ضروری ہے!

اس کے بعد راہی صاحب نے رمضانا کے انجام پر کچھ دلچسپ اعتراضات کئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر رمضانا واقعی حُسنِ فطرت کا دِل دادہ تھا تو یہ حسن کا احساس اُسے "سراپا مسرّت" کا پیکر بنا دیتا۔ لیکن سرما کے شروع ہوتے ہی وہ کیوں افسردہ ہو جاتا ہے؟ وہ کسی کھوئی ہوئی چیز کی تلاش کیوں کرنے لگتا ہے؟ وہ سرما کو ظالم اور غاصب کیوں کہتا ہے؟ اور راہی صاحب اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ رمضانا مجموعی لحاظ سے حسن فطرت کا دِل دادہ نہیں تھا، وہ زیادہ سے زیادہ موسمِ بہار اور خزاں پر فریفتہ تھا، یعنی فطرت کے ایک دُو رنگوں کا شیدائی تھا اور بقولِ ان کے اگر یہ سب نتیجے دُرست ہیں تو پھر یہ فیصلہ صادر کرنا پڑے گا کہ رمضانا حسنِ فطرت کا صحیح شعور نہیں رکھتا تھا...... اپنے اس فیصلے کی تائید میں وہ بڑی شدّت کے ساتھ یہ دلیلیں دیتے ہیں:۔

(۱) اگر اُسے حُسنِ فطرت کا صحیح شعور ہوتا تو اسے سرما کے حسن کی نیرنگیوں کا بھی احساس ہوتا۔

(۲) سرما کے آغاز سے اُسے ہرموکھ کی پہاڑی پر سونے کا دستار کیوں نظر

آتا تھا اور سرما کے شروع ہوتے ہیں اس کی آنکھیں اس کے حُسن کے احساس سے محروم کیوں ہو گئیں؟

اس کے بعد راہی صاحب بڑی خوبصورتی کے ساتھ شاعرانہ تشبیہات کے سہارے موسم سرما کا حُسن بیان کر کے رمضانا کی معلومات میں اضافے کے ساتھ ساتھ ہمارے ذوقِ جمال کی تسکین کا سامان بھی بہم کرتے ہیں۔

میں نے راہی صاحب کے ان اعتراضات کو" دلچسپ" کہا ہے اور میرا خیال ہے کہ ان میں تفریح کا کافی سامان موجود ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ راہی صاحب کے ان اعتراضات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا حصہ رمضانا کی حسن شناسی سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا حصہ خود راہی صاحب کی حسن شناسی سے۔

سوال یہ ہے کہ راہی صاحب نے یہ فیصلہ کیوں کر لیا ہے کہ اختر نے رمضانا کو ایک آئیڈیل حسن شناسی کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور کہانی کے کس فقرے اور کس کردار کی زبانی یہ احساس پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ رمضانا کے احساسات، جذبات اور نظریات کو صحت منداور آئیڈیل تسلیم کیا جائے۔ اختر نے ابتدا سے لے کر اس کے انجام تک اس کی ایک نفسیاتی کیفیت کو پیش کیا ہے۔ اس کی صحت مندی یا غیر صحت مندی کا فیصلہ کرنا نہ اختر کا کام تھا اور نہ اس نے ایسا کرنے کی کوشش کی ہے، اس لئے اگر راہی صاحب بڑی تحقیق اور کاوش کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ رمضانا حسنِ فطرت کا صحیح شعور اور ادراک نہیں رکھتا تھا تو اس سے نہ رمضانا کو مایوسی ہوگی نہ اختر کو اور نہ مجھے...... یہ تحقیق کر کے راہی صاحب نے صرف اپنی معلومات میں اضافہ کیا ہے۔

اعتراضات کے جس حصے کو میں" دلچسپ" سمجھتا ہوں، اس میں وہ

سوالات ہیں جو راہی صاحب نے خود رمضانا سے کئے ہیں! مثلاً یہ کہ وہ صرف موسم بہار اور خزاں کا شیدائی کیوں تھا؟ یا یہ کہ اُسے موسم سرما میں کوئی حسن کیوں نظر نہیں آیا، یا یہ کہ اس کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آئی کہ موسم سرما دراصل بہاری کی آمد کا پتہ دیتا ہے۔ انہیں شکایت ہے کہ کیٹس کی طرح اُسے سرما کا حسن نظر کیوں نہیں آیا، یا شیلے کی طرح اس نے سرما کو بہار کا پیغامبر کیوں نہیں سمجھا؟

میں ان اعتراضات کا جواب یوں دیتا ہوں کہ رمضانا نہ شیلے تھا اور نہ کیٹس؛ وہ نہ رحمان راہی تھا اور نہ شمیم احمد شمیم! وہ رمضانا تھا۔ وہ فلسفی نہیں تھا، ایک ہانجی کا لڑکا تھا۔ وہ ان معنوں میں "فلسفۂ جمالیات" کا ماہر نہیں تھا جن معنوں میں جناب راہی صاحب اُسے سمجھتے ہیں۔ اُنہوں نے رمضانا سے جو "ذاتی قسم" کے سوالات کئے ہیں، اگر یہی سوالات ہر ادبی تخلیق کے خالق اور اس کے کرداروں سے کئے جائیں تو ادبی تنقید میں بڑی دلچسپی پیدا ہو جائے۔

مثلاً اگر سرشار سے پوچھا جائے کہ اسکے "خوجی" نے اتنی ساری حماقتیں کیوں کیں اور آزاد سے یہ پوچھا جائے کہ وہ ساری عمر آوارہ گردی کیوں کرتا رہا، جب کہ وہ کوئی معقول کام بھی کر سکتا تھا۔

منٹو سے پوچھا جائے کہ "ٹوبہ ٹیک سنگھ" میں اس کے کردار پاگل کیوں ہیں اور ٹوبہ ٹیک سنگھ سے پوچھا جائے کہ وہ کوئی عقل مندی کی بات کرنے کی بجائے اناپ شناپ کیوں بکتا رہتا ہے؟ اختر محی الدین سے پوچھا جائے کہ "دندوزُن" میں گلہ چمار بریست چمار کے ہاں سے ہانڈی کیوں چُراتا ہے اور پھر گلہ چمار کی اس حرکت کو اخلاقی معیاروں سے جانچ کر یہ فیصلہ صادر کر دیا جائے کی وہ بد اخلاق اور چور ہے اور پھر اُس سے اپنی حرکت کا جواز پوچھا جائے اور آخر میں قیس سے یہ

پوچھا جائے کہ تم نے لیلیٰ جیسی کالی کلوٹی لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو کر اپنی ساری زندگی کیوں تباہ کی تو بڑا لطف آجائے!

راہی صاحب نے قریب قریب اسی نوعیت کے سوالات اختر، رمضانا اور میم صاحب سے کئے ہیں۔ رمضانا جب ''وحشتِ دِل'' سے گھبرا کر خودکشی کرتا ہے تو راہی صاحب یہ پوچھتے ہیں کہ اس نے خودکشی کیوں کی؟ کیا اس کے نزدیک محبوب سے ہمیشہ ہم آغوش ہونا ہی اصلِ محبت ہے۔ انہیں رمضانا کی اُس خواہش پر بھی اعتراض ہے جس کا اظہار وہ مرنے سے پہلے اپنے باپ سے کرتا ہے۔ رمضانا باپ سے کہتا ہے کہ جب میں مرجاؤں تو میری لاش کو تختِ سلیمان پر دفن کر کے میری آنکھیں ڈل کی جانب کر دینا...... '' راہی صاحب اس ''معصوم خواہش'' کو عقلیت کی کسوٹی پر پرکھ کر بے معنی اور لغو قرار دیتے ہیں۔

میں ان تمام اعتراضات کا تفصیلی جواب دے کر اس مقالے کو قابلِ اعتراض حد تک طویل نہیں کر دینا چاہتا، لیکن ایک شاعر کی زبان سے اس قسم کے غیر شاعرانہ سوالات سُن کر پیمانۂ صبر لبریز ہو جاتا ہے۔

رمضانا کو بہار اور موسمِ خزاں سے والہانہ عشق ہو گیا تھا، اس سے یہ پوچھنا اس کے ساتھ زیادتی ہے کہ وہ موسم سرما کو کیوں ''چاہ'' نہ سکا۔ جذبۂ عشق کی گرفت اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ اس سے آزاد ہونا ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔ یہی نہیں بلکہ بقول شاعر ؎ درجنوں از خود نہ رفتن کارِ ہر دیوانہ نیست! میں رمضانا کی وکالت نہیں کرنا چاہتا ہوں، لیکن اس کے یہ احساسات آپ تک پہنچانا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

''راہی صاحب! آپ بجا کہتے ہیں کہ سرما میں اپنا حسن ہوتا ہے۔ موسم سرما

کی چاندنی میں بڑی دِل کشی ہے۔ آپ کا یہ کہنا بھی بجا ہے کہ موسم سرما کے بعد ہی موسم بہار کا آغاز ہوتا ہے، لیکن بہار کی رعنائیوں اور خزاں کی رنگینیوں کی گرفت مجھ پر اتنی مضبوط تھی کہ میں اپنے آپ کو اس کے آزاد نہ کر سکا۔ میں زندگی کے شباب پر اس انداز سے مر مِٹا تھا کہ مجھے بڑھاپے کی سنجیدگی میں کوئی دِل کشی نظر نہیں آئی۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں کہ مجھے خودکشی نہیں کرنا چاہیئے تھا، لیکن کیا کیجئے کہ اگر آپ میری جگہ ہوتے تو آپ بھی وہی کچھ کرتے جو میں نے کیا اور اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو وہی کچھ کہتا جو آپ کہتے ہیں۔'' ......

قطع نظر اس کے کہ رمضانا کو سرما کے حُسن کا احساس کرنا چاہئے تھا یا نہیں سرما میں واقعی کوئی دِل کشی ہے یا نہیں ...... میں ایک بات کا اظہار کرنا ضروری سمجھتا ہوں، کیونکہ اس اظہار سے رمضانا کے کردار کی یہ گرہ کھولنے میں امداد مل سکتی ہے کہ اس نے سرما کو ظالم اور غاصب کیوں تصور کیا......

راہی صاحب نے جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، زبان اور تشبیہات کے طلسم سے ہمارے اور رمضانا کے اندر سرما کے حسن، اس کی خوبصورتی، اس کے جلال اور جمال کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن سرما کے اس حسن کا احساس سرمائی کھیلوں کے دِلدادہ اُن سیاحوں کو ہو سکتا ہے جو ہزاروں میل کا سفر طے کر کے جاڑے کے دِنوں میں یہاں آتے ہیں یا جناب رحمان راہی جیسے حساس شاعر کو!

کشمیر کے ایک عام آدمی کو جاڑے میں کوئی حسن نظر نہیں آتا، کشمیر کا کِسان اور یہاں کے محنت کش عوام موسم سرما سے نفرت کرتے ہیں، ان کے لئے جاڑا ایک قہرِ الٰہی سے کم نہیں ہے۔ جاڑے کے خلاف ہمارے جذبات اتنے شدید ہیں کہ آج بھی ''وندہ چھ گندہ'' جیسی مثالیں ہماری روزمرہ زندگی میں بہت عام ہیں۔

موسم سرما اور برف باری کے خلاف احتجاج کے یہ جذبات ہمارے لوک ادب اور ہماری نفسیات کا حصہ ہو کر رہ گئے ہیں اور حق تو یہ ہے کہ کشمیر کی غربت، افلاس، اقتصادی بدحالی اور معاشی پس ماندگی کی جتنی ذمہ داری موسم سرما پر ہے، اتنی شاید ہی کسی اور پر ہو۔ سال ہا سال سے کشمیری کسان اور مزدور موسم سرما کے آغاز سے ہی اپنے گھروں کو خیر باد کہہ کر ''پنجاب'' کی خاک چھانتے پھرتے ہیں۔ ان کے لئے موسم سرما میں اس شاعرانہ حسن کی تلاش بے سود ہے جس کی طرف راہی صاحب نے اشارہ کیا ہے۔ راہی صاحب نے موسم سرما میں جو حسن دیکھا ہے وہ سرینگر کلب میں بیٹھے ہوئے ایک ایسے سیاح کی نظر سے دیکھا ہے جو ہزاروں میل دور کا سفر طے کر کے برف پوش پہاڑیوں اور گرتی ہوئی برف دیکھنے کے لئے آیا ہو۔ لیکن اس حسن سے محظوظ ہونے سے پہلے کمرے میں بخاری جلا کر کھڑکی سے باہر جھانک رہا ہو۔ رمضانا ایک عام آدمی تھا، وہ نہ سیاح تھا اور نہ راہی صاحب کی طرح شاعر، اُسے سرما میں کوئی دل کشی نظر نہیں آئی تو اُس پر غصہ کرنے کی بجائے اُس سے ہمدردی کرنے کی ضرورت ہے۔

رمضانا کے کردار پر راہی صاحب نے جسم اور رُوح کے باہمی رشتے کے نقطہ نظر سے جو بحث کی ہے، میں اس پر کچھ نہیں کہوں گا۔ راہی صاحب نے رمضانا کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ اس کے تصورات اور اعتقادات صحیح نہیں ہیں۔ جسم اور روح لازم وملزوم ہیں اور ان کا الگ الگ کوئی وجود نہیں۔ اے کاش! رمضانا فلسفی یا شاعر ہوتا، جب وہ خودکشی کرنے کی بجائے یا تو فلسفۂ جمالیات پر کوئی کتاب لکھتا یا راہی صاحب کی طرح شعر کہتا......۔

راہی صاحب نے رمضانا کے کردار کو ایک مبہم اور نابالغ تصور قرار دے کر یہ

فیصلہ صادر کر دیا ہے کہ یہ انسان کے دِل میں شادمانی اور کشادگی کی بجائے افسردگی اور تنگی پیدا کر دیتا ہے۔ راہی صاحب نے جس نقطۂ نظر سے اس کے کردار پر بحث کی ہے اُس سے ان کے نتائج کی توثیق ہوتی ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ خود راہی صاحب کے نقطۂ نظر سے دِل میں افسردگی اور تنگی پیدا ہو جوتی ہے۔ رمضان کے کردار سے دِل میں وہ خلش بیدار ہوتی ہے جس کے بارے میں شیلی نے کہا ہے

Our Sweetest songs are those that tell of sadest thought

راہی صاحب نے میم صاحب کے کردار کو رمضانا کے مقابلے میں بہت حد تک معقول اور جان دار قرار دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ولایت میں پیدا ہونے، وہیں پرورش پانے، کیمبرج یونیورسٹی میں انگریزی ادب کے طالب علم ہونے اور مصور ہونے کے ناطے اس کے حسنِ فطرت پر فریفتہ ہونے میں بڑی معقولیت اور جواز ہے۔ میم صاحب کے کردار پر ''معقولیت'' کا یہ فتویٰ صادر کرنے کے بعد راہی صاحب نے اس پر اس نوعیت کے اعتراضات کئے ہیں جن کا شکار وہ رمضانا کو بنا چکے ہیں۔ میم صاحب کے تجزیے میں بھی راہی صاحب نے اس کے کردار کا تجزیہ کرنے سے زیادہ اپنی ''معقولیت'' پر زیادہ زور دیا ہے اور یہ ثابت کرنیکی کوشش کی ہے کہ وہ ولایت سے تعلق رکھنے اور کیمبرج یونیورسٹی کی طالب علم ہونے کے باوجود ورڈز ورتھ کو ٹھیک سے نہیں سمجھ پائی ہے۔ راہی صاحب نے بڑی محنت سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حسنِ فطرت کے متعلق میم صاحب کا نظریہ غلط اور غیر صحت مند ہے۔

راہی صاحب کے اعتراضات کا جواب دینے سے قبل میں میم صاحب کے کردار کے متعلق اپنے تاثرات بیان کرنا چاہتا ہوں۔

میرا خیال ہے کہ میم صاحب کا کردار رمضانا کے مقابلے میں کمزور ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کہانی کا مرکزی کردار رمضانا ہے اور میم صاحب کا کردار صرف رمضانا کے کردار کو اُبھارنے اور اس کے اُن جذبات، احساسات اور کیفیات کو سمجھانے کی ایک کوشش ہے جو رمضانا اپنے عجزِ بیان کی وجہ سے ملہ سبحان اور پڑھنے والوں کو اپنی زندگی میں نہیں سمجھا جا سکا۔

حسنِ فطرت کے متعلق میم صاحب کے ردِ عمل اور اس کے تاثرات کو سُن کر ملہ سبحان کو ہمیشہ رمضانا کی یاد آتی اور اُسے یہی احساس ہوتا کہ میم صاحب ایسی ہی باتیں کر رہی ہے جو رمضانا کرتا، مگر کر نہ سکتا تھا۔ اُسے اس بات کا یقین تھا کہ رمضانا کو دراصل یہی کچھ کہنا تھا جو میم صاحب کہہ رہی ہے۔ اُسے یوں محسوس ہوتا کہ جیسے آج رمضانا یہی باتیں کہنے کے لئے پہاڑ پر آیا ہو......اس لحاظ سے میم صاحب اور ملہ سبحان کا کردار دونوں ہی کہانی کے مرکزی کردار رمضانا کی شخصیت کو اُبھارنے اور واضح کرنے کے لئے تراشے گئے ہیں۔ رمضانا کا کردار میم صاحب کے وجود کے بغیر بھی ایک انفرادیت رکھتا ہے جبکہ یہ بات میم صاحب کے کردار کے متعلق کہی جا سکتی ہے اور نہ ملہ سبحان کے بارے میں! میم صاحب کو رمضانا کے کردار۔ اور اس کی شخصیت کا تسلسل بھی نہیں کہا جا سکتا۔ ان دونوں کرداروں میں بڑی مماثلت پائی جاتی ہے، لیکن یہ دونوں خودکشی کر کے اپنی رُوح کو جسم کی قید سے آزاد کرتے ہیں۔ لیکن اس مماثلت (Similarties) کے باوجود رمضانا اور میم صاحب کو "ایک" کہنا غلط ہوگا۔ رمضانا کے حسنِ فطرت پر وارفتہ ہونے کے محرکات کچھ اور ہیں اور میم صاحب کی فریفتگی کے اسباب کچھ اور ہیں۔ رمضانا کی نفسیات پر میں تفصیل سے بحث کر چکا ہوں۔ میم صاحب کی "حسن شناسی" ایک

Sophisticated اور تعلیم یافتہ خاتون کے احساسِ جمال کی تربیت یافتہ شکل ہے۔

میم صاحب اور رمضانا کی حسن شناسی میں ایک ہی قدر مشترک ہے اور وہ ہے ان دونوں کی رومانیت! میم صاحب حسن سے مسحور ہو کر اس کے اظہار کی صلاحیت رکھتی ہیں اور جیسا کہ راہی صاحب نے کہا ان کے دیوانہ پن میں ایک معقولیت پائی جاتی ہے۔ اور اس معقولیت کی وجہ یہ ہے کہ میم صاحب کے ذوقِ جمال کو ورڈز ورتھ، وان گاگ اور کیمبرج یونیورسٹی کے ماحول میں تربیت اور تہذیب کے مواقع حاصل رہے ہیں۔ اُس کی فطری رومانیت نے اُس کی حسن شناسی کو حسنِ فطرت پر مرکوز کر دیا۔ وہ اپنے تاثرات اور محسوسات کو تصویروں کے ذریعے بیان کرتی اور ورڈز ورتھ کی شاعری پڑھ کر اپنی ذہنی تسکین کا سامان بہم کرتی۔ اس کے ہاں جمالیات کا ایک واضح تصور ہے اور وہ ملہ سبحان سے یہ کہتی ہے کہ حسن کا احساس ہی انسان کو انسان بنا دیتا ہے۔ ورنہ ایک جانور اور انسان میں کیا فرق ہے۔ رمضانا کے ذوقِ جمال میں نہ یہ شائستگی ہے اور نہ تہذیب۔ اس کے ہاں جمالیات کا نہ کوئی فلسفہ ہے اور نہ میم صاحب کی طرح کوئی بلند آدرش! میم صاحب اور رمضانا کے کردار کا یہ نمایاں فرق ان کی موت سے اور زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ رمضانا اس لئے مرتا ہے کہ موسم سرما نے بہار اور خزاں کا حُسن لُوٹ لیا، میم صاحب اس لئے مرتی ہے کہ یہ حسن اس قدر وافر اور وسیع ہے کہ اس کا ذہن اور وجود اسے سمیٹنے کے لئے ناکافی ہے۔ رمضانا وہ منظر کئی بار دیکھ چکا تھا، جسے دیکھ کر میم صاحب "سراپا حیرت" بن کر رہ گئی۔ میم صاحب موسم بہار اور خزاں کے بعد موسم سرما کا کئی بار استقبال کر چکی تھیں۔ ان دونوں کی زندگی کا بظاہر ایک ہی محور ہے، لیکن ان کی موت کی راہیں بالکل مختلف ہیں۔ میم صاحب کا یہ سوچنا کہ "فن کار اپنے فن سے حسن کو مکمل کر دیتا

ہے، خام کو پختہ بنا دیتا ہے، مگر یہ وسعت، یہ سلیقہ، یہ حسن...... کیا وہ اس میں کوئی اضافہ کر سکتی ہے؟ نہیں نہیں! اس حسن کو رنگوں میں سمیٹنا، حسن کی توہین ہوگی......''

نظریاتی طور صحیح ہے یا نہیں، میں اس پر بحث نہیں کرونگا لیکن یہ میں ضرور کہوں گا کہ قدرت کی نیرنگیاں، فطرت کی سحر کاریاں اور انسانی ذہن کی گہرائیاں کبھی کبھی فن کار کو ایک ایسی منزل پر ضرور کھڑا کر دیتی ہیں جہاں اُسے اپنی گویائی اور اپنے اظہار کی قوت پر شک ہونے لگتا ہے۔ میم صاحب نے ولایت کی صبحیں بھی دیکھی ہوں گی اور شامیں بھی۔ وہ ان سے ضرور متاثر ہوئی ہوں گی، اس کے پاس محسوس کرنے اور اظہار کرنے کی ایک مخصوص قوت بھی موجود تھی، لیکن جب اس نے ایک ایسا نظارہ دیکھا جس نے اس کے روح کی اُن گہرائیوں میں ایک لطیف ارتعاش پیدا کر لیا جہاں اظہار اور بیان کے پَر جلتے ہیں تو اس کا یہ سوچنا نظریاتی اور منطقی لحاظ سے غلط ہو، تو ہو، ایک فطری ردِ عمل تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اگر ورڈز ورتھ جیسا عظیم فن کار اس نظارے کو دیکھتا تو وہ ایک شاہکار نظم کی تخلیق کرتا۔ لیکن میم صاحب ورڈز ورتھ کی شیدائی تھی، ورڈز ورتھ نہیں تھی۔ اس کا یہ بیان کہ وہ رنگوں سے وہی کچھ کرتی ہے جو ورڈز ورتھ الفاظ سے کرتا رہا...... اس حد تک صحیح ہے کہ ان کا موضوع ایک تھا لیکن جس طور سے ورڈز ورتھ اپنے موضوع کو پیش کر سکا اگر اُس طرح میم صاحب کر سکتی تو نہ وہ پریشان ہوتی اور نہ خودکشی کا ارتکاب کرتی...... ہوسکتا ہے کہ میم صاحب کے پاس حسنِ فطرت سے متاثر ہونے کی اتنی ہی صلاحیت تھی جتنی ورڈز ورتھ کے پاس تھی۔ ہوسکتا ہے کہ فطرت کے حسین مناظر دیکھ کر اُس پر بھی وہی دیوانگی طاری ہوتی ہو جس نے ورڈز ورتھ سے اپنی شاہکار نظمیں کہلوائیں۔ لیکن کیمبرج یونیورسٹی میں انگریزی ادب کی طالبِ علم ہونے کے باوجود اس کے پاس اظہار اور بیان کی وہ

قوت نہیں تھی جو ورڈز ورتھ کے پاس تھی۔ اسی لئے اس منزل پر پہنچ کر وہ ورڈز ورتھ سے زیادہ رمضانا کے قریب ہو جاتی ہے اور اس سے قربت کبھی کبھی یہ دھوکا لگتا ہے کہ وہ رمضانا کی شخصیت اور کردار کا ایک تسلسل (Continuity) ہے۔ رمضانا کے ''دیوانہ پن'' اور میم صاحب کی ''پریشانی'' میں جو عنصر مشترک ہے وہ ہے ایک جذبے، تجربے اور کیفیت کے اظہار کے لئے کوئی ذریعہ نہ ملتا۔

رمضانا کے دل میں جو جذبات پہاڑوں، مرغزاروں اور ڈل کی سطح پر تیرتے ہوئے پتوں کو دیکھ کر پیدا ہوتے ہیں۔ اُن کے اظہار کے لئے اُس کو الفاظ نہیں ملتے اور وہ ''پاگل'' ہو جاتا ہے۔ میم صاحب کے دل میں ایک حسین ڈھلتی ہوئی شام کو دیکھ کر جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اُسے کینوس پر منتقل کرنے کے لئے اس کا فن اس کا ساتھ نہیں دیتا۔ اس لئے وہ ''پریشانی'' ان کی موت کا سامان کر دیتے ہیں۔ اور ملہ سبحان کو میم صاحب کے ساتھ کوئی قریبی رشتہ اور تعلق محسوس ہوتا ہے اور آخر چپکے سے ہمارے کان میں کہتا ہے کہ ''دیکھا انسان کتنی عجیب چیز ہے، رمضانا اس لئے جان دیتا ہے کہ حسن کی وسعتیں محدود ہوگئیں اور میم صاحب اس لئے مرجاتی ہیں کہ حسن کی وسعتیں لامحدود ہو جاتی ہیں۔'' وہ ہم سے پوچھتا ہے کہ انسان کی اس بوالعجبی کو کس فارمولے اور نظریے کے تحت سمجھاؤ گے۔'' وہ کوئی حل یا کوئی فارمولا تجویز نہیں کرتا۔ وہ ہمارے ساتھ خود محوِ حیرت ہے۔

میم صاحب سے راہی صاحب کو سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ وہ حسنِ فطرت کی وسعتوں میں کھو کر پریشان کیوں ہو جاتی ہیں۔ اُس کی روح کو یہ منظر دیکھ کر شادماں ہو جانا چاہیئے تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ حسن سے مسحور ہو کر آدمی ایک متعلق سیاست دان کی طرح نہیں سوچتا اور اُس کو اپنا وجود کھویا ہوا محسوس نہیں ہوتا۔ راہی

صاحب مجھے معاف کریں گے کہ وہ لفظِ ''پریشان'' کے صرف ایک ہی معنی جانتے ہیں جو لغت میں درج ہیں ۔افسانہ نگار نے میم صاحب کی مسرت ، حیرت واستعجاب اور Ecstacy کیلئے پریشان کا لفظ استعمال کیا ہے اور برمحل استعمال کیا ہے۔ یہاں پریشانی کا لفظ ان معنوں میں استعمال نہیں ہوا ہے جن معنوں میں یہ شکست ،افسردگی، کش مکش اور اُلجھنوں سے پیدا شدہ ذہنی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ یہاں یہ اضطرار، بے چینی ،مسرت اور جذبات کی اس شدت کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے جو حسن کی سحر طرازیوں سے پیدا ہو جاتی ہے۔اپنی محبوبہ کو دیکھ کر آپ کے دِل میں جو ہل چل ، جو خلش اور بے چینی کی کیفیت پائی جاتی ہے وہ دراصل مسرت اور فرحت کی پیداوار ہوتی ہے۔میم صاحب کی پریشانی کی کیفیت کو راہی صاحب نے ان کے کردار اور اس ماحول سے الگ کر کے دیکھا ہے جو اس کا ایک حصہ ہے۔حسن کا اثر مختلف ذہنوں اور شخصیتوں پر مختلف انداز میں ہوتا ہے۔ راہی صاحب کا میم صاحب کی ''پریشانی'' دیکھ کر ان کے متعلق یہ فیصلہ کرنا کہ ان کی رُوح بیمار ہے یا یہ کہ اس نے حسن دیکھا ہی نہیں ......ایک جذباتی فیصلہ ہے۔ان کا یہ کہنا کہ حسن دیکھ کر آدمی کھو نہیں جاتا ،ایک شاعر، ایک نقاد اور ایک ادیب سے زیادہ ایک ایسے سائینس دان کی رائے معلوم ہوتی ہے جو انسانی ذہن کو جذبات کی بجائے ''آلات'' سے جانچتا ہے اور اگر واقعی راہی صاحب حسن کو دیکھ کر کھوتے نہیں تو کہنا پڑے گا۔

زِنقصِ تشنہ لبی واں بعقل خویش مناز
دِلت فریب گراز جلوۂ سراب نخورد

میم صاحب کا تحیر اور ان کی افسردگی مسرت کی انتہا ہے۔اس مسرت میں

شریک ہونے کے لئے نقاد میں حسنِ فطرت سے محظوظ ہونے کی اتنی ہی گہری حس کا ہونا ضروری ہے جتنی میم صاحب میں تھی۔راہی صاحب جانتے ہیں کہ آنسو، صدمے، غم اور شدید رنج کے اظہار ہوتے ہیں۔لیکن وہ اس وقت کیا کہیں گے جب فرطِ مسرت اور انتہائی شادمانی کے وقت بھی اس کا اظہار آنسو بہا کر کرے۔ کسی بہت ہی حسین عورت کو دیکھ کر میری طرح راہی صاحب پر بھی سنجیدگی اور افسردگی کی کیفیات طاری ہوں گی۔لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس سنجیدگی اور افسردگی کی تہہ میں وہ مسرت اور فرحت پوشیدہ ہے جو زندگی بھی ہے اور زندگی حاصل بھی ......ورڈز ورتھ نے اس کیفیت کو یوں بیان کیا ہے:۔

To me the meanest flower that blows
brings thoughts that often are too deep
for tears.

میم صاحب پر راہی صاحب کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اس نے حسن فطرت میں کھونے کے بعد یہ کیوں کہا......''افسوس! اس منزل پر میرا کوئی رہبر نہیں، یہاں نہ ورڈز ورتھ پہنچ سکا اور نہ وان گاگ......''راہی صاحب کہنا یہ چاہتے ہیں کہ میم صاحب نہ ورڈز ورتھ کو سمجھ سکی تھی اور نہ وان گاگ کو...... میں سمجھتا ہوں کہ میم صاحب ان معنوں میں ''فن کار'' نہیں تھی جن معنوں میں یہ لفظ ورڈورتھ، شیلے، کیٹس ،وان گاگ اور پکاسو کے لئے استعمال ہوتا ہے۔وہ ایک پندرہ سولہ برس کی Addolscent لڑکی ہے جس کی جذبات اور احساسات عنفوانِ شباب کی رومانیت کے مظہر ہیں۔حسن فطرت کے شدید احساس میں وہ جنسی جذبہ بھی کارفرما ہے جو اس عمر میں ایک نام سی خلش کے طور پر اُبھرنے لگتا ہے۔وہ ان ہی معنوں میں فن

کار ہے جن معنوں میں اس عمر کی کوئی لڑکی یا لڑکا فن کار ہوسکتا ہے یا جس طرح اس عمر میں شاعر اور افسانہ نگار تھا۔ یہ زندگی کی وہ منزل ہے جہاں ہر انسان شاعر، افسانہ نگار اور مصوّر ہوتا ہے۔ خیالات اور شعور کی پختگی ''جوانی کی اس کشاکش'' کے بعد ہی ظاہر آتی ہے۔ میم صاحب کے نظریۂ فن اور حسن پر مسلمہ فن کاروں کی طرح بحث کرنا، میم صاحب کے ساتھ بھی زیادتی ہے اور اپنے ساتھ بھی، اس کی رومانیت کا تجزیہ کرنے کے لئے اس کی عمر، اس کے ماحول اور اس کے ذہنی پس منظر کو اپنے ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ وہ اسی طور پر ورڈز ورتھ سے متاثر ہو کر اُسے اپنا محبوب شاعر سمجھتی ہے جس طور پر آج کی نوجوان لڑکیاں فیضؔ یا ساحر لدھیانوی پر فریفتہ ہوتی ہیں۔ یہ لڑکیاں نہ تو فیضؔ کے کلام کی معنویت، نہ اس کے فکر کی گہرائی اور نہ اس کے سخن کی اصلیت سمجھتی ہیں اور نہ ساحرؔ کے کلام کی موسیقیت کی صحیح رُوح کو پاسکتی ہیں۔ لیکن ان شاعروں کے ساتھ انہیں ایک جذباتی ہم آہنگی محسوس ہوتی ہے۔ ورڈز ورتھ اور وان گاگ سے میم صاحب کا لگاؤ اسی جذباتی ہم آہنگی کی پیداوار ہے...... اخترؔ نے کہیں بھی میم صاحب کے نظریات یا فلسفے سے اتفاق کرنا ضروری قرار دیا ہے۔ اور نہ ہی افسانے سے یہ بات کہیں Suggest ہوتی ہے۔

راہیؔ صاحب نے میم صاحب اور وان گاگ کے جذباتی تعلق کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے وان گاگ کی زندگی کے اُن گوشوں سے بھی ''پردہ'' سرکایا ہے۔ جہاں ان کے خیال میں ہماری نگاہ نہیں جاسکتی۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ وان گاگ کے بارے میں، میں صرف یہ جانتا ہوں کہ وہ بہت بڑا مصوّر تھا۔ میں نے اس کی زندگی کے متعلق کچھ ناول ضرور پڑھے ہیں، لیکن وان گاگ کے نام سے میرے ذہن میں صرف ایک مصوّر کی تصویر آجاتی ہے اور اس کی ذاتی زندگی کے

بارے میں بہت کچھ جاننے کے باوجود مجھے صرف اس کا فن ہی اپنی جانب متوجہ کرلیتا ہے۔ مجھ میں وان گاگ کے فن سے محظوظ ہونے کی صلاحیت نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح راہیؔ صاحب میں بھی نہیں ہے۔ میں یہ جانتا ہوں کہ دُنیا کے مصوّروں میں اُسے ایک عظیم مقام حاصل ہے۔ یہ مقام اُسے کیوں حاصل ہے یہ میں نہیں جانتا...... میم صاحب چونکہ مصوّری سے شوق رکھتی ہیں اسلئے وہ غالباً یہ ضرور جانتی ہوں گی کہ وان گاگ بھی حُسنِ فطرت کی تصویر کشی کیا کرتا تھا، وہ وان گاگ کے فن سے متاثر اور مرعوب نظر آتی ہیں اور وان گاگ کا نام لیتے وقت اس کے ذہن میں صرف وان گاگ کے فن کا ہی تصوّر آتا ہوگا۔ بالکل اسی طرح جس طرح غالبؔ کا نام سنتے یا لیتے وقت میرے ذہن میں دیوانِ غالبؔ کا ہی تصوّر رہتا ہے اور غالبؔ کی وظیفہ خواری اور جُوئے بازی کا خیال نہیں آتا۔ وان گاگ کے فن کے متعلق راہیؔ صاحب خود کچھ نہیں جانتے وہ اس کے متعلق کچھ جاننے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ وہ صرف اس کی ذاتی زندگی کے وہ حالات جو آرنلڈ ہاسر نے اپنی کتاب "The Social History of art" میں لکھے ہیں نقل کرتے ہیں اور اس کے بعد فیصلہ دیتے ہیں کہ میم صاحب اور وان گاگ کی حسن شناسی میں تو کوئی تعلق ہی نہیں...... میں راہیؔ صاحب سے یہ پوچھوں گا کہ جب وہ وان گاگ کی حسن شناسی کے متعلق کچھ جانتے ہی نہیں ہیں تو پھر میم صاحب کی حسن شناسی کو اس معیار پر کیوں جانچتے ہیں؟ میم صاحب پر راہیؔ صاحب نے وان گاگ سے ناواقفیت کا الزام تو لگا دیا، لیکن خود ناواقف ہونے کا اعتراف کرنے کے باوجود میم صاحب پر اپنی علمیت کا سِکّہ جمانے کی کوشش کرنے کے لئے وان گاگ کی حسن شناسی کے متعلق ان کی معلومات میں اضافہ کردیا ہے...... میم صاحب نے وان

گاگ کی مصوری کو ذہن میں رکھ کر اس کا نام لیا تھا، راہی صاحب نے اس نام کی تحلیل نفسی فرما کر میم صاحب کے انجام کی ''وضاحت'' کرنی چاہی۔ راہی صاحب اگر افسانے کے سارے کرداروں کو تحلیلِ نفسی کے اسی زاویئے سے دیکھتے تو خود اُن کے ذہن کی کئی گرہیں کُھل جاتیں!

میم صاحب کے مکالموں کا یہ حصہ، جس میں وہ ورڈز ورتھ اور وان گاگ کا نام لے کر یہ کہتی ہیں کہ اس منزل پر میرا کوئی رہبر نہیں، دراصل اس کی خود کلامی ہے۔ یہاں وہ ملا سبحان سے نہیں، بلکہ اپنے آپ سے مخاطب ہے۔ ان الفاظ سے ہم اس ہنگامے کی ایک جھلک ہی پا سکتے ہیں جو میم صاحب کے ذہن، شعور اور تحت الشعور میں برپا ہے۔ ان الفاظ کو مکمل بیان سمجھ کر ان میں کوئی تسلسل، ربط اور معنویت تلاش کرنا ناممکن نہیں، مُشکل ضرور ہے اور ایسا کرنے کے لئے نفسیات کا ماہر ہونا ضروری ہے۔ یہ الفاظ میم صاحب کے Thought Process کا ایک بے ربط سا اظہار ہیں...... ملہ سبحان کی ذہنی سطح اتنی پست ہے کہ میم صاحب اُس سے ورڈز ورتھ اور وان گاگ کے موضوع پر کھل کر بات کر ہی نہیں سکتی ہے۔ اسی لئے وہ وفورِ جذبات سے مغلوب ہو کر اپنے ہی ساتھ باتیں شروع کر دیتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ انسان جب اپنے آپ سے باتیں کرتا ہے تو ان میں وہ اختصار اور اشارات ہوتے ہیں کہ دوسرا آدمی متکلم کی ذہنی کیفیت کو سمجھے بغیر ان کا مطلب نہیں سمجھ سکتا۔ ہیملٹ کی خود کلامی کو بھی اس کے ذہنی پس منظر اور اس کی شخصیت سے الگ کر کے دیکھا جائے تو یہ ایک دفترِ بے معنی نظر آئے گا۔ میم صاحب پر یہ الزام لگانا کہ وہ ورڈز ورتھ اور وان گاگ کو اس طور سے نہیں سمجھی ہیں جس طرح راہی صاحب سمجھے ہیں، ہو سکتا ہے کہ ٹھیک ہو، لیکن اس الزام کی بنیاد جس تجزیے پر رکھی گئی ہے وہ

بجائے خود غلط ہے اور یہ بھی کیا ضروری ہے کہ میم صاحب اور راہی صاحب کے طرزِ فکر اور ذہن میں مماثلت ہی نہیں بلکہ یکسانیت کا بھی مطالبہ کیا جائے۔

راہی صاحب کا کہنا ہے کہ ملہ سبحان کا جج کے سامنے بار بار یہ فقرہ دُہرانا کہ ''آج ہاتھ کا شل نِکل گیا!'' بے معنی ہے اور اس سے کسی بات کی وضاحت نہیں ہوتی۔ جہاں تک اس کی معنویت کا تعلق ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس مختصر سے اشارے میں ایک کائنات چھپی ہوئی ہے۔ رمضانا کے ''دیوانہ پن'' اور پھر موت کو ملہ سبحان نے گوارا کر لیا تھا، رمضانا کی خود کشی کو اس کے دیوانہ پن کا نتیجہ سمجھ کر اس نے اپنے زخموں پر مرہم رکھ لیا تھا، لیکن میم صاحب کی آمد سے رمضانا کی موت کے زخم پھر ہرے ہو گئے۔ میم صاحب کی باتوں میں اسے رمضانا کی گونج سنائی دی۔ اُسے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ شاید رمضانا پاگل نہیں تھا، کیونکہ میم صاحب پاگل نہیں ہو سکتی۔ اسے اس بات کا یقین ہو گیا کہ رمضانا وہی سب باتیں کہنا چاہتا تھا جو میم صاحب کہہ رہی ہیں۔ اس نے میم صاحب کے وجود میں اپنے رمضانا کی رُوح اور اس کا عکس دیکھنا شروع کیا۔ میم صاحب اور رمضانا دونوں ہی حسنِ فطرت کے شیدائی تھے۔ اس بات کا ملہ سبحان پر بڑا گہرا اثر ہوا۔ اور پھر رمضانا کی موت کا واقعہ سن کر جب میم صاحب نے خود کشی کی تو ملہ سبحان سوچنے لگا...... کہ ''رمضانا کے مرنے اور پھر میم صاحب کے مرنے میں کوئی گہرا تعلق ہے......'' وہ تعلق کیا تھا، اسے وہ بیان نہیں کر سکتا تھا۔ ملہ سبحان رمضانا کے دیوانہ پن اور میم صاحب کے وجد وحال کو پریوں اور جنوں کی ''نظر'' سے تعبیر کرتا تھا۔ اس سے اس کی ضعیف الاعتقادی ظاہر ہوتی ہے۔ قدرتی طور جب اسے رمضانا اور میم صاحب کی موت میں اتنی مماثلت نظر آتی ہے تو وہ اپنے طور سے یہ سمجھ لیتا ہے کہ میم صاحب اور

رمضانا کا آپس میں کوئی گہرا رشتہ ہے۔ یہی نہیں، اُسے اپنا وجود بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی نظر آتا ہے۔ میم صاحب کی لاش کو گود میں لئے اُسے محسوس ہوا کہ "یہ میری بیوی ہے۔ نہیں! یہ میری بہو ہے۔ نہیں نہیں !! یہ میری بیٹی ہے۔ نہیں نہیں!!!......آج بات کا شل نکل گیا۔"

آج بات کا شل نکل گیا، یعنی آج یہ عقدہ کھل گیا، بڑا ہی بلیغ فقرہ ہے اور اس میں ملہ سبحان کا تحیّر، اس کی ضعیف الاعتقادی اور وہ جذبات پوشیدہ ہیں جن کو وہ الفاظ کی شکل نہیں دے سکتا۔ اس مرحلہ پر ملہ سبحان کے جذبات بھی رمضانا اور میم صاحب کی طرح الفاظ کے سانچے میں نہیں ڈھل سکتے۔ ملہ سبحان کے اس عجز نے اس اجمال کو وہ تفصیل بخشی ہے کہ پڑھنے والا (بہ استثنائے جناب راہی) وہ سب کچھ سمجھتا ہے جو ملہ سبحان کہنا چاہتا تھا، جسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے، بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ساری داستان سُن کر بھی اگر راہی صاحب اور جج صاحب اس فقرے کی معنویت اور اس کے اجمال کی تفصیل سے کچھ نہیں سمجھتے تو اس میں ملہ سبحان سے زیادہ ان کا اپنا قصور ہے۔

مفصل تنقیدی تجزیے کے بعد راہی صاحب نے افسانے کے کرداروں کے متعلق جو رائے دی ہے وہ بڑی اہم اور قابل غور ہے۔

"رمضانا کی موت، میم صاحب کا مرنا اور آخر میں ملہ سبحان کی "دیوانگی" یہ سب واقعی عجیب ہے۔ عظیم کردار دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور ضمیر میں بہار آجاتی ہے۔ اختر کے کرداروں کا انجام دیکھ کر رحم آتا ہے اور دِل تنگ ہوجاتا ہے۔ افسانے کا "آدم" بے شک عجیب (Strange) ہے، لیکن اس کو عجب ذات Wonderful نہیں کہہ سکتے۔"

افسانے کے کرداروں کا انجام دیکھ کر واقعی رحم یا تنگ دِلی کا احساس ہوتا ہے یا نہیں؟ میں اس موضوع پر یہاں بحث نہیں کروں گا۔ میں نے ان کرداروں کے متعلق جو کچھ کہا ہے اُس سے ثابت ہوگا کہ کم از کم میرے دِل میں رحم یا تنگ دِلی کے جذبات پیدا نہیں ہوئے۔ رہی یہ بات کہ یہ کردار Strange ہیں Wonderful نہیں۔ اگر راہی صاحب نے پورے خلوص اور نیک نیتی سے یہ رائے دی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ اختر کے افسانے کی کامیابی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس افسانے کا موضوع ہی یہی ہے کہ انسان ایک عجیب (Strange) ذات ہے۔ اِس افسانے میں اختر انسان کی عظمت پر نہیں بلکہ اس کے Strange ہونے پر دلالت کرتا ہے، اس کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ انسان، جو زندگی سے اتنی گہری وابستگی رکھتا ہے جو ناکامیوں، محرومیوں، پشیمانیوں اور ذلّتوں کے باوجود زندگی کو محبوب رکھتا ہے۔ وہ اتنا عجیب ہے کہ کبھی کبھی موت پر اسے قربان کر دیتا ہے۔ مجھے یہ افسانہ راہی صاحب کے اس شعر کی بڑی حسین تفسیر معلوم ہوتا ہے۔

آدم چھُ عجب ذات، دِپان مرگ چھُ مشکل
گر شوق سینس تھونہٕ زوس رژھ ہتہٕ حصرٕ چھ

یہ زندگی کی رعنائیوں، اس کے تنوع اور اس کی رنگا رنگی کی دلیل ہے کہ اس میں عظیم کرداروں کے ساتھ ساتھ عجیب کردار بھی ملتے ہیں اور اختر نے انسان کی عظمت پر تقریر کرنے کی بجائے ہمیں یہ بتایا ہے کہ زندگی کو خانوں میں نہیں بانٹا جا سکتا، انسانوں کو مشینوں کی طرح Classify نہیں کیا جا سکتا۔ فن کار زندگی کے اچھے اور بُرے پہلوؤں پر فیصلہ صادر نہیں کرتا۔ وہ انہیں صرف پیش کرتا ہے اور اس

طور پیش کرتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو اس زندگی اور ماحول کا ایک حصہ سمجھنے لگتے ہیں اور پیش کرنے کا یہ عمل اتنا سطحی نہیں ہوتا جتنا بظاہر کچھ لوگ سمجھتے ہیں۔ اختر کے افسانے کے موضوع اور اس کے کرداروں کو آرنلڈ ہاسر کے اس بیان کی روشنی میں جانچنا چاہیئے:۔

All art is , Properly speaking, a kind of Donquioctism, an attempt to adjust the world to the claims of an individual who reacts to an intolerable reality with unrealistic ideas. Both the artist and the fool sacrifice the world rather their own demands, or as they prefer to call them ideals.

("تعمیر" مارچ، اپریل ۱۹۶۰ء)

☆☆☆

شمیم احمد شمیم

آزاد کا شعور

سائنس، فلسفے اور نفسیات کے مطالعے کی روشنی میں بھی کبھی کبھی انسانی ذہن بھٹک جاتا ہے۔ تمدّن اور ترقی کے اس موجودہ دور میں بھی کئی مسئلے اس قدر پیچیدہ ہیں کہ ان کا حل تلاش کرنا تو الگ رہا، ان کی نوعیت کو سمجھنا اور اس پیچیدگی کو ذہن نشین کرنا بھی مشکل ہے۔ ان عقدہ ہائے لاینحل میں سب سے بڑا عقدہ خود ذہنِ انسانی ہے جو ہزاروں گتھیاں سلجھانے کے بعد بھی خود ایک معمّہ ہے۔ ابھی تک کوئی ایسا فارمولہ یا قاعدہ کلیہ وضع نہیں ہوا ہے جو اس کی ساخت کے ساتھ ساتھ اس کے کردار اور عمل کا احاطہ بھی کر سکے۔

مارکسزم نے بہت حد تک انسانی ذہن کے نشوونُما اور اس پر ماحول کے اثرات اور ردِ عمل کا ایک سائنٹفک نقطۂ نگاہ پیش کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس فلسفے نے بہت سے تضادات کو دُور کر دیا ہے لیکن اس سفر میں کچھ ایسے نازک مقامات اب بھی ضرور ہیں جہاں سے گذرتے وقت عقلیت کے چراغ کی لَو مدہم پڑ جاتی ہے۔ مارکسزم کی رُو سے انسان کے ذہن اور اس کے شعور اور ماحول کو سمجھے بغیر اس کی شخصیت، کردار اور فطرت کو سمجھنا مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے۔ یہی نہیں بلکہ ماحول میں انسان کی فطرت کو اس حد تک بدلنے کی قوت موجود ہے کہ اگر ایک

ذہین اور طباع بچے کو نامناسب اور ناموافق ماحول ملے تو اس کی ذہانت اور فطانت کا جوہر ضائع ہوگا اور اسی طرح ایک غبی اور نالائق بچے کو سازگار ماحول میں اپنی شخصیت کو پروان چڑھانے کے مواقع مل سکتے ہیں۔ یہ تمام مفروضے تجربوں سے گذر کر اب باقاعدہ سائینٹفک قانون بن چکے ہیں۔ لیکن ان تمام قوانین کے ہوتے ہوئے بھی ایک ایسی منزل آجاتی ہے جہاں ہم بے بس ہوجاتے ہیں۔ ایک ہی دور اور ایک ہی ماحول میں تربیت پانے والی دو شخصیتیں کیوں کر دو مخالف سمتوں میں سفر کرتی ہیں، اُن کا شعور، طرزِ فکر، رُجحانات اور میلانات ایک دوسرے سے مختلف ہی نہیں بلکہ ایک دوسرے کی ضد کیوں کر ہوسکتے ہیں، ماحول کا طلسم یہاں آکر پیچھے رہ جاتا ہے۔ انسان یہ سوچنے لگتا ہے کہ ایک ہی ماحول نے دو شیکسپیئر، دو ملٹن، دو غالب اور دو اقبال کیوں پیدا نہیں کئے۔ یہاں تک بات سمجھ میں آسکتی ہے لیکن تقریباً ایک ہی ماحول نے شیکسپیئر اور مارلو کیونکر پیدا کئے۔ ایک ہی ماحول میں غالب اور ذوق کے مختلف بلکہ متضاد ذہن کیوں کر وجود میں آئے۔ ماحول کی کارفرمائیاں مسلّم لیکن کبھی کبھی کچھ شخصیتیں، ماحول کے طلسم کو توڑ کر خود ماحول کو ہی متاثر کردیتی ہیں۔ ان کی صلاحیتیں اور قوتیں مخالف ہواؤں میں ہی جلا پاتی ہیں۔ ان میں متاثر ہونے سے زیادہ متاثر کرنے کی قوت پائی جاتی ہے اور یہی ''عہد آفریں'' شخصیتیں تاریخ کے بہاؤ کا رُخ موڑ کر اسے ایک نئی سمت میں لے جاتی ہیں۔ عبدالاحد آزاد کا شمار ان ہی شخصیتوں میں کیا جاسکتا ہے جو اپنے ماحول کے آگے سپر ڈالنے کی بجائے اپنی آشفتہ سری کے سہارے آگے بڑھتی رہتی ہیں اور اسی طرح کبھی کبھی اپنی دُنیا سے بہت آگے نکل جاتی ہیں۔ آزاد اپنی اس ''تیز گامی'' اور ''جنوں خیزی'' کی قیمت ابھی تک ادا کررہے ہیں۔ زمانے کو اس منزل تک پہنچنے

میں ابھی کافی وقت درکار ہوگا جہاں آزاد کے شعور، اس کی فکر اور اس کے ذہن نے ڈیرے ڈال دئے ہیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آزاد اپنے وقت سے بہت پہلے پیدا ہوگئے تھے، اس لئے ابھی ان کی صحیح قدر و قیمت کا تعین آسان نہیں۔

آزاد مہجور کے ہم عصر تھے۔ وہ دراصل ایک ہی دور کی پیداوار ہیں، انہیں قریب قریب ایک ہی ماحول اور ایک ہی فضا نصیب ہوئی، لیکن اس کے باوجود ان کی آوازیں ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہونے کی بجائے ایک دلچسپ تضاد پیدا کرتی ہیں۔ مہجور کی آواز میں ترنم، موسیقی، لطافت، نرمی، گھلاوٹ اور سپردگی ہے۔ آزاد کی آواز میں وقار، بانکپن، تلخی، گرج اور للکار ہے۔ آوازوں کا یہ اختلاف دراصل دو ذہنوں کا ٹکراؤ ہے اور ذہنوں کا یہ ٹکراؤ ادب کے طالب علم کے لئے ایک دلچسپ مطالعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مہجور کی آواز کے لوچ نے بہت جلد دُنیا کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس میں ایک ایسی کیفیت تھی کہ مضمحل ذہنوں اور مفلوج احساس کو ایک تسکین سی مل جاتی۔ اسی لئے مہجور کو اپنی زندگی میں ہی وہ قبولِ عام حاصل ہوا، جس سے ابھی تک آزاد محروم ہے اور نہ معلوم اُسے کب تک اس سے محروم رہنا پڑے۔ مہجور کی راہ بڑی ہموار، آراستہ و پیراستہ تھی۔ یہ وہ راہ تھی جس پر حبہ خاتون، رسول میر اور محمود گامی نے قدم قدم پر چراغ روشن کررکھے تھے۔ اسی لئے مہجور میں ایک یکسانیت، توازن اور تسکین کا احساس ہوتا ہے۔ اس سفر میں ذہن کو جھٹکے نہیں لگتے، زخموں میں کُرید نہیں ہوتی بلکہ ایک میٹھے میٹھے درد کا احساس ہوتا ہے۔

مہجور کی شاعری کے مطالعہ کے بعد ایک ہلکی سی تھکان کا احساس تو ہوجاتا ہے لیکن اس تھکان میں بڑی لذت حلاوٹ اور نشاطیہ کیفیت شامل ہے۔ اس میں وہی راحت اور فرحت ہے جو راہی کو منزل پر پہنچنے کے بعد محسوس ہوتی ہے۔ مہجور

کے عشق میں جو خود سپردگی، والہانہ پن، پاکیزگی اور شرافت ہے، کشمیری شاعری میں اس کا آغاز حبہ خاتون سے ہوتا ہے اور مہجور کے ہاں یہ اپنے نقطۂ عروج پر ہے۔ رسول میر کے جمالیاتی شعور نے ان عناصر کو سنوار کر ان میں دوشیزہ گی پیدا کر لی اور مہجور نے اسی دوشیزگی کو آئینہ دکھا کر اپنی دوشیزگی کا احساس دلایا۔ آزاد نے اپنے لئے ایک الگ راہ منتخب کر لی۔ اس کی انفرادیت، عقلیت اور جذبۂ بغاوت نے آسودگی شوق کے لئے کچھ اور راہیں تراشیں۔ اسی لئے آزاد کی آواز کچھ نامانوس اور کچھ ناگوار معلوم ہوتی ہے۔ اس میں ترنم کی دل کشی نہیں، تفکر کی سنجیدگی ہے۔ اس میں رومان کی کیف آگیں لذت نہیں بلکہ بغاوت کی دھیمی دھیمی حدت ہے جو شعلہ بننے کے لئے بے قرار معلوم ہوتی ہے۔ آواز کا بانکپن، اس کا وقار اور اس کی گھن گرج کشمیری شاعری کے لئے بالکل نئی چیز ہے اور یہی وجہ ہے کہ آزاد کے شعور اور اس کے ذہن کو سمجھنے کے لئے ایک نئے شعور اور ایک نئے ذہن کی ضرورت ہے، ہم اپنے روایتی پیمانوں اور پرانے معیاروں سے اس کے ظاہری حُسن و قبح کا اندازہ تو کر سکتے ہیں لیکن اس فکر اور اس انانیت کا صحیح تجزیہ نہیں کر پائیں گے، جس نے روایت سے باغی ہو کر کشمیری شاعری کو ایک نیا ذہن عطا کیا، عشق و محبت کی ابدیت اور اس کا عالم گیر تاثر مسلّم لیکن زندگی کبھی کبھی ان سرحدوں کو پھاند کر ایک ہی جست میں کئی منزلیں طے کرنا چاہتی ہے۔ آزاد کی شاعری زندگی کی اسی ترنگ کی پیداوار ہے اور ہمیں آزاد کو سمجھنے کے لئے کچھ دوران کے ہمراہ چلنا ہوگا۔ ہمارے ہاں آزاد وہ پہلے شاعر ہیں جو آپ کو دعوتِ فکر دیتے ہیں اور جن کو سمجھنے کے لئے آپ کو کچھ ریاض کرنا پڑتا ہے۔ آزاد کشمیری ادب میں پہلے "تعلیم یافتہ" شاعر ہیں اور ان کی شاعری سے محظوظ ہونے کے لئے ایک مہذّب اور تعلیم یافتہ ذہن کی ضرورت

ہے۔ "تعلیم یافتہ" سے میرا مطلب ڈگری یافتہ نہیں بلکہ میں تعلیم کو اس کے وسیع تر معنوں میں استعمال کر رہا ہوں۔ آزاد کے شعور کا مطالعہ کرتے وقت آپ کو یہ اندازہ ہوگا کہ اپنے محدود سے ماحول اور اپنی چھوٹی سی دُنیا میں رہنے کے باوجود اس کی نگاہ اور اس کی فکرِ رسا نے کتنی منزلیں طے کیں۔ ایک گاؤں میں پیدا ہو کر اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اُنہوں نے سکول ماسٹر کی حیثیت سے دیہات ہی میں گذارا، انہیں شہر کی Intellectual سوسائٹی میں رہنے کا موقعہ نہیں ملا۔ دیہات کی زندگی اپنی سادگی، اپنے حسن اور اپنی تمام تر رعنائیوں کے باوجود بڑی محدود ہوتی ہے۔ یہاں زندگی کی وسعتیں گھٹ کر جوئے کم آب بن جاتی ہیں، یہاں زندگی کی رفتار بڑی سست اور مدہم ہوتی ہے۔ لیکن آزاد نے اسی محدود دُنیا میں بڑی وسعتیں پیدا کر لی تھیں۔ انہوں نے شہر میں کچھ پڑھے لکھے لوگوں سے تعلق پیدا کر دیا تھا اور وہ بڑی باقاعدگی سے ان سے تبادلۂ خیال کرتے۔ مذہب، سائنس، وطنیت، قومیت اور سماج سے متعلق ان کے تعلیمی قابلیت میٹریکولیشن سے زیادہ نہیں، لیکن وہ ہمارے آج کل کے "یونیورسٹی پاس" نوجوانوں سے زیادہ آزاد خیال اور ترقی پسند ہیں اور ان کی ترقی پسندی اور آزاد خیالی ایک گہرے سائنیسی نقطۂ نظر کی پیداوار ہے۔ آزاد غالباً پہلے کشمیری شاعر ہیں جس نے مذہب کا طلسم اپنی پوری کمزوری اور گھناؤنے پن کے ساتھ بے نقاب کر دیا اور یہ وہ دور تھا جب مذہب کے متعلق صحت مند تشکیک کو بھی قابلِ اعتراض سمجھا جاتا تھا۔ آزاد کے ہاں ہمیں پہلی بار فرسودہ عقائد اور مذہب کے متعلق ایک صحت مند اور سائنیسی تشکیک کا احساس ہوتا ہے اور یہ تشکیک گہری علمیت، سنجیدہ فکر اور عقلیت کی پیداوار ہے۔ صدیوں کے رسم و رواج اور عقائد سے انحراف کرنا بجائے خود ایک بہت بڑی بات ہے۔ آزاد کے ہاں جرأت

اور حوصلہ ہی نہیں، ذوقِ تجسس بھی ہے اور اس تجسس نے آزاد کی بغاوت کو ایک صدائے احتجاج ہی نہیں رہنے دیا، اس میں وقار، تمکنت اور سنجیدگی پیدا کر لی۔ روایتی مذہب سے آزاد کی بغاوت ایک فراری کاغذ رلنگ نہیں، ایک مجاہد کا نعرۂ مستانہ ہے اور پھر جس جرأت اور جس حوصلے سے آزاد نے یہ نعرہ بلند کیا، وہ آزاد ہی کا حصہ تھا، مذہب کے نام پر مذہب کے ٹھیکے داروں نے نفرت اور عداوت کی جو آگ بھڑکا رکھی ہے اس نے ایک پوری نسل کو جھلسا دیا ہے اور آئندہ آنے والی نسلوں کے شعور کو بھی بہت حد تک متاثر کیا ہے۔ آزاد تحریکِ آزادیٔ کشمیر کے اس دور سے متعلق تھے جب آزادی کے دشمن مذہبی منافرت پیدا کر کے تحریک کو ناکام بنانا چاہتے تھے۔ انہیں اس خطرے کا شدید احساس تھا، انہوں نے اپنی پوری قوت کے ساتھ اس قسم کے رُجحانات کا مقابلہ کیا۔

فند باز یارو بأز گارو بأز پٔژن زین
باؤن ژِہ تھۆو ہے کعبہ تہ بُت خانہ ونے کیاہ
کفرک تہ دینک تیر لأیم میر شکارو
صد پارہ گومُت سینہ میٚون بگراو دِلک ساز

اور پھر اپنی قوم کو ان شاطروں کی ریشہ دانیوں سے خبردار کیا، جو مذہب کو مال تجارت سمجھ کر اپنی مطلب پروری کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔

محبت بأ گراؤن ریٚوت کزٕ یونکھ قدرتن پیدا
ژِہ لوگتھ دین و ایمانس کرن باپار اِنسانو
بنیوٚک دینگ تہ دھرمک تھم، نہ دِینُک غم نہ دھرمک غم
کران انسانیت ماتم، وُچھِت چأنی کار اِنسانو

مذاہب عالم کا پیغام دنیا میں امن، آشتی، اخوت اور برادری پیدا کرنا ہے۔ دُنیا کی تاریخ میں ایک بھی ایسا مذہب نہیں ہے جس نے نفرت اور باہمی عداوت کا سبق دیا ہو، لیکن پھر بھی ہمیشہ مذہب کے نام پر قتل و غارت گری کا بازار گرم رہا اور مختلف مذاہب کے ماننے والوں نے ایک دوسرے کو اپنا دُشمن سمجھ کر مذاہب کے بنیادی اصولوں سے انحراف کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ مذاہب، نفرت، عداوت اور زہرانگیزی کے ادارے بن گئے۔ آزاد ایسے مذاہب سے اپنی بیزاری کا اعلان کرتے ہوئے اپنے لہجے میں بڑی تلخی پیدا کرتے ہیں۔

دۆ گنٛیار چھو یلہ مطلب پوزلیہ نمازن ہُند
سوزِس یُو یہ بخشائیش بیہ تُورِ لُدِتھ ڈاے

مختصر یہ کہ آزاد مذہب سے مایوس ہو کر بیزار ہو گئے تھے اور جیسا کہ میں نے کہا ہے ان کی یہ مایوسی جہالت یا لاعلمی کا نتیجہ نہیں تھی، بلکہ ان کی گہری علمیت اور عقلیت کی پیداوار تھی۔ انہیں اس بات کا شدید احساس تھا کہ موجودہ سائنسی دور میں اپنے ماضی کے تصور کو کلیجے سے لگا کر حال کے تقاضوں سے بے نیاز رہنا خود کشی کے مترادف ہے اور روایتی مذہب جہاں ہمیں ماضی پرستی کی طرف مائل کرتا ہے وہاں ہم سے قوتِ عمل اور آگے بڑھنے کا حوصلہ بھی چھین لیتا ہے۔

"شکوۂ ابلیس" ان کی ایک طویل اور مشہور نظم ہے۔ یہ نظم کو اقبال سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے لیکن اس کے باوجود کشمیری ادب میں اس کی اپنی ایک انفرادیت ہے اور اس سے ہمیں آزاد کے شعور کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ یہ نظم اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود کشمیری ادب میں ایک اہم اضافہ ہے۔ اس سے اُس عقلیت اور تفکر کو سمجھنے کی راہیں کھل جاتی ہیں جو آزاد کی ساری شاعری کا جُزوِ غالب ہے۔ خدا

اوراس کے بتائے ہوئے قوانین کے متعلق یہ صحت مند تشکیک دلچسپ بھی ہے اور فکر انگیز بھی۔تشکیک کے یہ جراثیم اُن ہی ذہنوں میں پرورش پا سکتے ہیں جو حقائق کو سمجھنے کی کوشش کریں، جو اپنے اندر تجزیے کی قوت رکھتے ہوں اور اجتماعی شعور کے ساتھ ساتھ اپنی انفرادیت پر اعتماد رکھتے ہوں، جو روایات کا احترام کرتے ہوئے حریتِ فکر کو بھی قابلِ صد احترام سمجھتے ہیں اور آزاد کا باشعور ذہن ان تمام اسلحہ جات سے مسلح تھا۔

آزاد کے نیشنلزم کی بنیاد دراصل انہی حقیقتوں پر قائم ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس کے ہاں انقلاب کا تصور بھی ایک صحت مند تعمیری احساس کے ساتھ اُبھرتا ہے۔وہ ایک ایسے سوشلسٹ نظام کا خواب دیکھتے ہیں جس میں مذہب اور ذات پات کے نام پر کسی قسم کی تفریق روا نہ رکھی جائے اور جس میں ہر انسان کو مساوی حقوق حاصل ہوں۔انقلاب کا یہ صحت مند تصور ہمارے بہت کم شعراء کے ہاں نظر آتا ہے۔ان کے ہاں انقلاب ایک عظیم مگر مبہم اور نامعلوم تبدیلی کا نام ہے جس کا تصور خود ان کے ذہنوں میں بھی نہیں ہے۔لیکن آزاد کے ہاں ہمیں ایک فکری وحدت اور تسلسل ملتا ہے جس سے اس کے ذہن کی بلوغت، اس کے خیال کی رفعت اور اس کے شعور کی پختگی کا احساس ہوتا ہے۔ان کے ہاں جہاں بھی انقلاب کا لفظ آیا ہے، اپنی پوری گہرائی اور گیرائی کے ساتھ آیا ہے، اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ آزاد کے ذہن میں اُس نئی دُنیا کا مکمل خاکہ ہے جو انقلاب کے بعد اُبھرے گی۔یہی نہیں وہ انقلاب کے عمل کا بھی شعور رکھتے تھے، اسی لئے وہ اپنی سماجی زندگی کے تضادات سے گھبرا کر کبھی مایوس نہیں ہوئے۔مستقبل پر ان کے بے پناہ اعتماد نے انہیں کبھی Frustrate نہیں کیا۔اپنی بلندی نظری اور بلندی پروازی کے باوجود ان کی نگاہیں

زمین پر رہیں۔انہوں نے اسی آب وگل سے اپنے صنم تراشے، ان کی عشقیہ غزلوں میں بھی یہ ارضیت بڑی نمایاں ہے۔وہ اپنے عشق میں بھی بڑے حقیقت پسند رہے، اپنے محبوب پر جان دینے کی خواہش رکھتے ہوئے بھی وہ محبوب سے معذرت کرتے ہیں کہ تم پر جان دے دیتا لیکن پھر گھر کی دیکھ بھال کون کرے گا۔یہ بات جو دراصل ہلکے پھلکے انداز میں کہی گئی ہے، بڑی بلیغ ہے اور بہت سی حقیقتوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

آزاد کے شعور کو سمجھنے کے لئے صرف ان کی شاعری کو زیرِ نظر نہیں رکھنا ہوگا بلکہ اُن کارناموں اور اُن کاوشوں کو بھی نگاہ میں رکھنا ہوگا جو ابھی ہماری نگاہوں سے اوجھل ہیں اور میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جب تک آزاد کی یہ غیر مطبوعہ نگارشات ہمارے سامنے نہیں آتیں، آزاد کی صحیح عظمت کا فیصلہ کرنا دُشوار ہی نہیں ناممکن ہے۔آزاد نے کشمیری ادب کی تاریخ میں پہلی بار ایک تحقیقی کام کا آغاز کیا اور یہ ہے "تاریخ ادب کشمیر" کی تالیف۔

بدقسمتی سے موت نے انہیں یہ کام مکمل نہیں کرنے دیا، لیکن اس سلسلے میں انہوں نے جس قدر بھی کاوش کی، اس کا کشمیری ادب کی تاریخ میں ایک اہم مقام ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آزاد کا ذہن نہ صرف میدانِ شعر میں اپنی خلاقی کے جوہر دکھا سکتا ہے بلکہ سنجیدہ اور علمی موضوعات پر قلم اُٹھاتے وقت بھی اس کے متوازن اور تنقیدی شعور کا احساس ہو جاتا ہے۔میں نے آزاد کو کشمیری زبان کا پہلا تعلیم یافتہ شاعر کہا ہے اور تاریخ ادب کشمیر کے مختلف عنوانات سے ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ ایک صحت مند اور متوازن تنقیدی شعور رکھتے تھے۔

آزاد کے ہاں ہمیں پہلی بار ایک واضح تنقیدی شعور کا احساس ہوتا ہے اور اس لحاظ سے میں اس کتاب کو حالی کے مقدمہ شعر و شاعری سے کم اہمیت کا حامل نہیں سمجھتا۔ اس کتاب کے موضوعات اور عنوانات کی ایک فہرست اس نمبر میں شائع ہو رہی ہے جس سے یہ اندازہ ہوگا کہ اس موضوع پر انہوں نے کس کاوش اور ترتیب سے خیالات پیش کئے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ کتاب جو حکومت کشمیر کے محکمہ ریسرچ اینڈ پبلی کیشنز نے خریدی ہوئی ہے، ابھی تک شائع نہیں ہو سکی ہے۔ اب جب کہ آزاد کی شخصیت پر سے بہت سے پردے اُٹھ چکے ہیں، اُن کے اس عظیم الشان کارنامے کو عوام کے سامنے آ جانا چاہیئے۔ اس کے علاوہ ان کے کچھ دوستوں کے پاس ان کی کچھ غیر مطبوعہ شعری تخلیقات بھی موجود ہیں اور اس نمبر کی ترتیب میں مجھے کچھ ایسی چیزیں دیکھنے کا موقعہ ملا۔ چند چیزیں جو میں حاصل کر سکا ہوں، اس شمارے میں پیش کی جا رہی ہیں، لیکن بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کی اشاعت اس وقت موزوں نہ ہوگی، کیونکہ کبھی کبھی آزاد کی حریتِ فکر نے ایک ہی جست میں بہت سی منزلیں طے کر لی ہیں اور ان منزلوں تک پہنچنے کے لئے ابھی ہمارے شعور کو کافی سفر کرنا پڑے گا۔ اس وقت ان کی اشاعت کئی جبینوں پر شکن پیدا کرے گی۔

آزاد کے شعور کے متعلق سب کچھ کہہ دینے کے بعد بھی پوری حقیقت سامنے نہیں آ جاتی۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ ان کے ہاں تغزل میں وہ کیفیت نہیں ملتی جو کشمیری شاعری کی فضا کا جزوِ غالب رہی ہے، ان کے ہاں زبان میں وہ لطافت اور رکھ رکھاؤ نہیں ملتا جس سے ہمارے ذہن مانوس ہیں، ان کے ہاں زبان میں وہ نرمی، آہستہ خرامی اور پُر سکون فضا بھی نہیں ہے جو رسول میر اور مہجور

کے ہاں ملتی ہے، ان کی غزلوں میں جذبات کی فراوانی تو ہے لیکن جذبات کی تہذیب کا وہ التزام نہیں جس سے شعر کے ظاہری رکھ رکھاؤ اور حسن میں اضافہ ہو جاتا ہے ان کی شاعری کا پیکر کھردرا اور ناہموار سا ہے، ان کی آواز میں کچھ کرختگی کا سا احساس ہوتا ہے۔

ان تمام عناصر کی کمی نے آزاد کی مقبولیت کو کم کر دیا ہے۔ آزاد کی آواز ہمیں ایک نئی آواز معلوم ہوتی ہے اور اسے مانوس ہونے کے لئے ہمیں کچھ ریاض کرنا پڑتا ہے۔ لیکن یہ کوئی بُری بات نہیں، صرف الفاظ کا رکھ رکھاؤ، فارم کی غنائیت اور جذبے کا انفعال ہی شعریت نہیں کہلاتا، خیال کی وُسعت اور اس کا حسن، جذبے کی صداقت اور خلوص کی گرمی بھی تغزل اور ترنم کی کیفیت پیدا کر سکتی ہے اور آزاد کی شاعری میں جذبے کی یہ صداقت اور خلوص کی گرمی موجود ہے، بالکل جس طرح اقبال کے کچھ نقادوں نے اقبال کو صرف اس لئے شاعر ماننے سے انکار کر دیا تھا کہ اس نے شعر جیسی لطیف صنفِ سخن میں فلسفہ اور فکر جیسے غیر شاعرانہ عناصر داخل کر لئے تھے اور ایک نیا شاعرانہ ڈکشن استعمال کیا تھا، اسی طرح ہمارے ہاں کے کچھ نازک مزاج آزاد کو اس لئے تیسرے درجے کا شاعر سمجھتے ہیں کہ اس کے کلام میں وہ نرمی اور گھلاوٹ نہیں ملتی جو ہماری عشقیہ شاعری کا جزوِ غالب ہے۔ آزاد کے ہاں یہ نرمی اور گھلاوٹ گرمی اور بغاوت میں بدل گئی ہے اور اسی لئے ان کے ہاں کی فضا بھی بدل گئی ہے۔ میں نے کہا ہے کہ آزاد نے کشمیری شاعری کو ایک نیا ذہن دیا ہے، ان کا اسلوب مقبول ہو یا نہ ہو، ان کا دیا ہوا ذہن آج کشمیری شاعری میں پورے شباب پر ہے۔ آج نادم، راہی، کامل، روشن، فراق اور نئی نسل کے درجنوں شعراء جس راہ پر جا رہے ہیں، یہ وہی راہ ہے جسے آزاد نے ہموار کر دینا شروع کر دیا

تھا۔ ان کی عقلیت اور ان کا سائنسی نقطۂ نگاہ آج ہمارے شعور کی اساس ہے، اس لئے ہم آزاد کے نظریات سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن انہیں نظر انداز نہیں کر سکتے، وہ اپنی تمام کمزوریوں اور کوتاہیوں کے باوجود کشمیری ادب کی وہ عظیم شخصیت ہیں جنہوں نے ایک پوری نسل کو متاثر کر دیا ہے۔ ان کی شخصیت کی ہمہ گیری اور عظمت کا اندازہ ان کے کارناموں سے نہیں بلکہ ان کے ذہن کی وسعت اور ان کے حوصلوں کی بلندی سے کرنا ہوگا۔ انہوں نے روایات سے انحراف نہیں کیا، لیکن کشمیری شاعری میں عقلیت پسندی کی روایات کو ضرور جنم دیا اور یہ بجائے خود ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ مجھے اس بات کا شدید احساس ہے کہ میں آزاد کے متعلق وہ سب کچھ نہیں کہہ پایا ہوں جو مجھے کہنا ہے۔ اس مختصر مقالے میں میں نے صرف کچھ اشارے کئے ہیں۔ آزاد پر لکھتے وقت مجھے پہلی بار اپنی کوتاہ قلمی اور کم مائیگی کا احساس ہو رہا ہے۔ اس کے شعور کی بلندی اور اس کے ذہن کی وسعت کو الفاظ کی گرفت میں لانا میرے بس کی بات نہیں، میں صرف ان چند اشاروں پر اکتفا کر کے مضمون ختم کروں گا۔

............☆☆☆............

شمیم احمد شمیم

میں شیعہ ہوں نہ سنی

میں شیعہ ہوں نہ سنی' میں نذیر احمد کی ماں ہوں۔ نہیں میں اس کی ماں نہیں ہوں' میں خود نذیر احمد ہوں۔ وہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے اور میرے جگر میں کس نے چھرا گھونپ دیا ہے۔ میں تڑپ رہی ہوں۔ میرا نذیر تڑپ رہا ہے۔...... ہم دونوں تڑپ رہے ہیں' ہمیں بچاؤ...... ہماری زبان سوکھ گئی ہے، گلا خشک ہو گیا ہے' کیا کسی کے پاس پانی کے دو گھونٹ بھی نہیں ہیں کہ جو میرے نذیر کو پلا سکے؟ کربلا کے شہیدوں کا ماتم کرنیوالو! میرے شہید کے لئے کیا تمہارے پاس آنسو کے چند قطرے بھی نہیں ہیں؟ مجھے آج یاد نہیں ہے کہ میرا مذہب کیا ہے مجھے صرف یہ احساس ہے کہ میں ایک ماں ہوں اور ممتا میرا مذہب ہے دنیا کا سب سے قدیم' سب سے عظیم اور عالم گیر مذہب' جس کی گود میں رسولوں نے پرورش پائی۔ اور جس کی ٹھنڈی چھاؤں میں پیغمبروں نے پیغمبری کے آداب سیکھے۔ تم جو آج شیعہ اور سنی بنے پھرتے ہو' جا کر اپنی ماؤں سے پوچھو کہ شیعہ اور سنی ہونے سے پہلے تم کیا تھے اور تم نے شیعہ اور سنی ہونے کا سلیقہ کہاں سے سیکھا؟ میں اس نذیر احمد کی ماں ہوں کہ جو نہ ابھی شیعہ تھا اور نہ سنی' کیونکہ بارہ سال کی عمر کے بچے نہ شیعہ ہوتے ہیں اور

نہ سنی۔ وہ صرف بچے ہوتے ہیں۔ نذیر احمد کو تو ابھی یہ علم بھی نہیں تھا کہ وہ مسلمان کیوں ہے؟ نماز کیوں پڑھی جاتی ہے روزے کیوں رکھے جاتے ہیں اور مسجدوں کے میناروں سے ہر صبح اذان کیوں دی جاتی ہے؟ وہ صبح کے فلسفے اور کربلا کے حادثے پر غور کرتا' البتہ یوم عاشورہ پر ماتمی جلوسوں کا تماشا دیکھ کر اسکے دل میں کچھ سوالات پیدا ہونے لگے تھے اور اسے یہ جان کر بڑا غصہ آنے لگا تھا کہ یزید نے رسولؐ کے نواسوں کو پیاس سے تڑپا تڑپا کر کربلا کے میدان میں شہید کر دیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ دسویں محرم کو جب وہ عاشورہ کے جلوس کا تماشا دیکھنے کے لئے گھر سے نکلا۔ تو اس نے مجھے آخری بار ماں کے نام سے پکار کر کہا تھا کہ ماں میں ماتم کرنے جا رہا ہوں۔ اسے کیا معلوم تھا کہ وہ مجھ بدنصیب کو ساری زندگی ماتم کرنے کے لئے اکیلا چھوڑ کر چلا جائے گا' اور میں ہر سال کربلا کے شہیدوں کی یاد کے ساتھ اپنے معصوم شہید کی یاد منانے کے لئے نہ معلوم کتنے سال اور زندہ رہوں......

میں کوئی پڑھی لکھی عورت نہیں ہوں' مجھے یہ معلوم نہیں ہے کہ واقعۂ کربلا کی مذہبی اور سیاسی نوعیت کیا ہے؟ میں صرف یہ جانتی ہوں کہ آج سے تیرہ سو سال پہلے کربلا کے میدان میں حضرت فاطمہؓ لخت ہائے جگر حضرت امام حسینؓ کو یزید نے بڑی بے دردی اور بے رحمی سے شہید کر دیا۔ میں نے سنا ہے کہ اماموں کی مائیں اپنے بیٹوں کی شہادت پر یوں تڑپ تڑپ کر روئیں کہ سارا آسمان خون کے آنسو رونے لگا۔ مجھے محرم الحرام کے متعلق صرف یہ معلوم ہے کہ مسلمان یہ مہینہ انہی شہیدوں کی یاد میں آج تیرہ سو سال سے مناتے آئے ہیں۔ ہم میں سے کچھ لوگ سینہ کوبی کر کے اپنے رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں......اور کچھ خاموشی سے اس

المناک سانحے پر آنسو بہا کر اظہار غم کرتے ہیں۔ میں اماموں کی شہادت کے المیے کو ایک ماں کی حیثیت سے دیکھتی اور محسوس کرتی ہوں اور میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ اس عظیم سانحے کا کوئی سیاسی' کوئی مذہبی یا فرقہ وارانہ رخ بھی ہے اور اسی لئے میں حیران ہوں کہ حسینؓ کا ماتم کرنے والے میرے نذیر پر کس طرح ہاتھ اٹھا سکتے ہیں؟ میں حیران ہوں۔ کہ میرے جگر میں چھرا گھونپنے والا ہاتھ کس یزید کا ہو سکتا ہے؟ ایک ماں کے غم میں رونے والے دوسری ماں کا چراغ بجھا کر کس طرح اپنی سوگواری کا اظہار کر سکتے ہیں؟ میرے نذیر کو مجھ سے چھیننے والے حسینؓ کا ماتم کرنے کے مستحق کیوں کر ہو سکتے ہیں؟ میری دنیا کو ویران کر کے نذیر کے بھائی بہنوں کی خوشیاں تاراج کرنے والے کس مذہب' کس فرقے سے تعلق رکھتے ہیں؟ محرم کے تعزیتی جلوسوں پر پتھراؤ کرنے والے، کس خدا کے بندے اور کس رسولؐ کے امت سے ہیں؟ حسینؓ کے غم میں گریہ زاری کرنے والوں کے غم کا مذاق اڑانا کس مذہب اور کس شریعت میں جائز ہے؟ میرے پاس ان تمام سوالات کا کوئی جواب نہیں۔ لیکن میں اپنے معصوم نذیر کی خاطر ان سوالات کے جواب چاہتی ہوں۔ تا کہ آئیندہ کسی ماں کا نذیر کسی یزید کی حیوانیت اور بربریت کا شکار ہو کر اس کی ماں، اس کے باپ، اس کے بھائی بہنوں کے لئے، قیامت اور کربلا کا سامان اور عنوان نہ بنے۔ میں اپنے نذیر کی موت کے لئے کسی شیعہ کسی سنی کو دوش نہیں دیتی......لیکن میں ان مذہبی رہنماؤں اور ان سیاسی رہزنوں کو دوش دئے بغیر نہیں رہ سکتی کہ جو ایک خالص مذہبی مظاہرے کو اپنی ذات اور اپنے مفادات کے لئے استعمال کر کے معصوم نذیروں کے قتل کا موجب بنتے ہیں جو کربلا کے شہیدوں کے ماتم کو اپنی سیاسی اور سماجی توقیر کا مسئلہ بنا کر اس کی عظمت اور تقدس کو پامال کرتے

ہیں مرے نذیر کے قاتل یہی سیاسی سوداگر اور مفاد پرست ہیں۔ کہ جو شیعہ اور سنی کا فساد بپا کر کے ماؤں سے ان کے بیٹے چھین لیتے ہیں۔

نذیر میرا بڑا لاڈلا بیٹا تھا۔ میں نے زیارتوں اور درگاہوں پر بھیک مانگ مانگ کر نذیر کو حاصل کیا تھا۔ اس کے ساتھ میرے اور اس کے باپ کے بہت سے ارمان وابستہ تھے۔ وہ ہماری زخمی جگر کو اس وقت تک تڑپاتا رہے گا جب تک کہ ہم زندہ ہیں۔ حسینؑ کا ماتم کرنے والے تو سال بھر کے لئے کربلا کے شہیدوں کو بھول جائیں گے لیکن میں ماں ہوں۔ میں اپنے شہیدوں کو کیوں کر بھلا سکتی ہوں۔ حسینؑ کے غم میں ساری دنیا روتی ہے لیکن میرے نذیر کے غم میں میرے ساتھ زندگی بھر آنسو بہانے کے لئے کون تیار ہوگا؟ میں پوچھتی کہ یہ کیسی دنیا ہے اور یہ کیسے لوگ ہیں کہ جو ایک ماں کے غم میں سینکڑوں سال سے رو رہے ہیں۔ لیکن دوسری ماں کو تنہا زندگی بھر رونے کے لئے مجبور کرتے ہیں؟ میں بار بار یہ سوچتی ہوں کہ میرے نذیر نے کیا کیا تھا کہ اسے یوں بے دردی کے ساتھ قتل کیا گیا؟ کیا کوئی شیعہ عالم یا کوئی سنی مولوی میرے اس سوال کا جواب دیکر میری بے چین روح، میری مضطرب اور بے قرار سانسوں کو اطمینان اور سکون کے چند لمحے میسر کر سکتا ہے؟
میں ہر شام اپنے نذیر کا انتظار کرتی رہوں گی میں ہر صبح اس کے کمرے میں اسے جگانے کے لئے جایا کروں گی۔ میں دن بھر اس کے وہ کپڑے دھویا کروں گی کہ جو پہن کر وہ سکول جایا کرتا تھا۔ میرے لئے وہ مرا نہیں، زندہ ہے جب تک میں زندہ ہوں۔ وہ بھی زندہ رہے گا۔ وہ میرے جسم، میری روح کا حصہ تھا اور جب تک میرے جسم میں جان موجود ہے۔ نذیر زندہ ہے۔ ہر سال جب محرم کا جلوس ہمارے گھر کے سامنے سے گزرا کرے گا۔ مجھے نذیر کے وہ الفاظ یاد آئیں گے کہ جو اس

نے مجھ سے آخری بار کہے تھے......"ماں! میں ماتم کرنے جا رہا ہوں"......ساری دنیا کربلا کے شہیدوں کا ماتم کرے گی۔ اور میں اپنے کربلا کے شہید کا ماتم کروں گی۔ کیونکہ میرے لئے آج کا کربلا اُس کربلا سے کچھ کم نہیں کہ جو آج سے تیرہ سو سال پہلے ہوا تھا۔

میں نے سنا ہے کہ کچھ سیاسی جماعتیں نذیر پر اپنا حق جتا کر اس کی شہادت کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ میں ان سیاسی سوداگروں سے گزارش کروں گی کہ میرے نذیر کی تجارت نہ کرو۔ اس کی موت کا سودا کر کے اسے اپنے حقیر مفادات کے لئے استعمال نہ کرو، وہ میرا بیٹا تھا۔ میرا حق اس پر سب سے فائق تھا۔ اسے کسی شیعہ نے نہیں مارا، کسی سنی نے نہیں مارا۔ اسے اس دور کے یزیدوں نے مارا ہے۔ جاہلوں اور فرقہ پرستوں نے مارا ہے۔ وہ شہید ہو گیا تا کہ فرقہ پرستی، تعصب اور جہالت کا اندھیرا مٹ جائے۔ اسے شہید ہی رہنے دو، اس کی تجارت نہ کرو۔

فقط

مرحوم نذیر کی ماں

(آئینہ ۲۵ر دسمبر ۱۹۷۷ء)

............☆☆☆..................

مزاحیہ

شمیم احمد شمیم

بِن بُلائے مہمان

موت اور مہمان ہمیشہ بِن بُلائے آتے ہیں۔ موت کے ٹالنے کا سامان کیا جاسکتا ہے۔ مگر مہمان کا ٹالنا ممکن نہیں۔ یہ بلائے ناگہانی جب سر پر سوار ہوتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری تمام ذہنی صلاحیتیں ہم سے چھن گئی ہیں۔ ہم گھبراہٹ میں اس بلائے جان سے چھٹکارا پانے کے لئے تیر پہ تیر مارتے ہیں اور جب سب تیر بیکار ثابت ہوتے ہیں، تو ہم کھسیا کر بڑی "خندہ پیشانی" سے اس کا استقبال کر کے اپنی شکستِ کا اعتراف کرتے ہیں۔ اس شکست میں کتنی محرومیاں، کتنی حسرتیں اور کتنے ارمانوں کا خون پوشیدہ ہوتا ہے اس کا احساس اُسی کو ہوسکتا ہے جس کے دسترخوان پر کبھی کسی بِن بلائے مہمان کو نازل ہونے کا اِتفاق ہوا ہو۔ بچارے نے کتنے ارمانوں سے اپنی نئی نویلی دُلہن کے ساتھ پہلی بار تنہائی میں بیٹھ کر زردہ اور مٹر پلاؤ کھانے کا پروگرام بنایا تھا کیونکہ کل شام کو ہی ہفتے بھر کے قیام کے بعد دُلہن کا بھائی گھر جا چکا تھا اور آج اُن کی ازدواجی زندگی کا یہ پہلا دن تھا، جب وہ بغیر کسی مداخلت بے جا کے صحیح معنوں میں اپنے گھر کے حکمران نظر آرہے ہوں۔ بیوی بھی بڑے انہماک اور دلچسپی سے کھانا بنا رہی ہے۔ اُس کی خواہش ہے کہ

میاں کو کھانے میں اس قدر لُطف آئے کہ وہ اُس کی تعریفیں کرتے کرتے سارا چٹ کر جائے۔ میاں بیوی دونوں یہ تصور کے محل بنا رہے ہیں کہ دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ دُلہن کے خالو جان تشریف فرما ہوتے ہیں۔ ریت کی دیوار دھڑام سے گر جاتی ہے۔ میاں بیوی کے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹیں جنم لینے لگتی ہیں۔ وضعداری نبھانے کیلئے خالو جان کی آمد پر جھوٹ موٹ خوشی اور جوش و خروش کا اظہار کیا جاتا ہے۔ خالو جان پھولے نہیں سماتے کہ اُن کی آمد پر بچوں کو کتنی خوشی نصیب ہو رہی ہے۔ شام کو دسترخوان پر خالو جان دُلہن کے پکائے کھانے کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہے ہیں مگر میاں کو تو جیسے چُپ لگ گئی ہے۔ اُسے تو کھانا زہر لگ رہا ہے۔ وہ ہاں ہوں کر کے ٹال جاتا ہے۔ خالو جان کو کیا معلوم کہ ان کی بے وقت تشریف آوری نے ان کے کِن کِن ارمانوں کا خون کر دیا ہے اور یوں ہی جب تک خالو جان سر پر سوار رہتے ہیں جھوٹی ہنسیاں ہنسی جاتی ہیں، تکلفات نبھائے جاتے ہیں۔ کوشش یہ ہو رہی ہے کہ خالو جان کو کہیں یہ محسوس نہ ہو کہ ان کا چند روزہ قیام میاں بیوی کو ناگوار ہے۔ یہ اس ناٹک کا انتہائی ناگوار پہلو ہے!

بِن بُلائے مہمانوں کی آمد کا سلسلہ کب سے شروع ہوا ہے؟ اس کا ہمیں ٹھیک سے کوئی عِلم نہیں۔ ہاں قیاس غالب ہے کہ اس کا آغاز مہمان نوازی کے ساتھ ہی ہوا ہے۔ زمانہ قدیم میں جب کچھ نیک اور بزرگ لوگوں نے مہمان نوازی کی روایات کی بنیاد ڈالی تو رفتہ رفتہ بِن بلائے مہمانوں نے بھی جنم لینا شروع کیا۔ اور جب سے اب تک یہ سلسلہ اس قدر دراز ہو چکا ہے کہ اب مہمان کم اور بِن بلائے مہمان زیادہ نظر آتے ہیں۔ اصل میں بِن بلائے مہمانوں کی نشوونما کے لئے

خاص قسم کی مٹی اور آب وہوا کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً ہندوستان کی مٹی اور یہاں کی آب وہوا انسانوں کی اس مخصوص نسل کے لئے بہت موزون ثابت ہورہی ہے جبھی یہاں پران کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ مغرب نے مہمان نوازی کی رسم کو حد اعتدال سے نہیں بڑھنے دیا اور اس پر کچھ ایسی پابندیاں عائد کیں جو اس صنف کو وہاں پنپنے نہ دیں گی۔ مثلاً وہاں ہر مہمان کے لئے یہ ضروری ہے کہ اُسے میزبان نے دعوت دی ہو۔ اُس پر یہ بھی پابندی ہے کہ وہ کسی مخصوص وقت پر ہی آنے کی زحمت گوارا کرے۔ ہم ان رسوم وقیود سے آزاد ہیں۔ میزبان کی طرف سے دعوت اور وقت کی تخصیص کو ہمارے ہاں تکلف سمجھا جاتا ہے۔ صبح کے پانچ بجے سے رات کے بارہ بجے تک کسی بھی وقت بغیر کسی اطلاع یا نوٹس کے آپ کے ہاں مہمان ٹپک سکتا ہے، موت کا تو ایک دن معین ہے۔ مہمان کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ بن بلائے مہمانوں کی کئی قسمیں ہوتی ہیں اور ان کی صحیح تقسیم کا کام کچھ آسان نہیں۔ ہاں نمونے کے طور پر کچھ قسموں کا ذکر کرنا مناسب نہ ہوگا۔

ان کی ایک قسم وہ ہے جو خود کو آپ کا بے تکلف دوست فرض کرتے ہیں۔ یہ لوگ بڑے خطرناک ہوتے ہیں اور ان سے بچنا عام طور پر محال ہوتا ہے۔ یہ کسی بھی وقت ایک نعرہ بلند کرکے آپ کے ہاں وارد ہوسکتے ہیں۔ بغیر کسی تکلف کے جو کچھ گھر میں پکا پکایا ہو، اُسی پر ہاتھ صاف کر جاتے ہیں۔ بھابی جان کی تعریفیں ہورہی ہیں، بے تکلفی میں آپ کی شکایتیں اور بُرائیاں ہورہی ہیں اور آپ سب کچھ سننے کے لئے ہی نہیں، بلکہ ہنسی خوشی سُننے کے لئے مجبور ہیں۔ کیونکہ آپ کا بے تکلف دوست آپ ہی کے گھر میں آپ کی چھاتی پر مونگ دل رہا ہے اور آپ کو بے تکلفی اور دوستی کی لاج رکھنا ہے۔

ایک قسم وہ ہے جو رشتہ داری کو پاسپورٹ سمجھ کر بغیر کسی جھجک کے تشریف فرما ہوتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اُن کا گھر ان کے دادا جان کی میراث تھی، جو انہوں نے آپکو بخش دی۔ اس لئے ان کا بھی اس گھر پر اسی قدر حق ہے جس قدر آپ کا، یہ لوگ اسقدر خطرناک نہیں، جس قدر اذیت ناک ہوتے ہیں۔ یہ بڑے ٹھاٹھ سے حکم چلاتے ہیں۔ فرمائشیں کرتے ہیں۔ ان کو آپکی گھڑی پسند آتی ہے۔ آپکا قلم اچھا لگتا ہے۔ آپکی نئی سلی ہوئی بش شرٹ بھاجاتی ہے اور جب تک آپ تنگ آکر کوئی نہ کوئی چیز انہیں بخش نہ دیں، یہ آپ کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔

ایک اور قسم میں وہ لوگ شامل ہیں، جو آپ کو اپنا برخوردار سمجھ کر آپکے بُرے بھلے کے ٹھیکے دار ہوتے ہیں۔ اگر یہ آپ کے پڑوس میں رہتے ہیں تو پھر ان سے گریز یا فرار ممکن نہیں۔ خیریت اسی میں ہے کہ آپ اپنا مکان بدل دیجئے۔ یہ ہر صبح عین اس وقت نازل ہوں گے جب آپ بڑے اطمینان سے ناشتہ فرمارہے ہوں۔ آپ سے مخاطب ہوئے بغیر یہ آپ کی بیوی سے یوں گویا ہوں گے "دلہن! ذرا چائے کی ایک پیالی بنانا، تمہارے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے بڑی مزیدار ہوتی ہے۔" دُلہن چائے بنا کردے گی۔ اس کے بعد یہ آپکی چھوٹی بچی کو پیار چمکار کر اُس سے پان بنوائیں گے۔ جب تک وہ پان بنارہی ہے وہ آپ سے بچی کی تعریفیں کرتے جائیں گے۔ "بڑی شریر لڑکی ہے، مجھے دور سے آتا دیکھ کر چمٹ جاتی ہے۔" آپ کو اپنی بچی سے اُلجھن ہونے لگتی ہے، وہ منہ میں پان ٹھونس کر آپکو نصیحتوں پر نصیحتیں جھاڑنا شروع کرتے ہیں، اس کار خیر سے فارغ ہوکر انہیں فوراً یاد آجاتا ہے کہ آج ان کا نوکر بھاگ گیا ہے۔ انہیں آپ کو بیوی کے ہاتھ کا کھانا بہت مزا دیتا ہے۔ اس لئے وہ دوپہر کا کھانا آپ کے ساتھ ہی کھائیں گے۔ شام کو چائے

بھی آپ ہی کے ساتھ پئیں گے۔ آپ انکار نہیں کر سکتے، کیونکہ انہیں آپکے بُرے بھلے کا بڑا خیال رہتا ہے۔ وہ آپ کی بچی اور بیوی کی تعریف کرتے ہیں اور آپ کا ان سے بے رُخی سے پیش آنا بے مروتی میں شامل ہوگا۔ آپ اندر ہی اندر جھلاتے رہیں گے مگر زبان سے اُف تک نہ کریں گے، کیونکہ یہی شرافت کا تقاضہ ہے۔

بن بلائے مہمانوں کی قسمیں کہاں تک گنائی جائیں۔ مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ لاتعداد آفات ارضی وسماوی کیطرح اس بلائے بے درمان کو بھی گوارا کرنا ہی پڑتا ہے۔ آپ کو اپنی زندگی میں کئی بار اس ذاتِ شریف سے واسطہ پڑ چکا ہوگا۔ ایک بار خود بھی بن بلائے مہمان کا رول ادا کر کے دیکھئے کہ وہ جو دوسروں کیلئے وبال جان بن جاتا ہے۔ خود اس پر کیا گذرتی ہے۔ مجھے کئی بار بن بلائے مہمان کی حیثیت سے کئی مجلسوں میں شریک ہونے کا اتفاق ہو چکا ہے۔ کچھ نہ پوچھیئے کہ اختتام مجلس تک مجھ پر کیا بیتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ تمام حاضرین کی نظریں مجھی پر جمی ہوئی ہیں۔ ہر قہقہے اور مسکراہٹ کا نشانہ میں ہی ہوں۔ ہر لمحہ یہ اندیشہ لگا رہتا تھا کہ ابھی مدعو کئے گئے مہمانوں کی گنتی ہوگی اور مجھے نکال باہر کر دیا جائیگا۔ مسلسل یہ الفاظ میرے کانوں میں گونجتے رہتے کہ ''آپ کو کس نے زحمت دی ہے''؟ جب کوئی جان پہچان کا نظر آتا میں دوسری جانب دیکھنے لگتا۔ غرض کہ آخر دم تک میرے دل کی دھڑکن بڑھتی رہی اور وہاں سے باہر آ کر مجھے یوں محسوس ہوتا کہ برسوں کے بعد زنداں سے چھوٹا ہوں۔

میں جب کبھی بن بلائے کسی کے گھر جاتا ہوں، مجھے صاحب خانہ کی مسکراہٹ میں تلخی، اُس کی باتوں پر طنز، اُس کی بیگم کی مسکراہٹ میں جھلاہٹ اور باتوں میں کڑوا اور کسیلا پن نظر آتا ہے۔ یہ سب جانتے ہوئے بھی میں ہمیشہ

دوسروں کے گھر بن بلائے جاتا ہوں۔ اس لئے کہ مجھے کوئی اپنے گھر بلاتا ہی نہیں اور اگر میں اس انتظار میں رہوں کہ کب بلاوا آتا ہے تو شاید مجھے عمر بھر اپنے ہی گھر کی مُرغی پر قناعت کرنا پڑے گی جو دال برابر ہوتی ہے میزبان اگر مجبور ہے تو مہمان بھی مجبور ہوتا ہے۔ مہمان اگر میزبان کے لئے وبالِ جان بن جاتا ہے تو مہمان کی جان بھی عذاب میں ہوتی ہے۔ دونوں مجبور ہیں۔ اسی لئے دونوں ہی بے قصور بھی ہیں۔

☆☆☆

شمیم احمد شمیم

ویدراہی کی فلم ''دراڑ'' پر ایک مکالمہ

ویدراہی میرے ان دوستوں میں سے ہیں، کہ جن کے لئے میرے دِل میں محبت اور شفقت ہی نہیں عزت و احترام بھی ہے۔ بارہ سال قبل ہم دونوں محکمۂ اطلاعات میں ایڈیٹر تھے۔ میں اُردو رسالے ''تعمیر'' کا' اور وہ ہندی میں شائع ہونے والے ''یوجنا'' کے دونوں سرکاری ملازمت سے نا آسودہ ہی نہیں، بیزار بھی تھے اور کسی طرح رسی تڑا کر بھاگ جانا چاہتے تھے۔ وید کہانیاں لکھتے تھے اور ان کی نظر بمبئی پر تھی۔ میرے دماغ میں سیاست کا کیڑا تھا اور میں علی گڑھ جا کر ایل، ایل بی کرنا چاہتا تھا۔ ایک دِن وید نے مجھے بتایا کہ وہ نوکری چھوڑ کر بمبئی جا رہا ہے اور وہاں فِلموں کے لئے کہانیاں لکھے گا۔ میں سمجھا کہ مجھ پر دھونس جما رہا ہے کہاں جائے گا۔ لیکن پھر ایک دن وہ دفتر نہیں آیا اور اِس کے والد لالہ ملک راج صراف نے یہ اعلان کر دیا، کہ وید بمبئی گیا ہے اور وہ اب لوٹ کے نہیں آئے گا۔ میں اِس بات کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں، کہ وید کے بمبئی چلے جانے کے بعد مجھے پہلی بار یہ محسوس ہوا کہ میں رسی تڑا کر بھاگ سکتا ہوں، لیکن مجھے رسی توڑنے میں ٹھیک آٹھ سال لگے۔ جبکہ وید تین ہی سال کے بعد کامیاب ہو گیا۔ ویدراہی نے اپنی محنت، ریاضت اور خداداد صلاحیتوں سے بمبئی کی فِلمی دُنیا میں اپنے لئے ایک محفوظ جگہ

بنالی ہے۔ وہ کئی فلموں کی کہانیاں اور بہت سی فِلموں کے مکالمے لکھ چکا ہے اور اب اِس نے ہدایت کاری کے میدان میں بھی قدم رکھا ہے۔

پچھلے دنوں مجھے اِس کی ہدایت میں بننے والا پہلا فِلم ''دراڑ'' دیکھنے کا موقع ملا۔ مجھے یہ کہتے ہوئے مسرت کا احساس ہو رہا ہے کہ ''دراڑ'' دیکھ کر ویدراہی کی صلاحیتوں پر میرا ایمان اور اعتقاد پہلے سے بھی زیادہ مستحکم ہو گیا ''دراڑ'' وید کی اپنی ہی ایک کہانی پر مبنی فِلم ہے اور جس خوبصورتی اور خوش مذاقی سے اِس نے اِس کی ہدایت کاری کے فرائض انجام دیئے ہیں۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وید نے بمبئی میں بیٹھ کر اپنا وقت ضائع نہیں کیا ہے۔ بلکہ ایک سچے فنکار کی طرح ریاض کیا ہے۔ ''دراڑ'' یقیناً باکس آفس کے نکتہ نظر سے کامیاب فِلم ثابت نہیں ہو سکتی۔ اور مجھے خوشی ہے کہ اپنی اوّلین پیش کش میں ویدراہی نے باکس آفس سے زیادہ فنی معیار اور موضوع سے وفاداری اور تجربے کی صداقت کو زیادہ ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ فِلم کی کہانی بظاہر ایک نابیا ہتا جوڑے کے گرد گھومتی ہے لیکن اِس میں ہمارے معاشرے کے بہت سے تضادات اور ہماری زندگی کی بہت سی رنگینیاں سما گئی ہیں۔ جنگ کی تباہ کاریوں کے پسِ منظر میں انسانی تعلقات کا ڈرامہ، افراد کی نفسیاتی کش مکش اور محبت کا زیر و بم، شروع سے آخر تک ایک ایسا ماحول تیار کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ کہ جس میں دیکھنے والا اپنے آپ کو کرداروں کی خوشیوں اور مسرتوں، غموں اور مصیبتوں میں برابر کا شریک سمجھتا ہے جنگ کی بے رحمی اور بے مروتی کو ویدراہی نے جس فنکارانہ شدّت کے ساتھ پیش کیا ہے اِس کے پیشِ نظر اِس فِلم کو امن کے موضوع پر ایک بہت اچھا فِلم قرار دیا جا سکتا ہے۔ وید نے جنگ کے خلاف پروپاگنڈا کرنے کی بجائے اِس سے پیدا شدہ ایک انفرادی

المیے کو پوری انسانیت کا درد بنا کر پیش کیا ہے اور یہی اِس کا کارنامہ ہے۔ نقطۂ عروج پر پہونچتے وقت اگرچہ کہانی کچھ کمزور پڑ جاتی ہے۔ اور اِس میں ڈرامائیت پیدا کرنے کے کچھ بہترین مواقع ضائع کر دیئے گئے ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی ویدا اپنا پیغام پہنچانے میں کامیاب ہوجاتا ہے اور ہدایت کار نے وضاحت کی بجائے رمزیت اور ایمائیت سے کام لے کر بہت دیر پا تاثر پیدا کیا ہے۔ فِلم کے گانے اوسط درجے کے ہیں، اور مکالموں پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی ہے۔ تقریباً سارا فِلم آؤٹ ڈور میں تیار ہوا ہے اور کہیں بھی غیر ضروری تصنع سے کام نہیں لیا گیا ہے۔

"دراڑ"۔ ایک ایسا صاف ستھرا فلم ہے کہ جسے خوش مذاق اور بالغ ذہن ہی پسند کریں گے۔ یہ ویدراہی کا ایک بہت ہی جرأت مندانہ تجربہ ہے اور اگر وہ اِس روش پر قائم رہے تو ہم ان سے بہت سی اُمیدیں وابستہ کر سکتے ہیں۔

..................☆☆☆☆..................

ماں بیٹی کی خط وکتابت

ماں کا خط ...... بیٹی کے نام

ماں کا خط:۔

میری پیاری لختِ جگر! بھگوان جانتا ہے کہ میرا یہ خط تم تک پہنچ بھی پائے گا یا نہیں، کیونکہ تمہارے ماموں کا خیال ہے کہ تم ایک تنگ و تاریک کمرے میں محبوس ہو اور تم سے ملنے کی کسی کو اجازت نہیں۔ معلوم نہیں کہ مجھے اس بات کا یقین کیوں نہیں آرہا ہے۔ میرا اپنا خیال ہے تم بالکل آزاد ہو اور یہ خط تم تک ضرور پہنچ جائے گا۔ نہ بھی پہونچے تو مجھے اس کا دُکھ نہ ہوگا۔ کیوں کہ یہ خط صرف تمہارے ہی نام نہیں ہر اُس بیٹی کے نام ہے جو تمہاری ہی طرح ماں کی آغوش سے نکل کر کسی نئی آغوش کی تلاش میں جانے کے لئے بے قرار ہو۔ تمہاری شادی سے اِس شہر ہی میں نہیں، سارے ملک میں ایک ہنگامہ برپا ہوا ہے۔ تمہارے ہم مذہبوں نے آسمان سر پر اُٹھا لیا ہے اور پچھلے دو ماہ سے شہر کی کیفیت ہی بدل گئی ہے۔ دو تین نوجوان پولیس کی لاٹھیوں سے زخمی ہو کر موت کی نیند سو چکے ہیں۔ سینکڑوں بوڑھے اور نوجوان جیل یاترا کر کے لوٹے ہیں۔ پولیس اور فوج نے اہلِ شہر کی خوب مرمت کی ہے۔ تمہارے نام پر پنڈتوں اور مسلمانوں میں بہت سے نئے لیڈر وجود میں آگئے ہیں۔ دِلّی سے سرینگر تک ایک ہل چل مچی ہوئی ہے۔ وزیرِ داخلہ مسٹر چوان بھی

تشریف لائے تھے ۔ شریمتی اِندرا جی کے آنے کی بھی افواہ تھی۔ شاید وہ بھی آجائیں ۔ غرض تم نے غلام رسول سے شادی کیا کی' جذبات کے سوئے ہوئے سمندر میں طوفان اور تلاطم کی وہ لہریں پیدا کردیں کی سینکڑوں برسوں کی روایات کا محل دھڑام سے گر گیا۔

میری بیٹی! مجھے اِس بات کا بے حد افسوس ہے کہ تمہاری وجہ سے خواہ مخواہ اتنا بڑا ہنگامہ پیدا ہوا ہے' میں جانتی ہوں کہ تمہیں بھی یہ جان کر بے حد تکلیف ہوئی ہوگی کہ تمہارے نام پر لاٹھی چارج ہوئے ہیں یا خون بہا ہے ۔ میں نے اپنے پنڈت بھائیوں سے کہا تھا کہ اس بات پر ایجی ٹیشن کرنا مناسب نہیں ۔ لیکن نیتا لوگوں نے میری ایک نہ سُنی ۔ اُنہوں نے کہا کہ ایسا موقعہ پھر شاید کبھی نہ ملے ۔ اِس لئے ایجی ٹیشن کرنا بہت ضروری ہے ۔ میں نے صرف اس وقت رضامندی ظاہر کی جب ایک نیتا جی نے مجھے یہ بھروسہ دِلایا کہ ایجی ٹیشن کرنے سے تم اپنے گھر آسکتی ہو۔ ایجی ٹیشن ختم ہوگئی ہے اور تم اب بھی مجھ سے دُور ہو۔ اس لئے میں سمجھتی ہوں کہ نیتا لوگوں نے میرے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔ تم شاید اب کبھی نہ آؤ گی۔

میری بیٹی! برادری نے تمہاری شادی اور اِسلام قبول کرنے کے ساتھ اِتنے سارے مسائل وابستہ کردیئے کہ ایک ماں کو اپنے دل کی بات سنانے کا موقع ہی نہیں مِلا۔ نیتاؤں نے ملازمت اور کالجوں میں داخلے کے مسئلے کو بھی تمہاری شادی سے نتھی کردیا اور نتیجہ یہ کہ میں تم تک اپنی بات پہنچانے کے لئے تڑپتی ہی رہی۔ تم جانتی ہو کہ ہمارے لئے نوکری اور داخلے کی بات بالکل بے معنی ہے۔ تمہیں ملازمت مِل چکی ہے۔ میں ملازمت کر رہی ہوں ۔ تمہارے میرے سوا' گھر میں کوئی ہے ہی نہیں ۔ جس کی نوکری یا داخلے کی ہمیں کوئی فِکر ہو۔ لیکن اِس کے باوجود

تم ساری برادری کی نوکری اور داخلے کا عنوان بن گئیں ۔ اب ایجی ٹیشن ختم ہوگئی ہے۔ لوگ رفتہ رفتہ تمہیں بھلائے جا رہے ہیں۔ نیتا لوگ بہت اونچی سیاست میں اُلجھ گئے ہیں۔ اُنہیں اب تمہارے بارے میں سوچنے کی ضرورت بھی نہیں ۔ اب ایک ماں اپنی بیٹی کے ساتھ کچھ باتیں کرنا چاہتی ہے۔

پیاری پرمو! تمہیں شاید معلوم ہو کہ تمہاری پیدائش کے کچھ دِن بعد ہی تمہارے پتا جی سرگباشی ہوگئے تھے اور میں نے اپنی راتوں کی نیند اپنے دن کا چین اور اپنی جوانی کا لہو پلا پلا کر تمہیں پالا پوسا' مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب تم چار سال کی تھیں تو تم سخت بیمار ہوگئی تھیں۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ نمونیہ ہوگیا ہے اور بچنے کی اُمید نہیں ہے۔ میں نے پُورے سات دِن تمہیں اپنی آغوش میں یوں چمٹا کر رکھا۔ کہ اگر موت آتی بھی تو میں تمہیں دینے سے اِنکار کرتی ۔ شاید اِسی لئے موت کو تمہارے قریب پھٹکنے کی ہمت بھی نہ پڑی ۔ تم سکول میں داخل ہوگئیں تو میری ساری کائنات کا محور بدل گیا۔ تمہارے بغیر میرا گھر سونا سونا لگتا اور جب تک تم سکول سے لوٹ آتیں ۔ تمہیں اس بات کا بھی اعتراف ہوگا کہ جب تک تم سکول میں پڑھتی رہیں ۔ میں نے کبھی تمہیں یہ احساس نہ ہونے دیا کہ تم ایک بیوہ ماں کی بے سہارا لڑکی ہو۔ قرض اُٹھا کر' دن رات محنت کر کے میں نے تمہارے تعلیمی اخراجات برداشت کئے۔ تمہاری سہیلیوں کو اِس بات کا احساس نہ ہونے دیا کہ تم اِن کے مقابلے میں غریب ہو۔ تمہارے لئے اچھے اچھے کپڑے بنائے' خود بھوکوں رہ کر تمہیں اچھے سے اچھا کھانے کو دیا۔ میں خود سوکھ کر کانٹا ہوگئی۔ مگر تمہاری تندرستی دیکھ کر میں اپنے سارے دُکھ درد بھول جاتی تھی۔ تم نے نوجوانی کی سرحد میں قدم رکھا تو مجھے تمہاری شادی کی فِکر ہوئی۔ ہمارے سماج میں لڑکی کی شادی کتنی کٹھن اور

مہنگی ہوتی ہے۔ اس کا شاید تمہیں اندازہ ہو۔ میں نے پائی پائی بچا کر تمہارے لئے کچھ اثاثہ تیار کر ہی لیا۔ مجھے سوتے جاگتے اُٹھتے بیٹھتے صِرف تمہاری شادی کی فِکر دامن گیر تھی۔ میری خواہش تھی کہ تمہیں ایک اچھا پتی مِلے۔ ایک اچھا گھر مِلے اور میں تمہیں شاد و آباد دیکھ کر زندگی کے باقی دِن گزاروں۔ میں یہ سب باتیں دُہرا کر تمہیں اپنے احسانات کی یاد نہیں دِلانا چاہتی۔ جو کچھ میں نے کیا دُنیا کی ہر ماں یہی کرتی ہے۔ میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتی ہوں کہ مائیں اپنی بیٹیوں کی خاطر کیا کرتی ہیں۔ اور تم سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ تم نے اپنی ماں کی خاطر کیا کیا؟ ذات برادری کے لوگوں نے تو تمہیں اپنی سیاسی دکان چمکانے کے لئے استعمال کیا۔ لیکن میں ماں ہونے کے ناطے تم سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ کیا میرا بھی تم پر کوئی حق ہے یا نہیں؟ یہ بھول جاؤ کہ تم بالغ ہو یا نابالغ۔ یہ بھی بھول جاؤ کہ تم مسلمان ہو یا ہندو، یہ بھی بھول جاؤ کہ تمہارے نام پر شہر میں دنگا فساد ہوا ہے۔ صِرف یہ یاد رکھو کہ تم ایک بیوہ ماں کی اکلوتی بیٹی ہو۔ وہ ماں جس نے تمہیں ساری دُنیا کی نظر میں بچا کر جوان کیا تھا اور تمہارے مستقبل کے لئے خوبصورت گھروندے بنائے تھے۔ وہی ماں یہ جاننا چاہتی ہے کہ جب تم نے گھر کی چار دیواری سے قدم باہر رکھا۔ تو کیا تم نے یہ بھی سوچا کہ تمہاری ماں پر کیا گزرے گی۔ ایک لمحے کے لئے تمہیں یہ بھی خیال آیا کہ اس ماں کے ارمانوں پر کیا گزرے گی۔ جس نے اپنی زندگی کے بہترین سال تمہاری پرورش میں گزارے ہیں۔ بدقسمتی سے تمہاری شادی کے مسئلے پر یہاں کے لوگوں نے ہندو اور مسلمان کا مسئلہ بنا دیا۔ لیکن میں تو یہ جانتی ہوں کہ ہندو یا مسلمان تو تم بعد میں ہو گئیں۔ تم سب سے پہلے میری بیٹی ہو۔ یہ بتاؤ کہ اگر ہر بیٹی اپنی ماں کے ساتھ یہی سلوک کرے، جو تم نے میرے

ساتھ کیا ہے۔ تو ماں بیٹی کا پیار اُن کے رشتے کا تقدس کیسے برقرار رہے گا۔ اس وقت مسلمان تمہیں اسلام کی برتری اور ہندو تمہیں دھرم کی حفاظت کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اس لئے اصلی مسئلہ پسِ منظر میں چلا گیا ہے۔ میرے نزدیک ہندو اور مسلمان دونوں کے لئے مسئلہ یہ ہے کہ لڑکیوں کو والدین کی مرضی کے بغیر شادی کا اخلاقی حق حاصل ہے یا نہیں؟ کیا لڑکیوں کی شادی میں صرف اُنکی اپنی مرضی کا دَخل ہونا چاہیے یا ماں باپ کے مشورے کو بھی کوئی اہمیت حاصل ہے۔ جذبات کی رو میں بہہ کر ہندو اور مسلمان اسے خالص سیاسی مسئلہ اور بعض لوگ مذہبی مسئلہ بنائے ہوئے ہیں، لیکن میں جب ایک ماں کے نکتہ نظر سے سوچتی ہوں تو میرے لئے تمہارے ہندو رہنے یا مسلمان ہونے کا مسئلہ بالکل غیر مطلق ہے۔ میں صرف یہ جانتی ہوں کہ تمہاری ماں ہونے کے ناطے میرا ابھی تم پر حق ہے، کچھ نہیں سوچا۔ تم جذبات کی ترنگ میں ماں کی ممتا اور بیٹی کی سعادت مندی کو بھی بھول گئیں۔ اور مجھے تم سے یہی شکوہ ہے۔ تم اب مسلمان ہو گئی ہو اور میں نہیں جانتی کہ اسلام میں ماں کا کیا درجہ ہے اور ماں اور بیٹی کے تعلقات کی کیا حدیں مقرر ہیں۔ میرے پڑوس میں جو مسلمان عورت رہتی ہے وہ کہتی تھی کہ مسلمانوں کے پیغمبر نے کہا ہے کہ تمہیں اگر جنت کی تلاش ہو تو اپنی ماں کے پیروں تلے تلاش کرو۔ لیکن تم نے اپنی ماں کی محبت کو اپنے پیروں تلے روند کر اپنی جنت بسائی ہے۔ اور اگر میری پڑوسن ٹھیک کہتی ہے تو تم سچے معنوں میں مسلمان بھی نہیں مجھے اِس بات پر یقین نہیں ہے کہ تم پر اس خط کا کوئی اثر ہوگا۔ لیکن میں دُنیا بھر کی ماؤں سے جن میں مسلمان مائیں بھی شامل ہیں اور ہندو مائیں بھی، یہ جاننا چاہتی ہوں کہ اگر آپ کی بیٹیاں بھی وہی راستہ اختیار کریں جو میری بیٹی نے کیا ہے تو تمہارا ردِ عمل کیا ہوگا......؟ میں

جانتی ہوں کہ میں پرانے خیالات کی ایک بیوہ ہوں اور نئے زمانے کے تقاضوں کا مجھے صحیح احساس نہیں لیکن جس طرح جوانی کے قوانین ہوتے ہیں۔ مامتا کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ میرا یہ خط اس تقاضے کی پیداوار ہے۔

بھگوان تمہیں ہر حال میں خوش رکھے اور تمہیں ایک چاند سی لڑکی عطا کرے۔

فقط

تمہاری بیوہ ماں

(آئینہ ۲۰ر ستمبر ۱۹٦۷ء)

..........☆☆☆..........

بیٹی کا خط......ماں کے نام

ماتا جی!

آپ کا خط مِلا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ رسوم و قیود نفرت اور بیگانگی کی مصنوعی دیواروں کو ڈھاتی ہوئی آپ خود میرے پاس آگئی ہیں' آپ کی آنکھیں پہلے ہی طرح روشن تھیں مگر آپ کے چہرے پر جھریوں کے آثار نظر آئے۔ یہ پُرانی ساڑھی جسے پہنتے ہوئے اب آپ کو کئی سال ہوگئے۔ اب بالکل پھٹ چکی ہے۔ حیرت ہے کہ ماموں جان نے ابھی تک آپ کو نئی ساڑھی لاکر نہیں دی ہے آج پہلی بار میرے گھر آئی تھیں تو مجھے آپ کی راہ میں اپنی آنکھوں کا فرش بچھانا چاہیئے تھا مگر آپ کا آنا' اِس قدر غیر متوقع تھا کہ آپ کو سامنے دیکھ کر میں حیرت سے دیکھتی رہی۔ لیکن یقین جانئے کہ آپ کے جانے کے بعد میں بہت دُور تک اِس راہ پر اپنی آنکھوں کے موتی نثار کرتی رہی، جس پر آپ کے پوتر قدموں کے نشان پڑھے تھے۔ ماں نے بیٹی کے سامنے اپنا دِل کھول کر رکھدیا ہے تو بیٹی کو بھی اجازت دیجئے گا ماں کو اپنا کلیجہ چیر کر دکھائے۔

..........ماں! آپ کے خط کا ایک ایک لفظ ایک تیز نشتر کی طرح میرے سینے کو چھلنی کر گیا ہے۔ یہ دو ماہ کی ایجی ٹیشن جس میں کچھ لوگ مارے گئے اور بقول آپ کے سینکڑوں بچوں' جوانوں اور بوڑھوں کو جیل یاترا بھی کرنا پڑی۔ میرے لئے ایک غیر متعلق شوروغل اور ہنگامے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ لیکن آپ کے

خط نے کچھ ایسے جذبات کو بیدار کر دیا ہے کہ جن کو میں نے تھپکیاں دے دے کر سُلا یا تھا آپ نے مذہب اور سیاست کا لبادہ اُتار کر ممتا اور محبت کی بات کی ہے اور مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ دور، بہت دور سے' کوئی میرا نام لے کر پکار رہا ہے۔ نفرت، عداوت اور فساد کے اِس ماحول میں آپ کی آواز سُن کر مجھے میری منزل مِل گئی ہے دھرم، مذہب' وقار، حقوق' نوکری اور اِس طرح کے شور و غل میں ایک بیٹی اپنی ماں سے بہت دور نکل چکی ہے۔ آپ نے اچھا کیا کہ ذات برادری اور نیتاؤں کے چکر سے نکل کر اپنی بیٹی کو "پرمو کہہ" کر آواز دی۔ بات دراصل یہ ہے کہ اِس سارے مُقدمے میں صرف ماں اور بیٹی ہی فریق بن سکتے تھے لیکن جیسا کہ آپ نے کہا ہے دھرم اور برادری کے ٹھیکے داروں نے اپنے حقوق اور اپنی نوکریوں کے لئے ایک بیوہ ماں کی اکلوتی لڑکی کا سودا کرنا چاہا اور اس سودے بازی میں کچھ جانیں تلف ہوگئیں۔ کچھ مکان جل گئے اور کچھ دکانیں لُٹ گئیں۔

ماتا جی! آپ نے کچھ پرانی یادیں تازہ کر کے صرف اپنے آپ پر ہی نہیں، مجھ پر بے حد ظلم کیا ہے۔ اِن یادوں کا تعلق اِن دونوں سے ہے۔ جب ہم ماں بیٹیاں ایک تنگ و تاریک کمرے میں زندگی کی قبا میں پیوند لگایا کرتی تھیں۔ جب آپ گھر کے کام کاج سے فرصت پا کر میرے بال سنوارا کرتی تھیں' اور میں ہر شام آپ کے پیر دبا کر آپ کی طرف دادطلب نگاہوں سے دیکھا کرتی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہم جس لحاف تلے سوتے تھے۔ وہ کئی جگہ تار تار ہو چکا تھا اور آپ ہر شام اِس میں ایک نیا پیوند لگایا کرتی تھیں۔ انہی دنوں کی بات ہے کہ میں نے آپ سے یہ معصوم سا سوال کیا تھا کہ اِس دُنیا میں ہمارا کون ہے۔ تو آپ نے گلوگیر آواز میں جواب دیا تھا' بھگوان! پھر جب آپ نے نوکری کی تلاش شروع کر دی اور آپ

کو نوکری مِل گئی تو آپ نے یہی کہا تھا۔ کہ بھگوان کی کرپا سے مجھے نوکری مِل گئی۔ جوں جوں میں بڑی ہوتی گئی' میرے اندر یہ احساس بھی جوان ہوتا رہا کہ اِس وسیع دنیا میں بھگوان کے سِوا ہمارا کوئی نہیں۔ آپ کہتی ہیں کہ میں نے کبھی تمہیں یہ احساس نہ ہونے دیا کہ تم ایک بیوہ ماں کی ایک بے سہارا لڑکی ہو۔ میں کہتی ہوں کہ آپ کو غلط فہمی ہے، مجھے اپنی بے چارگی کا اِس قدر احساس تھا کہ میں بیان بھی نہیں کر سکتی۔ اسی لئے آپ کے منع کرنے کے باوجود میں نے تعلیم چھوڑ کر ملازمت اختیار کر لی ہے۔ میں آپ کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی تھی۔ میں نے اپنے خوابوں کی دنیا تعمیر کرنے سے پہلے ہی اسے مسمار کر دیا۔ انتہائی بے کسی اور شدید تنہائی کے احساس نے مجھے احساس کمتری میں مبتلا کر دیا اور میں اپنے آپ کو دُنیا کی حقیر ترین لڑکی سمجھنے لگی۔ ایک یتیم لڑکی' جس کا اس دنیا میں ایک بیوہ ماں کے سِوا کوئی نہ تھا بدقسمتی سے میں ایک ایسے سٹور میں ملازم تھی۔ یہاں گاہک ٹھوک بجا کر ہر چیز خریدتے تھے۔ ایک دِن میں اپنے بارے میں سوچنے لگی کہ اِس دُنیا کے بازار میں میری کیا قیمت ہے؟ یہ روپیہ کھوٹا ہے۔ دوسرا دیجئے' ساتھ والے کاونٹر پر ایک سیل گرل نے ایک گاہک کو کھوٹا روپیہ واپس دیتے ہوئے کہا، اور میں جیسے گہری نیند سے بیدار ہوئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے سوال کا جواب بھی یہی تھا۔ میں ایک کھوٹا روپیہ ہوں۔ جس کی کوئی قیمت نہیں' انہی دنوں کی بات ہے کہ سٹور میں کام کرنے والا ایک بھولا بھالا سانولا جوان لڑکا، خود بخود میری آنکھوں میں سمانے لگا۔

اماں جان! لمحہ بھر کے لئے غصہ تھوک دیجئے اور میری داستان کو ایک ماں کے نقطہ نظر سے نہیں، ایک نوجوان لڑکی کی نفسیات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کیجئے' جس دور سے میں گزر رہی ہوں' اس دور سے آپ ہی نہیں' دنیا کی ہر ماں ضرور

گزری ہوگی۔ عمر کی اِس منزل میں نوجوان لڑکی کی دُنیا میں ایک اِنقلاب رُونما ہوتا ہے۔اس کے سینے میں ایک خلش ۔اِس کے جذبات میں ایک طوفان اوراس کی آنکھوں میں کچھ سوال پیدا ہو جاتے ہیں۔وہ کچھ لمحوں کے لئے اپنا افلاس اپنا مرتبہ، اپنی غربت اوراپنی مجبوریوں کو بھول کر اپنے آپ کو مرکز کائنات سمجھنے لگتی ہے۔آپ اگر اپنے حافظے پر زور دیکر صرف بیس سال پیچھے کی طرف دیکھ لیں تو آپ پر اُن باتوں کی معنویت اور اِس افسانے کی حقیقت آشکارا ہوگی۔آپ اعتراف کریں گی کہ میری عمر کی ہر لڑکی اِس نفسیاتی تغیر سے گذرتی ہے۔اور سٹور کے اِس بھولے بھالے ملازم سے میری دل چسپی کا آغاز اِس تغیر کی یادگار ہے۔رفتہ رفتہ میری تنہائی کا احساس مٹنے لگا۔بے چارگی اور بے کسی کا تاثر مدھم پڑنے لگا۔میرے احساس کمتری میں ایک نمایاں کمی واقع ہونے لگی اور مجھے محسوس ہونے لگا کہ یہ دنیا اتنی بدصورت بھی نہیں جتنی مجھے نظر آرہی تھی مجھے اِس وقت یہ معلوم بھی نہ تھا کہ میں اِس بھولے نوجوان سے محبت کرنے لگی ہوں۔اس لئے میں نے نہ اِس کا نام پوچھا اور نہ ہی مذہب...... دِن گزرتے گئے۔اور مجھے دنیا حسین سے حسین تر نظر آنے لگی۔

ماتا جی! کیا دنیا کی کوئی عورت،کوئی لڑکی اِس بات کا دعویٰ کرسکتی ہے؟ کہ وہ اس نازک جذباتی دور سے نہیں گذری ہے؟ کیا مجھ سے پہلے یہ حماقت کسی سے سرزد نہیں ہوئی ہے۔کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ دھرم اور برادری کے بہت سے ٹھیکے داروں نے ایسے مجرموں کو آشیرواد بھی دی ہے؟ پھر کیا وجہ ہے کہ جب ایک ایک بیوہ ماہ کی اکلوتی لڑکی بھی اِس حماقت کو دہراتی ہے۔تو ذات، برادری اور دھرم کے نام پر ایک طوفان بپا کیا جاتا ہے۔آپ سے تو یہ کہکر معافی مانگ لوں گی کہ آپ کی بیٹی نے آپ کی صحبت پر اعتماد کرکے یہ جرم کیا ہے۔مجھے اِس بات کا یقین تھا کہ آپ

میری بڑی سی بڑی خطا بھی معاف کرسکتی ہیں۔ میں جانتی تھی کہ آپ میری خاطر بڑی قربانی دینے کے لئے بھی تیار ہوں گی۔اِس اعتماد نے مجھے یہ حوصلہ دیا کہ میں نے اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر ایسا قدم اُٹھایا۔جو غالباً مجھے نہیں اُٹھانا چاہیئے تھا۔ لیکن مجھے یہ بتایئے کہ برادری کے نام پر ہنگامہ کرنے والوں کو ہماری ذاتی معاملات میں دخل دینے کا کیا حق ہے۔مجھے برادری نے نہیں آپ نے پال کر جوان کردیا ہے۔مجھے دھرم کے ٹھیکے داروں نے نہیں،آپ نے تعلیم دِلائی ہے۔مجھے ہندو دھرم کے نام پَر اقتدار حاصل کرنے والوں نے نہیں،آپ نے نوکری دلائی تھی۔یہ برادری، ذات اور دھرم کے پجاری اس وقت کہاں تھے،جب آپ نے اِس پھٹے ہوئے لحاف میں پیوند لگایا کرتی تھیں۔میری شادی کے فوراً بعد آپ کے اور میرے اتنے دعویدار کیسے پیدا ہوگئے۔اور ہاں میں اِن دھرماتماؤں سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ ۲۸ رجولائی سے قبل تم میں سے کتنے نیتا ایسے تھے جو اپنے بیٹوں کو ایک بیوہ کی اکلوتی لڑکی سے بیانے کے لئے تیار تھے؟

ماتا جی! میں نے آپ کو بڑی تکلیف پہنچائی ہے۔اِس کا مجھے عمر بھر افسوس رہے گا۔آپ نے میری پَرورش کی۔دکھ درد جھیل کر مجھے جوان کردیا۔آپ کا احسان میں زندگی بھر نہ چکا سکوں گی۔لیکن ایک بات میں بھی کہنا چاہتی ہوں،کیا ایک بیٹی اپنی ماں سے کسی چیز کی توقع نہیں رَکھ سکتی ہے۔ہَر ماں، ماں بننے سے پہلے ایک بیٹی ہوتی ہے۔کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ لمحہ بھر کے لئے بیٹی بن کر گستاخی پر نظر ڈالیں، دُنیا میں کتنی ہی بیٹیاں ہوں گی۔جنہوں نے وہی حرکت کی ہوگی جو میں نے کی،لیکن وہ کتنی مائیں ہوں گی جنہوں نے اپنی بیٹیوں کو پولیس اور عدالت کی زینت بنانے کی جَسارت کی ہو۔آپ سے بہتر کون جانتا ہے کہ میں اپنی مرضی سے

مسلمان ہوگئی اور میں نے بغیر کسی جبر و فریب کے اِس بھولے بھالے نوجوان سے شادی کی، جو بدقسمتی سے میرا ہم مذہب نہیں ہے لیکن اِس کے باوجود آپ نے یہ جھوٹ بولا کہ مجھے ورغلا کر حبسِ بیجا میں رکھا گیا ہے آپ نے خودغرض لیڈروں کے جھانسے میں آکر میرے بالغ ہونے کا جھگڑا اُٹھایا۔ اِس کا حتمی فیصلہ عدالت کرے گی۔ کہ میں بالغ ہوں یا نابالغ...... لیکن مجھے یہ بتایئے کہ آپ کی مامتا نے یہ کیسے گوارا کرلیا کہ آپ کی بیٹی پولیس تھانوں اور عدالت کے کچہروں کی رونق بنے۔ مجھے اِس بات کا شدید افسوس ہے کہ میری وجہ سے ریاست کا امن وامان درہم برہم ہوگیا ہے اور صدیوں کی محبت رواداری میں فرق آگیا ہے۔ لیکن آپ نے بیٹی کی غلطی کے لئے اِس سے انتقام لینے کی کوشش کی۔ اور مامتا کی تاریخ میں ایسی مثال ملنا ممکن نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ماں باپ اپنے بچوں کی پرورش کرتے ہیں اور اس طرح اُنہیں اِن کے مستقبل کے متعلق سوچنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ لیکن آپ یہ کیوں بھول جاتی ہیں کہ جوان بچوں کو بھی اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق حاصل رہتا ہے اور زمانہ جس ڈگر پر جارہا ہے۔ اِس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسان کو حق خود اِرادیت حاصل ہوگا۔ میں نے وہی کیا ہے جو اِس سے پہلے میری بہت سی بہنیں کرچکی ہیں اور جو کچھ دنوں بعد ہر لڑکی کرے گی۔ اِس لئے آپ کی ناراضگی تو سمجھ میں آسکتی ہے مگر آپ کا جذبہ انتقام ناقابلِ فہم ہے آپ نے مسلمان ماؤں سے پوچھا ہے کہ اگر ان کی بیٹیاں بھی وہی راستہ اختیار کریں۔ جو آپ کی بیٹی نے کیا ہے تو اُن کا رویہ کیا ہوگا۔ مسلمان مائیں آپ کو میری معرفت یہ جواب دینا چاہتی ہیں کہ آپ کا سوال ہی نہیں۔ بہت سی بیٹیاں ایسا کرچکی ہیں بعض اوقات اپنی ماؤں کا دل دُکھا کر کسی غیر کے ساتھ گئی ہیں۔ اِن ماؤں پر غم والم کے پہاڑ

ٹوٹے۔ لیکن ان میں سے کسی ماں نے آج تک پولیس اور عدالت کا دروازہ نہیں کھٹکھٹایا۔ اِن ماؤں نے اپنی بیٹیوں کی خوشی کی خاطر اپنا وقار اور اپنی ہر خوشی قربان کردی مگر بیٹی کی عزت پر حرف نہیں آنے دیا۔ اِن کا ردِعمل وہی رہا ہے جو آپ کا تھا لیکن اُنہوں نے کبھی وہ نہیں کیا۔ جو ذات برادری کے ٹھیکے داروں نے آپ سے کرایا۔

جہاں تک میرے ہندو یا مسلمان ہونے کا سوال ہے میں آپ کی بیٹی ہونے کے ناطے آپ سے ایک بات اور کہنا چاہتی ہوں، وہ یہ ہے کہ جب سے میں نے محبت کا مذہب اختیار کیا ہے میرے لئے اِسلام، ہندودھرم یا کسی اور دھرم کی کوئی تحقیق باقی نہیں رہی ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ محبت کرنے والا دھرم سے بہت اونچا اُٹھ جاتا ہے اس لئے میں ہندو بھائیوں سے گذارش کروں گی کہ وہ دھرم کے نام پر میرے لئے چنتا کرنا چھوڑیں اور مسلمان بھائیوں سے التماس کروں گی کہ وہ مجھے اسلام کی عظمت کا نشان سمجھ کر میرے لئے مرنے مارنے پر تیار نہ ہوجائیں۔ ہاں میں ملک کے قانون سے درخواست کرتی ہوں کہ اگر میں نے صرف اپنے بنیادی حقوق کا استعمال کیا ہے تو میری حفاظت کا انتظام کیا جائے۔ آپ سب سے پہلے میری ماں ہیں اور اس کے بعد نیتا، زندہ باد کے نعروں کی گونج میں یہ نہیں بھولئے کہ پرمو آپ کی بیٹی ہے۔

بھگوان آپ کو ہر حال میں سکھی رکھے۔ آپ کے خط کا انتظار رہے گا۔

فقط

آپ کی نافرمان بیٹی

(آئینہ ۲۷ر ستمبر ۱۹۶۷ء)

شمیم احمد شمیم

شمیم صاحب

"وہ بڑا بے ایمان ہے۔"

"وہ ایک نمبر کا فراڈ ہے۔"

"وہ باتوں کا سوداگر ہے۔"

"وہ بڑا منہ پھٹ اور گستاخ ہے۔"

شمیم احمد شمیم کے متعلق بہت دیر تک ایک ہی رائے پر قائم رہنا ذرا مشکل ہے۔ اس کی شخصیت بیک وقت اتنی متضاد اور مختلف کیفیات کی حامل ہے کہ اس کا مطالعہ کرنے والے کو ہر قدم پر اپنی رائے میں ترمیم اور تصحیح کی ضرورت محسوس ہوگی۔ میں اس کے بارے میں جو کچھ کہوں گا۔ وہ اسی حد تک صحیح ہے کہ اس خاکے کے مکمل کرنے تک میری اس کے متعلق جو رائے ہے، ہوسکتا ہے کہ اس کے مکمل ہونے کے فوراً بعد مجھے یہ احساس ہو جائے کہ یہ ہر لحاظ سے نامکمل ہے۔"

شمیم صاحب کی پیدائش کا سانحہ سرینگر سے چالیس میل دور ناسنور نامی گاؤں میں آج سے تیس برس پہلے وقوع پذیر ہوا۔ ناسنور (جسے فعل نہی سے فعل امر بنانے کے لئے وہاں کے لوگوں نے آسنور میں بدلنے کی سخت کوشش کی، لیکن ناکام

رہے، مرزا غلام احمد قادیانی کے پیروؤں کی ایک بستی ہے۔ جہاں ہر بچہ پیدا ہوتے ہی قادیانی ہو جاتا ہے۔ اسی لئے شمیم صاحب اس دنیائے آفرینش میں قدم رکھتے ہی دنیائے آخرت کی تیاریوں میں مصروف ہوگئے۔ یعنی قادیانی ہوگئے اور چار پانچ برس کی عمر میں ہی انہیں قرآن مجید، احادیث اور روایات کے اس اسلحہ سے لیس کیا گیا، جس سے مرزا صاحب کے مسیح موعود ثابت کرنے کی جنگ لڑی جاسکتی تھی۔ گیارہ برس کی عمر تک پہنچتے پہنچتے شمیم صاحب اچھے خاصے مولوی ہوگئے۔ پابندِ صوم صلوٰۃ، متقی، پرہیزگار وغیرہ وغیرہ۔ یہ انہی دنوں کی بات ہے کہ ان کے والد (جو قادیانیوں کے زبردست مخالف تھے) نے قریب کے ایک گاؤں میں قادیانیوں کے خلاف زبردست مظاہرہ منظم کیا۔ ناسنور کے ارباب دین نے انہیں شکست دینے کے لئے ان کے مقابلے میں شمیم صاحب کو کھڑا کردیا اور شمیم صاحب نے ایک بھاری اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "میرا باپ گمراہی کے راستے پر جارہا ہے، خدا اُسے صحیح راستے پر چلنے کی توفیق عطا کرے......" اس کے کچھ ہی دنوں بعد جب اہلِ ناسنور نے شمیم صاحب کے والد کا سوشل بائیکاٹ کر کے انہیں ناسنور چھوڑنے پر مجبور کردیا، تو وہ بھی ناسنور سے شوپیاں منتقل ہوگئے۔ شوپیاں میں پہلی بار اس شخصیت کے خدوخال اُبھرنے لگے، جو اپنے مزاج، کردار اور نفسیات کے اعتبار سے نقشِ اوّل سے بالکل مختلف اور متضاد دکھائی دیتی ہے۔ یہاں اُنہوں نے سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کیا۔ ایک عدد تخلص رکھ کر فنِ شعر کے ساتھ زیادتیاں شروع کردیں۔ فنِ تقریر اور خطابت میں مہارت حاصل کرنے کے لئے ابتدائی تجربے کئے "قادیانیت" کا جادو رفتہ رفتہ سر سے اُترنے لگا مرزا صاحب کی جگہ شیخ صاحب نے لینا شروع کی۔

شیخ صاحب کے جلسوں میں نعرے دینا اور اُن کے جلوسوں میں والنٹیر کی حیثیت سے دوڑ دھوپ کرنا، اُن کی سیاست اور عقیدت کا اظہار بھی تھا اور اپنی شہرت کا سامان بھی! ۱۹۴۷ء تک وہ شیر کشمیر کے پرستاروں میں سے تھے۔ ان کی شخصیت میں انہیں پیغمبروں کا جلال اور اقبال کے مردِ مومن کا جمال نظر آتا تھا۔ ان کی تقریروں کا مفہوم نہ سمجھنے کے باوجود ان میں انہیں ایک ایسی لذّت اور کیفیت کا احساس ہوتا، کہ اسے الفاظ کی گرفت میں لانا مشکل ہے۔ ۱۹۴۷ء میں شمیم صاحب یک لخت پاکستانی ہوگئے۔ محمد علی جناح انہیں مسلمانانِ ہند کے نجات دہندہ نظر آنے لگے اور پاکستان ان کے خوابوں کی سرزمین! کشمیر کی عوامی حکومت کے غیر عوامی کردار نے ہندوستان کے تئیں اُن کی نفرت میں شدّت پیدا کردی اور اِن دنوں وہ شوپیان میں چند ساتھیوں کے ساتھ رات بھر ''خوفناک'' اور ''شرانگیز'' پوسٹر چسپاں کرتے رہے۔ میٹرک پاس کرکے جب انہوں نے سری نگر کے ایس، پی، کالج میں داخلہ لیا تو اُن کی وضع، قطع اور گفتگو کا انداز اور طور طریق دیہاتیوں کا سا تھا۔ سخت اور کھردرے بالوں والا یہ دبلا پتلا اور منحنی لڑکا اکثر نائٹ سوٹ پہنے کالج آتا۔ اس کے چہرے سے افلاس، اس کے لباس سے بے چارگی اور اس کی چال ڈھال سے ایک عجیب بے ہنگم پن ٹپکتا۔ وہ تھا تو سائنس کا طالب علم لیکن اپنا زیادہ تر وقت کالج کی ادبی سرگرمیوں میں صرف کرتا۔ معلوم نہیں کہ کس احمق نے اُسے سائنس لینے کا مشورہ دیا تھا۔ اس کے ذہن مزاج اور افتادِ طبع کو سائنس سے قطعی کوئی مناسبت نہ تھی۔ وہ سائنس کے اکثر پرچوں میں غالبؔ، میرؔ اور مومنؔ کے شعر لکھ دیتا اور جلد ہی اس کے استادوں کو یہ محسوس ہوگیا کہ یہ لڑکا سائنس میں چلنے کا نہیں۔ کچھ مخلص استادوں نے مشورہ دیا کہ سائنس چھوڑ کر آرٹس میں قسمت آزمائی کرو، لیکن

وہ اپنی ہار ماننے کیلئے تیار نہیں تھا۔ جوں توں کرکے ایف، ایس، سی، میں پاس ہوگیا۔ لیکن بی، ایس، سی میں آکر اٹک گیا۔ دو بار ناکام ہوکر علی گڑھ بھاگ گیا، وہاں بقول اسکے اس نے ایک ہی سال میں بی، اے پاس کرلیا۔ علی گڑھ میں اس کے ذہن نے ایک اور کروٹ لی۔ اب وہ پاکستانی سے اشتراکی ہوگیا تھا۔ مذہب سے اسکی بیزاری انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ مولوی شمیم تقریباً کامریڈ شمیم ہوگئے تھے۔ ۱۹۵۶ء میں علی گڑھ سے واپسی پر اسے بخشی غلام محمد اور صادق صاحب کی اندرونی کشمکش کا کچھ احوال معلوم ہوگیا۔ بخشی صاحب کے داماد میر نصر اللہ سے قربت کی بنا پر بخشی صاحب کے دربار تک رسائی ہوگئی۔ بیچارگی کے احساس، غیر یقینی مستقبل کے اندیشے، ذہنی سکون اور اقتصادی تحفظ کی تلاش میں بخشی صاحب کی حیات پرور مسکراہٹ نے سہارا دیا اور شمیم نے اپنی خدمات پیش کردیں۔ وہ سرکاری رسالے ''تعمیر'' کے ایڈیٹر ہوگئے۔ ''تعمیر'' کا مقصد پنچسالہ پلان کی پبلسٹی تھا۔ لیکن شمیم صاحب نے اُسے بخشی صاحب کی پبلسٹی کا پلان بنادیا اور اپنے آقا کو خوش کرکے جلد ہی ترقی کے زینوں کی طرف لپکنے لگے۔ دو سال کے اندر اندر وہ کلچرل آفیسر ہوگئے۔ ان دنوں وہ بخشی صاحب کی ناک کا بال تھے۔ بخشی غلام محمد کی سیاسی بد عنوانیوں کے اخلاقی جواز تراشنا ان کی زیادتیوں کو سیاسی جنگ کی اخلاقیات قرار دینا، ان کی خامیوں کو علمیت کا معیار ثابت کرنا، اور ان کی ذات کو کشمیر کی نجات سے تعبیر کرنا۔ شمیم صاحب کا محبوب مشغلہ تھا۔ ان ہی دنوں بخشی صادق کی کشمکش اپنے عروج پر تھی اور بخشی صاحب نے صادق صاحب کی اینٹوں کا جواب پتھروں سے دینے کے لئے ''حقیقت'' نام کا ایک ہفت روزہ جاری کردیا تھا۔ ایک روایت کے مطابق صادق صاحب اور ان کے ساتھیوں کے خلاف اس ہفت روزے میں جتنی

دشنام طرازی ہوا کرتی تھی وہ سب شمیم صاحب کے زورِ قلم کا نتیجہ ہوا کرتی تھی اور شمیم صاحب اپنی وفاداریوں کا یقین دلانے اور ان کا معاوضہ حاصل کرنے کے لئے بخشی صاحب کے مخالفون پر ہر پہلو سے وار کرتے تھے۔ بعض سیاسی مبصرین کا کہنا ہے "ترقی پسندوں" کی منظم جماعت کلچرل کانگریس میں انتشار اور پھوٹ پیدا کرنے کا کارنامہ بھی ان ہی کے ہاتھوں انجام دیا گیا۔ شمیم صاحب کی ان ہی خدمات کے عوض میں انہیں سرکاری جیپ کا ناجائز استعمال کرنیکی مکمل اجازت دی گئی تھی۔ پھر ایک دن خبر آگئی کہ بخشی غلام محمد کو شمیم صاحب کی وفاداریوں پر شبہ ہو گیا ہے۔ کافی ہاؤس اور کئی اور مقامات پر شمیم نے کچھ ایسی باتیں کہی ہیں، جن سے بغاوت اور نافرمانی کی بو آتی ہے اور بخشی صاحب شمیم سے بے حد ناراض ہیں۔ شمیم صاحب سے ان کی سرکاری جیپ چھین لی گئی اور وہ مستعفی ہو کر علی گڑھ کو روانہ ہو گئے۔ معلوم ہوا ہے کہ وہ ایل، ایل، بی کر رہے ہیں، لیکن چند ہی دن بعد سری نگر کے لوگوں نے پھر شمیم صاحب کو کافی ہاؤس میں جلوہ گر دیکھا۔ وہ ایل، ایل، بی کا ارادہ ترک کر کے پھر سرکاری ملازمت کی کھونٹی پر بندھ گئے۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد ان کو کافی ہاؤس میں دفتری اوقات کے دوران کافی پینے کی پاداش میں معطل کیا گیا۔ اب شمیم کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ سرکاری ملازمت میں وہ سکون، وہ اطمینان اور وہ آسائش میسر نہ ہو سکے گی، کہ جس کا وہ خواہاں ہے۔ اسلئے اُس نے ایک بار پھر علی گڑھ کا رُخ کیا اور ایل، ایل، بی کا امتحان پاس کر لیا۔

شمیم صاحب کی شخصیت کے جس پہلو نے مجھے زیادہ تر متاثر کیا ہے، وہ اس کا کھلنڈرا پن ہے۔ وہ دنیا میں کسی بات پر سنجیدگی سے سوچنے کے لئے تیار نہیں، چاہئے کسی کی زندگی اور موت کا ہی مسئلہ کیوں نہ ہو۔ وہ ہنسنے اور ہنسانے کے

لئے کوئی نہ کوئی پہلو نکال ہی لے گا۔ باوجود اس کے کہ وہ آجکل آئینہ میں بہت ہی سنجیدہ اور اہم مسائل پر بظاہر بڑی سنجیدگی اور متانت سے بحث کر رہا ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ اس کی یہ سنجیدگی بھی اس کے کھلنڈررے پن کا ایک پہلو ہے۔ وہ دراصل چٹکیاں لے لے کر خود محظوظ ہونیکی کوشش کر رہا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ یہاں کے لوگوں میں اب ہنسنے کی ہمّت نہیں، اسی لئے وہ خود رونی صورت بنا کر لوگوں کو رُلانا چاہتا ہے تاکہ پھر اُن کی اس حماقت پر وہ جی بھر کر ہنس سکے وہ انتہا درجے کا باتونی ہے۔ اُسے تقریر کرنے کا بے حد شوق ہے اور وہ بے تکان گھنٹوں بولتا رہتا ہے۔ اور غالباً اپنے اسی شوق کو پورا کرنے کے لئے اسے وکالت کا پیشہ اختیار کرنے کی سوجھی ہے اور سیاسی طور پر ابھی اُسے اپنی منزل نہیں ملی ہے۔ اسی کے نظریات میں وہ ٹھہراؤ، وہ پختگی اور توازن نہیں جو ایک باشعور نوجوان میں ہونا چاہیئے۔ وہ فکری طور پر نابالغ اور اپنی ساخت کے اعتبار سے ابھی تک عنفوانِ شباب ہی کی منزل میں ہے۔ وہ بیک وقت اشتراکی، مسلمان، نیشلسٹ اور فرقہ پرست ہے۔ اُس کے سیاسی نظریات میں اتنا تضاد اور Inconsistency ہے کہ "آئینہ کے قارئین کو پانچ سال سے یہی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کہنا کیا چاہتا ہے اور اس کا اپنا مثبت نظریہ کیا ہے۔ وہ پچھلے چند سالوں میں اس تیزی کے ساتھ اپنے اعتقادات بدلتا رہا ہے، کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ وہ کیا ہے۔ آج سے چند ماہ پہلے وہ صادق صاحب کا زبردست مداح تھا۔ آج وہ اُن کا سب سے بڑا نقاد ہے اور غضب یہ ہے کہ اپنی ہر "تبدیلی" کے لئے ایسے ایسے حسین جواز تراشتا ہے کہ دوست احباب منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔

شمیم کو ایک اور فن میں ید طولیٰ حاصل ہے اور وہ ہے منہ پر گالی دینے کا فن۔

وہ گستاخ اور منہ پھٹ ہے، کہ بعض اوقات بداخلاقی کی حدوں کو چھو لیتا ہے۔ اس کی زبان قینچی ہے اور اس میں ایسا زہر بھرا ہوا ہے، کہ جب بھی چلنا شروع ہوتی ہے تو چاروں طرف زخمیوں کے ڈھیر لگ جاتے ہیں۔ دُشمن بنانے اور دوست کھو دینے میں اس کا کوئی جواب نہیں اور جب سے اس نے ''آئینہ'' نکالنا شروع کیا ہے۔ اس نے ساری کائنات کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا ہے۔ وہ بڑا بے ایمان ہے اور سچ بول کر لوگوں کو دھوکہ دے رہا ہے۔ اس میں تعمیر کی بے پناہ صلاحیتیں ہیں، لیکن اس نے اپنی تمام قوتیں تخریب میں صرف کر رکھی ہیں۔ وہ سیاسی دُنیا کا سعادت حسن منٹو ہے جو چونکا دینے پر یقین رکھتا ہے۔ آپ شمیم سے نفرت کر سکتے۔ وہ اپنی شخصیت کو منوانے کا گُر جانتا ہے! اور جب سے وہ اسمبلی کا ممبر بن گیا ہے۔ اس نے اپنے اخبار ''آئینہ'' کو شمیم صاحب کی ذہنی صحت کا بلیٹن یا اُن کی ''صحیح بخاری'' قرار دیا ہے۔ عام لوگ ''آئینہ'' کو شمیم گزٹ اور شمیم نامہ کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ کیونکہ پچھلے دو تین سال سے اس میں شمیم صاحب کی تقریروں، ان کی مصروفیات اور ان کے لطائف کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ ۱۹۶۷ء کے عام انتخابات میں حلقۂ شوپیان سے آزاد امیدوار کی حیثیت سے ان کی کامیابی ایک ایسا معجزہ ہے کہ خود شمیم احمد شمیم جیسے کافر کو بھی خدا کی قدرت اور اُس کی وحدت پر ایمان لانا پڑا۔ لیکن کامیابی کے کچھ ہی دنوں بعد وہ خدا کو بھول جانے کے ساتھ ساتھ اپنے ووٹروں کو بھی بھول گئے۔

شمیم صاحب میں ایک اچھا ادیب بننے کی صلاحیتیں موجود ہیں، لیکن ادب چونکہ زیادہ ریاض لگن اور توجہ چاہتا ہے، اس لئے شمیم صاحب نے اپنے لئے صحافت کا راستہ اختیار کیا ہے۔ (سالنامہ اکتوبر ۱۹۶۹ء)



شمیم احمد شمیم...... بچپن کی ایک یادگار تصویر۔



ڈاکٹر فاروق عبداللہ اور عبدالواحد کے ساتھ، طالب علمی کے زمانے کی تصویر۔



اپنے چاچا جان مرحوم ایم،اے،صابر کے ساتھ (پاکستان میں)



چاچا مولوی عبدالرحیم کے ساتھ (پاکستان میں)۔



اپنی بڑی بیٹی صبا کو لئے ہوئے۔



پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ لی گئی ایک تاریخی تصویر۔



مسز اندرا گاندھی اور شمیم احمد شمیم۔



شمیم احمد شمیم، غلام محمد صادق اور شیخ محمد عبداللہ۔



بخشی غلام محمد کے ساتھ۔



دلیپ کمار، شمیم صاحب اور شمیم کے اہل خاندان۔



شوپیان میں مرار جی ڈیسائی کے ساتھ ۱۹۷۷ء۔



شمیم صاحب اور اُن کی بیگم سکینہ شمیم......شادی پر لی گئی تصویر ۱۹۶۳ء۔



پارلیمانی چناؤ میں فتح یابی کا جشن ۱۹۷۱ء۔



شمیم احمد شمیم اور میر واعظ مولانا محمد فاروق۔



شمیم احمد شمیم اپنی ہمشیرہ قرۃ العین اور صبا بشیر کے ساتھ۔



شیخ محمد عبداللہ اور شمیم احمد شمیم۔



شمیم احمد شمیم اور ذوالفقار بھٹو کے ساتھ۔



مولانا محمد سعید مسعودی اور شمیم احمد شمیم۔



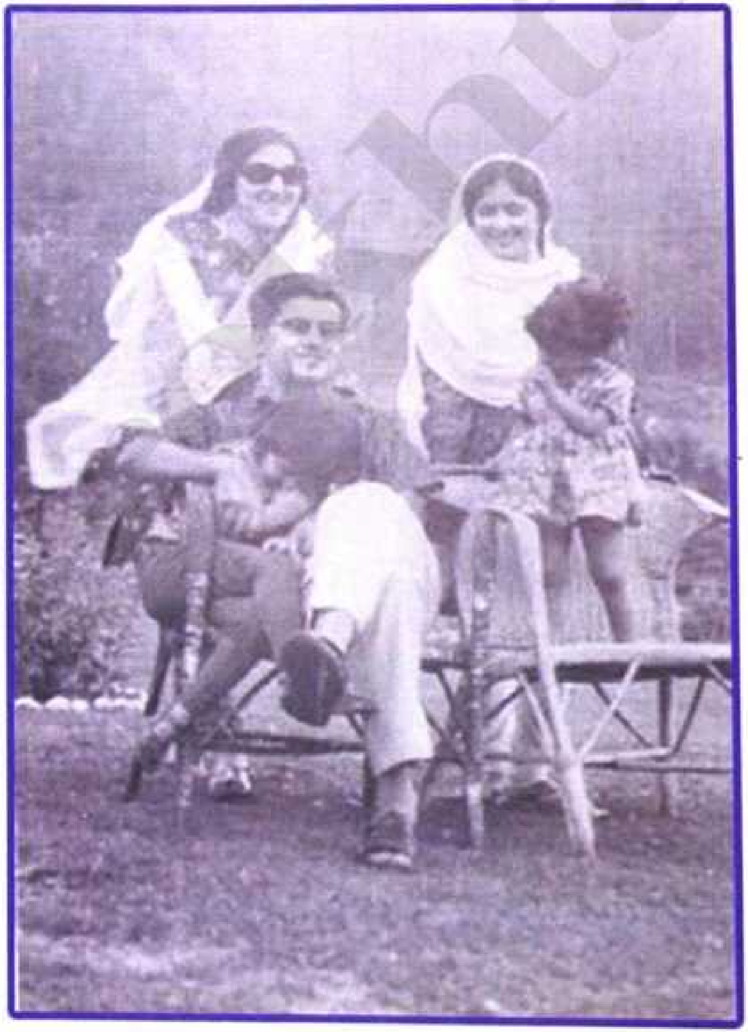
شمیم احمد شمیم اور غلام محمد صادق۔



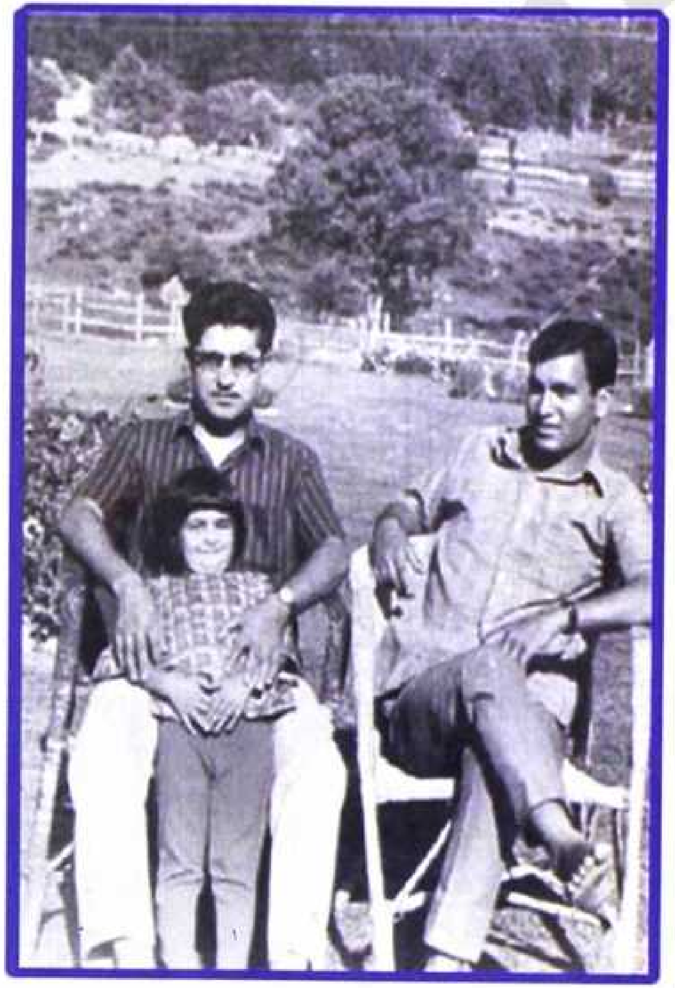
برزلہ میں واقع اپنی رہائش گاہ میں۔



دہلی میں ایک تقریب میں۔



شمیم احمد شمیم، ہمشیرہ حوا بشیر اور قرۃ العین۔



(ریٹائرڈ چیف جسٹس) بشیر احمد خان، شمیم احمد شمیم اور صبا شمیم۔



شمیم احمد شمیم۔



مسز اینڈ مسٹر شمیم، بشیر احمد خان اور مسز حوا بشیر، صبا شمیم۔



کلچرل اکیڈیمی کے اہتمام سے شمیم صاحب کی یاد میں تقریب۔



کلچرل اکیڈیمی کے اہتمام سے شمیم صاحب کی یاد میں تقریب۔ وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی پروفیسر ریاض پنجابی کا خطبۂ صدارت۔



شمیم احمد شمیم اور وزیر اعلیٰ غلام محمد صادق کوٹھی باغ ہائی سکول کی ایک تقریب میں۔



شمیم صاحب۔ کلچرل آفیسر، انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ ۱۹۶۴ء۔



بخشی غلام محمد اور گڈی اوبرائے کے ساتھ۔



جمی ہوئی جھیل ڈل پر شمیم احمد شمیم کی ایک یادگار تصویر۔



۱۹۶۷ء۔ معززین سے خطاب۔



ڈاکٹر شنکر رینہ، مسز شمیم، بشیر احمد خان اور حوا بشیر۔



شمیم احمد شمیم۔



یکم مئی ۱۹۸۰ء......جلوس جنازہ۔



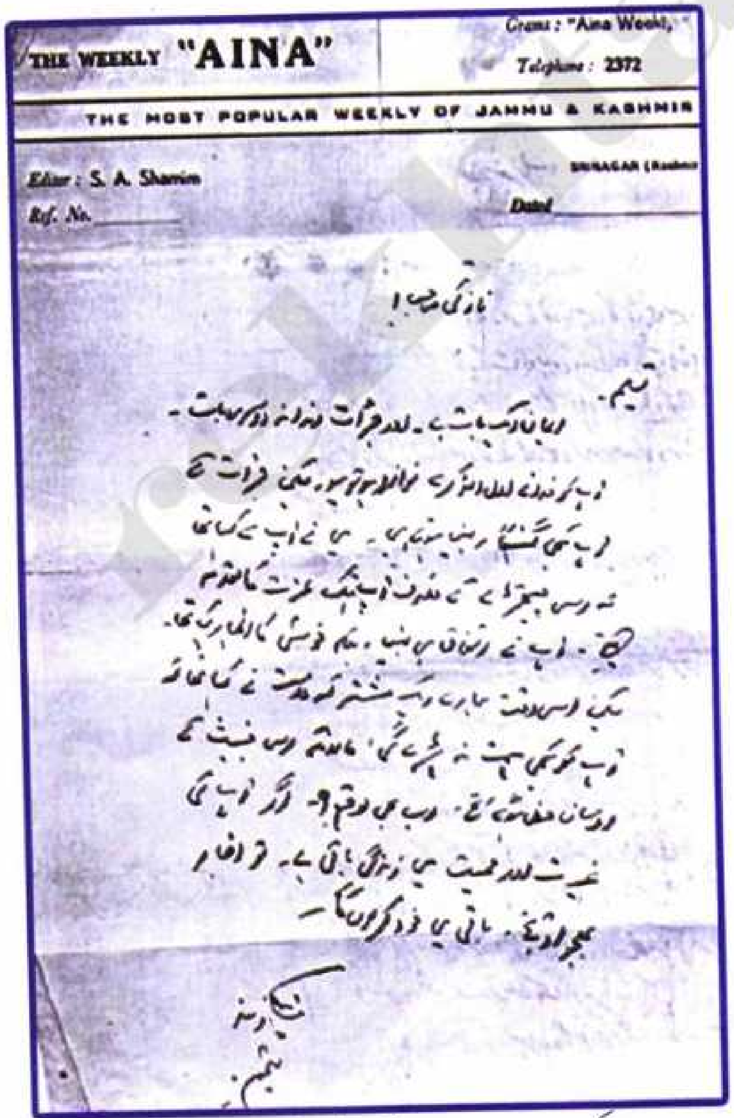
افغانستان میں خیر سگالی وفد کے ہمراہ۔



مرزا محمد افضل بیگ اور شمیم احمد شمیم۔



ڈاکٹر وحید اور شمیم احمد شمیم۔


THE WEEKLY "AINA"

Grams: "Aina Weekly"
Telephone: 2372

THE MOST POPULAR WEEKLY OF JAMMU & KASHMIR

Editor: S. A. Shamim

SRINAGAR (Kashmir)

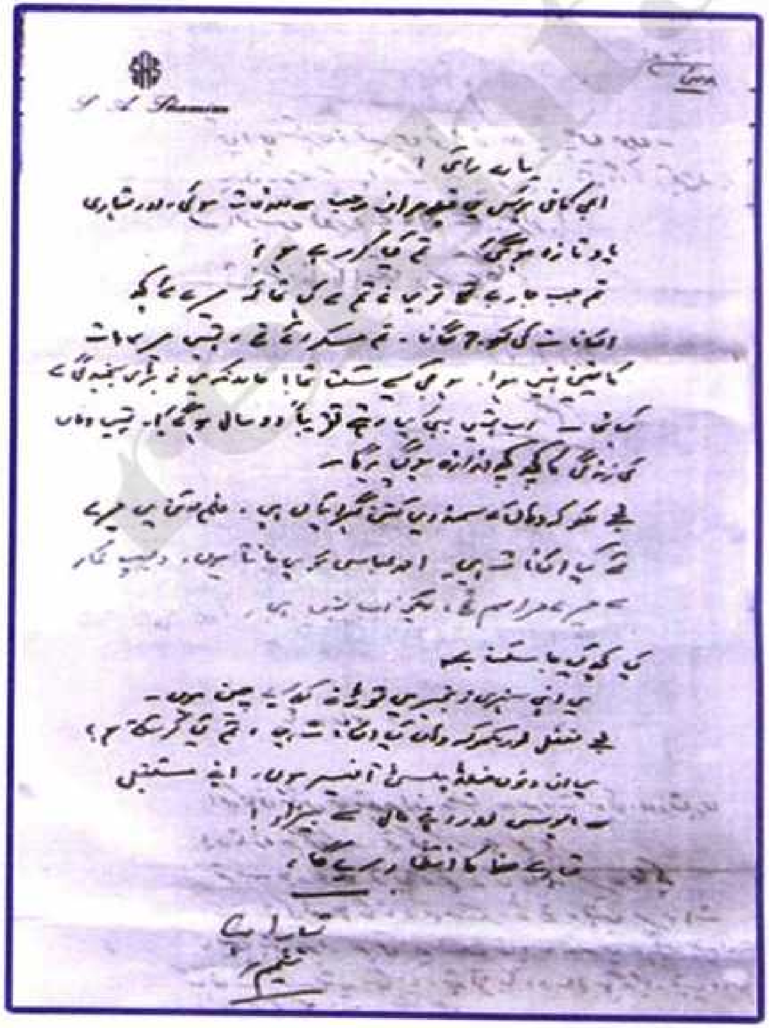
Ref. No.

Dated

نازکی صاحب!

تسلیم۔

عکسِ خط......میر غلام رسول نازکی کے نام ایک مکتوب۔


S. A. Shamim

سرکردہ فلمساز و یدراہی کے نام ایک مکتوب۔



شمیم احمد شمیم۔



مرزا محمد افضل بیگ، شیخ محمد عبداللہ، شمیم احمد شمیم اور دیگر زعماء ایک تقریب میں۔



کلچرل اکیڈیمی کے صدر دفتر پر ادیبوں اور فنکاروں کے ہمراہ۔



شادی کی ایک تقریب میں۔





مئی ۱۹۸۰ء......شمیم احمد شمیم کی قبر پر اجتماعی فاتحہ خوانی۔



{URDU}

SHEERAZA

SHAMEEM AHMAD SHAMEEM NUMBER

(Volume: 47 No: 6-8)

J&K ACADEMY OF ART, CULTURE & LANGUAGE

Chief Editor:
M. Ashraf Tak

Published By:
J & K Academy of Art, Culture and Languages
Srinagar/Jammu

Printed at
Makoff Printer

B Ahmad



تربتِ شمیم